دبستانوں کا دبستان کراچی
جلد دوم
احمد حسین صدیقی
UQAABI

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احمد حسین صدیقی

محمد حسین اکیڈمی
C-161 بلاک 6 فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی

سال اشاعت: اگست ۲۰۰۵ء
قیمت: ۳۰۰ روپے مجلد

نام کتاب: دبستانوں کا دبستان (جلد دوم)

مصنف: احمد حسین صدیقی

ناشر: محمد حسین اکیڈمی

C-161 بلاک 6 فیڈرل بی ایریا، کراچی
فون: 6342609, 6804506
Mob: 0300-8919918

ایک ضروری گزارش

'' دبستانوں کا دبستان'' جلد دوم کا جعلی نسخہ چھاپ دیا گیا جو غیر قانونی ہے۔ میری کتاب '' دبستانوں کا دبستان'' جلد دوم کسی ادارے نے میری باضابطہ اور قانونی اجازت کے بغیر چھاپ کر اس کی مارکیٹنگ شروع کردی اور اس طرح زر کثیر حاصل کرلیا۔ میری علمی و ادبی ساکھ ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ جن حضرات کی روداد اس جعلی کتاب میں شامل ہے اُن کی تصاویر کا حلیہ بھی بگاڑ دیا گیا ہے۔ اب میں اس کتاب کا اصل نسخہ شائع کررہا ہوں۔ اس ادارے کو قانونی نوٹس بذریعہ وکیل دیا جارہا ہے۔ عدالتی کاروائی کے بعد میں اس ادارے سے اپنے جملہ نقصانات کی تلافی قانوناً کرنے کا مجاز ہوں گا۔ میری درخواست ہے کہ جن اداروں کے پاس یہ جعلی نسخہ ہے وہ اسے فروخت نہ کریں۔

احمد حسین صدیقی

تقسیم کار: فضلی بک سپر مارکیٹ

507/3، ٹیمپل روڈ، اُردو بازار، کراچی
فون: 2212991 Email: fazleebook@hotmail.com

طابع: فضلی سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ

F-42، حب ریور روڈ، سائٹ، کراچی۔

ترتیب

---••☆••---

دبستانوں کا دبستاں-حیاتِ جاوید احمد حسین صدیقی

۲۰۰۵ء

تذکرہ اہل علم و ادب کا اب تک ایسا کوئی نہیں
جس میں ہوں شامل شاعرؔ ناثرؔ صاحب تصنیف اور فنکار
شاعر ناثر عالم فاضل بزم کی زینت ہیں راغبؔ
(یہ ہے دبستانوں کا دبستاں بزم آرائی کا شہکار)

۲۰۰۵ء

راغبؔ مرادآبادی

انتساب

میں اپنی کتاب دبستانوں کا دبستان، کراچی (جلد دوم)

اردو کے منفرد محقق، معتبر نقاد اور ممتاز شاعر

مشفق خواجہ

کے نام معنون کرتا ہوں جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علم و ادب کو فروغ دینے میں صرف کیا۔

دنیا میں بے شمار اہل علم، دانشور اور اکابر پیدا ہوئے اور اپنی عمر علم و ادب کی خدمت میں گزار کر رخصت ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے کارہائے نمایاں انہیں ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں اور ان کے نقشِ قدم آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب کا شمار بھی ایسے ہی علم برداروں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر تشنگانِ علم و ادب کی پیاس بجھانے میں اور انتہائی اہم علمی و ادبی کاموں میں گزاری۔ وہ ممتاز ادیب بھی تھے، مستند نقاد و محقق بھی تھے اور خوش فکر و قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ اردو زبان و ادب پر ان کی نظر بہت گہری اور مطالعہ بہت وسیع تھا۔ برصغیر میں ان

کے ثانی چند ہی لوگ ہو سکتے ہیں- ان کی ذات علم کا ایک خزانہ تھی ایک سمندر تھی جس سے ہر علم دوست فیضیاب ہوتا تھا- خواجہ صاحب نے ہفتے میں اتوار کا دن شاعروں ادیبوں محققوں نقادوں دانشوروں اور ادب کے طالب علموں سے ملنے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا- اس دن صبح ہی سے علم و ادب کے پرستاروں کی آمد شروع ہو جاتی اور یہ سلسلہ تین بجے تک جاری و ساری رہتا تھا- اس خوبصورت محفل میں اہل کراچی کے علاوہ اکثر ملک کے دوسرے شہروں سے بھی ادیب شاعر نقاد آتے اور مستفید ہوتے تھے- ملک کے دور دراز علاقوں سے کسب علم کی خاطر طلبہ بھی آجاتے اور فیضیاب ہو کر جاتے تھے اور کبھی کبھی ہندوستان اور دوسرے ممالک کے اہل علم اور اہل قلم بھی ان سے ملنے کے لیے آتے تھے-

مشفق خواجہ نے ابتدائی تعلیم کے بعد سنہ ۱۹۵۲ء میں کراچی بورڈ سے میٹرک سنہ ۱۹۵۷ء میں بی اے آنرز اور سنہ ۱۹۵۸ء میں ایم اے (اردو) کے امتحانات کراچی یونیورسٹی سے پاس کیے- انہیں طالب علمی کے ہی زمانے سے مطالعہ کا بہت شوق تھا- وہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے- جامعہ کراچی کے پہلے میگزین کا اجراء مشفق خواجہ اور ابن انشاء کی ادارت میں ہوا تھا- سنہ ۱۹۵۷ء سے سنہ ۱۹۷۳ء تک انجمن سے بحیثیت معاون معتمد وابستہ رہے- اس دوران خواجہ صاحب نے سہ ماہی ''اردو'' اور ماہنامہ ''قومی زبان'' کے مدیر اور نگراں شعبہ تحقیق و مطبوعات کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں- بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم خواجہ صاحب کی علمی ادبی اور تحقیقی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے اور اُن پر بہت اعتماد کرتے تھے- خواجہ صاحب کو سنہ ۱۹۶۳ء تک بابائے اردو کے ساتھ علمی و ادبی کام کرنے کا اعزاز حاصل رہا تھا-

انجمن ترقی اُردو کے بعد سنہ ۱۹۷۳ء سے ۲۰۰۵ء تک انہوں نے ۳۲ برس ایک گوشہ میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف اور تحقیقی کاموں میں گزارے- مشفق خواجہ نام و نمود کے قائل نہیں تھے- برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں شہرت رکھتے ہوئے شہرت اور خودنمائی سے حد درجہ پرہیز کرتے تھے- مشاعروں اور دوسری ادبی تقریبات میں کبھی شریک نہیں ہوتے تھے- لیکن علمی دنیا کے ہنگاموں سے دور رہ کر اور گوشہ نشین ہو کر بھی وہ برصغیر پاک و ہند اور دیگر ممالک کی ادبی اور غیر ادبی کارگزاریوں کی تازہ ترین خبر سے واقف رہتے تھے- اردو ادب پر کیا نیا کام ہوا اور کیا ہو رہا ہے اس کی بھی تازہ ترین اطلاع رہتی تھی-

مشفق خواجہ صاحب کے ذاتی کتب خانہ کا شمار ایشیا کے منفرد کتب خانوں میں کیا جا سکتا ہے- یہ

کتب خانہ ناظم آباد میں واقع ایک منزلہ عمارت میں ہے- تیسری منزل پر ایک کمرہ ہے سو وہ بھی کتب خانہ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے- پوری عمارت میں صرف ایک کمرہ رہائشی ہے باقی ہر کمرے میں کتابوں سے آراستہ ریک اور الماریاں بڑے قرینے سے رکھی ہوئی ہیں- کتابوں کو اس طریقے پر رکھا گیا ہے کہ جس کتاب کی ضرورت ہو فوراً ہی دستیاب ہو جائے- اس کتب خانے میں قدیم اور نادر کتابیں بھی ہیں اور جدید ادیبوں، محققوں، نقادوں، دانشوروں اور شاعروں کی کتابیں بھی ہیں- ان کتابوں کی تعداد تقریباً چالیس ہزار سے زیادہ ہے جس میں ان کے والد اور دادا سے ورثے میں ملنے والی کتابیں بھی شامل ہیں- کتابوں کے علاوہ خطاطی کے نمونے، خطوط کا نادر روزگار ذخیرہ، مخطوطات، رسالے، پرانے اخبارات اور مشاہیر کی تصاویر وغیرہ بھی ہیں- خواجہ صاحب کو فوٹو گرافی کا بھی شوق تھا- ان سے ملاقات کے لیے آنے والوں کی تصویر وہ خود ہی اپنے کیمرے سے اتارتے تھے- ان کے کتب خانے کی واقعی قدر قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے-

مشفق خواجہ ذہنی اور فکری طور پر بہت خوش مزاج، بے حد حاضر دماغ، بذلہ سنج اور زندہ دل انسان تھے- بات سے بات نکالنے اور جملے بازی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا- ان کی صحبت کی طوالت اور مجلس کی گفتگو کسی کے دل پر بار نہ ہوتی تھی- ہر شریک محفل ہر دم تازہ دم رہتا تھا- اللہ تعالیٰ نے انہیں ذہن و فکر کی بہترین خوبیوں سے نوازا تھا- ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کا سب سے زیادہ اظہار ان کے کالموں میں ہوا ہے- ان کے کالموں کی مقبولیت میں کسی ادیب اور کسی مزاح نگار اور مجلس طراز کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی- ان کا ایک کالم جو کراچی کے ایک اخبار میں چھپتا تھا ہندوستان میں دہلی سے حیدر آباد دکن تک کئی رسالوں اور اخباروں میں نقل کیا جاتا تھا- ان کی حس لطیف بہت تیز اور ذوق لاجواب تھا- وہ شگفتہ مزاج ہی نہ تھے بلکہ شگفتہ نگار اور شگفتہ بیان بھی تھے-

مشفق خواجہ زمانہ طالب علمی ہی سے علم و ادب کی خدمت کرنے میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے- یہ ان کی خاندانی روایات اور روشن خیال گھرانے کی تربیت کا اثر تھا- مشفق خواجہ نہایت خوش قسمت تھے کہ انہوں نے ایک نہایت معزز، مقتدر، معتبر اور باذوق علمی گھرانے میں آنکھ کھولی- ان کا اصلی نام خواجہ عبدالحی اور مشفق خواجہ قلمی نام تھا- وہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے- مشفق خواجہ کے جدِ امجد کشمیر سے لاہور آ کر آباد ہو گئے تھے- علامہ اقبال اور اس دور کے دوسرے اکابر سے ان کے

بزرگوں کے بہت قریبی روابط تھے- قیام پاکستان کے بعد مشفق خواجہ کے والد خواجہ عبدالوحید مستقل طور پر کراچی آ گئے تھے-

مشفق خواجہ کے والد خواجہ عبدالوحید ایک سرکاری ملازم تھے-انہوں نے بھرپور علمی وادبی زندگی گزاری-مشرقی ومغربی علوم پر خصوصاً اسلامیات پر ان کی گہری نظر تھی-وہ اقبالیات کے ماہر تھے- انہوں نے علامہ اقبال کے مشورے سے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا تھا-سرکاری ملازمت کے باوجود ان کا قومی سیاست اور قومی رہنماؤں سے بہت قریبی تعلق تھا-اسی زمانے میں ان کا انجمن خدام الدین سے تعلق پیدا ہوا-وہ اس کے پندرہ روزہ اخبار ''الاسلام'' (انگریزی) کے ایڈیٹر بھی رہے- اس کے بعد وہ بارہ برس تک پی ای سی ایچ ایس کالج کراچی برائے خواتین میں اسلامیات کے استاد رہے-خواجہ عبدالوحید صاحب کا سب سے پہلا مضمون ''مخزن'' میں شائع ہوا تھا-ابتدا میں ان کو شاعری اور افسانہ نگاری سے بڑا لگاؤ تھا،اور ایک افسانوی مجموعہ ''تلاشِ سکون'' کے عنوان سے تاج کمپنی لاہور سے شائع بھی ہوا تھا لیکن وہ جلد ہی علمی کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے اور پھر زندگی بھر تاریخ وتمدنِ اسلام کے بارے میں لکھتے رہے-خواجہ عبدالوحید کا پہلا اہم مقالہ ''قرآن کی سائنسی روح'' "The Scientific spirit in Quran" تھا جو پانچویں انڈین اورنٹیل کانفرنس منعقدہ لاہور سنہ ۱۹۲۸ء کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا تھا جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی تھی-اس مقالے کو علامہ سید سلیمان ندوی نے اس قدر پسند کیا کہ اس کا اردو میں ترجمہ کرا کے اپنے مشہور رسالے ''معارف'' (جنوری، فروری سنہ ۱۹۳۰ء) میں شائع کیا-

خواجہ عبدالوحید کو علامہ اقبال سے بڑی عقیدت تھی اور علامہ اقبال بھی ان پر بہت شفقت فرماتے تھے-انہوں نے کئی اداروں میں علامہ کی رہنمائی میں کام کیا-ان کے نام علامہ کے خطوط شائع ہو چکے ہیں-علامہ اقبال سے متعلق انہوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو ''نقوش'' کے اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا-انہوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ بھی شروع کیا تھا جو ایک مدت تک اخبار ''الاسلام'' کراچی میں قسط وار چھپتا رہا-خواجہ وحید صحافت کے علاوہ مختلف مذہبی انجمنوں کے روحِ رواں بھی تھے-وہ ایک عرصے تک اپنا روزنامچہ لکھتے رہے ہیں جس میں علمی وادبی تحریکات اور شخصیات کے بارے میں نادر معلومات ہیں-

مشفق خواجہ ایسے علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کے متعدد افراد نے علمی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان کے حقیقی تایا خواجہ عبدالمجید اردو کی مشہور لغت ''جامع اللغات'' (چہار جلد) کے مصنف تھے۔ اسی خانوادے کے ایک فرد خواجہ عبدالرشید مشفق خواجہ کے تایازاد بھائی تھے۔ خواجہ عبدالرشید پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر اور فوج میں کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں پہلے وہ انڈین میڈیکل سروس میں لیفٹیننٹ بھرتی ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے سنہ ۱۹۴۴ء میں میجر اور پھر لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۷۳ء میں ریٹائر ہونے کے بعد وہ دیال سنگھ پبلک لائبریری لاہور سے منسلک ہوگئے اور لائبریری کو خوبصورت انداز میں منظم کیا۔ ساٹھ کی دھائی میں وہ جناح ہسپتال کراچی میں بھی بحیثیت ایڈمنسٹریٹر رہ چکے تھے۔ فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی ترویج میں خواجہ عبدالرشید نے مختلف موضوعات پر کام کیا اور اپنی تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔ جن میں تذکرہ طالب آملی' تذکرہ شعرائے پنجاب' معارف الآ ثار' معارف النفس' سیر فرنگ وغیرہ شامل ہیں۔

اسی مہذب خانوادے کے چشم و چراغ مشفق خواجہ صاحب بھی تھے جن سے میری ملاقات غالباً مارچ سنہ ۲۰۰۰ء میں دہلی یونیورسٹی کے سابق پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم کے توسط سے ہوئی تھی جنہیں خواجہ صاحب نے دوپہر کے کھانے پر ہوٹل پنک پینتھر ناظم آباد میں مدعو کیا تھا۔ اس موقع پر مسعود احمد برکاتی صاحب اور ذوالفقار مصطفیٰ صاحب بھی موجود تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے خواجہ صاحب نے میری طرف مخاطب ہوتے کہا کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے!...... میرے کچھ کہنے سے پہلے برکاتی صاحب نے خواجہ صاحب کو بتایا کہ یہ ادارہ ترقیات کراچی (KDA) کے سابق ڈائریکٹر جنرل احمد حسین صدیقی ہیں۔ خواجہ صاحب نے یہ سن کر کہا: ارے ان کو تو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ خواجہ صاحب کی یہ بات سن میں حیران تھا کہ یہ مجھے بچپن سے کیسے جانتے ہیں' کیا ان کا تعلق بھی امروہہ سے ہے؟ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ انہوں نے فرمایا: میرے پاس سیکڑوں خودنوشت ہیں جو لکھنے والے یا دوسرے حضرات مجھے دے جاتے ہیں۔ لیکن صدیقی صاحب کی خودنوشت ''سیاحت ماضی'' مجھے خریدنا پڑی تھی۔ پھر میں سمجھ گیا کہ خواجہ صاحب میرے بچپن کے واقعات پڑھ کر مجھ سے واقف ہوئے ہیں۔ اس کے بعد خواجہ صاحب کے یہاں میرا آنا جانا شروع ہوا۔ چار پانچ سال کی ملاقاتوں کے باوجود آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی وہ مجھے اور میں انہیں بچپن ہی

سے جانتے تھے۔

مشفق خواجہ صاحب خود ایک انسٹی ٹیوشن تھے۔وہ کئی اداروں کی رہنمائی کررہے تھے۔ادارہ یادگار غالب اور غالب لائبریری کے قیام اور اس کے ابتدائی کاموں میں خواجہ صاحب مرزا ظفر الحسن کے شریک اور مشیر تھے۔مرزا ظفر الحسن کی وفات کے بعد اس کی حالت بتدریج ابتر ہوتی جارہی تھی۔لائبریری کی طرف سے وہ بہت فکر مند رہتے تھے۔ان کی خواہش تھی کہ اسے ازسرنو منظم کیا جائے۔اس سلسلے میں انہوں نے مجھ سے بھی لائبریری کے کاموں کی نگرانی کرنے کے لیے کہا اور اس کی مجلس نظما کارکن بھی بنادیا۔اس کام کے لیے میں تیار تو نہیں تھا لیکن انہیں منع بھی نہیں کرسکتا تھا۔بہرحال ان کے حکم کے مطابق میں نے اس ذمہ داری کو قبول کرلیا۔غالب لائبریری کے نیچے کی منزل (گراؤنڈ فلور) حبیب بنک نے جب خالی کردی تو خواجہ صاحب کے مشورے سے اس منزل کو لائبریری کی ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم و توسیع اور دوسرے کاموں کی نگرانی کرتا رہا۔وفات سے تین دن پہلے جب عمارت کی مرمت اور فرش وغیرہ کا کام ختم ہو چکا تو ۱۷رفروری ۲۰۰۵ء بروز جمعرات خواجہ صاحب نے غالب لائبریری میں ایک میٹنگ رکھی جس میں غالب لائبریری کی چیئرمین ثریا بجیا' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' ڈاکٹر معین الدین عقیل' ڈاکٹر محمد علی صدیقی' ڈاکٹر نوید الظفر' احمد مقصود حمیدی سابق چیف سکریٹری سندھ' جناب اعجاز حسین' جناب حسن مصطفی' حکیم سعید مرحوم کی صاحبزادی سعدیہ راشد' پروفیسر ذوالفقار مصطفی' محترمہ زہرہ نگاہ' محترمہ رعنا فاروقی' راقم الحروف اور دیگر شخصیات نے شرکت کی اور لائبریری کو بہتر انداز میں چلانے اور اس کے ذرائع آمدنی بڑھانے کے سلسلے میں کچھ تجاویز پر غور کیا گیا۔خواجہ صاحب نے اس میٹنگ میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔غالب لائبریری میں مشفق خواجہ صاحب کی یہ آخری میٹنگ تھی۔اس موقع پر کچھ مخیر حضرات نے عطیہ کے طور پر لائبریری کی مالی امداد بھی کی۔خواجہ صاحب اس کامیابی سے بہت مطمئن اور بے حد خوش تھے۔

۱۸رفروری بروز جمعہ میری ٹیلی فون پر ان سے بات ہوئی تو کچھ لائبریری کی میٹنگ سے متعلق بھی باتیں ہوئیں۔۱۹رفروری ہفتہ کی رات آٹھ نو بجے خواجہ صاحب کی طبیعت خراب ہوئی تو انہوں اپنے ملازم سے کہا کہ کسی کو بتانا نہیں لوگ پریشان ہوجائیں گے۔جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ان کا ملازم ایدھی ایمبولینس منگا کر ہسپتال لے گیا۔صبح ۸ بجے ہسپتال کے کوری ڈور میں اسٹریچر پر لے جاتے ہوئے

خواجہ صاحب پر دو مرتبہ ہارٹ اٹیک ہوا-انہیں فوراً ہی اِن ٹینسیو کیر میں لے جایا گیا اور دل کا معائنہ کیا جانے لگا-معائنے سے ان کی تشویشناک حالت کا علم ہوا تو اس کے مطابق علاج کیا جانے لگا-

موت اور زندگی کی کش مکش میں اتوار کا دن اور رات اور پھر پیر کا سارا دن گزر گیا لیکن بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی-۲۱ رفروری پیر کی رات دس بجکر دس منٹ پر مشفق خواجہ دارِ فانی سے رخصت ہو گئے-انتقال کی خبر سن کر ادبی دنیا میں ایک کہرام مچ گیا-خواجہ صاحب کے چلے جانے کے بعد اب یہ حالت ہے کہ دنیائے ادب کے ہر فرد کی نگاہیں مشفق خواجہ کو ڈھونڈتی ہیں اور نہیں پاتیں، وہ ہماری دنیا سے بہت دور جا چکے ہیں اب ہمیں دور تک ایسے روشن چراغ کی نظیر بھی نہیں ملتی-وہ خوبصورت ادبی محفلیں بھی اختتام کو پہنچیں جنھیں خواجہ صاحب بڑے اہتمام سے سجاتے تھے-

وہ شہر بھر سے مراسم کا سلسلہ بھی گیا
گیا وہ شخص تو لوگوں میں بیٹھنا بھی گیا

مشفق خواجہ صاحب کی تالیفات، مرتبات اور تصانیف تفصیل کچھ اس طرح ہے:

(۱) ''خوش معرکہ زیبا'' تذکرہ شعر مصنفہ سعادت خان ناصر معرکتہ الآرا مقدمہ کے ساتھ دو جلدوں میں لاہور سے شائع ہوا (۲) ''پرانے شاعر نیا کلام'' بعض ایسے شعراء پر تحقیقی کام جن پر پہلے کبھی نہیں لکھا گیا (۳) ''ابیات'' مجموعہ کلام (۴) ''اقبال'' از احمد دین (۵) ''غالب اور صفیر بلگرامی'' کراچی سے ۱۹۸۱ء اور دہلی سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی (۶) ''جائزۂ مخطوطات اردو'' جو ۱۳۴۸ صفحات کی ضخیم کتاب ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی (۷) تقریباً دو درجن تحقیقی مقالات جو برصغیر کے مختلف علمی جریدوں میں شائع ہوئے-(۸) ریڈیو پاکستان کے لیے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۶ء تک مختلف موضوعات پر تقریباً پانچ سو فیچر لکھے-(۹) ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۷ء تک مختلف اخبارات کے لیے دو ہزار سے زائد کالم لکھے-ان کالموں کا ایک انتخاب کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے (۱۰) ''کلیات یگانہ'' مرتب کی-اپنے والد کے روزنامچے کے سلسلے میں وہ واقعات اور اشخاص کے متعلق حواشی لکھنے میں مصروف تھے جو غالباً مکمل ہو چکے ہیں اور کمپوزنگ کے مرحلے سے بھی گزر چکے ہیں-خواجہ صاحب نے دنیائے ادب میں ایسی خدمات انجام دی ہیں کہ خواجہ صاحب کا نام ہمیشہ عزت واحترام سے لیا جاتا رہے گا-ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں سنہ ۱۹۹۸ء میں ان کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا-

مشفق خواجہ صاحب کے مجموعۂ کلام ''ابیات'' سے منتخب چند اشعار:

چند لمحوں کی رفاقت ہی غنیمت ہے کہ پھر — چند لمحوں میں یہ شیرازہ بکھر جائے گا

یادیں رہ جائیں گی اور یادیں بھی ایسی جن کا — زہر آنکھوں سے رگ و پے میں اتر جائے گا

مسافران رہ شوق تھک گئے تو کیا — جہاں رُکے وہیں بستی نئی بسائی ہے

دل جس کو تلاش کر رہا ہے — وہ مجھ سے جُدا ہی کب ہوا ہے

گزرے ہوئے موسموں کا حاصل — وہ غم جو ابھی نیا نیا ہے

یہ کوئی دل تو نہیں ہے کہ ٹھہر جائے گا — وقت اک خوابِ رواں ہے کہ گزر جائے گا

کیوں خلوت غم میں رہتے ہو — کیوں گوشہ نشیں بیکار ہوئے

آخر تمہیں صدمہ کیا پہنچا — کیا سوچ کے خود آزار ہوئے

کھلے دریچوں سے یوں جھانکتی ہے مایوسی — کہ جیسے اب کوئی جھونکا ادھر نہ آئے گا

گزرتی شب کا ہر اک لمحہ کہہ گیا مجھ سے — سحر کے بعد بھی اک رات آنے والی ہے

کبھی ہوا ہے کبھی روشنی کبھی دستک — عجیب سایہ سا اک میرے گھر میں رہتا ہے

ملا تو ایسے ملا جیسے جسم جاں سے ملے — بچھڑ کے یہ بھی نہ پوچھا کہ حال کیسا ہے

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو — اُسے بھی دیکھو، جو اک عمر یاں گزار گیا

--••☆••--

احمد حسین صدیقی

پیش لفظ

اُردو میں کتبِ حوالہ کی جو کمی ہے اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جسے کسی موضوع پر تھوڑا بہت کام کرنے کا تجربہ ہے۔ سب سے زیادہ کمی جس چیز کی کھٹکتی ہے، وہ سوانحی لغت ہے۔ اگر آپ سیاست، مذہب، ادب یا فنونِ لطیفہ سے متعلق کسی جدید یا قدیم شخصیت کے بارے میں کچھ جاننا چاہیں تو کوئی کتاب رہنمائی نہیں کرتی۔ جب کہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں نیشنل بایوگرافیکل ڈکشنریز تیار کی جاتی ہیں اور مناسب وقفوں سے اُن میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی فرد کے ضروری کوائف جاننا چاہیں تو اس کے لیے آپ کو بے شمار مآخذ کی ورق گردانی کرنی ہوگی، اس کے باوجود یقینی نہیں ہے کہ مطلوبہ معلومات دستیاب ہو جائیں۔

دیگر شعبوں سے قطع نظر، صرف اُردو ادب ہی پر نظر ڈالی جائے تو صورتِ حال خاصی مایوس کن نظر آتی ہے۔ یہ بات میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی بیسویں صدی کے اہم ادیبوں میں سے تھے۔ مے خانۂ دردؔ، دلّی کا آخری دیدار، لال قلعے کی ایک جھلک اور مضامین فراق جیسی کتابوں کے مصنف جو کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ چند شخصی نوعیت کے مضامین سے قطع نظر، ان کے حالاتِ زندگی اور تصانیف کی مکمل فہرست کسی تذکرے یا تاریخِ ادب میں نہیں ملے گی۔ بے شمار مآخذ کی ورق گردانی کرنے کے بعد ان کے حالات ملے تو کہاں؟ ایک فہرستِ کتب میں جو ۱۹۳۹ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ''مصنفینِ اُردو'' کے نام سے شائع کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس فہرستِ کتب تک کتنے لوگوں کی رسائی ہو سکتی ہے!

ادبی شخصیات کے حالات رسالوں، تذکروں اور مختلف نوعیت کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت اُن کتابوں کی ہے جو شہروں اور صوبوں کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ برصغیر کے تقریباً تین ساڑھے تین سو قصبوں، شہروں اور صوبوں کی تاریخیں لکھی گئی ہیں اور بڑی حد تک ان میں ادیبوں کا ذکر ہے۔ بعض قصبوں، شہروں اور صوبوں کے حوالے سے شاعروں اور نثر نگاروں کے جداگانہ تذکرے بھی لکھے گئے ہیں جو ادبی تاریخ کے بنیادی مآخذ ہیں۔ اس نوعیت کے اوّلین کاموں میں ذوالفقار علی مستؔ کا تذکرہ ریاض الوفاق (تالیف ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۴-۱۸۱۳ء) اور غلام علی

موسیٰ رضا رایق کا ''گلدستۂ کرناٹک'' (تالیف ۱۲۴۰ھ مطابق ۲۵-۱۸۲۴ء) ہے- اوّل الذکر میں بنارس کے شعرا کے تراجم ہیں اور ثانی الذکر جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، کرناٹک کے شعرا سے متعلق ہے- اس کے بعد تو اس نوعیت کے تذکروں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا- بڑے بڑے شہروں اور ریاستوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبوں تک کے شعرا کے تذکرے لکھے گئے- حیرت کی بات ہے کہ کراچی جیسے بڑے شہر کے حوالے سے پچھلے ۵۶ برسوں میں کوئی جامع کام نہیں ہوا جب کہ اس شہر میں قیام پاکستان سے لے کر اب تک' ہر دور میں ممتاز شاعروں اور نثر نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے- اس کمی کو پورا کرنے کی سعادت احمد حسین صدیقی صاحب کے نام لکھی تھی' سو انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے یہ کارنامہ انجام دیا-

صدیقی صاحب پیشے کے اعتبار سے آرکی ٹیکٹ ہیں لیکن مزاجاً وہ ادب کے آدمی ہیں- ادب سے ان کی فطری مناسبت ہی نے اُن سے ''سیاحتِ ماضی'' جیسی آپ بیتی لکھوائی- اُردو میں یوں تو بے شمار آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں' لیکن اُن میں سے اکثر کچھ بتانے کے لیے نہیں' بہت کچھ چھپانے کے لیے وجود میں آئی ہیں- بیشتر خودنوشت نگاروں نے اپنی ذات میں وہ تمام خوبیاں تلاش کر لی ہیں جو فرشتوں میں ہوں تو ہوں' انسانوں میں عموماً نہیں ہوتیں- صدیقی صاحب کو اپنے آپ سے ایسی خوش گمانیاں نہیں ہیں' انھوں نے زندگی کا احوال اُسی طرح لکھا ہے جس طرح اسے بسر کیا- اُن کی آپ بیتی میں زندگی ہر طرح کی صناعی اور ملمع کے بغیر نظر آتی ہے، اسی لیے دلچسپ بھی ہے اور پڑھنے کے لائق بھی-

آپ بیتی لکھتے ہوئے اپنی ذات کی بے جا نمود و نمائش سے بچنا آسان کام نہیں ہے' لیکن صدیقی صاحب نے اس مشکل کو بھی آسان کر دکھایا ہے اور اپنے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی جو خودستائی یا خودنمائی کے دائرے میں آتی ہو- مطالب کی ندرت سے قطع نظر، صدیقی صاحب کا انداز بیان بھی نہایت دلکش ہے اور اسی انداز و اسلوب کی وجہ سے وہ تخلیق کاروں میں جگہ پانے کے بجا طور پر مستحق ہیں-

صدیقی صاحب کی دوسری کتاب ''گوہرِ بحیرۂ عرب'' ہے جو کراچی سے متعلق ہے- انھوں نے اس شہرِ بے مثال کی تاریخ بیان کی ہے اور اس کے فن تعمیر پر ماہرانہ نظر بھی ڈالی ہے- نیز اس شہر سے متعلق ہر طرح کی معلومات اس طرح یک جا کر دی ہیں کہ یہ کتاب کراچی کی ثقافتی' تجارتی اور معاشرتی زندگی کی

آئینہ دار بن گئی ہے۔

کراچی کی تاریخ کے بعد صدیقی صاحب نے اپنے آبائی شہر امروہہ کی تاریخ ''کشورِ اولیا'' کے نام سے لکھی۔ امروہہ آبادی اور رقبے کے اعتبار سے تو کوئی اہمیت نہیں رکھتا' لیکن مسلم ثقافت کے مرکز کی حیثیت سے برصغیر کے اہم شہروں میں سے ایک ہے۔ یہ صحیح معنوں میں کشورِ اولیا بھی ہے اور گہوارۂ ادب بھی۔ امروہے کی چند تاریخیں پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں جو زیادہ تر فارسی میں ہیں اور قدیم انداز کی ہیں۔ صدیقی صاحب نے پہلی مرتبہ جدید انداز میں اس شہر کی تاریخ اس کے ثقافتی پس منظر کے ساتھ رقم کی ہے۔ خصوصاً یہاں کی عمارتوں اور فنِ تعمیر کے حوالے سے نیز یہاں کے رسوم و رواج کے بارے میں جو معلومات اور تفصیلات فراہم کی ہیں' اُن سے اس شہر کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کتاب کو تاریخِ امروہہ سے زیادہ برصغیر میں مسلم ثقافت کی تاریخ کا ایک اہم باب سمجھنا چاہیے۔

صدیقی صاحب کی تینوں کتابیں دو شہروں امروہہ اور کراچی کے گرد گھومتی ہیں۔ امروہہ اُن کی جنم بھومی ہے اور کراچی وہ شہر ہے جس نے اُنھیں' بقول خود' بہت کچھ دیا۔ لیکن صدیقی صاحب نے کراچی کو دیا بھی بہت کچھ۔ ادارۂ ترقیات کراچی کے سربراہ اور کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کے چیف کنٹرولر آف بلڈنگز کی حیثیت سے انھوں نے اپنی زندگی کے ۴۰ برس اس شہر کو بنانے اور سنوارنے میں گزارے۔ لہٰذا کراچی سے متعلق علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہنا' دراصل اس شہر سے اُن کی بے پناہ محبت کا اظہار بھی ہے اور ثبوت بھی۔ صدیقی صاحب کی اگلی کتاب ''دبستانوں کا دبستان'' بھی کراچی سے متعلق ہے۔ جس کی پہلی جلد ۲۰۰۳ء میں چھپی تھی' اور اب دوسری جلد شائع ہو رہی ہے۔ دونوں جلدوں میں تقریباً چار سو شاعروں اور نثر نگاروں کے حالات ہیں۔ صدیقی صاحب نے اس کتاب کے لکھنے میں جو محنت کی ہے' اُس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں شامل تقریباً پچاس فیصد ادیب ایسے ہیں جن کے حالات اس سے پہلے کسی کتاب میں نہیں ملتے۔ یہ حالات صدیقی صاحب نے ذاتی تلاش و تحقیق سے حاصل کیے ہیں اور جس طرح انھوں نے ادیبوں کے جاننے والوں اور وارثوں سے رابطہ کیا' اور بار بار کے تقاضوں کی مشقت اٹھائی' وہ کچھ انھیں کے بس کی بات تھی۔ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار جاتا۔

حالات کے ساتھ تصویریں حاصل کرنا بھی خاصا مشکل کام تھا۔ مگر صدیقی صاحب نے اس مشکل کو بھی آسان کر لیا۔ اس کتاب میں جو تصویریں ہنستی بولتی نظر آ رہی ہیں' اُن میں سے بیشتر اصل میں

ایسی نہ تھیں۔اس مرحلے پر صدیقی صاحب کی کمپیوٹر کی مہارت کام آئی اور اُنھوں نے دھندلی اور خستہ حال تصویروں میں اپنے کمپیوٹر سے جان ڈال دی ہے۔

اُردو کا سب سے بڑا تذکرہ ''خم خانہ جاوید'' جس کی پانچ جلدیں گزشتہ صدی کی پہلی چار دہائیوں کے دوران شائع ہوئیں' بلاشبہ نامکمل رہ جانے کے باوجود زبردست اہمیت کی حامل ہے۔تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس تذکرے کے مرتب لالہ سری رام کو متعدد اہل علم کی معاونت حاصل تھی۔لیکن صدیقی صاحب کا کام جو ابھی جاری ہے' اُنھوں نے تن تنہا انجام دیا ہے۔اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ کسی ایک شہر کے حوالے سے اتنے بڑے پیمانے پر کوئی دوسرا کام اب تک نہیں ہوا۔خدا صدیقی صاحب کو تادیر سلامت رکھے اور وہ اس مفید کتاب کی اگلی جلدیں مناسب وقفوں سے شائع کرتے رہیں۔

کراچی

نوٹ: مندرجہ بالا پیش لفظ مشفق خواجہ صاحب نے ۲۲ر جنوری ۲۰۰۵ء کو لکھا تھا۔میری دانست میں کسی کتاب پر مرحوم کی یہ آخری تحریر ہے۔

''دبستانوں کا دبستان، کراچی''

ایک فقید المثال تذکرہ

احمد حسین صدیقی کی کتاب ''دبستانوں کا دبستان، کراچی'' جلد دوم ہر لحاظ سے ایک اہم دستاویز ہے- اگر اس کا مطالعہ جلد اول کے ساتھ ملا کر کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ جو کام اداروں کو کرنا چاہیے تھا وہ تن تنہا احمد حسین صدیقی نے کر دکھایا- ان دونوں جلدوں میں کراچی سے تعلق رکھنے والے ادبا، شعرا اور سماجی سرگرمیوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے بارے میں مختصر تعارفی تحریریں شامل ہیں- ان تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ادبا کے بارے میں معلومات کا منبع خود وہی حضرات ہیں جو اس تاریخی دستاویز کی زینت ہیں یا پھر ان کے لواحقین کی جانب سے مہیا کردہ مواد-

دبستانوں کا دبستان کراچی جلد دوم اُردو کے ممتاز محقق، شاعر اور ادیب جناب مشفق خواجہ کے نام معنون کی گئی ہے- اس انتساب کے ساتھ خواجہ صاحب کے ساتھ مؤلف کی عقیدت کا اظہار یہ بھی شامل ہے- مشفق خواجہ کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی اس اہم منصوبہ کے محرک تھے- مشفق خواجہ نے، جنھیں اب مرحوم لکھتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے، جلد دوم کے لیے مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جو یقینی طور پر مرحوم کی آخری تحریر ہے-

مشفق خواجہ مرحوم احمد حسین صدیقی کی انتھک محنت اور کاوش سے بے حد متاثر تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ ''دبستانوں کا دبستان'' کراچی ایک ایسی تصنیف ہے جو اپنے مؤلف کو زندہ رکھے گی''-

احمد حسین صدیقی نے ڈائریکٹر جنرل، کے-ڈی-اے کے اہم منصب سے ریٹائر ہونے کے بعد اس کتاب کا بیڑہ اٹھایا تھا- اس سے پیشتر وہ ''سیاحتِ ماضی''، کراچی اور اپنی مولد: امروہہ کے بارے میں تین اچھی کتابیں تصنیف کر چکے تھے- یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ ایسا شخص جس نے ''سیاحتِ ماضی'' سے پہلے تصنیف و تالیف کی دنیا میں قدم نہ رکھا ہو وہ اس میدان میں کیونکر اس قدر پُر جوش ہو گیا کہ شاید و باید- احمد حسین صدیقی کے برادرِ بزرگ، محمد حسین صدیقی ملک کے ایک نامور وکیل اور شعر و ادب کی دنیا کی اہم شخصیت تھے- ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ان کا چھوٹا بھائی، بہت کم عرصہ میں، اس قدر نام پیدا

کر لے گا کہ اہلِ وطن ورطۂ حیرت میں پڑ جائیں گے۔

مجھے احمد حسین صدیقی کے برادر بزرگ محمد حسین صدیقی مرحوم سے نیازمندی کا شرف حاصل رہا ہے۔ میں اپنی اوّلین کتاب ''توازن'' میں اپنی ادبی افتادِ طبع کو مہمیز دینے والے چند دوستوں میں ان کے حضور اپنا اظہارِ معنونیت پیش کیا تھا۔ احمد حسین صدیقی اپنے بھائی کے قریبی حلقے کے لیے ''بیرونی'' تھے۔ وہ اپنے بھائی کے دوستوں کا اس قدر لحاظ کرتے تھے کہ وہ اُس حلقہ کے افراد سے کبھی بھی سلام اور آداب کے رشتے سے آگے نہ گئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ، اپنے بھائی کے انتقال کے بعد اس حلقہ کے دوستوں کے بہت قریب آ گئے۔ یہ بھی وضع داری کی ایک مثال ہے۔

احمد حسین صدیقی لائقِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے کراچی کے تمام قابلِ ذکر ادیبوں اور شاعروں کا ایک ایسا فقید المثال تذکرہ تالیف کر دیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ کراچی کے بیشتر شعرا اور ادبا اور اُن کے لواحقین جنہوں نے احمد حسین صدیقی کے ساتھ تعاون کیا وہ بھی لائقِ مبارکباد ہیں۔ اگر آپ کسی ادبی شخصیت کو احمد حسین صدیقی کے تذکرہ میں موجود نہ پائیں تو سمجھ لیجیے کہ احمد حسین صدیقی اپنے بے حد اصرار اور تگ و دو کے باوجود ان صاحب کے حالات حاصل کرنے میں ناکامیاب رہے۔ ان کے سہو میں کسی شعوری فیصلہ کو دخل نہیں ہو سکتا، چونکہ اس تذکرہ میں بہت اہم افراد کے ساتھ کم معروف افراد اس طرح شیر و شکر ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر اہم اور بے حد وقت طلب کام کس طرح ممکن ہو پایا۔

کتاب بہت سلیقہ سے شائع ہوئی ہے اور اس کی کمپوزنگ اور سرورق کا ڈیزائن بھی احمد حسین صدیقی نے کیا ہے۔ وہ اب کتابوں کی تزئین کاری کے میدان کے بھی شہسوار ہو چکے ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

کراچی۔ ۲؍مارچ ۲۰۰۵ء

معروضات

زیرِ نظر کتاب ''دبستانوں کا دبستان کراچی جلد دوم سے پہلے جلد اوّل آپ کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے۔ اس کام کی تحریک اور ابتدا کیسے ہوئی اس کا ذکر میں دبستانوں کا دبستان کراچی جلد اوّل میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔ اب یہ جلد دوم آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔ ان دونوں کتابوں میں تین سو اٹھاسی (۳۸۸) ممتاز ادبی شخصیات کے مختصر حالات ہیں جنہیں 'دبستانوں کا دبستان' کراچی جلد اوّل و دوم کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان محترم شخصیات میں ادیب، محقق، نقاد، شاعر، مصور، مورخ، سیاسی وسماجی اور علمائے دین شامل ہیں۔ ان میں وہ ہستیاں بھی ہیں جو اب دنیائے آب وگل میں نہیں ہیں اور وہ بھی جو اللہ کا شکر ہے کہ بقیدِ حیات ہیں۔

جلد اوّل اور دوم دونوں میں بیشتر شخصیات تہہ در تہہ خصوصیات کی حامل نظر آتی ہیں۔ مثلاً کوئی شاعر ہونے کے ساتھ افسانہ نگار' کوئی شاعر ہونے کے ساتھ مصور' کوئی بہ یک وقت شاعر' افسانہ نگار اور ناول نگار بھی' کوئی اپنے ذوقِ علمی کے ساتھ سیاسی وسماجی کارکن' کوئی پروفیسر اور مورخ بھی' کوئی ادبی وشاعرانہ ذوق کا عالمِ دین اور کوئی ادبی صلاحیتوں کے ساتھ اسٹیج' ٹی وی' سنیما' ڈرامہ' موسیقی وغیرہ فنون میں علمی اور عملی دلچسپی رکھنے والا بھی۔ ہر شخصیت کے ادبی اور فنی پہلوؤں کے ساتھ اس کے پیشہ ورانہ مشاغل کے تذکار' اُس کی زندگی کے نشیب وفراز اور اہم سوانح کو بھی سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ادیبوں اور شاعروں کے روایتی تذکرے کے بجائے رنگارنگ کمالات اور خوبیوں کا جامع تذکرہ بن گیا ہے۔ اس طرح اس آئینے میں کراچی کی زندگی کی ایک خوبصورت تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ اس شہر میں بّرِصغیر پاک و ہند کی اسلامی تہذیب وثقافت کے سارے عناصر یکجا نظر آتے ہیں اور اس ملاپ نے بہ اعتبار فکر وفن اور علم وادب شہر کراچی کو ایسی تازگی وتوانائی بخشی ہے کہ وہ دبستانوں کا دبستان بن گیا ہے۔

تذکرے تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ تاریخ' تذکرے اور شجرے لکھنے کی روایت بہت قدیم ہے۔ ہر انسان کو یہ تجسس رہا ہے کہ وہ کون ہے' کہاں سے آیا ہے' اس کے اسلاف کون تھے

اورانہوں نے ملک وقوم کے لیے کیا کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ معلومات ہمیں تذکروں، شجروں اور تاریخ سے ہی ملتی ہے۔ شجروں سے ہر انسان کو اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں اور نسلوں اور خاندانوں سے تعلق کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح تذکرے دوسرے لوگوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں اور قدیم اور موجودہ دور کی تبدیلیوں کا پتا دیتے ہیں۔

کسی بھی قوم کے ادیب، شاعر، صحافی اور دانشور اُس قوم کی شناخت، سرمایہ اور ایسے گوہرِ نایاب ہوتے ہیں جن کی بدولت پاک وشفاف معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ یہ بڑا المیہ ہے کہ آج ہم ان علم برداروں کے کارہائے نمایاں فراموش کرتے جارہے ہیں۔ موجودہ دَور کے ادباء وشعراء جو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر علم وادب کو فروغ دینے میں مصروف نظر آتے ہیں ان کی ہمارے معاشرے میں وہ قدر ومنزلت نہیں کی جاتی ہے جس کے وہ بجا طور پر حق دار ہیں۔ ایسے بگڑے ہوئے ماحول میں جو بچے پرورش پائیں گے وہ اپنے بچوں کی اصلاح کیسے کرسکیں گے اور اپنی کیا شناخت کرائیں گے کہ ہم کون ہیں، ہمارے آباواجداد کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور ہم کس تہذیب وتمدن کے وارث ہیں۔

تذکرے لکھنے کی اس روایت کو قائم رکھنے کی میں نے بھی ایک کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے اس تذکرے کی اس خصوصیت کو نظرانداز نہ فرمائیں گے کہ یہ ایک مکمل باتصویر تذکرہ ہے۔ میں بنیادی طور پر تو آرکی ٹیکٹ ہوں اور میری پیشہ ورانہ زندگی کا بیشتر حصہ ان مشاغل میں گزرا ہے جن کا بظاہر ادب سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ موضوع ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں لاتعداد گوہر اور موتی چھپے ہوتے ہیں اور انہیں تلاش کرنا انتہائی دشوار اور کبھی ختم نہ ہونے والا کام ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک بڑا اہم، تحقیقی، کٹھن اور ذمہ داری کا کام ہے۔ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ اپنی کم علمی کے سبب کدورت کے آثار پیدا نہ ہوجائیں۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ میں جن شخصیات کو ضبطِ تحریر میں لایا ہوں ان کے خدوخال پوری طرح اجاگر نہ ہوئے ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ''دبستانوں کا دبستان'' کراچی سے ہماری نئی نسل مستفید ضرور ہوگی۔

ہمارا معاشرہ وہ حساس مقام بن گیا ہے کہ جہاں تکریم وتاخیر کا مسئلہ ایک وبائی صورت اختیار کرگیا ہے جس کے باعث اہل علم ونظر اور دانشوروں کو معرض تحریر میں لانا اور سلامت روی سے گزر جانا میرے لیے ایک مشکل ترین کام ہے۔ بہرحال میں نے اپنے تئیں اس تصنیف کو جانب

داری، قصیدہ گوئی اور ہجو کی تلخی سے بہت دور رکھنے کی کوشش کی ہے- میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے مگر میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں جو کچھ کر سکتا تھا وہ میں نے اپنی بساط بھر کر دیا ہے- اس طرح کے کٹھن کاموں میں ایک آنچ کی کسر ہمیشہ رہ جاتی ہے- یہ کسر میرے کام میں بھی ضرور نظر آئے گی' یہ بھی ممکن ہے کہ میری کم علمی کے سبب کسی عزیز و محترم کا ذکر اس کے منصب و خواہش کے مطابق نہ ہو سکا ہو اور وہ میری اس کوتاہی کو دلآزاری یا میرے بارے میں کسی طرح کی بدگمانی و کدورت رکھنے کا وسیلہ بنالے' خدا کرے ایسا نہ ہو- میری تحریر میں زبان کی غلطیاں بھی ہوں گی جس کے لیے میں اپنے قارئین سے معذرت خواہوں-

زیرِ نظر تذکروں کا عرصہ گزشتہ ستاون اٹھاون سالوں پر محیط ہے جن کی تکمیل میں مختلف، رسائل، کتابیں، اخبارات، سوانح عمریاں، یادداشتیں، آپ بیتیاں اور بالمشافہ ملاقات سے استفادہ کیا گیا ہے- اس کتاب کی تیسری جلد بھی خاصی تیار ہے جسے اس کتاب کے بعد شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں- اس کتاب کے لیے تصاویر اور مواد حاصل کرنے میں مجھے بڑی مشکلات اور پریشانی کا سامنا بھی کرنا پڑا جس کا ذکر کرنا مناسب نہیں- بہر حال میں نے اپنے طور پر انتہائی کوشش کی ہے کوئی ایسی نمایاں شخصیت نہ رہ جائے جس کے بارے میں لکھنا ضروری تھا- یہاں میں اپنے قارئین سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ میری رہنمائی کریں کہ وہ کون سے اہم لوگ رہ گئے جن کے بارے میں لکھا جانا ضروری ہے تاکہ اگلے حصے میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر سکوں-

اس کتاب سے پہلے میں کراچی کی تاریخ ''گوہرِ بحیرۂ عرب'' کے عنوان سے لکھ چکا ہوں- کراچی کا ہمیشہ سے منفرد مقام رہا ہے- خوبصورت اور محفوظ بندرگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بے شمار خصوصیات کا حامل شہر ہے- یہ کتاب اپنی دیگر کتابوں کی طرح میں نے براہ راست کمپیوٹر پر خود ہی لکھی اور خود ہی کمپوز کی اور پھر اسے تصاویر سے آراستہ کیا ہے- تصاویر زیادہ تر رسالوں سے حاصل کیں جن میں بیشتر صاف نہیں تھیں جنہیں کمپیوٹر کی مدد سے صاف کر کے پیش کیا ہے-

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے ان شخصیات کے ناموں کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی ہے- آخر میں' میں اپنے کرفرماؤں ڈاکٹر فرمان فتح پوری' ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری بڑی رہنمائی کی- مشفق خواجہ مرحوم نے' جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے دکھ

ہوتا ہے' اس تصنیف کے سلسلے میں انہوں نے میری حد درجہ مدد کی اور میری اس کاوش کو بہت سراہا اور اس کتاب کا پیش لفظ لکھا- اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے- ڈاکٹر محمد علی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس کتاب پر خیال کا اظہار کیا- جو کتابیں، رسائل، آپ بیتیاں اور اخبارات ''دبستانوں کا دبستان'' کراچی کی تکمیل میں معاون ہوئے میں ان کے مصنفین کا بھی شکرگزار ہوں- میں غالب لائبریری کے اسٹاف، خاص طور پر نسیم صاحب اور شہاب قدوائی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں تصاویر اور مواد فراہم کرنے میں میری مدد کی-

---••☆••---

احمد حسین صدیقی

آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ۱۹۱۴ء کو ردولی کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے جو تعلقدار برئی کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے والد سرفراز احمد ردولی کے تعلقدار تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کی زیرنگرانی ردولی میں حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج فیض آباد سے ہائی اسکول اور کرسچین کالج لکھنؤ سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا اور تحقیقی مقالہ ''مولانا شبلی ایک دبستان'' لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا شمار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذہین اور ذی استعداد طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وہ ردولی کے پہلے فرد تھے جنہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور لکھنے لکھانے کا شوق انہیں زمانہ طالب علمی سے تھا۔ ''علی گڑھ میگزین'' میں، جس کے وہ ایڈیٹر تھے، ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب طلبہ یونین کے عہدہ دار بھی تھے۔

تعلقہ دار ہونے کے سبب رئیسانہ بو باس تھی، لہٰذا تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن میں مستقلاً رہنے لگے۔ اور اپنے والد چودھری سرفراز احمد انتظامات تعلقہ سے اپنے کو وابستہ کر لیا کیونکہ وارث تعلقہ وہی ہوتے تھے۔ کافی عرصہ تک تعلقہ کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ سیر و تفریح اور شکار کے بھی بہت شوقین تھے۔ ان مشاغل میں دلچسپی لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کافی عرصہ تک ادبی زندگی سے الگ تھلگ رہے۔ صرف فرصت کے اوقات میں شعر و شاعری سے شغل رہتا تھا اور صبحی تخلص کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد خاتمہ زمینداری کا ریزولیوشن یو۔پی اسمبلی سے پاس ہو گیا۔ اس سے ہر وہ شخص جس کا تعلق زمینداری سے تھا پریشان تھا۔ اسی دوران ملک کی حالت بھی بدلنی شروع ہوئی جس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہو گیا۔

زمینداری ختم ہونے کے بعد آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے لیے روزگار کے دروازے بھی بند ہو چکے تھے۔ لہٰذا تقسیم کے بعد ہجرت کر کے وہ مشرقی پاکستان چلے گئے۔

پاکستان آنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر کے ان کا تقرر ہو گیا-۱۹۶۲ء میں ترقی پائی اور ریڈر مقرر ہوئے-ڈھاکہ یونیورسٹی میں وہ ایک عرصہ تک ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ساتھ کام کرتے رہے-ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر حنیف فوق ان کے رفیق کار میں تھے-ڈاکٹر عندلیب شادانی کے انتقال کے بعد ۱۹۶۹ء میں آفتاب احمد صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اُردو اور فارسی کے صدر مقرر ہوئے-اس عہدے پر انہوں نے ۱۹۷۵ء تک خدمات انجام دیں-مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد یکم جولائی ۱۹۷۵ء میں وہ ریٹائر ہوئے-مشرقی پاکستان کے حالات سازگار نہیں تھے لہذا ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کراچی تشریف لے آئے اور گلستان جوہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی-یہاں پر وہ نیشنل بک فاؤنڈیشن میں بحیثیت آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ملازم ہو گئے-ملازمت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب مختلف یونیورسٹیوں اور جامعہ کراچی سے بطور ممتحن منسلک رہے-

سید علی محمد زیدی نے اپنی تصنیف ''اپنی یادیں'' شائع کردہ عزمی پبلیکیشنز، ردولی، بارہ بنکی (یوپی) میں ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب کی علمی ادبی خدمات پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

''یونیورسٹی کی ملازمت اور علمی ماحول نے فطرتاً ادبی زندگی کا از سر نو آغاز کیا-ڈاکٹر آفتاب کا اسلوب نگارش صاف، شفاف، سادہ اور سلیس ہے وہ بڑی خوبصورت زبان لکھتے ہیں-تنقیدیں تاثراتی اور جذباتی ہوتی ہیں اور ایسی تنقیدوں میں جو خلوص ہوتا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے-ڈاکٹر صاحب چونکہ دبستان شبلی سے تعلق رکھتے ہیں لہذا ان کی تحریروں میں دبستان شبلی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں-وہ مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مہدی افادی، مولانا محمد حسین آزاد، جعفر علی اثر لکھنوی اور آل احمد سرور سے متاثر نظر آتے ہیں-

ڈاکٹر صاحب نے داغ، میر اور آتش پر جو کتابیں لکھی ہیں ان کو داغ، میر اور آتش پر کتاب لکھنے والے نقاد مشکل ہی سے نظر انداز کر سکتے ہیں-اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا انداز نقد نہایت شگفتہ اور شاداب ہے-آپ کی تحریروں میں بڑی رعنائی اور رنگینی ہے-ان کے نظریات سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر نثر کی دلکشی سے انکار ممکن نہیں-

.........وہ علامہ شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، داغ دہلوی اور آتش پر مخصوص تحقیقی مقالے

قلمبند کر چکے ہیں- ادیبوں، شاعروں اور محققوں کے سلسلہ میں آپ کا دائرہ معلومات کافی وسیع ہے اور سند کا درجہ رکھتا ہے- اس کے علاوہ آپ کے مضامین برابر ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں جن کو صاحبان ذوق بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں- اس وقت دو کتابیں ''شبلی اور ان کی تصانیف''، ''اکبر الہ آبادی چند مطالعے'' زیر طبع ہیں''

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف میں حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

(۱) شبلی ایک دبستان

(۲) گلہائے داغ

(۳) صہبائے مینائی

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی مختصر علالت کے بعد ۲۲ / مارچ ۱۹۹۸ء کو دار فانی سے رخصت ہو گئے- ان کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اُردو نے ایک تعزیتی جلسہ بھی کیا-

---••☆••---

آفتاب حسن، میجر

اردو کالج کراچی کے نامور اور استاد پرنسپل میجر آفتاب حسن ۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء کو بہار کے شہر بازید پور میں پیدا ہوئے- بازید پور کی نسبت سے کبھی کبھی وہ ا-ح-بازید پوری لکھتے تھے- دس سال تک انہوں قرآن شریف، اُردو اور فارسی گھر پر پڑھی- سنہ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا- سنہ ۱۹۳۲ء میں آفتاب حسن نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی آنرز اور سنہ ۱۹۳۳ء میں طبعیات میں ایم ایس سی کیا- اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے اسٹیٹ اسکالرشپ پر لندن چلے گئے- لندن جانے سے قبل انہیں بتا دیا گیا تھا کہ یہاں کیمیا میں استاد کی ضرورت ہے- لندن میں ان کی ملاقات چودھری رحمت علی سے ہوئی- ان دنوں تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی- چنانچہ آفتاب صاحب بھی طلبہ کی اس جماعت میں شامل ہو گئے جو برطانیہ میں تحریکِ پاکستان چلا رہے تھے- اس سلسلے میں وہ طلبہ کے وفد کے ساتھ سنہ ۱۹۳۴ء میں محمد علی جناح (اس وقت قائداعظم نہیں تھے) سے ملنے گئے اور مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں پاکستان چاہیے-

سنہ ۱۹۳۶ء میں آفتاب حسن صاحب وطن لوٹے اور حیدرآباد دکن میں انسپکٹر تعلیم مقرر ہوئے اور ساتھ ہی مددگار ناظمِ تعلیمات کی خدمات بھی انجام دیتے رہے- سنہ ۱۹۴۷ء میں وہ مجلسِ تعلیم ثانوی کے معتمد مقرر ہوئے- کچھ عرصہ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل بھی رہے- اسی زمانے میں آفتاب صاحب نے ایک رسالہ "سائنس" کے نام سے جاری کیا-

سنہ ۱۹۴۸ء میں سقوط حیدرآباد کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور ۱۹۴۹ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں صدر شعبہ سائنس مقرر ہوئے- پاکستان ملٹری اکیڈمی کی ملازمت میں ان کے نام کے ساتھ میجر کا اضافہ ہوا جو ہمیشہ کے لیے ان کے نام کا جزو لازم بن گیا- پاکستان ملٹری اکیڈمی کے بعد سنہ ۱۹۵۳ء میں میجر آفتاب حسن کا اردو کالج میں بحیثیت پرنسپل تقرر ہوا- اس وقت اُردو کالج رنچھور لائن میں ایک پرانی عمارت میں واقع تھا- اس منصب پر انہوں نے سنہ ۱۹۵۹ء تک خدمات انجام دیں- تدریسی خدمات کے

ساتھ ساتھ میجر آفتاب علمی ادبی اور دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ ان کے دور میں کراچی یونیورسٹی کی بیشتر پوزیشن اسی کالج میں آتی تھیں اور کھیلوں کے مقابلوں میں بھی اسی کالج کی ٹیمیں ہمیشہ فاتح رہتی تھیں۔ اسی زمانے میں خواجہ معین الدین کا لکھا ہوا ڈرامہ ''تعلیم بالغان'' سب سے پہلے اسی کالج کے اسٹیج پر کھیلا گیا۔

میجر آفتاب اردو کالج کے پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ جامعہ کراچی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے اعزازی ناظم بھی تھے اور کچھ عرصے کے لیے شعبۂ کیمیا کے منتظم بھی رہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء سے سنہ ۱۹۷۲ء تک وہ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے باقاعدہ ناظم اور شعبۂ فطری علوم کے پروفیسر رہے۔ ان کے زمانے میں اس شعبہ میں بہت کام ہوا۔ سنہ ۱۹۷۸ء میں جب مقتدرہ قومی زبان قائم ہوا تو میجر آفتاب صاحب اس کے معتمد مقرر کیے گئے اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے انتقال کے بعد قائم مقام صدر نشین مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۸۳ء تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔

پاکستان آنے کے بعد اردو میں سائنس کی تعلیم ان کا پہلا اور آخری عشق تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے کئی کام کیے' سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی' رسالہ ''جدید سائنس'' جاری کیا' رسالہ ''سائنس بچوں کے لیے'' جاری کیا۔ سائنس کی تقریباً ایک لاکھ اصطلاحوں کے اردو مترادفات تیار کرائے۔ مقتدرہ قومی زبان کا ماہنامہ ''اخبار اردو'' جاری کیا۔ جلسے جلوس نکالے' مذاکرے اور مباحثے کیے۔ انہوں نے ہر دور میں کلمۂ حق کہا اور کسی دباؤ میں نہیں آئے۔ ڈاکٹر آفتاب حسن نے اُردو ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر کے لیے کلیدی تختہ صدر ضیاء الحق کی کابینہ میں پیش کر کے منظور کرایا۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) اسرائیل (ڈراما) (۲) سائنس کی پہلی' دوسری' تیسری اور چوتھی کتاب (۳) معلومات سائنس (۴) سائنس اور زندگی (۵) سائنس اور ریاضی کی درسی کتابیں (۶) اُردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات طبعیات (۷) ریاضی فلکیات اور کیمیا وغیرہ

آفتاب حسن طالب علموں سے محبت کرنے والے عظیم استاد تھے۔ پاکستان آ کر انہوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ فروری سنہ ۱۹۹۳ء کو میجر آفتاب حسن دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

---••☆••---

آمنہ کمال، پروفیسر

پروفیسر آمنہ کمال ۱۹۳۱ء میں رامپور کے ایسے علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں جو صدیوں سے شعروسخن کا گہوارہ رہا ہے۔ ان کے والد محمد احمد مینائی برصغیر کے مشہور شاعر و نعت نگار منشی امیر احمد مینائی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ امیر احمد مینائی شاعری، نثر نگاری، اردو، عربی، فارسی اور ہندی پر عبور رکھتے تھے اور اپنے ہم عصروں اور بعد کے ذی شعور علماء و فضلاء میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ وہ نواب رامپور کے استاد تھے اور اُن کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ آمنہ کمال کے والد محمد احمد مینائی خود بھی شاعر تھے اور صریر تخلص کرتے تھے۔ آمنہ کمال ابھی ساڑھے تین سال کی تھیں کہ ان کے والد کا سایہ ان کے سر سے اُٹھ گیا۔ آمنہ مینائی کے بچپن کے چھ سال رامپور کے ایک حویلی نما مکان میں اپنے چچاؤں، پھوپھیوں، والدہ اور بھائی بہنوں کے ساتھ گزرے۔

والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ ان کے بھائیوں میں کوئی بھائی بھی فارغ التحصیل ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ ایسے حالات میں آمنہ مینائی کے منجھلے چچا نے جو اُس وقت ریاست حیدرآباد دکن میں وزیر مذہبی امور تھے، اصرار کر کے اس خاندان کے سب افراد کو اپنے پاس بلا لیا۔ آمنہ کمال کہتی ہیں کہ مشکلات کے باوجود وہ دَور خلوص و محبت سے بھرپور تھا اور عجب اپنائیت اور خوشیوں کا زمانہ تھا۔ سیاسی طور پر جنگِ آزادی، مولانا محمد علی جوہر کی تحریک خلافت اور اقبال کی شاعری کے ڈنکے بج رہے تھے۔

آمنہ کمال نے ابتدائی تعلیم دو سال تک ایک کانوینٹ میں حاصل کی۔ اس کے بعد حیدرآباد کے مشہور اسکول نام پلی گرلز اسکول سے امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا۔ اُس وقت ان کے اسکول کی ساتھیوں میں ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر طلعت سلیمان، عذرا ابن علی (محفوظ علی بدایونی کی پوتی) اور اطہر سلطانہ (وکیل بعد میں وزیر) اور متعدد معزز گھرانے کی لڑکیوں سے تعلق اور ربط وضبط تھا۔ میٹرک کے بعد مشہور کالج کلّیۂ اُناث، حیدرآباد میں انٹر آرٹس میں داخلہ لیا۔ مضامین اور تعلیم کے تسلسل میں سب سے

زیادہ رہنمائی ان کے منجھلے بھائی ادریس احمد مینائی خالدؔ نے کی۔

آمنہ کمال بتاتی ہیں کہ یہاں ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر جہاں بانو نقوی' ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، رضیہ حسن موہانی اور محترمہ زینت ساجدہ تھیں جنہوں نے ملک میں چلنے والی کئی تحریکوں سے بھی آشنا کرایا۔ انگریزی کی استادوں میں مس شیریں شروف اور مس چنائے بہت نامور تھیں۔ بقول آمنہ کمال اس عظیم درس گاہ میں بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں اُس وقت کے دانشور ڈاکٹر عبدالعلیم، ملک راج آنند' کرشن چندر' فراق گورکھ پوری' اختر حسین رائے پوری وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اثر مخدوم محی الدین کی شاعری اور شخصیت کا تھا اور فضا میں چاروں طرف رچا بسا تھا۔ ہر زبان پر اُن کے تذکرے تھے اور ہر طرف ان کے اشعار سنائی دیتے تھے۔ فیض احمد فیض کی معرکتہ الآراء نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' اور ساحر لدھیانوی کی 'مادام' بہت مقبول تھیں۔ کیفی اعظمی کی بیوی شوکت بھی اسی کالج میں پڑھتی تھیں۔

سنہ ۱۹۴۸ء میں سقوطِ حیدر آباد کے بعد حالات ایسے ناگفتہ بہ ہوئے کہ بہت سے مسلمانوں کو پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔ ان کے بڑے بھائی نے بھی پاکستان ہجرت کرنے کا ارادہ کیا۔ آمنہ کمال نہیں چاہتی تھیں کہ ایسے خوبصورت ماحول کو چھوڑ کا پاکستان چلی جائیں لیکن گھر کے تمام افراد ہجرت کر جانے پر متفق تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں آمنہ کمال اپنے گھر کے تمام افراد کے ساتھ کراچی آ گئیں۔ ان کے بہنوئی نے جو سنہ ۱۹۴۶ء سے یہاں مقیم تھے انہیں کیماڑی پر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں ٹھہرایا۔

آمنہ کمال نے بی اے میں داخلہ لینا چاہا تو معلوم ہوا کہ کراچی میں داخلوں کی تاریخ گزر چکی ہے۔ چنانچہ ان کی بھانجیوں نے اصرار کر کے انہیں لاہور بلا لیا اور اس طرح آمنہ کمال کا داخلہ لاہور کالج میں ہو گیا۔ ان کے ایک بہنوئی میجر خلیل الرحمٰن صدیقی لاہور میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ بی اے کی ڈگری حاصل کر کے دو سال بعد آمنہ واپس کراچی آ گئیں۔

کراچی آنے کے بعد انہوں نے ایم اے کرنے کے لیے داخلہ لیا۔ اس زمانے میں کراچی یونیورسٹی کی عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی لہٰذا مختلف مضامین کی کلاسیں مختلف کالجز میں ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ آمنہ کمال نے اپنی تعلیم اسلامیہ کالج میں مکمل کی۔ انہوں نے کہ اُس وقت پڑھائی کا بڑا غیر رسمی مگر بہت اچھا انداز تھا۔ اساتذہ اپنی مرضی سے کبھی کبھی کلاسوں میں پابندی سے آتے اور کبھی طالب علموں کو اپنے

گھر بلا کر پڑھاتے تھے۔دوران تعلیم مختلف مباحثوں اور تحریری مضامین کے مقابلوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔۱۹۵۴ء میں ایم اے کے نتیجے سے قبل آمنہ کمال سرسید گرلز کالج میں لیکچرر مقرر ہوگئیں۔یہ کالج ۲۶ر جولائی سے شروع ہوا اور ۷ر اگست کو ان کا تقرر ہوا تھا۔

حیدرآباد دکن میں قیام کے دوران آمنہ کمال کے مختلف مضامین حیدرآباد دکن کے رسالے ''سب رس'' اور ایوان میں شائع ہوتے تھے۔رسالہ ''مہر نیم روز'' میں کئی ترجمے اور افسانے شائع ہوئے۔آمنہ بینائی نے ریڈیو پاکستان کے خواتین پروگرام ''اردو ادب کے نسوانی کردار'' کے سلسلے میں کئی تقریریں کیں۔سرسید گرلز کالج کی زندگی میں انہوں نے بڑے نشیب وفراز دیکھے اور یہ اندازہ ہوا کہ یہی وہ منزل تھی جس کا انہیں برسوں سے انتظار تھا۔کالج میگزین جو ابتدا سے ان ہی کے سپرد تھا' پچیس تیس سال تک ان کی ہی نگرانی میں نکلتا رہا۔اسی زمانے میں آمنہ کمال نے اورینٹل کالج لاہور سے پی ایچ ڈی کے لیے درخواست دی۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے انہیں ''لکھنؤ کا دبستانِ نثر'' پر کام کرنے کی ترغیب دی۔کراچی میں ان کے نگراں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مقرر ہوئے۔لیکن موضوع کی غیر معمولی وسعت اور اپنی نجی مصروفیات کے سبب وہ اس کام کو جاری نہ رکھ سکیں۔

سرسید گرلز کالج کی پرنسپل مسز زمن تھیں۔وہ جب بھی کسی مصروفیت کی بناء پر ملک سے باہر جاتیں تو پرنسپل شپ ان ہی کے سپرد کر جاتی تھیں۔مسز زمن کے ریٹائرمنٹ کے بعد آمنہ کمال ہی پرنسپل مقرر ہوئیں۔ان کے زمانے کی طالبات میں بڑی نمایاں اور باصلاحیت لڑکیاں شامل رہی ہیں جن میں پروین شاکر' شمیم کاظمی' خوش بخت عالیہ' سعیدہ گزدر' ملکہ معین (حسینہ معین کی بہن)' حمیرا اطہر اور نگار یاسمین وغیرہ شامل ہیں۔کالج کے اس دور میں آمنہ کمال لکھنے پڑھنے کا کام جم کر نہیں کر سکیں۔البتہ مذاکروں اور سیمیناروں میں حصہ لیتی رہیں۔ایک کتاب ''قائداعظم اینڈ ایجوکیشن'' (انگریزی) جو ایجوکیشن بورڈ کراچی سے شائع ہوئی اس میں قائداعظم اینڈ ویمن ایجوکیشن کا باب آمنہ کمال ہی نے مرتب کیا تھا۔

اپنے خاندان کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھتے ہوئے اور درس وتدریس کی اعلیٰ خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۹۳ء میں آمنہ کمال مدت ملازمت ختم ہوجانے کے بعد ریٹائر ہوئیں۔انہیں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس میں ورکنگ کمیٹی کی ممبر شپ کا اعزاز حاصل ہے۔

---••☆••---

آمنہ نازلی

آمنہ بیگم جو آمنہ نازلی کے نام سے مشہور ہوئیں' اُردو کی معروف صاحبِ طرز نثر نگار ادیبہ تھیں-۱۹۱۴ء میں یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئیں-ان کے والد اور دادا بی سی آئی ریلوے کے بہت بڑے کنٹریکٹر تھے-بھرت پور اور باندی پور کے ریلوے اسٹیشن انہوں نے ہی تعمیر کرائے تھے-آمنہ بیگم ابھی دس سال کی تھیں کہ ان کے والد غلام محمد کا انتقال ہوگیا-ان کی تعلیم وتربیت اور پرورش ان کی والدہ نے اس طرح کی کہ انہیں یتیمی کا احساس نہیں ہونے دیا- آمنہ نازلی نے پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل کی سند حاصل کی تھی-اس کے بعد ان کی شادی برصغیر کے معروف افسانہ نگار علامہ راشد الخیری کے صاحبزادے مولانا رازق الخیری سے ہوگئی-ان کے شوہر رازق الخیری مشہور و معروف ادیب اور صحافی تھے اور ماہنامہ ''عصمت'' دہلی کے ایڈیٹر تھے-تقسیم ہند کے بعد وہ ہجرت کر کے کراچی آ گئے تھے-یہاں پر بھی انہوں نے تصنیف وتالیف اور صحافت کا سلسلہ جاری رکھا-انہوں نے کراچی سے ماہنامہ ''عصمت'' کو بھی جاری کیا-مولانا رازق الخیری ادب میں بے باکی' فحاشی اور عُریانی ایسے موضوعات پر لکھنے لکھانے کے سخت خلاف تھے-وہ پاکستان کی قومی زبان اردو کے صرف حامی ہی نہیں تھے بلکہ اردو کے لیے وہ ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے-تقسیم کے بعد پاکستان آ کر بھی انہوں نے ماہنامہ ''عصمت'' جاری کر کے اس مشن کو جاری رکھا-

مولانا رازق الخیری کی وفات کے بعد ماہنامہ ''عصمت'' کراچی کو آمنہ نازلی نے سنبھالا اور اسے بڑا فروغ دیا-علامہ راشد الخیری کی بہو اور رازق الخیری کی بیگم ہونے کے علاوہ آمنہ نازلی برصغیر کی مشہور ادیبہ اور ایک کہنہ مشق افسانہ نگار بھی تھیں-انہوں نے بیسویں صدی کے نصف سے لکھنا شروع کر دیا تھا-وہ معاشرے کی اصلاح کے لیے صاف ستھرے افسانے لکھتی تھیں اور اپنے والد کی طرح فحاشی اور عُریانی کے سخت خلاف تھیں-انہوں نے افسانہ نگاری سے زیادہ اصلاحی و معاشرتی مضامین لکھے ہیں-

روزنامہ ''جسارت'' کراچی ۱۱ر فروری ۱۹۸۵ء میں انٹرویو دیتے ہوئے اس سوال کے جواب میں

کہ ''مگر کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ ادیب پر مذہب وغیرہ کی پابندی عائد نہیں کرنی چاہیے۔اسے آزادئ اظہار ملنا چاہیے'' آمنہ نازلی نے کہا:

''ایسا کرنے والے وہ ہیں جو فحش نگار ہیں۔جنہوں نے ''لحاف'' اور ''کتے'' جیسے مضامین لکھے ہیں۔ننگی اور بے ہودہ باتیں لکھی ہیں۔پتھر کے زمانے کی بات ہے۔بس صاحب لباس اتار دیجیے کہ یہ حقیقت ہے۔نائٹ کلبس اس کی مثالیں ہیں، جہاں جہاں بے غیرتیاں ہیں وہ سب کچھ یہی ہے۔عصمت چغتائی نے اپنا افسانہ لحاف شادی سے پہلے لکھا تھا۔وہ تو وہی لکھ سکتا ہے جو کسی کا مشاہدہ رہا ہو، جس نے کہ ایسی بے ہودہ باتیں یا تو اُن کو قریب سے ایسا دیکھا ہو، جیسے بلّی کھیر کا پیالہ چاٹتی ہے، یا پھر میں اُن کی ذات کے لیے تو ایسا نہیں کہہ سکتی حیرت کی بات ہے توبہ توبہ نعوذ باللہ۔(ساقی) میں ایسا ایک مضمون چھپا تھا۔ممتاز شیریں نے لکھا تھا'' کنواری لڑکی کچی کیری چٹ پٹی 'پوچھو تو سہی' کمبخت تجھے کیسے پتا؟''

آمنہ نازلی نذر نیاز جیسے رسم ورواج کی بھی سخت مخالف تھیں۔اس سلسلے میں مندرجہ بالا انٹرویو کے دوران انہوں نے کہا:

میں تو ویسے ہی اللہ کے واسطے خاموشی سے کچھ دے دلا دیتی ہوں۔ہار، پھول، حاضری، تیجہ، دسواں، چہلم وغیرہ کے سخت خلاف ہوں۔ڈھکوسلا بنالیا ہے لوگوں نے۔بُرے سے کی رسمیں بُری لگتی ہیں۔بیٹھ جاتے ہیں دائرے میں۔کہیے، مرنے والے کو کیا ہوا تھا؟ خواب میں بھی نظر آئے؟ رُوح کیسے نکلی؟ کوئی وصیت بھی کی؟

آمنہ نازلی ۲رفروری ۱۹۹۶ء کو دارِفانی سے رخصت ہوگئیں۔ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:۔

(۱) دولت پر قربانیاں (۲) افسانے (۳) ہم اور تم (۴) افسانے (۵) عقل کی باتیں 'مضامین (۶) دوشالہ (۷) ننگے پاؤں (۸) ڈرامے (۹) خواتین کی دستکاری (۱۰) عصمتی دسترخوان (۱۱) مشرقی مغربی کھانے (۱۲) بیماروں کے کھانے (۱۳) مذاقیہ کھانے (۱۴) عصمتی کشیدہ کاری اور (۱۵) ہنڈکلیاں وغیرہ۔

---••☆••---

ابوالجلال ندوی، مولانا

برصغیر کے مشہور و معروف ماہر لسانیات و محقق مولانا ابوالجلال ندوی ۱۸۹۴ء میں اعظم گڑھ کے ایک مشہور قصبے ''چریاکوٹ'' میں پیدا ہوئے- چریاکوٹ علمی حیثیت سے بہت ممتاز اور معروف قصبہ تھا- مولانا کا آبائی گھر اعظم گڑھ ہی کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''محی الدین پور'' میں واقع تھا- زمانہ قدیم سے مولانا ابوالجلال صاحب کے آباواجداد اور ان کے خاندان کے لوگوں کو علم و ادب سے خاص شغف رہا تھا- ان کے والد بزرگوار مولوی محمد ابراہیم کو مولانا عنایت رسول چریاکوٹی سے شرف تلمذ حاصل تھا- وہ عبرانی سے بھی واقف تھے لیکن عدم ممارست کی وجہ سے بعد میں اسے بھول گئے تھے- ان کے چھوٹے بھائی مولوی ابوالحسنات بھی ایک عالم تھے- مولانا کی دو بہنیں تھیں اور ایک صاحبزادے جنید صغیر کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہیں- مولانا ابوالجلال ندوی کی عمر جب تیرہ چودہ برس کی ہوئی تو ان کے سر سے ان کی والدہ کا سایہ اٹھ گیا جس کے بعد ان کی پرورش و پرداخت ان کی نانی صاحبہ نے کی- مولانا کی رسم بسم اللہ مولانا عنایت رسول چریاکوٹی نے کرائی- صرف و نحو کی کتابیں مولوی الیاس صاحب چریاکوٹی نے پڑھائیں- کچھ تعلیم انہوں نے اپنے والد سے بھی حاصل کی-

مزید تعلیم کے لیے ان کے والد نے انہیں گورکھپور کے ایک اسکول میں آٹھویں درجہ میں داخل کرادیا- یہاں ان کا قیام اپنے خالو محمد محسن عباسی ایڈووکیٹ کے یہاں تھا- والد کی خواہش تھی کہ وہ میٹرک کر کے کوئی سرکاری ملازمت کرلیں- لیکن اسکول کی تعلیم میں مولانا کا جی نہ لگا اور چند ماہ بعد خاموشی سے لکھنؤ چلے گئے- پیسہ کوڑی پاس نہ تھا بھوکے پیاسے لکھنؤ کی سڑکوں پر گھومتے رہے- بہرحال کسی بھلے مانس کے ذریعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جہاں کھانے پینے اور رہنے کا انتظام بھی ہوگیا- یہاں انہوں نے ممتاز علما کی نگرانی میں معقولات منقولات کی تعلیم حاصل کی- ان کا شمار ندوہ کے ذہین اور ذی استعداد طالب علموں میں ہوتا تھا- ان کی صلاحیت اور محنت و مطالعہ کا ذوق دیکھ کر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے انہیں دارالمصنفین کے رفقائے علمی میں شامل کرلیا تھا- دارالعلوم ندوۃ العلماء میں

تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے الہ آباد بورڈ سے عالم کا امتحان پاس کیا-تعلیم سے فارغ ہوئے تو مولانا اعظم گڑھ کے مدرسۂ اسلامیہ باغ میر پیٹو میں درس وتدریس سے منسلک ہو گئے-

دارالمصنفین میں مولانا کا قیام ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک رہا-اس دور میں انہوں نے تقریباً نصف درجن بڑے معیاری مضامین لکھے جو معارف میں شائع ہوئے-دارالمصنفین کے بعد وہ مدراس چلے گئے جہاں سیٹھ جمال کے قائم کردہ جمالیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے-مولانا کو لسانیات اور علم الاشتقاق سے بڑا شغف تھا-وہ بڑی مہارت' دلچسپی اور خاص توجہ سے زبانوں کا باہمی رشتہ وتعلق اور الفاظ کی وسعت اور شاخ درشاخ تقسیم کو ثابت کرتے تھے-لیکن مولانا کا ذوق وشوق کسی ایک فن تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ مختلف موضوعات سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے-لسانیات اور دوسرے موضوعات پر ان کے محققانہ مضامین شائع ہوئے تو علمی حلقوں میں انہیں بہت پسند کیا گیا-ابوالجلال ندوی نے مختلف فنون سے متعلق بعض اہم کتابوں پر اعلیٰ درجے کے ریویو لکھے جن سے اہل علم کو ان کی علمی حیثیت اور استعداد کا اندازہ ہوا-

عربی' فارسی اور اُردو کے علاوہ انہیں انگریزی اور عبرانی پر بھی عبور حاصل تھا-ہندو آریہ سماجیوں سے مناظروں سے متاثر ہو کر انہوں نے ہندی اور سنسکرت زبانوں کو بھی خوب سیکھا-انہیں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں وید، گیتا اور اپنشد پر بھی دسترس حاصل تھی-مولانا قدیم کتبات اور مہریں پڑھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے-کسی زبان میں کتنا ہی پیچیدہ اور گنجلک کتبہ انہیں دیا جاتا، وہ اسے پڑھ لیتے تھے-

مدراس کے قیام میں مولانا نے موہن جوڈارو (سندھ) سے برآمد ہونے والی قدیم مہروں کی قرأت اور تشریح وتوضیح پر کام کیا-مولانا کی تحقیق کے مطابق موہن جوڈارو کے رسم الخط کا رشتہ قدیم عبرانی اور عربی زبانوں سے ملتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی اس تہذیب کا دوسرے انبیا کی امتوں اور مسلم تہذیب سے گہرا تعلق تھا-مولانا کا اس سلسلے کا پہلا مضمون انجمن ترقی اُردو کراچی کے سہ ماہی رسالے ''تاریخ وسیاست'' میں شائع ہوا-ان کے متعدد مضامین حکومت پاکستان کے ماہنامہ ''ماہ نو'' میں چھپتے رہے-انہوں نے موہن جوڈارو کے ہزاروں کتبات پڑھ کر مدد کی، لیکن کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا-

مدراس میں طویل عرصۂ قیام کے بعد ۱۹۴۶ء میں مولانا صاحب اعظم گڑھ واپس آ گئے اور دوبارہ دارالمصنفین سے وابستہ ہو گئے-وہ آزادیٔ ہند کی تحریک میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ایک کارکن یا مقامی رہنما کے طور پر بھی عملی حصہ لیتے تھے جس کی پاداش میں انہوں نے خاصی مدت جیل کی صعوبتیں

بھی اُٹھائیں-ان کی تین بیٹیاں اور بیٹا کراچی میں مقیم ہیں جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے آئے تھے-وہ خود پاکستان آنا نہیں چاہتے تھے حالانکہ ان کی اہلیہ بھی پاکستان آچکی تھیں-بالآخر اپنے اہل وعیال کے بے حد اصرار پر وہ پاکستان آگئے-بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں شاہ محی الحق فاروقی نے اپنی کتاب ''بیدار دل لوگ'' میں مولانا کی دو چار دلچسپ باتیں لکھی ہیں-ملاحظہ کیجیے:

مولانا کے اپنے سگے بھتیجے احمد حاطب صدیقی (ابونثر) جو ایک صاحب طرز کالم نگار ہیں، اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار ان سے مولانا نے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ''عربی قاعدے میں الف زبرءَ، الف زیرا ے وغیرہ-'' انہوں پوچھا، ''اردو بھی پڑھتے ہو؟'' ابونثر نے بتایا کہ اردو کا قاعدہ ختم کرلیا-'' مولانا نے پوچھا کہ اگر ہم اردو کا کوئی جملہ بولیں تو کیا تم لکھ لوگے-'' ابونثر کے انکار پر مولانا نے ابونثر سے کاغذ اور قلم منگوایا اور کہا، ''لکھو، الف زیرا ے، میم زیرمے، رے زیررے، ب زیربے، ٹے زیرٹے، کاف زیرکے اور اب تین مرتبہ لام زیرلے لکھو-'' چنانچہ ان لکھے ہوئے حروف کی صورت کچھ اس طرح بن گئی: اِم رِبِ ٹِ کِ لِ لِ لِ اس کے بعد مولانا نے کہا اب اسے ہجے کیے بغیر پڑھو-چنانچہ جب پڑھا گیا تو یہ جملہ بن گیا: اے میرے بیٹے کیلئے لے لے-ایک روز مولانا نے ابونثر کو بتایا کہ انسان نے لکڑی کاٹنے کے لیے جب اس پر اپنے اوزار (کلہاڑا) سے وار کیا تو جو آواز نکلی، وہی اس عمل کا نام ہوگئی-مثلاً اُردو، ہندی، اور انگریزی میں ''کٹ'' اور عربی میں قطع-اسی طرح ایک دن انہوں نے ابونثر کو بتایا کہ جب انسان کو پیاس لگی اور اس نے پیاس سے بے قرار ہوکر کچھ کہنے کو منہ کھولا تو منہ سے جو آہ نکلی وہی ''پانی'' کا نام بن گیا-چنانچہ ہر زبان میں ''پانی'' کا نام لیتے ہوئے منہ ضرور کھلتا ہے-مثلاً عربی میں ''ماء'' انگریزی میں ''واٹر'' جرمن میں ''واسر'' فارسی میں ''آب'' اور اردو ہندی میں ''پانی''

مولانا صاحب کے علم میں بڑی وسعت اور گہرائی تھی، جس موضوع پر بولتے سننے والوں پر اپنی غیر معمولی علمی' تاریخی' ادبی اور مذہبی معلومات کا گہرا اثر چھوڑتے تھے-اس مختصر مضمون میں مولانا کی علمی اوران کے تحقیقی کاموں کی بہت سی باتوں کا ذکر نہیں کیا جاسکا-اکتوبر ۱۹۸۴ء میں مولانا ابوالجلال ندوی نے کراچی میں انتقال کیا-سعود آباد کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں-

---••☆••---

احمد زین الدین

اصل نام زین الدین احمد صدیقی اور قلمی نام احمد زین الدین ہے- تاریخ پیدائش تو انہیں بھی نہیں معلوم البتہ میٹرک کے سٹیفکیٹ کے مطابق ۲۲/جولائی ۱۹۳۹ء کو قصبہ بھتری، تحصیل سید پور، ضلع غازی پور (یوپی) میں پیدا ہوئے- ان کے والد مولوی عبدالستار قصبہ بھتری کے بڑے زمینداروں میں شمار کیے جاتے تھے- جب زین الدین نے ہوش سنبھالا تو زمینداری کا خاتمہ ہو چکا تھا جس کا سبب وہ ریزولیوشن تھا جو یوپی اسمبلی نے پاس کر کے کاشتکاروں کو زمین کا مالک بنا دیا تھا- اس طرح مولوی عبدالستار کی زمینیں بھی ان سے لے کر کاشتکاروں میں تقسیم کر دی گئیں- اب ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا- زین کے بڑے بھائی' جو کانپور میں آرڈی ننس فیکٹری میں ملازم تھے' کبھی کبھار اپنی تنخواہ سے کچھ پیسے بھیجا کرتے تھے- لیکن تقسیم کے بعد وہ مشرقی پاکستان چلے گئے- ان پریشانیوں اور مشکلات کے دوران مولوی عبدالستار صاحب کی شریک حیات بھی ان کا ساتھ چھوڑ کر ملک عدم رخصت ہو گئیں- والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد زین الدین کی پرورش و پرداخت ان کی بڑی بہن نے کی جس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی-

والدہ کے انتقال کے بعد زین کے بڑے بھائی مشرقی پاکستان سے تعزیت کے لیے گاؤں آئے تو واپسی پر والد کی اجازت سے زین الدین کو بھی مشرقی پاکستان لے گئے- وہ زین کی تعلیم کی طرف سے بڑے فکر مند تھے- انہوں نے ۱۹۵۲ء کے وسط میں زین الدین کو نواب پور گورنمنٹ ہائی اسکول میں ساتویں کلاس میں داخل کرا دیا- ۱۹۵۷ء میں زین الدین نے اچھے نمبروں کے ساتھ میٹرک پاس کر لیا- میٹرک کرنے کے بعد ان کے بھائی نے زین سے صاف صاف کہا کہ میری آمدنی محدود ہے اور اخراجات زیادہ ہیں- اگر تمہیں مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ہے تو کہیں ملازمت کرو اور ساتھ ساتھ پڑھو بھی- زین الدین کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ ان کے بھائی کی اتنی آمدنی نہیں ہے کہ وہ ان کی پڑھائی کے اخراجات بھی برداشت کریں- اس خیال کے تحت زین نے کسی کالج میں داخلہ بھی نہیں لیا-

احمد زین الدین کے ہم جماعتوں کو جب یہ علم ہوا کہ وہ مخدوش مالی حالات کے سبب اپنی تعلیم جاری نہیں کر سکتے تو ایک ہم جماعت لڑکے رزاق نے اپنے والد سے ان کی مدد کرنے کے لیے کہا- چنانچہ انہوں نے بطور قرض حسنہ زین احمد کی مدد کی- اس کے بعد انہوں نے قائداعظم کالج ڈھاکہ میں شام کی شفٹ میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کو جاری کیا- کچھ عرصے بعد ڈھاکہ الیکٹرک سپلائی کمپنی میں انہیں ملازمت بھی مل گئی- زین نے پہلی تنخواہ ملتے ہی رزاق کے والد کو شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ رقم واپس کر دی جو انہوں نے زین احمد کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے دی تھی- اس زمانے میں انہیں کئی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرنی پڑیں لیکن وہ ہمت نہیں ہارے- ۱۹۶۵ء میں زین نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے پاس کیا اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مشورے اور تائید سے پاکستان ایئر فورس کے شاہین اسکول میں جزوقتی ملازمت کر لی- اس کے علاوہ پاکستان آبزرور گروپ آف نیوز پیپرز کے فلمی ہفت روزہ اخبار ''چترالی'' اور ''پاسبان'' وغیرہ میں بھی کام کیا اور اس طرح وہ بیک وقت چار ملازمتیں کرتے تھے-

احمد زین الدین کو اسکول کے زمانے سے ہی شعروادب سے دلچسپی رہی ہے- اس سلسلے میں ان کے اساتذہ مولوی عبدالرشید ادیب' واحد خیری اور کچھ دنوں نظیر صدیقی نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی- جب وہ نویں کلاس میں پڑھ رہے تھے تو اس وقت انہوں نے ایک مضمون ''میرا خواب'' کے عنوان سے لکھا تھا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ان کے استاد ادیب صاحب نے بھی بہت تعریف کی- پھر کالج کے زمانے میں انہوں نے کہانیاں لکھنا بھی شروع کر دیا جنہیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی- قیامِ مشرقی پاکستان کے دوران انہوں نے زیادہ کہانیاں لکھیں- وہ کہتے ہیں:

> میں کہانی خود نہیں لکھتا بلکہ معاشرے میں پھیلے ہوئے ان سوالوں کا جواب تلاش کرتا ہوں' جو ہر لمحے میری روح کو مضطرب رکھتے ہیں- دکھ کی چادر اوڑھے میں نے اب تک جو کچھ بھی دیکھا ہے، اسے آپ کو بھی دکھانے کی کوشش کرتا ہوں- اپنے احساس کی چھوٹی سی دنیا میں آپ کو لے جانا چاہتا ہوں،، اس درد سے آشنا کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے معاشرے کے بیقرار انسانون کا مقدر ہے، حالانکہ میں یہ جانتا ہوں کہ میری ''اس دنیا'' میں آپ کو کچھ نہیں ملے گا- مگر آپ کچھ دیکھ ضرور لیں گے بس شرط اتنی سی ہے کہ آپ کی چشم وا ہونی چاہیے اور ذہن و دل کشادہ-''

سنہ ۱۹۶۰ء کے آخر میں ان کے والد بھی ہندوستان سے آ گئے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں جب مشرقی پاکستان کے حالات بگڑنے لگے تو احمد زین الدین نے انہیں اپنے بھائی کے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی بھیج دیا اور جون ۱۹۷۱ء میں وہ خود بھی کراچی آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں احمد زین الدین نے کراچی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ ان کی تصانیف میں "دریچے میں بجی حیرانی" کہانیوں کا مجموعہ اور "رنگِ شناسائی" مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔

---••☆••---

احمد صغیر صدیقی

معروف شاعر، ادیب، مترجم اور نقاد احمد صغیر صدیقی ۱۹۳۸ء میں بھارت کے ایک شہر بہرائچ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے بہرائچ ہی میں حاصل کی۔ احمد صغیر صدیقی جو ایک تعلیم یافتہ گھرانے کے فرد ہیں، بچپن ہی سے بڑے ذہین اور پڑھنے لکھنے کے بڑے شوقین رہے ہیں۔ انہیں لکھنے لکھانے کا شوق تو بچپن ہی سے تھا لیکن ۱۹۵۴ء سے انہوں نے باقاعدہ طور پر لکھنا شروع کیا۔ لکھنے کی ابتدا انہوں نے رومانی نظموں اور افسانوں سے کی جو تقسیم سے پہلے بھارت کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۸ء میں احمد صغیر پاکستان آ گئے اور دو سال لاہور میں قیام کیا۔ اس کے بعد وہ مستقل طور پر کراچی آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور پھر زرعی ترقیاتی بینک میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۹۴ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر پہنچنے کے بعد انہوں نے اختیاری ریٹائرمنٹ لے لیا۔ دوران ملازمت بھی انہوں نے اپنے منصبی فرائض کے بعد لکھنے پڑھنے اور ادبی تخلیقات کو جاری رکھا۔ ان کی طبع زاد کہانیوں کا مجموعہ "کالی کہانیاں" ۱۹۸۱ء میں آیا۔ ایک شعری مجموعہ "اطراف" ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ترجمہ کہانیوں کے چار مجموعے "دنیا کی بہترین کہانیاں" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے ادب کے لیے انہوں نے اپنی اوریجنل منظوم پہیلیوں کی ایک کتاب "بوجھو تو جانیں" بھی شائع کی۔ سنہ ۲۰۰۲ء میں ان کی ایک کتاب "گوشے اور جالے" تنقید نگاری پر بھی شائع ہو چکی ہے۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں: "میں آپ کی غزلوں کا تو پہلے مداح تھا۔ اب آپ کا مضمون پڑھ کر آپ کی تنقید نگاری کا بھی قائل ہو گیا ہوں آپ تنقید کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوں۔"

احمد صغیر صدیقی کا شمار اس عہد کے معتبر شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک اچھے شاعر، ادیب، مترجم، کہانی نگار اور نقاد بھی ہیں۔ ایک ہی وقت میں اتنی خوبیاں ہونا بڑے وصف کی بات

ہے۔انہوں نے بے تحاشا کہانیاں ترجمہ کیں۔ نجوم اور دست شناسی میں اُنہیں دلچسپی ہوئی تو اس موضوع پر کئی مضامین اور کتابچے لکھ دیے۔اس کے باوجود وہ یہی کہتے ہیں ''مجھے نہیں معلوم کہ ادب کی دنیا میں میری کوئی حیثیت ہے یا نہیں۔البتہ مجھ میں لکھنے کی Urge ہے اور یہ میرا مشغلہ ہے۔'' مندرجہ ذیل اشعار ان کے مجموعہ کلام ''اطراف'' سے لیے گئے ہیں' ملاحظہ کیجیے:

میں اکیلا ہوں جہاں اور اکیلا بھی نہیں
میرے اللہ یہ سنسان مکاں کیسا ہے

یہ نہ دیکھو کہ مرے زخم بہت کاری ہیں
یہ بتاؤ کہ مرا دشمنِ جاں کیسا ہے

باغ کے پھول تک مصنوعی ہو گئے
کوئی بتلاؤ اب تتلیاں کیا کریں

مرے پڑوس میں تھیں اتنی وسعتیں آباد
محال ہو گیا میرا مکان میں رہنا

اب کیا کریں کہ پھر کوئی یاد آ گیا
بیٹھے تھے آنکھ پونچھ کے' دامن نچوڑ کے

بھڑکے گا کس کا شعلۂ جاں آفتاب سا
احمد صغیر تم تو شبِ غم کے ہو گئے

میں نے کیا کھویا اُسے ہر رنگ میرا کھو گیا
راز تھا جس میں دفینوں کا وہ نقشہ کھو گیا

پھول سے کھلتے دریچے بند ہیں اس شہر کے
کیا گلی مہکے کوئی جھونکا ہوا کا کھو گیا

کیا کریں پھیلا ہے سناٹے کا جادو دُور تک
اپنے اندر بولنے والا کبھی کا کھو گیا

بجھا جو دل تو زندگی بھی زندگی نہیں رہی
کوئی فضائے اَلف لیلوی نہیں رہی

اُٹھا کے سب چراغ ہم نے راستوں پہ رکھ دیے
بلا سے پھر ہمارے گھر میں روشنی نہیں رہی

دل اپنی کوششوں پہ پشیمان ہے بہت
خوابوں کے کاروبار میں نقصان ہے بہت

لیلیٰ کا دور قصہ پارینہ ہو چکا
مجنوں کو آج فکر گریبان ہے بہت

یادوں کے ساتھ دل میں کسک اور بڑھ گئی
زخموں کی وادیوں کی مہک اور بڑھ گئی

دل اپنی کوششوں پہ پشیماں ہے بہت
خوابوں کے کاروبار میں نقصان ہے بہت

سوچتے سوچتے سوالوں پر
برف گرنے لگی ہے بالوں پر

اس دورِ کم نگاہ میں انصاف کی تلاش
صحرا میں جیسے سایۂ اشجار ڈھونڈیے

دنیا سے نہ یہ رسم نبھی چند برس بھی
سمجھے تھے ہمیں یاد کیا جاتا رہے گا

---••☆••---

احمد ہمیش

اصل نام احمد قریش صدیقی اور قلمی نام، جس سے مشہور ہوئے، احمد ہمیش ہے۔ان کے والد کا نام مولوی ابوالليث صدیقی تھا۔احمد ہمیش یکم جولائی سنہ ۱۹۴۰ء کو موضع بانسپار، ضلع بلیا، یوپی بھارت میں پیدا ہوئے۔احمد ہمیش کے خاندان میں مذہبیت اور اشتراکیت کا بڑا غلبہ تھا لہٰذا اسی ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔انہوں نے رسمی تعلیم کے اعتبار سے انٹرمیڈیٹ کیا اور اپنی علمی استعداد کو بھرپور ذاتی مطالعے اور محنت سے پورا کیا اور اس انداز سے کیا کہ وہ کئی زبانوں کے ادب پر اچھی خاصی نظر رکھتے ہیں۔

احمد ہمیش نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز سنہ ۱۹۵۸ء میں شاعری سے کیا تھا۔انہوں نے نثری نظمیں لکھیں۔اس کے بعد احمد ہمیش نے پہلی کہانی سنہ ۱۹۶۳ء میں ''بے زمینی'' کے عنوان سے لکھی۔یہ کہانی اُن کے افسانوں میں شامل ہے۔افسانوں کا مجموعہ سنہ ۱۹۶۶ء میں ''مکھی'' کے عنوان سے بھارت میں شائع ہوا۔یہ ایک بہت لمبی علامتی کہانی جس میں احمد ہمیش نے برصغیر کی دردانگیز اور تکلیف دہ سماجی زندگی کی اثرانگیز تصویر کھینچی ہے۔

احمد ہمیش کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی تصنیف ''افسانہ اور افسانہ نگار'' میں لکھتے ہیں:

> ''احمد ہمیش طبعاً ایک آرٹسٹ ہیں، ایسے آرٹسٹ کہ اگر وہ آرٹ کو اپنا ہمہ وقتی مشغلہ نہ بنالیتے تو پاگل ہوجاتے، ویسے بھی آرٹسٹ پاگل ہی ہوتے ہیں، اپنی جان کا زیاں کرتے ہیں لیکن دوسروں کی جاں نوازی سے غافل نہیں ہوتے۔احمد ہمیش کی بھی یہ کیفیت ہے، انہیں مصوری، ڈرامہ، شاعری اور کہانی سے بھی لگاؤ ہے، یہ اُن کی کمزوریاں بھی ہیں اور اُن کی مجبوریاں بھی، پھر بھی جیسا امتیازی نشان انہوں نے افسانے میں بنالیا ہے دوسرے شعبوں میں نہیں بناپائے، شاید ایسا ممکن بھی نہ ہو اس لئے کہ فن کسی طرح کا ہو اپنے تکملہ کے لئے فن کار سے

مکمل توجہ، پوری توانائی اور زندگی بھر کی ریاضت چاہتا ہے۔

احمد ہمیش کا اِدّعا ہے کہ وہ ایک کھرے، سچے اور بے ریا کہانی نویس ہیں۔انہیں اردو افسانہ نگاری میں خواہ وہ قدیم ہو یا جدید بہ حیثیت مجموعی ایک طرح کی ملمع کاری اور صنعت گری نظر آتی ہے، افسانے میں گردوپیش کی زندگی کا عکس ہوتا ہے، لیکن ایسا نہیں جیسا کہ زندگی واقعی ہے، احمد ہمیش یہ چاہتے ہیں کہ افسانے میں زندگی کو ٹھوس حقیقت کے طور پر پیش کیا جائے اور وہی پیش کیا جائے جو مشاہدے اور تجربے میں آیا ہے، انہیں اشیاء و افراد کا ذکر کیا جائے جن سے فنکار کا واسطہ رہا ہے اور جن سے اُس کے ذہن و قلب نے براہ راست اچھا یا بُرا تاثر قبول کیا ہے۔یہی نہیں بلکہ جو کچھ کہانی میں پیش کیا جائے وہ من و عن اسی زبان، اسی لب و لہجہ اور اسی فضا میں پیش کیا گیا ہو جس نے کسی خاص سچوایشن کو جنم دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ صرف مواد اور موضوع کے لحاظ سے نہیں، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی احمد ہمیش کے افسانے اپنے ہمعصروں سے بہت الگ نظر آتے ہیں، وہ فی الواقع جدید تر اردو افسانے میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں اور ان کی یہ حیثیت روز بروز نمایاں تر ہوتی جارہی ہے۔''

احمد ہمیش نے اپنے فن کے بارے میں، ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے خط میں لکھا ہے کہ ''میں کہانی ہی لکھ سکتا ہوں، یہ میرا مقدر ہے۔البتہ کہانی لکھنے کے بعد اسلوب، ٹکنک اور موضوع کی بات آتی ہے۔اس بحث میں بھی میرے سوچنے کا ڈھنگ کہانی لکھنے کے پیشہ ورانہ رویّے سے مختلف ہے۔میں ادب میں رجحانات کی تبدیلیوں سے بے خبر نہیں ہوں۔ مگر یہ معاملہ کچھ اس قسم کا ہے کہ اگر میں لفظ ''جنگل'' لکھوں تو لازم ہے کہ میں نے جنگل دیکھا ہو۔رہا 'اسٹائل' تو اسٹائل میرے ساتھ آیا ہے۔بحیثیت کہانی کار میں خود کمٹیڈ ہوں''

---••☆••---

اختر حامد خاں

اختر حامد خاں ۱۵ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد منشی امیر احمد خان انگریزی حکومت میں کورٹ انسپکٹر اور پولیس انسپکٹر رہتے۔وہ انتہائی خوددار، ایماندار اور محنت سے کام کرنے والے شخص تھے۔اختر حامد خاں کے برادر بزرگ حمید اختر خاں ایک نامور سماجی کارکن تھے۔اُن کا ذکر ''دبستانوں کا دبستان'' جلد اول میں کیا جاچکا ہے۔اختر حامد کے آباواجداد شاہ جہاں کے عہد میں کابل سے داراشکوہ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ان کے جدامجد سرمست خان، شاہی فوج میں بڑے افسر تھے جنھیں فیروز آباد کا علاقہ جاگیر میں دیا گیا تھا۔انہوں نے اپنے بیٹے کا نام دارا کے پیر کے نام پر، سرمد خان رکھا تھا۔اختر حامد نے اپنے دادا کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب ''میری ناکام زندگی'' میں لکھا ہے:

> ''ہمارے دادا مولوی میر محمد خان، پڑھے لکھے، عالم فاضل، سرکار انگریزی میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول، پنشن کے بعد صوفی ہوگئے، حویلی کی مسجد میں جمعہ کو درس دیتے، اتفاق سے بینائی جاتی رہی تو اللہ میاں سے روٹھ گئے،
>
> ''تیرا ذکر کرتا تھا، اگر منظور نہیں تو یوں ہی سہی'' کہا اور مراقبے میں بیٹھ گئے، چالیس روز بعد آنکھیں روشن ہوگئیں، تو دوبارہ مسجد میں درس دینے لگے''

اختر حامد خاں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔اس کے بعد انہیں بلند شہر گورنمنٹ ہائی اسکول میں پانچویں کلاس میں داخل کیا گیا۔سنہ ۱۹۳۸ء میں اسی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا اور سنہ ۱۹۴۳ء میں انہوں بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔بعدازاں انہوں نے انجنیر نگ میں داخلہ لیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال میں قحط پڑ رہا تھا۔اختر حامد علامہ مشرقی کے حکم پر بنگال کے قحط میں خدمت کی غرض سے ۱۹۴۳ء میں کلکتہ چلے گئے اور اس طرح ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی جس پر والد صاحب بہت ناراض ہوئے۔علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں انہوں نے خاکسار طلبہ کا سرکاری ترجمان ''ریڈرس ویکلی'' جاری کیا جو بعد میں میرٹھ سے شائع ہوتا رہا۔

اس زمانے میں بنگال کے لوگ قحط کا شکار تھے۔ان حالات کو دیکھتے ہوئے اختر حامد خاں نے ایس ایم حنیف کے ساتھ مل کر قحط زدہ لوگوں کی بھرپور مدد کی۔اسی دوران انہوں نے ہفتہ وار رسالہ ''خاکسار'' میں ۱۳ مضمون لکھے جو کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے۔اختر حامد نے ایک سال تک کلکتہ میں قیام کیا اور ذریعہ معاش کے لیے مختلف کام کیے۔انہوں نے بھارت کیمیکل میں ۷۰ روپے پر ملازمت بھی کی۔اس کے بعد ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک پروفیسر کرار صاحب اور اپنے بھائی کے ساتھ بیگم باغ میرٹھ میں ادارہ الامین کو منظم کیا اور خاکسار تحریک کی باغی جماعت کو سنبھالا۔

۱۹۴۷ء میں حامد اختر دہلی گئے اور کچھ دن جامع ملیہ میں سائنس پڑھائی۔اس زمانے میں جامعہ ملیہ کے حالات خراب ہوئے تو انہوں نے اس کو بچانے کے لیے بڑی مدد کی۔وہ ۱۹۴۹ء تک جامعہ ملیہ میں رہے۔اس کے بعد ۶ رجولائی ۱۹۴۹ء کو حامد صاحب لاہور ہوتے ہوئے کراچی آگئے۔یہاں پر اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے مختلف کام کیے۔۱۹۵۲ء میں کومیلا مشرقی پاکستان چلے گئے اور وہیں پر رہائش اختیار کر لی۔مشرقی پاکستان میں انہوں نے اپنے بھائی اختر حمید خاں' جو بڑے نامور سماجی کارکن تھے کے ساتھ مل کر مہاجر کو آپریٹو کارخانہ قائم کیا۔یہ ایک چھوٹا سا پیتل کا کارخانہ تھا جو ترقی کرتے ہوئے سنہ ۱۹۷۱ء تک ایک بڑا کارخانہ ہو گیا تھا۔کارخانہ داری کی تربیت کے لیے وہ جاپان بھی گئے۔۱۹۷۱ء میں کومیلا سے ہجرت کر کے کراچی آگئے اور اپنے بھائی کے ساتھ مل کر شعبہ تعمیرات سے منسلک ہو گئے۔

ذریعہ معاش اور سماجی کاموں کے ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی وابستہ رہے۔انہوں نے متعدد اخبار/رسائل جاری کیے اور کتابیں بھی لکھیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

(۱) ''تعمیر نو'' ۱۹۴۶ء میرٹھ (۲) ''گنگا جمنی تہذیب'' ۱۹۵۹ء کراچی (۳) ''چند خاکے'' ۱۹۷۰ء ڈھاکہ (۴) ''چند بزرگ'' ۱۹۸۲ء کراچی (۵) ''نئے خاکے'' ۱۹۹۹ء کراچی (۶) ''چند تبصرے'' ۱۹۹۹ء کراچی (۷) ''میری ناکام زندگی'' ۲۰۰۰ء کراچی (۸) ''پیام قرآن مجید'' ۲۰۰۲ء کراچی (۹) ''کومیلا سے اورنگی تک'' (ترجمہ) ۱۹۹۷ء کراچی۔

--••☆••--

اختر لکھنوی

محمود الحسن نام اور تخلص اختر اور اختر لکھنوی قلمی نام ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء کو محلہ نرہی، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد حسین حافظِ قرآن تھے۔ شعر و ادب کی بستی میں ذوقِ سخن کی طرف مائل ہونا تقاضائے فطری تھا۔ اُن کی تخلیقات کے شائع ہونے کا سلسلہ سنہ ۱۹۴۸ء سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ برصغیر کے کثیر الاشاعت مشہور و معروف ادبی ماہناموں اور رسائل میں اُن کا کلام چھپتا رہا جن میں نقوش، لیل و نہار، استقلال، سویرا (لاہور)، شمع، قومی زبان، نیرنگ خیال (راولپنڈی)، اردو نیشنل (ٹورنٹو کناڈا) وغیرہ شامل ہیں۔ قبل آزادی اختر لکھنوی کو لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں، راجہ صاحب محمود آباد اور آزادی کے بعد حسین شہید سہروردی، شیر بنگال مولوی فضل الحق اور شاعر ادیبوں میں جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، حسرت موہانی، جوش اور دوسرے نامور ادیبوں اور شاعروں کی قربت حاصل رہی۔

تقسیم ہند کے بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کی اور ڈھاکہ میں مقیم ہوئے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں وہ انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان کے آفس سکریٹری مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۵۵ء تک وہ اپنے اس عہدے پر فائز رہے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور روزنامہ ''انقلاب'' میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں روزنامہ ''انقلاب'' کے بند ہو جانے کے بعد وہ مختلف جرائد، رسائل کے ایڈیٹر رہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد سنہ ۱۹۷۴ء میں جب وہ کراچی پہنچے تو انہیں ریڈیو پاکستان راولپنڈی، اسلام آباد اور آخر میں ریڈیو پاکستان کراچی میں تعینات کیا گیا۔

اختر لکھنوی کے نعتیہ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے شفیق الدین شارق لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں نعتیہ شاعری اب ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ مجموعی طور پر محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی ر گجراتی سے لے کر غالب، مومن، حالی، نظیر اکبر آبادی، داغ دہلوی، محسن کاکوروی، امیر مینائی، مُنیر شکوہ آبادی، امجد حیدر آبادی، بیدم وارثی،

مولانا ظفر علی خان، سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، حفیظ تائب، حنیف اسعدی، اقبال عظیم اور عصرِ حاضر کے دیگر شعراء تک ایک بہت طویل فہرست ہے- جذباتی کیفیت کے حوالے سے زائرِ حرم حمید صدیقی اور بہزاد لکھنوی نے اپنے وقت میں خاصی شہرت پائی- اس معتبر، محترم مبارک اور مسعود قافلے میں اختر لکھنوی بھی اپنی تمام تر عقیدتوں کے ساتھ شریک ہو گئے ہیں-"

اختر لکھنوی کے مجموعۂ نعت "حضور" میں ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور و معروف شاعر جناب تابش دہلوی لکھتے ہیں:

"طلبِ صادق ہو تو گوہرِ مقصود ضرور ملتا ہے، اور یہی کچھ اختر لکھنوی کے ساتھ ہوا- وہ پاکیزہ شاعری کرتے ہیں، ان کی غزلیہ شاعری بھی لطافت سے مملو ہے اور یہی پاکیزگی ان کی نعت میں ان کی درِ حضورؐ پر حاضری کا وسیلہ بنی، وہ درِ رسولؐ پر حاضری کے بیتابی سے آرزومند تھے اور بالآخر درِ نبیؐ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے-"

اختر لکھنوی کا نعتیہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہر اک منظر ہے دلآویز خوشبو ہے ہواؤں میں
بہاریں رقص کرتی ہیں مدینے کی فضاؤں میں

وفاؤں کا تقاضا ہے دیارِ رنگ و نکہت میں
چلو، اتنا کہ چل کر آبلے پڑ جائیں پاؤں میں

عجب دہلیز ہے، دہلیز سرکارِ دو عالم کی
وہاں ملتے ہیں تخت و تاج والے بھی گداؤں میں

انہیں دیکھو تو آنکھیں یہ کہیں بس دیکھتے جاؤ
عجب ہے حسن اس در کے غلاموں کی اداؤں میں

چلا ہے جو حبیبِؐ کبریا کی راہ پر اختر
مکمل ہے وہ اپنے شوق میں اپنی وفاؤں میں

پہلے بھی بلایا تھا، پھر بلائے جائیں گے   پھر مدینہ دیکھیں گے پھر مدینہ جائیں گے

درِ مصطفیٰ پہ جس دم، دمِ بیخودی میں پہنچے
تو لگا کہ جیسے ہم بھی حدِ زندگی میں پہنچے

اخترؔ لکھنوی کی تصنیفات میں ان کا شعری مجموعہ ''دیدہ تر'' سقوطِ مشرقی پاکستان کے المناک حادثوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس مجموعہ میں سقوطِ ڈھاکہ کے کتنے ہی ایسے واقعات ہیں جنہیں پڑھنے سے کڑوا دھواں آنکھوں میں لگتا ہے اور رُلاتا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں سقوطِ ڈھاکہ کی تمام داستان مرتب اور محفوظ کر دی ہے۔ اخترؔ لکھنوی کا کلام ملاحظہ کیجیے ۔

کٹے شاہراہوں پہ سر کیسے کیسے
ہوئے بے خبر، باخبر کیسے کیسے

کرم کیجئے، ہم سے مت پوچھئے اب
جلائے ہیں لوگوں نے گھر کیسے کیسے

بکھر کر ہوئے ریزے ریزے کی صورت
ہمارے بھی ہیں راہبر کیسے کیسے

ہمارے گھروں میں لہو سے ہمارے
منقش تھے دیوار و در کیسے کیسے

ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا لیکن
لوگ کہتے ہیں اندھیروں سے نکل آئے ہیں

آخری قرض بھی لو ہم نے ادا کر ہی دیا
اپنے شانوں پہ صلیب اپنی اٹھا لائے ہیں

ڈھونڈنے میں کہیں قاتل کو نہ دشواری ہو
سر ہتھیلی پہ لئے لوگ چلے آئے ہیں

ایک لمحے کی مسرت کوئی اس سے پوچھے
جس نے ہر حال میں دکھ جھیلے ہیں غم کھائے ہیں

---••☆••---

ادیب سہیل

ان کا اصل نام سید محمد ظہور الحق اور قلمی نام ادیب سہیل ہے۔ابتدا میں کچھ عرصہ ان کا تخلص ذکی چواروی رہا۔ سنہ ۱۹۲۴ء کو چوارہ ضلع مونگیر (بہار) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سید عبدالرشید طبیب تھے جنہیں طبابت ورثہ میں ملی تھی۔اُردو فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم اپنے رشتہ دار مولوی عبدالسلام سے گھر پر حاصل کرنے کے بعد ادیب سہیل نے ہادی ہائی اسکول گیا میں داخلہ لیا اور وہیں سے میٹرک پاس کیا۔اس کے بعد وہ نوکری کی تلاش میں کلکتہ چلے گئے جہاں وہ محکمہ ریلوے کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے۔ادیب سہیل کو پڑھنے لکھنے کا شوق دوران ملازمت کلکتہ میں بیدار ہوا۔ وہاں وہ ''ردی خانے'' سے کتابیں لے کر پڑھا کرتے تھے۔اس زمانے میں وہ کلکتہ، دہلی اور پھر کلکتہ میں رہے۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں انہوں نے کلکتہ سے آئی کام کا امتحان پاس کیا۔

تقسیم کے بعد انہوں نے پاکستان آپٹ کیا اور ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے اور سید پور (مشرقی پاکستان) میں مقیم ہوئے۔مشرقی پاکستان کے محکمہ ریلوے کی ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھا اور اس طرح انہوں نے جامع راج شاہی سے گریجویشن کیا۔ سنہ ۱۹۴۶ء سے انہوں نے افسانہ نگاری سے آغاز کر دیا تھا۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں ان کا ایک افسانہ ''زخم اور قہقہہ'' راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان اور میراجی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ''خیابان'' بمبئی میں شائع ہوا۔افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۸ء سے شعر و سخن میں بھی دلچسپی لینے لگے۔وہ اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کے ذریعے بنگال میں اُردو کی اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔کچھ عرصہ وہ روزنامہ ''پاسبان'' ڈھاکہ کے مدیر بھی رہے۔ادیب سہیل کو اُردو بنگالی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔انہیں موسیقی کے علم و رموز سے بھی کما حقہ واقفیت ہے۔

ادیب صاحب ہمیشہ ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۹ء سے سنہ ۱۹۷۰ء تک وہ انجمن ترقی اُردو، سید پور کے نائب معتمد اور آرٹس سینٹر سید پور کے نائب صدر رہے۔ آرٹس سینٹر سید پور کے معتمد جناب احمد سعدی تھے۔اس ادارے سے ''سراج الدولہ'' اور ''ٹیپو سلطان'' جیسے مشہور ڈرامے پیش کیے گئے۔ پیش کش کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر ڈراما دو دن اُردو اور ایک دن بنگلہ میں کھیلا جاتا تھا۔ادیب سہیل نے

ٹیلی وژن کے پروگرام ''پاکستانی ادب سال بہ سال'' میں بہ حیثیت محقق ومسودہ نویس کی خدمات انجام دیں اورڈراما ''تان سین''، ''سُر کا سفر'' اور وقتاً فوقتاً نغمہ نگاری میں بھی دلچسپی لی۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ۱۹۷۴ء میں ادیب سہیل کراچی آ گئے۔ یہاں آتے ہی ان کی تعیناتی محکمہ ریلوے اکاؤنٹس راولپنڈی ہوئی۔ سنہ ۱۹۸۲ء میں انہوں نے قبل از وقت ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لیا اور ماہنامہ ''افکار'' میں بحیثیت مدیر کام کرنے لگے۔ سنہ ۱۹۸۴ء کے اواخر میں انہوں نے انجمن ترقی اردو کے ماہنامہ ''قومی زبان'' کی ادارت سنبھالی اور تا حال اس کے مدیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ادیب سہیل ایک کہنہ مشق افسانہ نگار اور خوبصورت شاعر ہیں۔ ادبی دنیا میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔

ادیب سہیل کے موضوعات میں فنونِ لطیفہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے موسیقی پر متعدد تکنیکی مضامین لکھے جو ملک کے مئوقر اخبارات وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے لیے ایک سال تک ہفتے وار پروگرام ''ساز کہتے ہیں'' کے عنوان سے لکھا۔ حال ہی میں ان کا مجموعہ کلام ''بکھراؤ کا حرف آخر'' شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی وہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو سقوطِ مشرقی پاکستان سے پہلے اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات وسانحات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان ہی واقعات وسانحات سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک کتاب ''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' لکھی جو ان کی منظوم سوانح ہے۔ منظوم سوانح سے لیے گئے کچھ اشعار ملاحظہ ہو

نئے وطن میں ہر ایک جانب
بنی تھیں لوگوں کی قتل گاہیں
ان آنکھوں نے دیکھے
نفرتوں کے وہ روپ بہروپ
ایسے سنگین
جن کو سوچوں تو جھوٹ معلوم ہو
لکھوں تو مبالغے کا گماں ہو اُن پر
مقدر اپنا نئے وطن کا سقوط ٹھہرا
اور ہم کہ برباد اور پریشاں
نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن
اک اور ہجرت کی سمت پھر سے جمیں نگاہیں

وہ دن بھی آیا
کہ لاکھوں افراد فاقہ مستی سے
کس مپرسی سے تنگ آ کر
مہاجرت کے پروں پہ ہو کر سوار نکلے
تو پھر عروس البلاد، یعنی کراچی پہنچے
یہ سرزمیں سیکڑوں برس سے
مہاجرت کو پناہ دیتی رہی ہے
حق ہے، مہاجرت گاہ اس کو کہیے
مگر یہ لگتا ہے جیسے رختِ سفر
میرے شانے پر دھرا ہے
مہاجرت کے سفر میں
چالیس سال سے میں رواں دواں ہوں
مہاجرت میں محبتوں کا شباب بیتا
پتا نہ چل پایا مجھ کو یک سر
جوانی کب آئی، کیسے گزری!
اور اب کہ جب دونوں، عارفہ اور میں (اہلیہ کا نام)
نئی فضا میں، نئی ہواؤں میں
شاخ در شاخ ہو چکے ہیں
تو سوچتے ہیں کہ زندگی نے
مہاجرت کے سوا ہمیں کیا عطا کیا؟

--••☆••--

ارشد تھانوی، مولانا

مولانا کا اصل نام رشید احمد اور قلمی نام ارشد تھانوی ہے۔ وہ سنہ ۱۸۸۷ء کو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یوپی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی سلطان احمد یوپی پولیس میں تھانہ دار، میرٹھ میں قائم مقام کوتوال اور ریاست بھوپال میں وکیل رہے۔ مولانا نے ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو علم و فضل کا گہوارا تھا۔ ان کی والدہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ ارشد تھانوی کو بچپن میں مثنوی گلزار ابراہیم سنایا کرتی تھیں۔ اپنے علمی و ادبی خاندان کے ماحول میں مولانا ارشد تھانوی کو بھی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ وہ نو دس سال کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ اس زمانے کے اشعار انہیں آخرِ عمر تک یاد تھے۔ مولانا کے بچپن کا ابتدائی دور تھانہ بھون میں گزرا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں ارشد صاحب اپنے چھوٹے چچا کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ ایک دن ارشد تھانوی کے چچا ان کو ساتھ لے کر حکیم واصل خاں صاحب (حکیم اجمل کے بڑے بھائی) سے ملنے گئے تو انہوں نے ان کو مدرسہ طبیہ دہلی میں داخل کرانے کی رائے دی۔ چنانچہ انہیں فوراً ہی مدرسے میں داخل کرا دیا گیا۔ قیامِ دہلی میں ارشد صاحب نے چند روز ڈپٹی نذیر احمد سے بھی پڑھا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں ارشد تھانوی اپنے والد کے ساتھ بھوپال آ گئے۔ یہاں انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور کورٹ سب انسپکٹر مقرر ہوئے۔ چودہ سال کورٹ کی ملازمت کرنے کے بعد ان کا تقرر بحیثیت تھانہ دار اور پھر تحصیلدار ہوا۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں وزیرِ مال سے جھگڑا ہو گیا تو ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ اس کے بعد مولانا ارشد تھانوی حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں نواب اکبر یار جنگ کے یہاں مہمان رہے اور نواب صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب کی کوشش سے ایک پائیگاہ میں سب جج مقرر ہو گئے لیکن یہ ملازمت کچھ پسند نہیں آئی تو بھوپال آ کر وکالت شروع کر دی۔

سنہ ۱۹۴۸ء میں مولانا پاکستان آئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ کراچی آنے کے کچھ عرصہ بعد وہ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ یہاں پانچ سال تک وہ بچوں کے لیے کہانیاں لکھتے رہے جن کی تعداد

ہزاروں میں ہوگی-اس طرح انہوں نے مغربی مصنفین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا-انہوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھے جن میں لالۂ صحرا' خوبی تقدیر' پلاسٹک سرجری' نیلی پگڑی وغیرہ بہت مقبول ہوئے-ان میں بعض ڈرامے متعدد بار نشر کیے گئے-

ارشد تھانوی شاعر بھی تھے نثر نگار بھی-ساٹھ پینسٹھ سال تک انہوں نے دونوں حیثیت سے مختلف موضوعات واصناف پر بہت کچھ لکھا ہے-سنہ ۱۹۶۸ء میں مولانا ارشد تھانوی دارفانی سے رخصت ہو گئے-ارشد تھانوی صاحب کی علمی وادبی استعداد کا ذکر کرتے ہوئے محمد احمد سبزواری ماہنامہ ''نگار'' مارچ سنہ ۱۹۶۸ء میں لکھتے ہیں:

''ان کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ بیاض ارشد سنہ ۱۳۱۸ھ میں شائع ہوا-''بیاضِ ارشد ''اس کا تاریخی نام ہے-جس میں حسب روایات قدیم حروف تہجی کے لحاظ سے غزلیں ہیں- دوسرا مجموعہ ''حُسن تخیل'' کے نام سے سنہ ۱۹۱۱ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا اس میں شاعر کی ایک تصویر بھی ہے جہاں شاعر جنگل کے ایک گوشے میں بیٹھا نظر آتا ہے، اس تصویر کو دیکھ کر محوی صدیقی نے ایک نظم کہی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

نظر آتا ہے تو مدت سے پامالِ جفا ارشدؔ ۔۔۔ تبسم سے بھی تیرے لب نہیں ہیں آشنا ارشدؔ

مبارک ہو فراغ خاطرِ عزلت گزیں تجھ کو ۔۔۔ بساط عزتِ تمکیں ہو صحرا کی زمیں تجھ کو

تیسرا مجموعہ ''تصویرِ افکار'' تھا-یہ نظموں کا مجموعہ ہے-اس میں متعدد تصاویر بھی ہیں-مثلاً ایک تصویر میں مالن رانی کو پھول پیش کر رہی ہے-نظم کا عنوان ''فصل بہار'' ہے-اس نظم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ابتدا میں حوریں اس دنیا میں عورتوں کی شکل میں بھیجی گئیں-آسمانی حوریں اپنی پرانی سہیلیوں کو یاد کرتی ہیں-مگر ان سے کوئی ربط قائم نہیں کر سکتیں لہٰذا انہوں نے ہر سال فصلِ بہار پر اپنا پیغام پھولوں کی شکل میں بھیجنا شروع کیا-چنانچہ تصویر کے نیچے جو شعر درج ہے وہ یہ ہے:-

پھول رانی کو جو مالن پیش کرنے آئی ہے
رنگ وبو کی شکل میں حوروں کے بوسے لائی ہے

''آثار سانچی'' ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں بدھ مت کے مشہور استوپا سانچی کا تاریخی

حال ہے- سانچی پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے-

''اختر بیگم'' ایک مختصر ناول ہے جسے صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا- ''اجتماع ضدین'' ایک دوسرا ناول ہے

''طواف زمین'' یہ فرانسیسی ناول نگار جانس ورن کی مشہور کتاب ''اسی دن میں دنیا کا سفر'' کا ترجمہ ہے-

شوکت تھانوی کا نام اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں، لیکن غالباً یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کو شوکت تھانوی بنانے والے یہی ارشد تھانوی ہیں- عم زاد بھائی اور پھر بڑے بہنوئی کی حیثیت سے شوکت صاحب ان سے کافی مرعوب تھے، پھر ان کے بچپن کے زمانے میں جب ارشد صاحب لکھنؤ آتے اور وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں ان کا خیر مقدم ہوتا تو اس سے بھی کافی متاثر ہوتے تھے- یہ اسی مرعوبیت اور تاثر کا نتیجہ تھا کہ وہ صاحب جو نہ تھانہ بھون میں پیدا ہوئے اور نہ اس وقت تک تھانہ بھون کی صورت دیکھی تھانوی بن گئے (شوکت صاحب صاحب اولاد ہونے کے بعد پہلی مرتبہ ایک دن کے لئے تھانہ بھون گئے تھے) اور شوکت تخلص رکھا ورنہ اصل نام محمد عمر تھا- ایک دن اتفاق سے ارشد صاحب کو اپنے برادر خورد کے شاعر ہو جانے کا علم ہوا تو فرمائش کی کہ اچھا اپنی کوئی چیز سناؤ- شوکت صاحب نے اپنی دو تین کامیاب غزلیں سنائیں مگر برادر معظم کو شک ہوا کہ یہ ان کا کلام نہیں بلکہ ادبی سرقہ ہے- چنانچہ امتحان کی غرض سے یہ مصرع دیا ع

جب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

شوکت نے چند لمحے توقف کیا اور مصرع لگا دیا

غمناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

ارشد پھڑک اٹھے اور شوکت کو شاعر تسلیم کر لیا-''

---••☆••---

ارم لکھنوی، شہنشاہ حسین

ان کا اصل نام شہنشاہ حسین، ارم تخلص اور ارم لکھنوی قلمی نام تھا- لگ بھگ سنہ ۱۹۱۰ء میں شعر و سخن کی بستی لکھنؤ میں پیدا ہوئے- ان کے والد سید نثار حسین محکمہ ریلوے میں اہم منصب پر فائز تھے- ارم لکھنوی نے ابتدائی تعلیم کے بعد انگریزی میں ایم اے کیا- ان کی جوانی کا خاصہ حصہ کلکتہ میں بسر ہوا وہاں بھی انہیں ارباب فن کی صحبت اور ہم نشینی میسر تھی- تقسیم کے بعد ارم لکھنوی پاکستان آئے اور ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور پھر ہمیشہ اسی ادارے میں خدمات انجام دیتے رہے- یہاں پر وہ نظم و غزل نشر کرنے والے موسیقار کے تلفظ کی صحت کرنے کی خدمات بھی انجام دیتے تھے- شاعری میں علامہ آرزو لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا- وہ آرزو لکھنوی کے عزیز شاگردوں میں تھے- پاکستان میں انہوں نے اپنے اُستاد آرزو لکھنوی کی یاد میں انجمن آرزو بھی قائم کی تھی-

حضرت ارم لکھنوی پاکستان میں لکھنؤ دبستان کے آخری نمائندہ شاعر تھے- برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان سے جتنے بھی شعراء پاکستان تشریف لائے ان میں ارم لکھنوی کو اس لیے خصوصی اہمیت حاصل تھی کہ ان کی ذات سے اُردو غزل گوئی کی ایک روایت قائم تھی جو ان کے ساتھ ختم ہوگئی- ارم لکھنوی نے ساری عمر شادی نہیں کی- وہ اپنے بھائی بہن کی اولاد کو ہی اپنی اولاد سمجھتے تھے-

ارم لکھنوی بڑے خوش مزاج اور محبت کرنے والے انسان تھے- اکثر ان کے دوست احباب چھیڑ چھاڑ کیا کرتے تھے لیکن وہ کبھی ان کی چھیڑ چھاڑ پر ناراض یا برا نہیں مانتے تھے- اس سلسلے میں ان سے متعلق ایک واقعہ مرحوم ماہر القادری صاحب نے ماہنامہ ''فاران'' کراچی میں تحریر کیا ہے- وہ لکھتے ہیں:

''جنرل اعظم ان دنوں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے، ''گلستان'' ڈھاکہ کا مشہور سنیما ہے اُسی میں مشاعرہ منعقد ہوا، جنرل صاحب موصوف نے بھی شرکت فرمائی، کسی شاعر کو اُس کے شعر پر زیادہ داد ملتی تو وہ غالباً اپنی گرانی گوش کے سبب اپنی بیگم صاحبہ سے کچھ پوچھتے، ارم لکھنوی نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا:-

وہ کہتے ہیں کہ جا اب رستگاری ہوگئی　　　اے جنوں! زنجیر یہ تو اور بھاری ہوگئی

تو ہال دادِ تحسین کے شور سے گونج اُٹھا اس پر جنرل صاحب نے اپنی بیگم صاحبہ سے سرگوشی کے انداز میں کچھ دریافت کیا جب مشاعرہ گاہ سے ہم قیام گاہ پر آئے تو میں نے کہا آرم صاحب آپ نے غضب کر دیا، مارشل لاء کے دور میں ایسا سیاسی مطلع پڑھ دیا، وہ چونک کر بولے، اس مطلع کو سیاست سے کیا واسطہ، اور یہ غزل تو میں نے تقسیم ہند سے قبل انگریز کے دورِ حکومت میں لکھنؤ میں کہی تھی- اس مذاق میں اقبال صفی پوری صاحب کی شوخی اور ظرافتِ طبع نے اور لطف پیدا کر دیا، آرم صاحب کو باور کرایا گیا کہ یہ شعر اوپر کے حلقوں میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے- معاملہ بڑا سنگین نظر آتا ہے اور بھیا آرم! ہم جانتے ہیں کہ تمہارا سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا ہے، مگر:-

اس کی توجیہہ تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتی، اس شعر کو یہ معنی پہنائے جا رہے ہیں کہ پچھلے دوروں کے مقابلہ میں موجودہ دور سخت تر ہے! آرم بے چارے کے چہرے پر فکر و تشویش کی ہوائیاں سی چھٹنے لگیں، کئی دن مذاق کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور جب اس مذاق کا راز ان پر کھل گیا، تو برا نہیں مانا-"

آرم لکھنوی پاکستان میں لکھنو دبستان کے آخری غزل گو شاعر تھے- انہوں نے ۷۵ برس عمر پائی- ۵ر فروری ۱۹۶۷ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے کراچی میں انتقال ہوا اور تدفین لیاقت آباد کے قبرستان میں ہوئی- آرم لکھنوی کا کلام ملاحظہ ہو:

اس نے دیکھا ہنس دیا اک رسم جاری ہوگئی　　　کیا ہوا دنیا کو کیا حالت ہماری ہوگئی

وہ یہ کہتے ہیں کہ جا اب رستگاری ہوگئی　　　اے محبت اور یہ زنجیر بھاری ہوگئی

آئینہ میں اپنی صورت دیکھتا جاتا تھا میں　　　دفعتہً پیش نظر صورت تمہاری ہوگئی

ہجر کی شب اُن ستاروں میں جو تھے پیش نظر　　　روشنی اتنی ملی اختر شماری ہوگئی

کوئی کچھ سمجھے مگر حساس دل کی موت ہے　　　ختم جس منزل پر آکر بے قراری ہوگئی

دل سے یوں رخصت ہوئی دل کی تمنا اے آرم　　　اور بھی مٹی ہوئی تصویر پیاری ہوگئی

ہم باغ تمنا میں دن اپنے گزار آئے　　　آئی نہ بہار آخر، شاید نہ بہار آئے

ٹکرایا ترے در سے اک نعرۂ مستانہ
بے نام لیے تیرا ہم تجھ کو پکار آئے

جگمگائے دل بھی پھونکے طور بھی
میرا جلوہ نار بھی ہے نور بھی

منہ کا بدلا تھا مزہ بہکے نہیں
ہم نے چکھی ہے مئے منصور بھی

ہے غنیمت ان کا جھوٹا التفات
پھر بدل جائے نہ یہ دستور بھی

روئے دل اور آنکھ نم ہونے نہ پائے
ہو نہ کوئی اس طرح مجبور بھی

آنکھ ترسے دل کرے محسوس آرم
وہ ہیں جتنے پاس اتنے دُور بھی

ہوئے بدنام لے کے نام اپنا
ورنہ کچھ اور تھا مقام اپنا

جان آ آگئی لبوں پہ آرم
پھر بھی ہے درد ناتمام اپنا

محبت سلامت کہ اہلِ محبت
ستم میں بھی لطفِ ستم دیکھتے ہیں

کبھی سر بھی رکھ دیں گے ان کے قدم پر
ابھی صرف نقشِ قدم دیکھتے ہیں

اُنہیں دیکھ کر کوئی سنبھلے تو جانیں
مگر جن نگاہوں سے ہم دیکھتے ہیں

مٹے ہوؤں کی کوئی یادگار کیا ہوگی
مزار ہی نہیں شمع مزار کیا ہوگی

---••☆••---

اسد محمد خان

اسد محمد خان ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ریاست بھوپال میں پیدا ہوئے- ان کے آباواجداد کا تعلق درّہ خیبر میں آفریدی قبیلے کی ذیلی شاخ میرزائی خیل سے ہے- اسد محمد خاں کے دادا میاں کمال محمد خان کو والیٔ ریاست سے اختلاف تھا جس کی وجہ سے ان کی جائداد ضبط ہو گئی تھی- اسد صاحب کے والد مصوری کے استاد تھے- انہیں مذہب سے بڑا لگاؤ تھا- اپنی عمر کے آخری تین چار سال انہوں نے تبلیغ میں گزارے-

اسد محمد نے میٹرک بھوپال سے پاس کیا- انٹر کی تعلیم کے دوران وہ بھوپال سے پاکستان آئے اور کرشن نگر لاہور میں مقیم ہوئے- پاکستان آنے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ وہ بھوپال میں کمیونسٹ پارٹی سے منسلک ہو گئے تھے- اور پارٹی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے- اُن کے ماموں اور خالو اور دیگر عزیزوں نے انہیں بہت سمجھایا کہ اپنی ان حرکتوں سے باز آ جاؤ- اس سلسلے میں آخر وہ ایک مرتبہ گرفتار ہو گئے اور ۷ دن قید میں گزارے- اس کے بعد انہوں نے پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی جس کی وجہ سے پارٹی ان کی جانی دشمن ہو گئی- اِن کے والد نے انہیں سمجھایا کہ تم اپنے بھائی کے پاس پاکستان چلے جاؤ- اِن کے بھائی پاکستان میں پہلے سے موجود تھے جو پاکستان کی فوج میں تھے-

پاکستان میں کچھ عرصہ انہیں مشکلات کا سامنا رہا جس کے سبب اُن کی تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا- ابتدا میں وہ پیر الٰہی بخش کالونی میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ رہے پھر مختلف جگہوں پر جھونپڑی ڈال کر گزارا کیا- لیکن اپنی تعلیم کو جیسے تیسے ہوا' جاری رکھا- ان ہی حالات میں انہوں نے جناح کالج سے انٹر آرٹس کا امتحان پاس کیا- انٹر کے بعد سندھ مسلم کالج سے بی اے کیا اور پھر انگریزی میں ایم اے کرنے کے لیے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن اپنے نا مساعد حالات کے سبب ایم اے نہیں کر سکے- معاشی طور پر یہ دور اسد صاحب کی زندگی کا انتہائی کٹھن اور پریشان کن تھا جس نے انہیں

فاقہ کشی تک مجبور کر دیا تھا۔

اپنے ذریعہ معاش کے لیے اسد محمد خان نے مختلف جگہ کام کیا۔ انہوں نے کمرشیل آرٹسٹ، پبلشر، کلرک، اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر، ٹریول ایجنٹ، انگریزی کے استاد اور ریڈیو نیوز ریڈر وغیرہ اور دوسری مختلف حیثیتوں میں کام کیا۔ ابتدا میں وہ روز نامہ ''احسان'' لاہور کے لیے کارٹون اسکیچ بناتے تھے۔ اس کے بعد وہ کراچی میں ریلوے اسٹیشن ماسٹر کا تربیتی امتحان پاس کر کے ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ لیکن تین چار ماہ کے بعد یہ ملازمت چھوڑ کر کراچی پورٹ ٹرسٹ میں بحیثیت کلرک ملازم ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر امپورٹس کے عہدے تک پہنچے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے افسران اور ساتھیوں کا سلوک ان کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ چنانچہ انہیں اپنی تعلیم حاصل کرنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے منصبی فرائض کے ساتھ ساتھ وہ اِس ادارے کا ہاؤس جرنل ''صدف'' بھی مرتب کرتے تھے۔ انہیں ترجمے کرنے کا ہمیشہ سے بہت شوق رہا ہے۔ وہ لاطینی امریکی ممالک، پولینڈ، برازیل، چلی وغیرہ کے ادب کے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ترجمے بھی کرتے ہیں۔ اِن ترجموں میں شاعری اور نثر دونوں شامل ہیں۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں ریڈیو پاکستان کی بیرونی نشریات کے ڈائریکٹر عزیز حامد مدنی صاحب نے اسد محمد کو اپنے پاس بلا کر کہا کہ تم انگریزی کا ترجمہ اچھا کر لیتے ہو لہٰذا یہاں آ کر ریڈیو پر ترجمہ اور خبریں پڑھا کریں۔ چنانچہ اپنے ادارے کراچی پورٹ ٹرسٹ کی اجازت کے بعد اسد محمد خاں نو سال تک ریڈیو پاکستان میں بحیثیت نیوز ریڈر خدمات انجام دیتے رہے۔

اسد محمد خان ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ ترجمے بھی کرتے ہیں اور کارٹون اسکیچ بھی بناتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں وہ اُس کا اظہار اپنے فن سے کرنے کا سلیقہ خوب جانتے ہیں۔ ادبی زندگی کا آغاز انہوں نے دورانِ تعلیم ہی سے شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے دو نثر پارے یعنی تصوراتی خاکے لکھے۔ یہ دونوں نثر پارے اسکول کے میگزین میں بھی چھپے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء سے شاعری شروع کی۔ ''نو منزلہ بلڈنگ'' ان کی پہلی مطبوعہ نظم ہے جو ہندوستان کی تقریباً اٹھارہ یونیورسٹیوں میں ایم اے کے کورس میں شامل رہی ہے۔ اس کے بعد ان کی

نظمیں کراچی کے مختلف رسائل میں چھپنا شروع ہوئیں۔ اسد کی پہلی کتاب ''کھڑکی بھر آسمان'' ہے جس میں شاعری اورافسانے دونوں ہی شامل ہیں۔ ان کی شاعری کے کچھ بول ملاحظہ کیجیے جو اکثر ریڈیوٹی وی سے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں:

انوکھالاڈلا کھیلن کو مانگے چاند' کیسی انوکھی بات رے'

تم سنگ نیناں لاگے مانے نہیں جیارا'

زمیں کی گود رنگ سے امنگ سے بھری رہے'

اسد محمد خان کو مطالعے کا بھی بڑا شوق ہے۔ انہوں نے پہلے تو چارلس ڈکنز کو پڑھا۔ پھر جاسوسی ادب پڑھنا شروع کیا تو اسٹینلے گارڈنر' ابن صفی کو پڑھا۔ اس کے بعد سنجیدہ ادب پڑھنا شروع کیا تو دوستوسکی' جان اسٹائن بیک کو پڑھا۔ اس کے علاوہ بیدی سریندر پرکاش' انور خان' رشید امجد' سلام بن رزاق' علی امام نقوی اور منٹو کو پڑھا۔ منٹو جو ان کے آئیڈیل ہیں اُن کو تو خوب پڑھا۔ آج بھی وہ لکھنے پڑھنے میں مشغول نظر آتے ہیں۔

--••☆••--

اسرار احمد کریوی، حکیم

حکیم اسرار احمد صاحب کریوی سنہ ۱۹۰۸ء کوری ضلع الہ آباد (یوپی) بھارت میں پیدا ہوئے۔ اِن کا سلسلہ نسب بزرگ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی سے ملتا ہے۔ حضرت بہاء الدین ذکریا کے ایک فرزند شاہ اسماعیل کو بمرولی ضلع الہ آباد میں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ ان ہی کی اولاد میں خواجہ محمد نے بمرولی سے سات میل مغرب میں دریائے گنگا کے کنارے سکونت اختیار کرلی۔ یہ مچھیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اس بستی سے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ راجہ رام چندر جی اِسی گھاٹ سے اُتر کر دکن کی طرف گئے تھے۔ اسرار احمد کے آباواجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ اِن کے بزرگوں نے سنہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تھا جس کی وجہ سے ان کے خاندان کو سخت سزائیں دی گئیں اور ساری جائداد بھی ضبط کرلی گئی۔

اسرار احمد نے پرائمری کے بعد عربی تعلیم مدرسۂ عالیہ مصباح العلوم الہ آباد سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر اعظم کریوی کے پاس میرٹھ چلے گئے جہاں اُنہوں نے جامع مسجد اندرکوٹ میں دینی تعلیم شروع کی۔ دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسرار احمد واپس الہ آباد آ گئے اور مدرسۂ عالیہ مصباح العلوم الہ آباد میں تعلیم کا سلسلہ جاری کیا۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے فاضل ادب فارسی، فاضل طب، کامل فارسی اور آنرز اُردو کے امتحانات پاس کیے۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو کچھ دنوں مدرسۂ عالیہ مصباح العلوم میں مولوی اور عالم کے درجوں کو تعلیم دی۔ لیکن جلد ہی سبکدوش ہوکر پرائیویٹ طور پر انگریزی تعلیم شروع کی اور علی گڑھ سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایف اے اور بی اے کے امتحانات صرف انگریزی میں آگرہ یونیورسٹی سے پاس کیے۔

اسرار احمد سنہ ۱۹۴۱ء میں ناگ پور کے انجمن حامی ہائی اسکول میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ لیکن دو سال کے بعد استعفادے کر انہوں نے مطب شروع کیا اور ایک ہفتہ وار اخبار ''امید'' جاری کیا جو دو سال تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ اسرار احمد سیاسی طور پر کانگریس سے منسلک ہوگئے لیکن کانگریس کی

اُردو کش پالیسی پر انہوں نے احتجاجاً استعفادے دیااور کانگریس سے کنارہ کش ہوگئے-اس کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوگئے- مسلم لیگ میں اُنہوں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیااور دوبار قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں-سنہ ۱۹۳۹ء میں مولوی عبدالحق صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوااور سنہ ۱۹۴۶ء تک اُنہی کے ساتھ اُردو کی تحریک سے وابستگی رہی-اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کے ساتھ دس سال تک ہندوستان کے طول وعرض میں سفر کیا-ناگ پور کے قیام کے دوران سنہ ۱۹۴۰ء میں اِن پر بغاوت کا مقدمہ دائر کیا گیا جس سے لیاقت علی خاں کی بدولت نجات ملی-۱۹۴۲ء میں ناگ پور کو خیر آباد کہہ کر دہلی اور لکھنؤ میں ''دانش محل'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا-سنہ ۱۹۴۶ء میں ''نیا اخبار'' کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جس کی مقبولیت اس قدر ہوئی کہ اِس کی اشاعت چند ہی دنوں میں سات ہزار سے تجاوز کرگئی-ایک ایڈیٹوریل ''سخن ہائے گفتنی'' کی بناپر اسرار احمد کو چھ ماہ کی سزا ملی جس کو بعد میں مزید چھ ماہ بڑھادیا گیا لیکن کسی قانونی نکتہ کی وجہ سے جلد رہائی ہوگئی-

سنہ ۱۹۴۸ء کے آخر میں اسرار احمد پاکستان آگئے اور یہاں بھی انہوں نے ایک اخبار ''نئی دنیا'' کے نام سے نکالا لیکن اُس وقت کی حکومت اِسے برداشت نہیں کرسکی مجبوراً اُنہوں نے اِسے بند کردیا-کراچی کے قیام میں وہ دوسال اسلامیہ سائنس کالج میں صدر شعبہ اُردو رہے اور پھر روزنامہ ''انجام'' میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے-وہ نیشنل کالج کراچی میں جز وقتی استاد بھی رہے- اسرار احمد نے اُردو زبان کی ترقی کے لیے بہت کام کیااور بڑی پریشانیاں بھی اُٹھائیں-اخبار ورسائل سے ہٹ کران کی ایک تصنیف ''سی پی میں کانگریس کا راج'' کو بڑی شہرت ملی-اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا-

اس خاندان اوراس کے آباواجداد نے جنگِ آزادی سے لے کر تحریک پاکستان تک بڑی پریشانیاں اُٹھائیں اور جیلوں کی صعوبتیں جھیلیں-لیکن یہ بڑاالمیہ ہے کہ اِسی خاندان کے ایک فرد زہیر اکرم ندیم جو اسرار احمد کریوی کے فرزند تھے' کراچی میں شہید کردیا گیا-زہیر اکرم ندیم ایک معروف سماجی' سیاسی کارکن تھے اور حکومت سندھ میں وہ صوبائی وزیر بھی رہے-۵رجنوری ۱۹۹۲ء کو اسرار احمد کریوی دارِفانی سے رخصت ہوگئے-گلشنِ اقبال کراچی کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں-

---••☆••---

اسعدؔ شاہجہانپوری

اسعدؔ شاہجہانپوری کا اصل نام محمد صدیق حسن تھا۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں شاہجہانپور کے محلہ بکسریاں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد ولی صاحب ریاست اندور میں فوجی ملازمت میں صوبہ دار تھے۔ ان کے دادا امام بخش صاحب بسلسلۂ ملازمت اودھ سے شاہجہانپور آئے تھے اور یہیں پر انہوں نے سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسعدؔ صاحب کو ابتدائی تعلیم گھر میں دلائی گئی جیسا کہ اس وقت کا دستور تھا۔ دس سال کی عمر میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ اسعدؔ صاحب نے مقامی اساتذہ اور قدیم مدارس میں فارسی کی تکمیل کی اور عربی میں بھی بقدرِ ضرورت استعداد پیدا کی۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور ایس ایل سی کے امتحانات پاس کیے۔
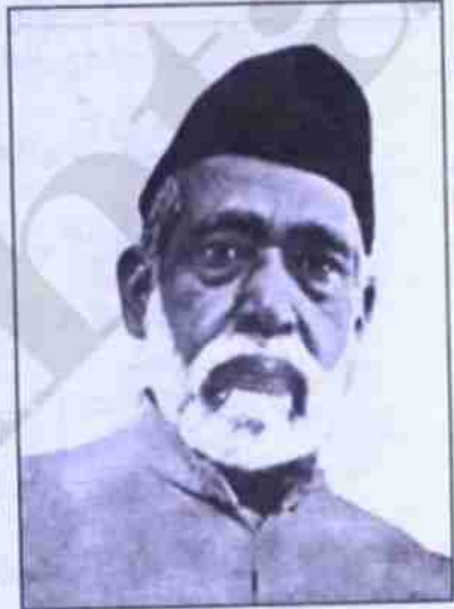
اسعدؔ شاہجہاں پوری کی طبیعت بچپن سے ہی شعر وسخن کی طرف مائل تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے پندرہ سال کی عمر میں سب سے پہلے نعت اور ایک منقبت حضور خواجہ اجمیریؒ کی شان میں کہی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں اپنے ہموطن نواب ناظم علی خاں ہجرؔ کے شاگرد ہوئے۔ ہجرؔ صاحب مرزا خاں داغؔ دہلوی کے ارشدِ تلامذہ میں سے تھے اور اپنے دور کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ اسعدؔ صاحب کو اصلاح لیتے ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ ہجرؔ صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس کے بعد انہوں نے کسی کی شاگردی اختیار کرنا پسند نہیں کیا بلکہ اپنے ذوق اور مشق کو ہی اپنا رہبر بنایا۔

ذریعہ معاش کے لیے سنہ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے محکمہ کلکٹری شاہجہانپور میں ملازمت اختیار کر لی اور تیس سال تک مختلف سرکاری محکموں میں خدمات انجام دیتے رہے۔ مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد سنہ ۱۹۴۶ء میں اسعدؔ صاحب ریٹائر ہوگئے اور پنشن پائی۔ وہ ابتدا سے ہی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان کو کامیاب بنانے اور مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے انہوں نے بہت سی جوشیلی نظمیں لکھیں۔ وہ ان نظموں کو مسلم لیگ کے جلسوں میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ پڑھتے تھے۔ تحریکِ پاکستان میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اسعدؔ شاہجہانپوری ایک سچے مذہبی اور نیک انسان تھے۔ وہ دینی

خدمات میں بھی بھرپور حصہ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے بے شمار قادیانوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ اس سلسلہ میں اسعدؔ شاہجہاں پوری نے ایک تصنیف ''قادیانیوں کے باطل مذہب کا محاکمہ'' کے عنوان سے مرتب کی ہے جو غالباً طبع نہیں ہوئی۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو مارچ سنہ ۱۹۴۸ء میں اسعدؔ صاحب ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی میں مستقل رہائش اختیار کی۔ یہاں آ کر مطالعہ اور شعر و شاعری کے علاوہ ان کا کوئی اور مشغلہ نہیں تھا۔ سنہ ۱۹۵۲ء سے سنہ ۱۹۵۷ء تک اسعدؔ شاہجہاں پوری بزمِ غالبؔ کے صدر رہے اور انجمن کے ماہانہ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی فرماتے ہیں:

> ''اسعدؔ صاحب ہماری شعری روایت اور جدید تجربوں میں ایک دوراہے پر ہیں۔ ان کا ایک قدم متقدمین کے ساتھ اور ایک جدید شعراء کے ساتھ ہے۔ ان کے یہاں وہ عصری تقاضے بھی ہیں جو قدرتی طور پر متقدمین کے یہاں نہیں ملتے اور وہ ریاض بھی ہے جس سے دورِ حاضر کے اکثر جدید شعرا محروم ہیں۔''

اسعدؔ شاہجہانپوری کے کئی شاگردوں کو اساتذہ کا مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ان کے ایک صاحبزادے حنیفؔ اسعدی بھی نامور شاعر ہیں ان کے جانشین دردؔ اسعدی نے ''بزمِ اسعد پاکستان'' قائم کی ہے جو شعر و سخن کی گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

ان کا مجموعۂ کلام ''وجدانِ سلیم'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ ۲۲؍ جولائی ۱۹۶۶ء کو تحریکِ پاکستان کے نامور شاعر اسعدؔ شاہجہانپوری کا کراچی میں انتقال ہوا۔ کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

باد صرصر کی قسم امواج دریا کی قسم　　طائرانِ خلد کی آزاد دنیا کی قسم
جذبہ وارفتگی میں جشنِ صحرا کی قسم　　حالت صد یاس میں ہر ہر تمنا کی قسم

دل کو بہلاتا تو ہوں لیکن بہلتا ہی نہیں
سیکڑوں ہیں سحر کوئی سحر چلتا ہی نہیں

زندگی بھر میں یہاں اک لمحہ عشرت کا نہیں　　اس چمن میں ایک برگ گل بھی قسمت کا نہیں
اپنے افسانہ میں ایک عنوان راحت کا نہیں　　کوئی دم سینہ میں پاکیزہ مسرت کا نہیں

قید ہیں دام و قفس میں مرغ و ماہی کی طرح
مسکراتے ہیں چراغ صبح گاہی کی طرح

ساز و ساماں طرب ہم کو میسر کیوں نہیں جس سے آنکھیں شاد ہوتی ہیں وہ منظر کیوں نہیں
انجمن اپنی بساط ماہ و اختر کیوں نہیں کیوں نہیں دامن میں آخر لعل و گوہر کیوں نہیں

سر گراں ہیچو صلۂ مسرف پراگندہ خیال
اس پہ ذوق جشن جم ہے اس پہ شوق وجد و حال

چیر کر سینہ زمیں کا سیم و زر پیدا کرو پرزے کر کے دامن دریا گہر پیدا کرو
اٹھو ٹکرا کر چٹانوں سے شرر پیدا کرو دسترس تا عالمِ شمس و قمر کرو

ورنہ جینا کچھ نہیں اک لعنت مذموم ہے
بینوا دنیا میں کیف زیست سے محروم ہے

پھر اس کو گردش لیل و نہار لا نہ سکی جو لمحہ عیش کا دریا بہا کے ڈوب گیا
وہ آرزو وہ ذوق طلب وہ نظر گئی سب کچھ گیا متاعِ محبت اگر گئی
اب وہ فریب وعدہ کی رنگینیاں کہاں اب وہ امیدواریِ شام و سحر گئی
صیاد سے فرار نہ شاخِ چمن سے کام جب آشیاں مٹا ہوس بال و پر گئی
جاتے کہاں ہو تم سبدِ گل لئے ہوئے اسعدؔ بہارِ انجمن شعر تر گئی

میری وحشت سے ہے سایہ بھی گریزاں میرا
ساتھ میرے ہے جہاں جاؤں بیاباں میرا

شعلہ تمہید ہے عرضِ تپش پیہم کی
شمع کہنے کو ہے سوزِ غم پنہاں میرا

طلوعِ مہر ہوئی طورِ راہ سے کم تاب
جو عشق پہلے حقیقت تھا اب فسانہ ہوا

---••☆••---

اطہر صدیقی

اطہر صدیقی قلمی نام اور اطہر تخلص کرتے ہیں۔ ۲۲ر فروری سنہ ۱۹۳۳ء کو فیروز آباد آگرہ، بھارت کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آئے اور کراچی میں مستقل رہائش اختیار کی۔ کراچی آ کر سب سے پہلے انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں اطہر نے سندھ مسلم کالج کراچی سے بی اے اور پھر کراچی یونیورسٹی سے دو ایم اے کیے۔ ایک اُردو میں پھر ایک فارسی ادب میں بھی۔ انہوں نے ایم اے کے دونوں امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر درس وتدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا اور جناح کالج کراچی سے منسلک ہو گئے۔

اطہر صدیقی کو شعر و سخن کا ذوق دورِ طالب علمی ہی سے تھا اور بڑی اٹھان کے شاعر تھے۔ شاعری کے علاوہ علمی اور تحقیقی کاموں سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے کئی مقالے انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالے ''اُردو'' میں شائع ہوئے۔ اطہر صدیقی نے ''طلسم ہوشربا کے مافوق الفطری عناصر'' کے عنوان سے ایک مبسوط تحقیقی مقالہ تحریر کیا، جو باقاعدگی سے رسالہ ''اردو'' میں شائع ہوتا رہا۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں اپنے ادبی اور تحقیقی ذوق کی تسکین کے لیے انہوں نے کراچی سے اعلیٰ پایہ کا ادبی رسالہ ''سات رنگ'' کے عنوان جاری کیا جو کئی سال تک بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔

وفات سے قبل وہ پی ایچ ڈ کے لیے امیر خسرو پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے، لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ان کا یہ اعلیٰ کام مکمل نہ ہو سکا۔ وہ ذیابیطس کے پرانے مریض تھے مگر علاج اور پرہیز کے معاملے میں بے حد لاپرواہ تھے۔ ۸ر دسمبر سنہ ۱۹۷۹ء کو دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ عزیز آباد کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں۔ اطہر صدیقی کے کلام کے چند اشعار اور ایک غزل ملاحظہ کیجیے۔

کونسی بزم ہے جس میں ترا چرچا نہ ہوا	روشِ اصلِ وفا تھی کہ تو رسوا نہ ہوا
اُڑ گئیں رونقیں دیوانے کے اُٹھ جانے سے	پھر کوئی بزم میں سرگرمِ تماشا نہ ہوا

ہم کو منظور غمِ بے کسیِ دل لیکن
وہ ستمگر کسی انداز سے اپنا نہ ہوا

تیرے دم سے رہی آسودگیٔ قلب ونظر
ہم سے خود شکوۂ نیرنگیٔ دنیا نہ ہوا

کس محبت سے ترے درد کو چاہا ہم نے
جز ترے غیر کا احسان گوارا نہ ہوا

اک تری یاد سے قائم رہا شیرازۂ دل
ورنہ اس بیکسیٔ شوق میں کیا کیا نہ ہوا

بندگی ان کی میسر ہمیں آئی اطہرؔ
جن سے بیماریٔ دل کا بھی مداوا نہ ہوا

گراں تھے مجھ پہ بہت حادثات فردا و دوش
وہ اس خیال سے کچھ اور بانکپن سے چلے

خدا کا ذکر بھی منظور ہے مگر واعظ
یہ تذکرہ بھی کسی شوخ گلبدن سے چلے

اس نے کچھ اس پیار سے دیکھا ہوش وخرد کو کیا کہیے
آج تو اپنے ہاتھ سے اطہرؔ چھوٹ گیا پیمانہ بھی

---••☆••---

اطہر ہاپوڑی

اصل نام سید معشوق حسین، تخلص اطہر اور قلمی نام اطہر ہاپوڑی ہے-ان کے والد جناب امراؤ علی صاحب ابن سید ثناء اللہ زاہد پرہیزگار، متقی اور پابند شریعت باخدا بزرگ تھے-ان کے بڑے بھائی سید اشفاق حسین ڈپٹی مجسٹریٹ، ڈپٹی کلکٹر تھے-اطہر ہاپوڑی ۳ر اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ء کو ہاپوڑ میں پیدا ہوئے-ابھی وہ بارہ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا-والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی سید اشفاق حسین نے کی-

مولانا اطہر ہاپوڑی نے فارسی کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں-ان کے ایک استاد مولوی قمر الدین قمر جو نعت گو شاعر تھے' مولانا کو فارسی پڑھاتے تھے-مولوی قمر الدین قمر کا تعلق سوروں ضلع ایٹہ سے تھا-وہ اکثر اپنی نئی غزل کو ہفتوں گنگنایا کرتے تھے جسے سُن سُن کر وہ پوری غزل اطہر صاحب کو یاد ہوجایا کرتی تھی-ایک دن اطہر صاحب کی طبیعت میں لہر پیدا ہوئی تو انہوں ایک مطلع موزوں کیا-اس کے بعد بلا مقطع چار شعر اور کہے اور مولوی صاحب کو اصلاح کے لیے دکھایا-ان کی غزل کا مطلع یہ تھا؎

اگر عشقِ محمدؐ دل میں میرے جلوہ گر ہوتا   تو ہرگز خارِ عصیاں سے نہ یہ باغِ جگر ہوتا

غزل دیکھ کر مولوی صاحب نے اصلاح نہیں دی اور شعر کہنے سے منع فرمادیا-مولانا اطہر صاحب کو علم حاصل کرنے کا ہمیشہ شوق رہا-۱۸۹۲ء میں یہی شوق انہیں لاہور کھینچ لے گیا جہاں عرصے تک قیام رہا-لاہور میں انہوں نے مولوی محمد علی مرحوم، گوجرانوالا سے عربی صرف ونحو اور مولانا اصغر علی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور سے عربی ادب کی چند کتابیں پڑھیں اور علامہ عشرت اصفہانی سے فارسی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی-اطہر صاحب کو شعر وسخن کا ذوق بچپن ہی سے ہوگیا تھا-وہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے-چنانچہ علامہ عشرت اصفہانی کو مولانا نے اپنا فارسی کلام بھی دکھایا-اس کے بعد دوران قیام لاہور میں عشرت اصفہانی کا تلمذ اختیار کیا اور تین سال تک استفادہ کیا-عشرت اصفہانی بڑے فاضل اور حاضر طبع شاعر تھے-اطہر ہاپوڑی کو تحقیق شعری کا شوق حضرت جلال لکھنوی اور مولوی ظہیر احسن شوق

نیموی کے باہمی مباحثے کی کتابیں دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔

۱۸۹۰ء، ۱۸۹۱ء میں اطہر ہاپوڑوی نے مین پوری میں قیام کیا جہاں مولوی محمد محسن صاحب کاکوروی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ وہیں منشی طاہر علی طاہؔر فرخ آبادی اور منشی حیات بخش رسؔا تلمیذ حضرت داغؔ دہلوی سے دوستانہ مراسم ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۹ء تک اطہؔر ہاپوڑوی علی گڑھ میں اپنے بڑے بھائی سید اشفاق حسین صاحب کے پاس رہے جہاں وہ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ علی گڑھ کے دورانِ قیام انہیں مولانا حالؔی اور مولانا شبلؔی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد وہ رام پور چلے گئے جہاں انہوں نے وکالت کی پریکٹس شروع کی۔ رام پور میں ملک الشعرا حضرت امیؔر مینائی کی خدمت میں شرف نیاز حاصل کیا۔ منشی صاحب مرحوم کا کلام خود ان کی زبان مبارک سے سُنا اور اپنا کلام بھی اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ رام پور کے بعد مولانا اطہر نے گوالیار میں وکالت کی۔ ۱۹۱۰ء میں یہ جے پور چلے گئے۔ یہاں پر انہوں نے مشکوٰۃ شریف، ہدیہ سعیدیہ وغیرہ اور چند عربی رسائل مولانا امیر حسن سہا محدث سے پڑھے۔ جب تشنگی علم کم نہ ہوئی تو ملک الشعرا سپہر ایرانی کی تصنیف انیق براہن العجم اور قوانین العجم ایران سے خاص طور پر منگوا کر پڑھیں۔ جے پور میں وہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک منصف رہے۔ اس کے بعد فرقہ وارانہ وجوہ کی بنا پر استعفےٰ دے کر ٹونک چلے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے اردو کی حمایت میں ہندی پرچارنی سبھا کے مقابلے میں اُردو ڈیفنس کمیٹی قائم کی اور سکریٹری کی حیثیت سے اُردو کی خدمت کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں ان کی شریکِ حیات کا انتقال ہو گیا۔ پھر اسی سال مولانا اطہر پاکستان آ گئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ اپنی تصنیف کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''۱۔ اُردو کے تین دیوان ۲۔ مجموعہ قصائد اُردو ۳۔ مجموعہ قصائد و غزلیات فارسی ۴۔ رسالہ تحقیقات الفاظ ۵۔ قطعات تاریخ۔ مراثی و سلام ۶۔ رسالہ اصلاحِ عروض زیرِ تصنیف ۷۔ مکتوباتِ شعری ۸۔ رسالہ جدید عروض و قوافی ۹۔ اظہار اللغات:۔ اس لغت کے دو حصے ہیں ایک حصے میں وہ الفاظ ہیں جس کو ہندوستانی فارسی نہیں سمجھتے اور شبہ کرتے ہیں اور دوسرے حصے میں وہ الفاظ ہیں جن کو ہندوستانی فارسی سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ فارسی نہیں ہیں۔ ہر لفظ کی سند فرہنگ ناصری سے دی گئی ہے اور دوسرا حصہ میں محاکمہ ہے جو برہان قاطع اور مرزا غالب کی قاطع برہان کے متعلق ہے اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مرزا غالب کی رائے برہان قاطع کی نسبت اکثر غلط ہے۔ اور اس کی تائید فرہنگِ ناصری سے نہیں ہوتی۔ فرہنگ ناصری کا مؤلف ایرانی ہے اس کی رائے برہان قاطع

اور قاطع برہان دونوں سے زیادہ مستند ہو سکتی ہے۔"

پاکستان آنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں اطہر ہاپوڑوی کُل راجستھان اردو کنونشن میں شرکت کے لیے کراچی سے جے پور گئے۔ اُس وقت ان کی عمر ۸۶ سال تھی۔ وہ چندروز جے پور اور اپنے وطن ہاپڑ میں رہنے کے بعد کراچی واپس آ گئے۔ ۲۵ رفروری ۱۹۵۷ء کو اطہر ہاپوڑی دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ ذیل میں ان کے کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہر چیز میں یوں تو ترا جلوا دیکھا لیکن تجھے اب تک نہ خود آرا دیکھا

پایا نہ سراغ اِس چمن میں تیرا ڈالی ڈالی، پتّا، پتّا دیکھا

ہربار توبہ توڑکے کرتے ہوے کشی اطؔہر یہ دل لگی نہیں اچھی خدا کے ساتھ

میرے گھر غیر کو تم لیکے نہ مہماں ہوناا نہ پریشاں مجھے کرنا نہ پریشاں ہونا

شکر ہے کعبے سے بت خانے میں پہنچے اطؔہر آخری وقت میں لکھا تھا مسلماں ہونا

تکلیف مرض سے ملی راحت تجھے مرکر بنتی نہ اجل کاش مسیحا کوئی دن اور

مرنے کا ترے غم نہ اٹھاتے ترے ماں باپ توجانِ پدر رہتی جو زندا کوئی دن اور

مرجاتے ہم اطؔہر تو یہ غم کون اٹھاتا تقدیر میں لکھا تھا یہ جینا کوئی دن اور

نشاں کہاں اب دل حزیں کا رکھا نہ اس عشق نے کہیں کا
دھواں ہوں اک آہِ آتشیں کا نہ آسماں کا نہ زمیں کا

جسے فلک نے خراب رکھا مرے فشارلحد نے پیسا
وہ دور پہلے تھا آسماں کا یہ دور آیا ہے اب زمیں کا

یہ رعب تھا ان کا مجھ پہ اطؔہر کہ کہہ سکا کچھ نہ حالِ ابتر
سنایا ان کو فسانہ شب بھر کہیں کہیں سے کہیں کہیں کا

--••☆••--

اظہر قادری، پروفیسر

خاندانی نام ظہیرالدین محمد یحییٰ اور قلمی نام اظہر قادری تھا- اظہر قادری ۱۵؍دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کو فیض آباد یو پی کے تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے- ان کے والد کا نام کیپٹن عبدالصمد قمر صدیقی تھا- ان کے دادا دادی کا تعلق میرٹھ سے تھا اور نانا نانی فیض آباد کے رہنے والے تھے- حضرت عبدالقادر جیلانی کی نسبت سے وہ خود کو قادری لکھتے تھے- ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنی والدہ سے حاصل کی- اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے میٹرک پاس کیا- ۱۹۴۵ء میں اظہر قادری نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے اور سنہ ۱۹۵۰ء میں اول درجے میں ایم اے (اُردو) کیا-

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۵۰ء میں اظہر قادری ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے اور ڈھاکہ میں مستقل رہائش اختیار کر لی- ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے درس و تدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا اور سقوطِ ڈھاکہ تک سابق مشرقی پاکستان کے مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے- مشرقی پاکستان کے دوران وہ ناٹرے ڈیم کالج ڈھاکہ، ہولی کراس کالج فار ویمن ڈھاکہ، ڈھاکہ یونیورسٹی، سنٹرل ویمن کالج ڈھاکہ، جگن ناتھ کالج ڈھاکہ سے وابستہ رہے- انہوں نے پاکستان کونسل ڈھاکے میں بنگالیوں اور دیگر غیر ملکیوں کو اردو پڑھانے کے بھی فرائض انجام دیے- سقوط ڈھاکہ کے بعد اظہر صاحب کراچی آئے اور پھر سندھ یونیورسٹی جام شورو سے وابستہ ہو گئے- وہ کراچی یونیورسٹی، اردو آرٹس کالج اور جناح ویمن یونیورسٹی سے بھی منسلک رہے- اظہر قادری کو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا- انہیں اردو انگریزی مضامین لکھنے کا بھی بہت شوق تھا- ڈھاکہ کے بعد کراچی اور لاہور کے مختلف رسالوں نقوش، ساقی، ادب لطیف، افکار، وہمر، سیپ، ماہ نو اور جام نو وغیرہ میں چھپتے رہے ہیں- انگریزی مضامین میں اظہر نے فردوسی، شیکسپیئر، شاہ عبداللطیف پر لکھے-

پروفیسر اظہر قادری کا ابتدائی دور کلکتہ میں گزرا جو اس وقت علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ تھا- یہاں پر انہیں علامہ وحشت کلکتوی، ابوالکلام آزاد، آرزو لکھنوی، ناطق لکھنوی جیسے یگانہ روزگار اساتذہ کی

علمی ادبی مجلسوں کو قریب سے دیکھنے اوران سے مستفیض ہونے کا موقع ملا اور علامہ وحشتؔ کلکتوی سے انہوں نے شرف تلمذ بھی حاصل کیا۔ یہیں پر ان کی ادبی سرگرمیاں شعروشاعری سے شروع ہوئیں اور ساتھ میں نثر نگاری اور تنقید کو بھی اپنایا۔ انہوں نے انگریزی ادب' فلسفہ اور تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔

وحشتؔ کلکتوی نے پروفیسر اظہر قادری کی شاعری پر اپنے گراں قدر خیالات کا اس طرح اظہار کیا ہے:

''کچھ عرصے سے میں چاہتا تھا کہ پروفیسر اظہر قادری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں لیکن ایک بات ہمیشہ اس ارادے کی تکمیل میں مانع آتی تھی، وہ یہ کہ میرے اور اظہر قادری کے باہمی تعلقات سے میرے اوران کے جاننے والے واقف ہیں اور یہ اندیشہ لاحق ہوتا رہا کہ جو کچھ میں لکھوں گا محبت پر محمول کیا جائے گا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اظہار کلمتہ الحق سے اغماض کسی طرح مناسب نہیں۔ چنانچہ میں جو کچھ لکھوں گا بلاخوف تردید لکھوں گا۔

اظہر قادری نے متعدد ادبی مضامین پاکستان کے موقر رسالوں میں لکھے ہیں جو وقعت کی نظر سے دیکھے گئے ہیں۔ ان میں اکثر نقد و نظر کا پہلو واضح نظر آتا ہے۔ اصناف سخن میں اظہرؔ قادری نے فن رباعی کو اپنایا ہے اور اس صنف میں ایک نمایاں مرتبہ حاصل کیا ہے، ان کی رباعیوں میں ایک والہانہ کیف پایا جاتا ہے۔ جس کا اثر پڑھنے والوں کے دلوں پر گہرا ہوتا ہے۔''

اظہر قادری صاحب نے تنقید نگاری، ناول نویسی، شاعری اور افسانہ نگاری اور انگریزی زبان میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ رفیع احمد فدائی اور اشتیاق احمد شوق کے ساتھ مل کر ''سب رنگ'' نام کا ایک جریدہ نکالا۔ ماہنامہ ''جام نو'' کراچی کے ادارۂ تحریر میں معاون خصوصی کی حیثیت سے وابستگی رہی۔ سہ ماہی ترسیل (انٹرنیشنل) کے سرپرست کی حیثیت سے شریک رہے۔ ماہنامہ ''جام نو'' کراچی میں ہر ماہ نقد و نظر کے تحت آٹھ نو سال سے مستقل مضامین لکھتے رہے۔

اظہر قادری صاحب کی تصانیف: (۱) رضا علی وحشت (تنقید) ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ (۲) ایک کتے کی آپ بیتی (ناول) سنہ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ادب اور سائنس کے نام سے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ترتیب و تدوین کے مرحلے میں تھا لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔ ۲۹ نومبر ۲۰۰۳ء کو اظہر قادری زندگی کا سفر ختم کر کے ملک عدم رخصت ہو گئے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے پروفیسر اظہر قادری کی شاعرانہ تخلیق کا انداز ملاحظہ کیجیے۔

یہ اور بات کہ ہم تشنہ رہ گئے ورنہ ہمارے سر سے گھٹا بار بار گزری ہے
اس آرزو میں کہ اوروں کو کچھ قرار ملے تمام عمر مری بے قرار گزری ہے
لبھائے کیا مجھے اظہر بہار دو روزہ مری نگاہ سے تصویر یار گزری ہے

عشرت دنیا سے مجھ کو اب رہا کیا واسطہ آپ کا غم بن گیا ہے میرا جزو زندگی
گردشِ ایام کا مفہوم اس سے پوچھیے آنسوؤں کے درمیاں کاٹی ہو جس نے زندگی

دیر و حرم میں ذکر ترے آستاں کا تھا کیا جانے کیسے آگئی میری جبیں کی بات

کہتے نہیں کسی کو بھی بیگانہ دوستو ہے سب سے اپنا رشتۂ یارانہ دوستو
چاہو تو دل ہر اک کا محبت سے جیت لو دنیا میں کوئی بھی نہیں بیگانہ دوستو

ہم اہل دل ہیں ہمارا جو بس چلے اظہر تمام دہر کو خوشیوں سے ہمکنار کریں

پھر در و بام سے دھوپ ہٹنے لگی، صحن میں سائے ہر سو لپکنے لگے
رنگ لانے لگا نشۂ تیرگی، روشنی کے قدم پھر بہکنے لگے

کارواں رنگ و بو کا ہوا خیمہ زن، پھر گلستاں میں فصلِ بہار آ گئی
پھر صبا درد کی رقص کرنے لگی، زخم ہائے جگر پھر مہکنے لگے

چادرِ تیرگی میں شکن پڑ گئی، زلفِ شب رفتہ رفتہ سمٹنے لگی
ماہِ داغِ جگر جگمگانے لگا، آنسوؤں کے ستارے چمکنے لگے

جب بھی لائی صبا بوئے زلفِ صنم، جب بھی آئی مجھے یادِ روئے صنم
زخم ہائے جگر خون دینے لگے، رخ پہ اشکوں کے گوہر ڈھلکنے لگے

پھر مرے دل سے غم نے نچوڑا لہو، عیش کا پھر ہے ساماں بہم آج شب
پھر صراحی سے سرخی چھلکنے لگی، جام پھر بزمِ مئے میں کھنکنے لگے

یاد آئی کسی کی شب ہجر میں لیکے اظہر پیامِ نشاط و طرب
ساز چھڑنے لگے، بین بجنے لگی، ڈھول گیتوں کی لے پر کھنکنے لگے

---••☆••---

افتخار احمد عدنی

افتخار احمد عدنی ۲۷/اپریل سنہ۱۹۲۱ء کو میرٹھ کے علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ برصغیر کے معروف شاعر شیفتہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد نواب محمد اسمٰعیل خاں کا شمار میرٹھ کے معزز و معتبر مسلم رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ افتخار عدنی کے برادر بزرگ جے اے مدنی حکومت پاکستان میں ڈپٹی سیکریٹری ورکس، جوائنٹ سیکریٹری، کمشنر کراچی اور پشاور، چیئرمین واپڈا مشرقی پاکستان اور متعدد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔

افتخار عدنی نے ابتدائی تعلیم کے بعد فیض عام ہائی اسکول میرٹھ سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۲ء میں انہوں نے میرٹھ کالج سے بی اے اور ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (فارسی) کے امتحانات پاس کیے۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو بمبئی میں اپنے ماموں واجد محمود کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک وہ بمبئی میں رہے اور یہیں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ادب لطیف میں ان کے مضمون "گیرودار" سے ہوا۔ افتخار عدنی ترقی پسند مصنفین کے اجتماعات میں دلچسپی لیتے اور باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ بمبئی کے دورانِ قیام میں ہی ان کے ظ انصاری سے تعلقات استوار ہوئے جو ان کی وفات تک قائم رہے۔

۱۹۴۸ء میں عدنی صاحب ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ ابتدا میں وہ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی سے منسلک رہے۔ بعد ازاں اپنے برادر بزرگ کے اصرار پر ۱۹۵۰ء میں افتخار سی ایس پی کے امتحان میں شریک ہوئے۔ اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد وہ راولپنڈی میں اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وہ سکھر اور میانوالی میں ایس ڈی ایم اور لاہور میں چیف سیکریٹری پنجاب کے دفتر میں انڈر سیکریٹری رہے۔ ۱۹۵۶ء میں ڈیرہ غازی خاں میں ڈپٹی کمشنر رہے اور پھر ایڈیشنل سیٹلمنٹ کمشنر ہو کر لاہور چلے گئے جہاں دو سال تک مہاجرین کی آبادکاری کے لیے خدمات انجام دیں۔ عدنی صاحب نے ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۶ء تک بحیثیت ڈپٹی سیکریٹری

فنانس، جوائنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز، ڈائریکٹر غلام محمد بیراج، ڈپٹی سیکریٹری ایڈمنسٹریشن، پلاننگ کمیشن اور ڈائریکٹر سیکریٹریٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کراچی کے اہم عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ ۷۸ء میں نیپا کراچی کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور یہیں سے ۸۶ء میں ریٹائر ہوئے۔

افتخار عدنی اتنے اہم اور ذمہ دار عہدوں پر رہنے کے باوجود ادبی سرگرمیوں میں برابر شریک رہے۔ ڈیرہ غازی میں ڈپٹی کمشنری کے دوران میں انہوں نے پاک وہند کا یادگار مشاعرہ منعقد کرایا۔ اس مشاعرے میں برصغیر کے اہم شعراء نے شرکت کی جس میں حضرت جگر مراد آبادی بھی تشریف لائے تھے۔ کراچی میں نیپا کو ادبی وثقافتی تقاریب کے لیے اہم مرکز بنانا عدنی صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ یہاں کے سازگار ماحول میں غالب کی فارسی غزلوں کا ترجمہ کرنے کا موقع ملا اور یہ کام آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد افتخار احمد عدنی نے "اک محشر خیال" کے عنوان سے اپنی پرانی تحریروں کو ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ افتخار احمد عدنی ۹ر اکتوبر ۲۰۰۴ء کو میرٹھ کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے ایک جلسے کی تقریب میں صدارت کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اسی دن رات کو دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

ظ انصاری سے افتخار عدنی کے گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے اپنے مجموعہ مضامین "اک محشر خیال" کا انتساب بھی ظ انصاری کے نام کیا۔ اُن کی وفات سے متاثر ہو کر عدنی صاحب نے ماہنامہ "قومی زبان" میں اپنی یادداشتیں جو ظ انصاری کے علاوہ جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی اور بابا ذہین شاہ تاجی سے متعلق ہیں، قلم بند کرنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ افتخار عدنی صاحب کا ایک اہم کام غالب کی فارسی شاعری کا اُردو ترجمہ ہے جو انہوں نے سنہ ۱۹۹۵ء میں "غالب شناسی کے کرشمے" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ سنہ ۲۳۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کتاب میں غالب کی فارسی غزلوں کا اُردو ترجمہ افتخار صاحب نے اور انگریزی ترجمہ رالف رسل نے کیا ہے۔ ان کی یادداشتوں کا مجموعہ "رنگارنگ بزم آرائیاں" زیر طبع ہے۔ اسی طرح غالب کے ایک ہزار فارسی اشعار اردو ترجمہ "نقشِ ہائے رنگ رنگ" طباعت کے مراحل میں ہے۔ عدنی صاحب کا کیا ہوا غالب کے فارسی کلام کا اُردو ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

اے بہ خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا　　　باہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا

ہو وہ خلایا ملا، خو تری ہنگامہ را
سب سے تری گفتگو، امر میں سب سے جدا

شاہد حسن ترا در روش دلبری
طرّہ پرخم صفات، موئے میاں ماسوا

شاہدِ حسنِ ازل تیری عجب دلبری
طرّہ صفاتِ قدیم، موئے کمر ماسوا

دیدہ وران را کند دید تو بینش فزون
از نگہِ تیز رو گشتہ نگہ توتیا

بینشِ دیدہ دراں دید سے تیری فزوں
تیز نگاہی سے ہے ان کی نظر توتیا

آب نہ بخشی بزور خون سکندر بدر
جاں نپذیری بہ ہیچ نقد خضر نارد؛

آبِ بقا کے قریں، خون سکندر بدر
ہدیۂ جاں نا پسند، نقد خضر ناروا

بزم ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب
ساز ترا زیر وبم واقعۂ کربلا

شمع تری بزم کی خستگی بو تراب
نغمہ ترے ساز کا واقعۂ کربلا

خلد بہ غالب سپار زانکہ بدران روضہ در
نیک بود عندلیب خاصہ نو آئین نوا

زیب چمن کے لئے، خلد میں غالب کو رکھ
چاہیے اک عندلیب اس میں خوش آئیں نوا

---••☆••---

افتخار اجمل شاہیؔن

افتخار اجمل نام اور تخلص شاہیؔن کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء کو شیخ پورہ ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم مولوی عبدالحنان صاحب بڑے معروف عالم تھے۔ شاہیؔن نے میٹرک تک کی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول شیخوپورہ سے حاصل کی اور وہیں سے سنہ ۱۹۵۶ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد شیخ پورہ سے پٹنہ (عظیم آباد) آ گئے۔ افتخار اجمل شاہیؔن صاحب نے سنہ ۱۹۵۸ء میں بی این کالج پٹنہ سے انٹر اور سنہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء میں جامعہ پٹنہ سے فارسی میں بی اے آنرز اور ایم اے کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۶۳ء کو وہ مشرقی پاکستان آ گئے اور بسلسلہ ملازمت چاٹگام اور ڈھاکے میں مقیم رہے۔ یہاں آ کر شاہیؔن صاحب درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے اور اپنی تعلیم کو بھی مزید جاری رکھا۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) بھی کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۷۲ء میں سی ٹی اور ۱۹۷۳ء میں جامعہ کراچی سے بی ایڈ کیا۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں حکومت ایران نے انہیں فارسی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے اسکالرشپ دی لیکن والدین کی بیماری کی وجہ سے وہ ایران نہیں جا سکے۔

جولائی سنہ ۱۹۶۵ء میں افتخار صاحب سنٹرل گورنمنٹ اسکول میں بحیثیت سینئر ٹیچر مقرر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں ان کا سروس کمیشن کے ذریعہ بحیثیت لکچرار اردو انتخاب ہوا۔ سنہ ۱۹۶۷ء سے سنہ ۱۹۷۱ء تک وہ گورنمنٹ کالج آف کامرس، چاٹگام میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ اور پھر سقوطِ ڈھاکہ کے بعد افتخار کراچی آ گئے اور جامعہ ملیر ٹیچر ٹریننگ کالج میں ان کی تقرری ہوئی۔ سنہ ۱۹۷۶ء میں وہ پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ دوبارہ اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ پہلی تقرری سراج الدولہ گورنمنٹ کالج میں ہوئی اس کے بعد ڈی جے سندھ گورنمنٹ کالج میں تبادلہ ہو گیا اور یہیں سے مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ۹ رفروری سنہ ۲۰۰۱ء کو افتخار اجمل شاہیؔن ریٹائر ہو گئے۔

شاہیؔن کو ادب سے لگاؤ تو طالب علمی سے تھا لیکن تخلیقی سفر کا آغاز سنہ ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ ابتدا میں مضامین لکھے اور ہندی انگریزی سے تراجم کیے۔ سنہ ۱۹۶۲ء سے ان کے مضامین باقاعدہ چھپنا شروع

ہوئے-شاہین صاحب نے دوسو سے زائد پاک وہند کے مقتدر ادبی رسالوں میں مضامین' مقالے لکھے اور اس طرح کے بہت سے ادبی وتنقیدی مجموعے زیر ترتیب ہیں-نعتوں کا مجموعہ ''عقیدت کا سفر'' شائع ہو چکا ہے- شاعری کا بھی ایک مجموعہ ''شاعری کا سفر'' کے نام سے زیر ترتیب ہے-جدید شاعری کا انسائیکلو پیڈیا (مرتبہ شہزاد محمود) میں ان کی چھ غزلیں شامل ہیں-شاہینؔ کی ایک غزل اور چند نعت کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

شاد ہم کو جو خوبرو کرتے
ہم بھی جینے کی آرزو کرتے

اس کے کہنے میں آگئے کیوں تم
بات ہم سے تو روبرو کرتے

تم بھی پڑھنے لگے نمازِ عشق
پہلے لازم یہ تھا وضو کرتے

اس کی چاہت نکال دی دل سے
دل کو کب تک لہولہو کرتے

کھیلتے تھے جنوں میں دامن سے
چاک کرتے کبھی رفو کرتے

ہم پہ ہی فرض جانثاری تھی
ہم نہ کرتے تو کیا عدو کرتے

کشتۂ آرزو ہیں ہم شاہینؔ
لوگ کیسے ہیں آرزو کرتے

عنایت کی ہم پہ نظر بن کے آئے   کڑی دھوپ تھی وہ شجر بن کے آئے
گئی ظلمتِ شب وہ پھیلا اجالا   جہاں میں پیامِ سحر بن کے آئے

--••☆••--

افتخار عارف

برصغیر کے معروف شاعر افتخار عارف ۲۱ر مارچ ۱۹۴۳ء کو لکھنؤ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں ہوئی، پھر دو ایک سال شیعہ اسکول لکھنؤ میں پڑھا۔ اس کے بعد جبلی اسکول اور جبلی کالج میں پڑھا۔ جبلی کالج اس زمانے میں بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ علامہ اطہر علی تلہری، حامداللہ افسر میرٹھی، علی عباس حسینی جیسے اساتذہ اس ادارے سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ میٹرک کرنے کے بعد افتخار عارف نے انٹرمیڈیٹ گورنمنٹ کالج لکھنؤ اور پوسٹ گریجویٹ لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔ جنرلزم کا ایک کورس انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی سے بھی کیا۔ افتخار عارف بچپن ہی سے بڑے ذہین اور پڑھنے لکھنے کے بے حد شوقین رہے ہیں۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں نصابی کتابوں کے علاوہ غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ ان کا بہترین مشغلہ رہا ہے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر افتخار عارف ۱۹۶۵ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ یہاں آ کر وہ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۷ء تک وہ ریڈیو پاکستان میں بیرونی نشریات کے نیوز کاسٹر رہے۔ اس کے بعد افتخار صاحب پاکستان ٹیلی ویژن سے منسلک ہوگئے۔ یہاں پر انہوں نے پروڈیوسر، سینئر پروڈیوسر، اسکرپٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ انہوں نے ریڈیو ٹیلی وژن سے پروگرام بھی پیش کیے اور خبریں بھی پڑھیں۔ ٹیلی وژن پروگرامز میں ''کسوٹی'' کے نام سے ان کا بہترین اور لاجواب پروگرام تھا جو علمی اور بڑا معلوماتی پروگرام تھا۔ اس پروگرام کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہر گھر کے بڑے سے چھوٹے افراد اسے بڑی پابندی سے دیکھتے تھے۔

۱۹۷۷ء میں ریڈیو، ٹیلی وژن سے استعفیٰ دے کر عارف صاحب بی سی سی آئی بنک لندن سے وابستہ ہوگئے جہاں وہ ۱۹۸۰ء تک بحیثیت افسرِ تعلقات عامہ رہے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک بی سی سی آئی کے نمائندے کے طور پر ''تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن'' لندن میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۰ء تک انہوں نے اُردو مرکز لندن میں بحیثیت ایگزیکٹو انچارج خدمات بھی انجام دیں۔ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۵ء تک وہ

ڈائریکٹر جنرل اکادمی ادبیات پاکستان (وزارت تعلیم پاکستان) اور مجلّہ اکادمی سہ ماہی ''ادبیات'' (اُردو) اور ششماہی جریدہ ''پاکستانی لٹریچر'' (انگریزی) کے مدیر منتظم رہے۔ سنہ ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۰ء تک انہوں نے مقتدرہ قومی زبان (کیبنٹ ڈویژن، حکومت پاکستان) میں بحیثیت چیئرمین خدمات انجام دیں اور آجکل وہ چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان (وزارتِ تعلیم) ہیں۔

افتخار عارف نے لکھنؤ میں آنکھ کھولی تو اپنے اطراف شعر وسخن کا چرچا دیکھا۔ ایسے ماحول کا اثر انداز ہونا ایک فطری عمل ہے۔ شعر کہنے کا چسکا انہیں مجلسوں سے لگا۔ افتخار عارف کا پہلا مجموعہ ''مہر دونیم'' کے نام سے پہلے کراچی پھر لندن اور دہلی سے شائع ہوا۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ افتخار عارف صاحب کو اُن کی علمی ادبی خدمات پر متعدد اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں انہیں آدم جی ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں عالمی اُردو کانفرنس دہلی کی جانب سے فیض انٹرنیشنل ایوارڈ برائے شاعری دیا گیا۔ ۱۹۸۹ء میں صدارتی ایوارڈ برائے حُسن کارکردگی اور ۱۹۹۴ء میں بابائے اُردو ایوارڈ برائے شاعری سے نوازا گیا۔

افتخار عارف اس سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں جو شعر وسخن میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے بھی نظم ونثر دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کی تصانیف میں ''مہر دونیم'' (۱۹۸۴ء) ''بارہواں کھلاڑی (۱۹۸۹ء)'' ''حرف باریاب'' (۱۹۹۴ء) ''جہانِ معلوم (۲۰۰۳ء) شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا کلام ملاحظہ کیجیے۔

نئے سکندر ہیں اور ظلمات کا سفر بھی نیا نیا ہے
فریب کی منزلوں میں انداز حیلہ گر بھی نیا نیا ہے

کڑی کمانوں کے تیر بے اعتبار ہاتھوں میں آگئے ہیں
دعا نئی تھی سو اب یہ خمیازۂ اثر بھی نیا نیا ہے

کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
جہان رزق میں توقیر اہل حاجت کیا

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

بادل بادل گھومے پر گھر لوٹ کے آنا بھولے ناں
اللہ سائیں ڈار سے بچھڑے کونج ٹھکانہ بھولے ناں

جب کبھی اجلے اجلے دن پر ٹوٹ کے برسے کالی رات
ایک اپنی بستی کے نام کا دیا جلانا بھولے ناں

امید و بیم کے محور سے ہٹ کے دیکھتے ہیں
ذرا سی دیر کو دنیا سے کٹ کے دیکھتے ہیں

بکھر چکے ہیں بہت باغ و دشت و دریا میں   اب اپنے حجرۂ جاں میں سمٹ کے دیکھتے ہیں

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے

یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دن
جو تھک گیا ہے تو اب اس کو مختصر کردے

میں زندگی کی دعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہو سکے تو دعاؤں کو بے اثر کردے

ہوا کا زہر جڑوں تک پہنچ چکا ہے تو پھر
مری ہری بھری شاخوں کو بے ثمر کردے

ستارۂ سحری ڈوبنے کو آیا ہے
ذرا کوئی میرے سورج کو باخبر کردے

قبیلہ وار کمانیں کڑکنے والی ہیں
مرے لہو کی گواہی مجھے نڈر کردے

مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کردے

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اجاڑ دے مری مٹی کو دربدر کردے

--••☆••--

افسر ماہ پوری

اصل نام ظہیر عالم صدیقی ہے، قلمی نام افسر ماہ پوری اور تخلص افسر ہے۔ یکم دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء کو موضع ماہ پور، ضلع چھپرا (حال ضلع سیوان)، صوبہ بہار بھارت میں پیدا ہوئے۔ ماہ پور کے پہلو میں دآہا ندی بہتی ہے۔ افسر ماہ پوری کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے متصل گاؤں فرید پور میں ہوئی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے ان کے والد مولوی عبدالرحمٰن نے کلکتہ بلا لیا لیکن وہاں پڑھائی کا ماحول بالکل نہیں تھا۔ چنانچہ کافی مدت تک ان کی پڑھائی کا بندوبست نہیں ہوسکا جس کا انہیں بہت دُکھ تھا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں افسر ماہ پوری کو کڑایا مسلم بوائز اسکول میں داخل کرایا گیا لیکن دو سال بعد ہی اسکول کو خیر باد کہنا پڑا۔ پھر نجی طور پر نصابی کتابیں مولوی عبدالحمید صاحب سے پڑھیں۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان دیا اور درجۂ اوّل میں کامیاب ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی بنگال سیکریٹیریٹ (رائٹرس بلڈنگ) میں ملازم ہوگئے۔ ان کی اس ملازمت کا سلسلہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ۱۰ رجنوری سنہ ۱۹۷۴ء کو حکومتِ بنگلہ دیش کے تحت اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد اپنے خاندان کو لے کر کراچی آ گئے۔

تقسیم سے قبل سنہ ۱۹۳۵ء میں ان کے رشتے کے چچیرے بھائی اختر ماہ پوری تعلیمی سلسلے میں کلکتہ آئے اور افسر ماہ پوری کے گھر ٹھہرے۔ وہ نہایت خوش فکر شاعر اور شگفتہ نگار ادیب تھے۔ انہوں نے افسر کا رجحان شعر و سخن کے طرف دیکھا تو ان کا تخلص افسر تجویز کیا تھا۔ لیکن ان کو شعر و شاعری سے زیادہ دلچسپی نثر نگاری سے تھی۔ چنانچہ سنہ ۳۷ - ۱۹۳۶ء میں انہوں نے اپنی ادبی زندگی نثر نگاری سے شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے افسر ماہ پوری کا یہ جنون اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

افسر ماہ پوری نے ۱۹۳۶ء میں رومانی افسانے لکھنے کی ابتدا کی، پھر بچوں کی ایک نظم لکھ کر باقاعدہ نظمیں لکھنے کا آغاز کیا۔ افسر نے شعر و ادب کی کئی سمتوں میں اپنا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ رومانی افسانے لکھے،

اردو، انگریزی میں تنقیدی مضامین تحریر کیے نظمیں اور غزلیں لکھیں۔

مجلہ غبارِ ماہ میں ڈاکٹر حنیف فوقؔ لکھتے ہیں:

''افسرؔ ماہ پوری سابق مشرقی پاکستان میں اہم، ادبی مقام رکھتے تھے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہاں کی ادبی فضا کی تعمیر میں اُن کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں اردو کے ان باشعور ادیبوں میں سے تھے جو ادب کو پیغامِ محبت سمجھتے تھے۔ اردو کے ساتھ ساتھ بنگلا ادب سے واقفیت اور دونوں زبانوں کی آ گہی نے انہیں خیر سگالی کا جوہر شناس اور خوش مشربی کا جواہر تراش بنا دیا تھا۔ افسرؔ ماہ پوری نے نذرالاسلام کی مسلم تہذیب سے مناسبت رکھنے والی نظموں کا منظوم ترجمہ ''جامِ کوثر'' کے نام سے کیا تھا جو بنگالی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوا۔''

ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف فوقؔ مزید لکھتے ہیں:

افسرؔ ماہ پوری کے اشعار میں دنیا اور نیرنگیٔ دنیا کا جو مشاہدہ ملتا ہے، اس میں چاند کی کالی رات سے لڑنے کے منظر کے ساتھ ساتھ بھنور میں ناؤ کے ڈوبنے اور ناخدا کے پُر معنی سکوت کے مناظر بھی شامل ہیں۔ افسرؔ ماہ پوری کے اشعار کا بنیادی الم ہی یہ ہے کہ محبت کے دیوں کو ہوا نے بھی بجھایا ہے اور ان کے بجھانے میں انسان بھی شریک رہا ہے۔''

۵ر فروری ۱۹۹۵ء کو افسرؔ ماہ پوری ملک عدم رخصت ہوگئے۔ نارتھ کراچی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ ان کی تصانیف میں (۱) ''غبارِ ماہ'' غزلوں کا پہلا مجموعہ، ''نگارِ ماہ'' (نظمیں)، (۳) ''جامِ کوثر'' (۴) ''طور سے حرا تک'' (حمد ونعت) اور قاضی نذرالاسلام کی اسلامی نظموں کے منظوم تراجم وغیرہ شامل ہیں۔ افسرؔ ماہ پوری کے کلام سے منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ان کی یادوں سے سکوں ملتا ہے دل کو کتنا
کھنک سی رہتی ہے سینے میں ایک مدت سے
کچھ تو ہوجائے اجالا شب تنہائی میں
ہم کہاں ہوں گے نہ جانے اس تماشگاہ میں
جو ساتھ چل رہا تھا ، اچانک بچھڑ گیا
دیکھنا یہ ہے کہ محفل میں محبت کے دیے

پیڑ اوجھل ہے مگر چھاؤں گھنی ہے کتنی
کسی نے دیکھا تھا ہم کو کبھی محبت سے
ان کی زلفوں میں سجاتے ہیں ستارے بیٹھے
کس تماشائی سے پہلے، کس تماشائی کے بعد
پھر شہر کی گلی گلی ہم جھانکتے رہے
کتنے انسان نے بجھائے ہیں، ہوا نے کتنے

لا ساقیا ایاغ کہ اب شام ہو چلی
روشن کریں چراغ کہ اب شام ہو چلی
آوارہ ہم ہیں عرصۂ صحرا میں اور طیور
جاتے ہیں سوئے باغ کہ اب شام ہو چلی
آتی ہے ان کی یاد کہ دن ہو چکا تمام
جلتے ہیں دل کے داغ کہ اب شام ہو چلی
ستائیس تھوڑی دیر کہ ملنا محال ہے
اس کا کہیں سراغ کہ اب شام ہو چلی

افسر ماہ پوری کی ایک نظم ''زرد پتے'' جو انہوں بنگلہ دیش سے ہجرت کے بعد لکھی:

یہ زرد پتے،
بچھڑ کے شاخوں کی انجمن سے،
بھٹکتے پھرتے ہیں صحرا صحرا،
تڑپتے پھرتے ہیں قریہ قریہ،
سسکتے پھرتے ہیں کوچہ کوچہ،
نہ ان کا دنیا میں کوئی مولا' نہ کوئی ملجا' نہ کوئی ماویٰ،
خزاں کی سفاکیوں سے لرزاں، خموش گریاں،
سموم وصر صر کی ٹھوکروں سے،
جہاں میں ہر سو بکھر گئے ہیں،
چمن کے دل سے اُتر گئے ہیں
شفق کی قندیل بجھ چلی ہے
اُفق پہ چھانے لگا اندھیرا
تھکے پرندوں کے قافلے بھی
رواں دواں سوئے گلستاں ہیں
مگر یہ بے خانماں مسافر.......... یہ زرد پتے
سوال کرتے ہیں ہر شجر سے
کہ ہم کہاں ہیں؟.......... کہیں ہمارے بھی آشیاں ہیں؟

---••☆••---

افضل صدیقی

محمد افضل حسین صدیقی اصل نام تخلص افضل اور قلمی نام افضل صدیقی ہے۔ ۳؍مئی ۱۹۳۰ء کو دہلی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دتی کی جامع مسجد کے پیچھے سرکاری مڈل اسکول میں ہوئی۔ یہاں انہوں نے آٹھویں کلاس تک پڑھا۔ ۱۹۴۱ء میں دریا گنج کے اینگلو سنسکرت وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ یہ ہندوؤں کا اسکول تھا جہاں مسلمان لڑکے صرف چار تھے جن میں ایک افضل تھے۔ افضل کو مضمون نگاری کا شوق یہیں سے شروع ہوا تھا۔ ان کے مضامین اتنے اچھے ہوتے تھے کہ انہیں انعامات سے بھی نوازا گیا۔ بحث ومباحثہ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ میٹرک کے بعد ان کی تعلیم دو سال تک منقطع رہی جس کا سبب ناساعد حالات تھے۔ والد کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ دو سال کے بے کار دن انہوں نے اُردو بازار مچھلی والان میں گزارے۔ دتی کی جامع مسجد اسی علاقے میں واقع ہے۔ اس جگہ بہت سے نامور ادیب، شاعر اور دانشور رہتے تھے جن میں سائل دہلوی، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر وغیرہ کے نام بہت مشہور ہیں۔ افضل صدیقی نے ان سب لوگوں کو قریب سے دیکھا اور ان کی ادب پرور فضا سے متاثر ہوتے رہے۔ فرصت تو تھی ہی شعر بھی کہنے لگے۔ ان ہی دنوں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا جس کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ معاشی حالات بھی ابتر تھے لہٰذا کم عمری میں ملازمت کی تلاش کرنے لگے۔

دوسری جنگِ عظیم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور انگریز کا فوجی نظام بڑے زوروں پر تھا۔ طرح طرح کی اسامیاں نکل رہی تھیں۔ چنانچہ افضل صدیقی کو بھی جی ایچ کیو کے پبلیکیشنز ڈائریکٹریٹ میں کلرکی کی جگہ مل گئی۔ ایک سو پانچ روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ اس ملازمت کو دو ہی سال ہوئے تھے کہ پاکستان بن گیا اور بھارت میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ سیکڑوں مسلمان بے دردی سے کاٹ دیے گئے۔ خاص کر دتی میں جو خوں ریزی ہوئی اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس پریشانی کے عالم میں مسلمان پاکستان بھاگنے لگے۔ افضل صدیقی کا خاندان بھی لُٹتا پٹتا بالآخر ۱۰؍نومبر ۴۷ء کو پاکستان پہنچ گیا اور لاہور میں مقیم ہوا۔

افضل کے والد نے لاہور میں سگریٹوں کی ایجنسی کھولی-افضل صدیقی باقاعدہ پاکستان آپٹ کر کے آئے تھے-چنانچہ یہاں آنے کے بعد انہیں پاکستانی فوج کے مرکز راولپنڈی جانا پڑا-لیکن جلد ہی فوج کی نوکری سے اکتا گئے اور استعفیٰ لکھ کر دفتر کے کسی آدمی کو پکڑا دیا اور کہا میرے لاہور چلے جانے کے بعد دفتر میں داخل کرنا-نہ معلوم اُس شخص نے ان کا استعفیٰ پیش کیا یا نہیں-جب افضل لاہور پہنچے تو والد سے کہا کہ میں چھٹی پر آیا ہوں-کچھ دنوں بعد فوج سے غیر قانونی بھاگنے کا انہیں نوٹس ملا جس کے بعد یہ بہت پریشان رہے-بہر حال بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اس پریشانی سے ان کی جان چھوٹ گئی- فوج کی نوکری چھوڑنے کے بعد افضل روزنامہ ''امروز'' لاہور میں نوآموز صحافی کی حیثیت سے کام کرنے لگے-''امروز'' کے علاوہ انہوں نے اور بھی مختلف اخباروں میں کام کیا-ان ہی دنوں کراچی میں ایک نمائش لگی جسے دیکھنے کے لیے افضل صاحب کراچی آئے-یہاں چند دنوں کے لیے آئے تھے لیکن وہ کئی ہفتوں تک ٹھہرے رہے-اب انہیں پڑھنے لکھنے کا شوق بھی ہو چلا تھا-مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرنے لگے-پاکستان چوک میں انجمن ترقی اُردو کراچی کی شاخ کا دفتر تھا-جہاں ایک جلسہ منعقد ہونا تھا-اس جلسے میں افضل صدیقی کو بھی مضمون پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا-جلسے میں جب افضل نے مضمون پڑھا تو بہت پسند کیا گیا-اس جلسے میں زیڈ اے بخاری بھی موجود تھے-انہیں بھی افضل صدیقی کا مضمون پسند آیا-اسی موقع پر بخاری صاحب نے ان سے پوچھا کیا کرتے ہو-انہوں نے کہا کہ بیکار ہوں-بخاری صاحب نے کہا' ریڈیو میں کام کرو گے-افضل نے حامی بھر لی-اس طرح یہ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے-پھر ریڈیو سے ایسی وابستگی ہوئی کہ نامور صحافی ہونے کے باوجود وہ ریڈیو ٹی وی پر بھی پابندی سے کام کرتے رہے-

ریڈیو سے منسلک ہونے کے بعد انہیں تلفظ ٹھیک کرنے کے ساتھ بچوں کے سیکشن اسکرپٹ لکھنے پر بھی لگا دیا گیا-پھر بچوں کی دنیا سے قدم اٹھایا تو بڑوں کی طرف آ گئے-بخاری صاحب نے ایک فیچر ''تازہ بتازہ'' شروع کرنا چاہا جسے افضل صدیقی کو لکھنا تھا لیکن یہ پروگرام کھٹائی میں پڑ گیا البتہ اسی نوعیت کا دوسرا پروگرام ''دیکھتا چلا گیا'' شروع کیا گیا جسے افضل صدیقی لکھتے تھے-اسی طرح انہوں نے بچوں کے لیے لوریاں اور گیت لکھے-ریڈیو اسٹیشن سے اشتین قطب صاحب نے ایک نیا سلسلہ ''حامد میاں کے ہاں'' شروع کیا اس پروگرام سے بخاری صاحب کچھ مطمئن نہیں ہوئے-لہٰذا انہوں نے اس پروگرام

میں ایک کردار کا اضافہ کر کے بہت دلچسپ بنادیا- یہ کردار ایک ایسے نوجوان سے کرایا جائے جو تعلیم سے کورا ہو اور حد درجہ بے وقوف، مگر اپنے آپ کو بڑا ہوشیار سمجھتا ہو' گھر والوں کا چہیتا ہو' خود بھی گھر والوں سے پیار رکھتا ہو' لیکن بڑے حماقت مآب انداز میں- یہ کردار حامد میاں کے سالے انجم کا تھا- اس کردار کے لیے بخاری صاحب کی نظر انتخاب افضل صدیقی پر پڑی- ابتدا میں تو افضل اس کردار کے لیے تیار نہیں تھے لیکن بعد میں وہ تیار ہو گئے- اس کردار نے افضل صدیقی کو ایسی شہرت بخشی کہ وہ ریڈیو کے بہت بڑے فنکار کہلانے لگے- بعد ازاں انہوں نے صحافت کو اپنا پیشہ بنایا اور روزنامہ ''امن'' کراچی میں بحیثیت مدیر فائز ہوئے- شاعری کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح اور انشائیہ لکھتے تھے- اس کے علاوہ وہ ایک اچھے مترجم بھی تھے- انہوں نے ناروے کے معروف ادیب زیتر ے ہوم کے ڈرامے کا اردو میں ترجمہ کیا اور بچوں کی لوریاں' مجموعے کے قطعات لکھے جو اخبار' رسائل اور جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے- ۱۶/اپریل ۱۹۹۲ء کو افضل صدیقی دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے- اُن کا کلام ملاحظہ کیجیے

نئے چراغ جلاؤ وفا کی راہوں میں
بڑے حسین بلاوے ہیں اُن نگاہوں میں

ضرور کوئی بہاروں کا قافلہ ہوگا
غبار اُڑ تو رہا ہے خزاں کی راہوں میں

تری نظر کا سہارا نہ آرزو کا فریب
بہت دنوں سے اکیلا ہوں غم کی راہوں میں

کہیں قریب کہیں دور ہو گئے افضلؔ
وہ زندگی سے مری زندگی کی راہوں میں

---••☆••---

اقبآل حیدری

اقبآل حیدری سنہ ۱۹۲۹ء میں اجین کے ایک علمی ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید رحمت علی حیدری کا شمار شہر کے معزز و معتبر لوگوں میں تھا۔ اقبال حیدری کو بچپن ہی سے علم و ادب سے گہرا شغف تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم اُجین میں ہوئی۔ دربار ہائی اسکول رتلام سے ۱۹۴۵ء میں میٹرک اور مادھو کالج اُجین سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ تقسیم کے بعد وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ یہاں آ کر انہوں نے ایس ایم کالج کراچی سے سنہ ۱۹۵۰ء میں بی اے (آنرز) کیا اور جامعہ کراچی سے سنہ ۱۹۵۳ء میں ایم اے (اکنامکس) کی سند حاصل کی۔ اقبال حیدری کا شمار ملک کے ممتاز و معتبر اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔

اقبآل حیدری کے ذوقِ سخن کی ابتدا اُجین ہی میں ہو چکی تھی جب وہ ابھی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہ اقبآل، ٹیگور، جوشؔ ملیح آبادی اور سیمابؔ سے بہت متاثر تھے اور یہ ان کے پسندیدہ شعراء تھے۔ پاکستان آنے کے بعد ان کی پہلی نظم بعنوان ''کوششِ ناکام'' رسالہ ''ساقی'' ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترجمے بھی کئے اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کی پہلی تخلیق آلیور گولڈ اسمتھ کی طویل نظم (Deserted Village) کا ترجمہ تھی جو اجین کے ہندی رسالہ ''اگامیکل'' میں شائع ہوئی۔ ان کے افسانے رسالہ ادب، جامِ نو اور افکار میں شائع ہوتے رہے۔ بحیثیت صحافی وہ اردو کے کئی ادبی ماہناموں سے بھی منسلک رہے ہیں جن میں ماہنامہ ''ادب'' اور ''جامِ نو'' کی ادارت کو مقبولیت رہی۔ دستوفسکی کے مشہور ناول (Crime & Punishment) ''کرائم اینڈ پنشمنٹ'' کا اردو ترجمہ ''جرم و سزا'' کے نام سے کیا جو بائیس اقساط میں رسالہ ''جامِ نو'' میں شائع ہوا اور اب کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ادب کے علاوہ ان کا ایک اور اہم موضوع اکنامکس ہے۔ اس مضمون پر انگریزی میں تین کتابیں ''اسٹاک ایکسچینج گائیڈ آف پاکستان''، ''مارکیٹ کنڈیشن اِن پاکستان'' اور ''کارپوریٹ کمپنیز ایٹ اے گلانس'' کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اقبالؔ حیدری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر منظور حسین شورؔ لکھتے ہیں:

''اُن کی شاعری کے تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شعور کا دھارا کسی خصوصی سمت میں نہیں بہتا، بلکہ دو رُخ پر بہتا ہے ایک رُخ کو آپ اُن کا تغزل کہہ لیجئے اور دوسرے رُخ کو جو شاعر کی ذات سے نہیں، بلکہ اُس کے ماحول کے مشاہدات سے وابستہ ہے اس کو اصطلاحاً نظم کہا جاسکتا ہے- جہاں تک اقبالؔ حیدری کے تغزل کا تعلق ہے اُن کی غزل کی ریڑھ کی ہڈی اس کی واردات اور کیف وکم کی سچائی ہے، اُن کی غزل میں محبت کی پاکیزگی اور نفس کی حس شرافت کا شدید احساس ملتا ہے-''

ادبی دنیا میں اقبالؔ حیدری کا نام بڑا معروف ہے- ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے ادبی اثاثہ میں اضافہ ہوا ہے- ان کا پہلا مجموعہ ''شہرِ بے نوا'' سنہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا- ان کی تصانیف میں ایک تصنیف ''فروغِ فرغ زاد'' بھی شامل ہے- ان کے کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اُس کوچہ سے گزرو ہو نہ تم اس سے ملو ہو
اِس شہر میں کیسے گذر اوقات کرو ہو

یا ہم سے گھڑی بھر کی جدائی تھی قیامت
یا ہم سے گھڑی بھر بھی نہ اب بات کرو ہو

جب برملا کہنے کی یہاں رسم نہیں ہے
پھر کس لیے تم پرسشِ حالات کرو ہو

اس سفر میں تو فقط چلتے ہی رہنا ہے تمہیں
دم ذرا بھی جو لیا تو راہ میں رہ جاؤ گے

زندگی جس سے عبارت تھی وہ احساس جمیل
رات کے آخری لمحات میں دم توڑ چکا

دیر سے بیٹھا ہوں اب تھک کے سرِ راہ گزر
سوچتا ہوں کہ مری زیست کا مقصد کیا تھا

خودسری میں اپنے سائے سے جو لپٹے رہ گئے
ان غزالوں کا مقدر دشتِ تنہائی ہوا

ناگہانی کوئی افتاد پڑی ہو جیسے
ہر گھڑی ہم پہ قیامت کی گھڑی ہو جیسے

ایک زندانِ تحیّر میں مقید ہے حیات
وقت کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے

رو رو جی ہلکان کرو گے غم کی کھیتی کاٹو گے
ایک تماشا بن جاؤ گے کوئی نہ تم سے بولے گا

خوشبو اس کی مجھ سے لپٹ کے کیا کیا یاد دلائے گی
ماضی کے جب ویرانوں میں ذہن دریچے کھولے گا

---••☆••---

الیاس احمد مُجیبی

الیاس احمد نام اور الیاس مُجیبی قلمی نام ہے-انہوں نے اپنے ممدوح مشہور صوفی بزرگ شاہ طالب حسین مجیب جن کا آستانہ فرخ آباد میں ہے' سے متاثر ہو کر اپنے نام کے ساتھ مجیبی کا اضافہ کر لیا تھا-الیاس مُجیبی ۹ رجنوری ۱۸۹۸ء کو محلہ ملک خیل' قائم گنج کے پٹھان خاندان میں پیدا ہوئے-ان کے مورث آفریدی پٹھان تھے جن کا شجرہ ملک آزاد خان کلان خیل جرگہ سے تھا-ان کے فرزند رحیم داد خان خیبر سے آئے اور قائم گنج فرخ آباد میں آباد ہوئے-الیاس مُجیبی کے والد محمد عبدالحفیظ خاں کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا-ان کے کتب خانہ میں قلمی نسخے' تاریخی کتب اور شجرے ابھی تک قائم گنج میں محفوظ ہیں-الیاس مجیبی ڈاکٹر ذاکر حسین' صدر جمہوریہ ہند' کے رشتے میں ماموں تھے اور دونوں تقریباً ہم عمر تھے-الیاس مجیبی نے ابتدائی تعلیم قائم گنج کے مڈل اسکول سے حاصل کی-اس کے بعد وہ فرخ آباد چلے گئے اور گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے کر وہیں رہنے لگے-فرخ آباد میں آستانہ مجیبیہ سے اتنی وابستگی بڑھی کہ گھر بار سب کچھ چھوڑ بیٹھے-ان کی جدائی کے غم میں ان کی ماں بھی تڑپتی رہیں-اس دوران ان کی ملاقات ایک ادیب سجاد انصاری سے ہوئی جو بڑے انسان شناس بھی تھے-انہوں نے مجیبی صاحب کو کچھ ایسی نصیحت کی کہ ان کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا-والدہ کی بیماری کا سن کر مجیبی صاحب سیدھے گھر چلے آئے لیکن چند ہی دنوں بعد ان کی والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں-

ان دنوں تحریکِ خلافت کا بڑا زور تھا لہٰذا مجیبی صاحب بھی تحریک میں شامل ہو گئے-ڈاکٹر ذاکر حسین قائم گنج آئے تو انہیں مجیبی کا تحریک میں شامل ہونے کا علم ہوا تو انہیں اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے- ان دنوں جامعہ ملّیہ علی گڑھ میں تھی-ڈاکٹر صاحب نے انہیں جامعہ ملّیہ سے وابستہ کر لیا اور اس طرح ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا-جامعہ ملّیہ علی گڑھ سے دلّی منتقل ہوئی تو مجیبی صاحب بھی دلّی آ گئے-لکھنے پڑھنے کا پہلے ہی سے بہت شوق تھا جو انہیں ورثہ میں ملا تھا جامعہ ملّیہ کے ماحول نے ان کے ذوقِ علم کو ایسی جلا بخشی کہ بچوں کے ادب میں انہیں شہرتِ دوام حاصل ہوئی-وہ بچوں

کے لیے کتابیں لکھنے لگے اور ''شرکت ادبیہ'' کے نام سے ایک کتاب گھر بھی قائم کیا- اس ادارے نے سجاد انصاری کے مضامین کا مجموعہ ''محشر خیال'' کے عنوان سے شائع کیا- اس کے بعد مجیبی صاحب کو سیرت پاک لکھنے کا خیال آیا- انہوں نے بچوں کے لیے ایک کتاب ''سرکار گادربار'' کے عنوان سے شائع کی- بچوں کے لیے اس زمانے میں ''سرکار گادربار'' کے مقابلے کی کوئی اور کتاب نہیں تھی-

۱۹۳۰ء میں الیاس احمد مجیبی کی شادی ہوئی- اسی زمانے میں حکومتِ حیدرآباد دکن نے عثمانیہ لغت بورڈ کے لیے انجمن ترقی اُردو کو دس برس ایک ہزار روپے ماہانہ کی گرانٹ منظور کی- لغت کے عمل میں مجیبی صاحب کو بھی شامل کیا گیا- شادی ہوئے چند دن ہی گزرے تھے کہ وہ اس دعوت پر حیدرآباد چلے گئے- ابتدا میں تو بابائے اُردو مجیبی صاحب کے کاموں کو پرکھتے رہے پھر ان کی محنت اور مستعدی دیکھ کر محبت سے پیش آنے لگے اور جگہ جگہ ان کی تعریفیں بھی کرتے تھے- بابائے اُردو کا مشفقانہ سلوک دیکھ کر بعض کارکنوں کو مجیبی سے خدا واسطے کا بَیر ہو گیا اور ان کے خلاف بابائے اُردو کے کان بھرتے رہے- آخر ایک دن مولوی صاحب نے مجیبی کو برخاست کر دیا- اس پریشانی کے عالم میں جب وہ واپس گھر لوٹے تو انہیں معاشی مشکلات اور گھریلو پریشانیوں نے آ گھیرا- جو کچھ جمع پونجی تھی سب پریشانیوں کی نذر ہو گئی- مزید آفت یہ آئی کہ بیوی کا سارا زیور اور جو کچھ پیسہ کوڑی گھر میں تھا چوری ہو گیا- بیوی اس صدمے کو ایک سال بھی برداشت نہ کر سکیں اور اللہ کو پیاری ہو گئیں- ان حالات کے باوجود انہوں نے پھر سنبھالا لیا اور اپنے لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مشغول ہو گئے- ۱۹۳۹ء میں انہوں نے دوسری شادی بھی کر لی-

مکتبہ جامعہ نے مجیبی صاحب کی دو کتابیں شائع کیں- اس کے بعد یکے بعد دیگرے پچیس کتابیں چھاپیں- کچھ کتابیں دوسرے اداروں نے اور کچھ انہوں نے خود بھی چھاپیں- یہ سلسلہ اچھا چلا تو ''بچوں کا بک ڈپو'' نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کر لیا- چھوٹے بچوں کے لیے ''سرکار گادربار'' وہ پہلے ہی چھاپ چکے تھے- اس کے بعد انہوں نے ایک سے ایک اعلیٰ کتاب لکھ کر شائع کی- انہوں نے تیسری چوتھی جماعت کے بچوں کے لیے ''آنحضرتؐ''، ''چار یار'' لکھی- ''اچھی کہانی'' کے عنوان سے حضرت یوسفؑ کا واقعہ لکھا- ان کی ساری کتابیں بڑی مقبول ہوئیں اور ملک کے نامور بزرگوں اور ادیبوں نے مجیبی صاحب کی اس اعلیٰ کاوش کو بہت سراہا-

زمانے کی اس بے ثباتی کو کیا کہیے- دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں ہندو مسلم فساد اور متعصبانہ رویے کی آگ بھڑک اُٹھی- دلّی جو کبھی تہذیب وتمدن، علوم وفنون، جاہ وحشمت، شان وشوکت کا گہوارا تھا اب وہاں نہ چہل پہل، نہ خوشی خرمی، نہ مہذب وباوقار محفلیں نہ متانت وسنجیدگی اور نہ علمی چرچے تھے- ہر طرف قیامت برپا تھی- پریشان حال مسلمانوں کے جتھے کے جتھے اپنے گھر بار چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں دلّی کے پرانے قلعے میں کھلے آسمان کے نیچے آپڑے- اپنے ہی شہر کے اس قلعے میں مجیبی صاحب نے بھی دن گزارے- بیشتر لوگوں نے پاکستان کی راہ اختیار کی- لیکن یہ باہمت شخص ایسے ناگفتہ بے حالات میں بھی ڈٹے رہے- کچھ حالات بہتر ہوئے تو مجیبی صاحب دلّی چھوڑ کر ڈاکٹر ذاکر حسین کے پاس علی گڑھ چلے گئے- لیکن ڈاکٹر صاحب کے مہمان بن کر رہنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا اور مجبور ہو کر پاکستان چلے آئے- یہاں انہوں نے ''اُردو گھر'' کے نام سے ادارہ قائم کیا جس کا افتتاح مولانا سید سلیمان ندوی نے کیا لیکن یہ ''اُردو گھر'' کامیاب نہیں ہو سکا- گھر اور ذریعہ معاش کی تلاش میں سرگرداں رہے- جیسے تیسے کر کے ایک مکان ناظم آباد میں بنوایا تھا اور اسی میں دوبارہ ''اُردو گھر'' قائم کیا لیکن کامیابی حاصل نہ ہو سکی- البتہ یہ ضرور ہوا کہ انہوں نے جو کتابیں سیرت اور اسوۂ صحابہ کرامؓ کے حوالے سے لکھیں تھیں وہ اسکول کے نصاب میں شامل ہو گئیں-

مجیبی صاحب نے سنہ ۱۹۴۳ء میں الف لیلیٰ کی بعض کہانیاں مرتب کی تھیں- ان کہانیوں کا ایک منتخب ایڈیشن انہوں نے اپنے والدین کے لیے تیار کیا- یہ منشی عبدالکریم کے ترجمہ کردہ نسخے کی تخلیص تھی- ایک تحقیقی تعارف لکھا اور بچوں والے ایڈیشن میں جو رشید احمد صدیقی نے دیباچہ لکھا تھا اُسے شامل کر کے کتاب تیار کی جو ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی- اس کتاب پر عالمی ادارے یونیسکو نے انعام بھی دیا تھا جو ان کی بیگم نے وصول کیا- مجیبی صاحب زندگی بھر علم وادب کی خدمت کرتے رہے- خاص طور پر بچوں کے ادب میں ان کی نمایاں خدمات ہیں- جانفشانی سے کام کرتے کرتے وہ اب بالکل نڈھال ہو چکے تھے- اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی انہیں پریشانیوں اور ناکامیوں کا سامنا رہا- انہوں نے اپنا کتب خانہ ڈاکٹر محمود حسین کو جامعہ ملّیہ کے لیے دیدیا تھا- دکھ اور پریشانیوں سے تھک ہار کر آخر ۳ رجنوری ۱۹۵۸ء کو الیاس مجیبی صاحب دارِفانی سے رخصت ہو گئے-

---••☆••---

امید فاضلی

ان کا اصل نام ارشاد احمد تخلص امید اور قلمی نام امید فاضلی ہے۔ ۱۳/نومبر سنہ ۱۹۲۳ء کو وہ ڈبائی، ضلع بلند شہر (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید محمد فاروق ہے۔ امید فاضلی کی ابتدائی تعلیم ڈبائی میں ہوئی۔ ڈبائی کے بعد مزید تعلیم میرٹھ میں حاصل کی اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے تک تعلیم مکمل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سنہ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹ میں ملازمت اختیار کرلی۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ یہاں پر وہ اپنے محکمہ سے ہی منسلک رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد امید فاضلی نے تصنیف و تالیف اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور ماہنامہ ''الفاظ'' میں مدیر کی حیثیت سے منسلک ہو گئے۔

امید فاضلی چھوٹی عمر ہی سے شعر و سخن میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ وہ گیارہ سال کی عمر سے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ ان کی پسندیدہ صنف سخن میں غزل ہے لیکن انہوں نے مرثیے بھی خوب کہے ہیں۔ اوائل عمری میں شکیل بدایونی سے اصلاح لی۔ ۱۹۴۳ء میں ناخدائے سخن نوح ناروی، جانشین حضرت داغ دہلوی کی شاگردی میں آ گئے۔ کراچی کی ادبی فضا میں ان کے ذوقِ سخن کو اور فروغ ملا اور ادبی حلقوں میں انہیں معتبر مقام حاصل ہوا۔ امید فاضلی کی تصانیف میں ''دریا آخر دریا ہے'' (مجموعہ غزلیات) ''میرے آقا'' (نعتوں کا مجموعہ) ''سرِ نینوا'' مجموعہ مراثی وغیرہ شامل ہیں۔ امید فاضلی کی تصانیف میں ''دریا آخر دریا ہے'' (مجموعہ غزلیات) اس مجموعہ پر انہیں آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ''سرِ نینوا'' (مجموعہ مراثی) اس مجموعہ پر میر انیس ایوارڈ دیا گیا۔ ''میرے آقا'' نعتوں کا مجموعہ ''تاب جاودانہ'' ملی کلام ''پاکستان زندہ باد'' شامل ہیں۔ امید فاضلی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف نقاد و شاعر مشفق خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''امید فاضلی نے زندگی کو جس گہری نظر سے دیکھا ہے اور جس متنوع انداز سے برتا ہے اس کے مخلصانہ اور فنکارانہ اظہار نے ان کی غزل کو منفرد اور تازہ تر لہجہ دیا ہے۔ یہی لہجہ ان کی

غزل کی پہچان ہے۔''

برصغیر کے نامور نقاد پروفیسر کرار حسین نے لکھا ہے:

''امید فاضلی نے شعری زبان میں دُکھوں کی لوح پر حوصلہ مندی کا اسم لکھا ہے۔ یہ اسم ان کے تخلیقی وجود کا وہ جوہر اور فن کے بطون سے پھوٹی ہوئی وہ روشنی ہے؛ جس نے عصری شاعری کے نگارخانے میں اپنے انفرادی لب ولہجہ اور اجتماعی تجربات کے چراغ روشن کیے ہیں۔''

امید فاضلی کے کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یادوں کی گھنی چھاؤں بھی رخصت ہوئی گھر سے
اک اور سفر کے لیے لوٹ آؤ سفر سے

جانے یہ کیسا زہر دلوں میں اُتر گیا
پرچھائیں زندہ رہ گئی انسان مَر گیا

اس شہر میں بُراج طلب ہے ہر ایک راہ
وہ خوش نصیب تھا جو سلیقے سے مرگیا

کہہ گئیں کرنیں زمیں کی پیاس سے
اب کے بادل تشنگی برسائیں گے

کتنی جھوٹی خواہشوں کے خوف سے
جھوٹ بھی سچ کی طرح لکھے گئے

اے ہوائے درد آہستہ گزر
رات ہے دن کی تھکن اوڑھے ہوئے

زندگی میں ہی کس نے یاد کیا
بعد میں کس کو یاد آؤ گے

میں کس سے بات کروں کون سننے والا ہے
یہاں تو جھوٹی اناؤں نے قد نکالا ہے

سو یہ ہوا کہ بجھا چاند بھی چراغ کے ساتھ
سُنا تو یہ تھا کہ سورج نکلنے والا ہے

بستی کا یہ عالم کہ نظر ابر کی جانب
اور ابر کا یہ حال کہ دو بوند کو ترسے

جل اُٹھتے ہیں یادوں کی منڈیروں پہ سرِشام
جو خواب بچا لایا تھا جلتے ہوئے گھر سے

اندر سے اصولوں کی طرح ٹوٹے ہوئے لوگ
بک جائیں تو دیکھو نہ تعجب کی نظر سے

ہو لاکھ ہوا تیز مگر غم نہیں امیدؔ
لَو حرف کی روشن ہے مرے خونِ جگر سے

وہ دور دور تھے جب تک بھلے لگے تھے بہت
جو مِل کے بیٹھے تو دیکھا کہ فاصلے تھے بہت

یہ پوچھتی ہے دِلوں سے گھروں کی ویرانی
وہ لوگ کیا ہوئے جو ہم کو چاہتے تھے بہت

گرے زمیں پہ تو پھر اُن کا کچھ پتہ نہ ملا
ہوا کے دوش پہ کچھ پتے ناچتے تھے بہت

--••☆••--

انجم فوقی

پورا نام ظہور محمد، انجم تخلص اور قلمی نام انجم فوقی ہے۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۱۱ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب نور محمد بھی شعر سخن سے ذوق رکھتے تھے اور مصرعے بھی مرتب کر لیتے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر اور چھ سات سال کی عمر میں دو تین برس ریاست اندور مالوہ میں مولانا حکیم غریقؔ حیدر آبادی کے زیر سایہ رہے۔ مولانا غریقؔ مقتدر شعراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے یہاں شعری نشستوں میں انجم فوقی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے گورنمنٹ طبیہ کالج کلکتہ اور طبیہ کالج علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ شعر و سخن کا ذوق نوعمری سے تھا۔ اس سلسلے میں انجم صاحب نے حضرت فوقؔ سبزواری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

سنہ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے ماہنامہ ''سنگم'' کانپور سے شائع کیا جس کے مدیر وہ خود ہی تھے۔ اس کے ساتھ وہ کئی اور ماہناموں کے اعزازی مدیر بھی رہے۔

تقسیم کے بعد انہوں نے پاکستان ہجرت کی اور کراچی میں آباد ہوئے۔ قبل ہجرت اُن کی تصانیف میں آتشِ غم (رباعیات، قطعات، اجالے) (غزلوں کا مجموعہ) رازِ کہکشاں وغیرہ بدایوں سے شائع ہوئیں۔ پاکستان آنے کے بعد غزلوں کا مجموعہ ''مہر و ماہ''، ''فکر و فن'' (عروضی اصطلاحات) مکتوبات پر مشتمل کتاب ''انکشاف'' اور ان کے کلام و مکتوب کا انگریزی میں ترجمہ ''وژن'' (Vision) وغیرہ کراچی سے شائع ہوئے۔

''مہر و ماہ'' میں انجم فوقی کی تصنیف ''فکر و فن'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں:

''علمِ عروض و قواعد پر ایک ایسی جامع اور مستند کتاب کی ضرورت تھی جس سے استفادہ با آسانی کیا۔ حکیم انجم فوقی صاحب بدایونی سے بہتر ایسی کتاب لکھنے کے لیے کوئی شخص نہیں تھا چنانچہ فکر و فن، ایک ایسی کمی کو پورا کرتی ہے جس کا احساس اردو سے دلچسپی رکھنے والے ایک عرصہ

سے کر رہے تھے۔حکیم صاحب ایک صاحبِ فکر اور واقفِ فن عالم ہیں۔ان کی تصنیف فکروفن اردو کی بڑی اہم خدمت ہے امید کرتا ہوں کہ اس سے بیش از بیش استفادہ کیا جائیگا''

علامہ نیاز فتح پوری کہتے ہیں: ''اُردو شعروادب کی کوئی منزل انجم فوقی کی دسترس سے باہر نہیں''

انجم فوقی صاحب بیک وقت حکیم، عالم، شاعر، ادیب، مصنف اور تنقید نگار تھے۔ان کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ذات سے ذات کا فاصلا کیا
سوچتا ہوں مجھے ہوگیا کیا

بات طولِ سفر کی نہیں ہے
جیب خالی تھی گھر لوٹتا کیا

جس طرف دیکھیے دکھ ہی دکھ ہیں
پیار کا سلسلہ بڑھ گیا کیا

فاصلہ قُرب کی آبرو ہے!
قُرب جب تک نہ ہو فاصلا کیا

پتہ پتہ سوکھ چکا ہے
شاخیں چھاؤں کہاں سے لائیں

دل کا ہے ملاقات ملاقات کرے ہے
پوچھو تو کہ سایہ بھی کہیں بات کرے ہے

ترے لب ہیں برنگِ حوضِ کوثر مخزنِ خوبی!
یہ خالِ عنبریں تس پر ہلال آسا کھڑا دستا

طلوعِ مہر نے پھولوں کی زندگی کم کی
یہ کیا خوشی ہے کہ تقدیر کھل گئی غم کی

جفا شعار دعا دے مرے تبسم کو
ہزار بار بڑھادی ہے، آبرو غم کی

نہ کر یقین کہ بیدار ہیں چمن والے
بھرے چمن میں لٹی ہے بہار شبنم کی

لبوں تک آئی ہوئی مسکراہٹوں کو نہ روک
تری بلا سے جو بڑھ جائے زندگی غم کی!

غزل میں چاہیے وہ نظمِ شعریت انجم
کہ بھول کر بھی زمانہ جسے بھلا نہ سکے

مانگی تھی دعائے آزادی لیکن یہ خبر کیا تھی انجم!
مختارِ نشیمن ہوتے ہی، مجبورِ قفس ہوجائیں گے

بجھتے جاتے ہیں قلب و نظر کے دیے
صبح آئی تو لیکن اندھیرے لئے

تم نہ ہو معترف یہ الگ بات ہے
شعر کہتا ہے انجم تمہارے لئے

---••☆••---

انورؔ دہلوی

اصل نام محمد انوار الحسن، تخلص انورؔ اور قلمی نام انورؔ دہلوی ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء کو دہلی کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان والد کا نام محمود علی انوری تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد منوہر لال میموریل ہائی اسکول فیروز پور چھاؤنی، مشرقی پنجاب میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد کمرشیل کالج دہلی میں پڑھا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ذریعۂ معاش کے لیے انہوں نے پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف میں ملازمت اختیار کرلی۔ شعروسخن کا ذوق انہیں اپنے علمی و ادبی گھرانے سے ملا۔ اپنے برادر نازشؔ حیدری کی مشفقانہ رہنمائی میں انورؔ دہلوی نے خیام الہند سید جلال الدین حیدرؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں حیدرؔ دہلوی نے انہیں فارغ الاصلاح قرار دیا۔

انورؔ صاحب ملازمت کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ ان کی ادبی خدمات میں ماہ نامہ ''سادات'' دہلی کا اجراء اور ادارت، استادالمکرّم کی سو رُباعیات (رُباعیاتِ حیدر) کی دہلی سے اشاعت اور ماہ نامہ الہام (دہلی) کا اجراء اور ادارت شامل ہیں۔

تقسیمِ ہند کے بعد انورؔ دہلوی پاکستان آئے۔ ابتدا میں وہ قصور، پنجاب میں مقیم ہوئے بعد میں کراچی آئے اور ہمدرد دواخانہ سے منسلک ہوگئے۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے خیام الہند سید جلال الدین حیدرؔ دہلوی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ترتیب دیا اور ''صبحِ الہام'' کے عنوان سے شائع کیا۔ شمس زبیری مرادآبادی علامہ سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ میں شامل ہونے سے پہلے تک اصلاحِ سخن کے سلسلے میں انورؔ دہلوی سے وابستہ رہے۔ اسی طرح خوش گو شعرا جناب انورؔ سجاد دہلوی، شبیرا کبرآبادی، نظیر موجؔ بھرتپوری، شریف مضطرؔ اور دیگر تشنگانِ شعروسخن ان کی شاگردی کا دم بھرتے رہے۔

مجموعۂ کلام 'کشیدِ فکر' میں ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری (ستارۂ امتیاز) لکھتے ہیں:

''انورؔ دہلوی اُردو کے اُن بزرگ اور کہنہ مشق شاعروں میں ہیں جو زبانِ شعر اور اسلوبِ شعر

دونوں کے رموز سے خوب واقف ہیں، نہ صرف واقف ہیں بلکہ اُن کو برتنا بھی جانتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاعری کے جس قابلِ توجہ مرتبے پر آج فائز ہیں، اُس تک پہنچنا مشکل ہوتا۔ اُن کا یہ وصف کیا کم ہے کہ وہ میر امّن کی دتی کے روڑے ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ ایک بڑے ماہرِ فن اور مستند اُستاد حضرت حیدؔر دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔"

انوؔر دہلوی کے مجموعۂ کلام "گلشنِ کرب" میں سحؔر انصاری لکھتے ہیں:

"انوؔر دہلوی کے ہاں روایات کی پاس داری بھی ہے اور زبان کا سلیقہ بھی نمایاں ہے۔ وہ تغزل کے ساتھ ساتھ اخلاقی، سماجی اور سیاسی مسائل پر بھی پوری توجہ دیتے ہیں، لیکن پیرایۂ بیان کہیں بھی غزل کی شرائط سے عاری نہیں ہوتا۔ ان کی غزل میں اس تہذیب کا عکس بھی ہے جو اب قصۂ پارینہ ہوتی جا رہی ہے اور اس طرزِ حیات کا ردِعمل بھی جس نے زندگی کی قدروں کو بُری طرح پامال کیا ہے، لیکن یہی وہ مرحلہ ہے جہاں دیکھنا ہوتا ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کو کیا ہے۔ انوؔر دہلوی مثبت رویّوں کو عزیز رکھتے ہیں۔"

انوؔر دہلوی کے دو مجموعۂ کلام "گلشنِ کرب" اور "کشیدِ فکر" شائع ہوئے۔ ۴ر نومبر سنہ ۱۹۹۴ء کو انوؔر دہلوی دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ پاپوش نگر کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کا کلام ملاحظہ کیجیے ؎

رونق کہاں ہے کل کی سی دیوار و در میں آج
آثار دشت کے نظر آتے ہیں گھر میں آج

صحرا نوردیوں کا تکلّف بھی اُٹھ گیا
سامان سب جنوں کے مہیا ہیں گھر میں آج

محسوس ہو رہے ہیں قیامت کے فاصلے
وہ ارتباط ہی نہیں شام و سحر میں آج

انوؔر یہ کون میرے تصوّر میں آ گیا
دُنیا کی وسعتیں سمٹ آئیں نظر میں آج

خلوص اُٹھ گیا دُنیا سے ہم نفَس ورنہ
یہ محفل اِس قدر اُجڑی ہوئی نہیں ہوتی

ہم بچھڑ کے یاد کے شہروں میں رہ گئے
کیا لوگ تھے جو ذہن کے گوشوں میں رہ گئے

کرنوں کا کھیل ختم ہوا دُھوپ ڈھل گئی
سائے ہی سائے میرے خیالوں میں رہ گئے

پروانے جن سے بزمِ شب آراستہ رہی
دم توڑ کر سحر کے چراغوں میں رہ گئے

انوؔر مسرّتوں کا گزر بھی یہاں نہیں
ہم بند ہو کے غم کی فصیلوں میں رہ گئے

کس کس کو یاد رکھیں کس کس کو بھول جائیں
لاکھوں سبق ملے ہیں دو دن کی زندگی میں!

کیا خبر کس کے لیے، کس وقت کس عالم میں ہو
لوگ کہتے ہیں شبِ غم کی سحر ہو جائے گی

آج کل اتور ہیں جس دُنیا میں ہم نغمہ سرا
ایک دن ہم سے یہ دُنیا بے خبر ہو جائے گی

کیا اب کے بہاروں میں کوئی رنگ نہیں ہے
ثابت نظر آتے ہیں ابھی تک جو گریباں

اے زندگی ہماری محبت کی قدر کر
ہم نے قدم قدم پر ترے ناز اُٹھائے ہیں

رُخ پر نشانِ کرب نہ آنکھوں میں اشکِ غم
کس حُسنِ احتیاط سے ہم مُسکرائے ہیں

حادثے جتنے بھی دنیا کی نظر سے گزرے
یہ مشیّت تھی کہ پہلے مرے گھر سے گزرے

غم سے نہ کبھی فراغ پایا ہم نے
روشن یہی اک چراغ پایا ہم نے

دل ہے کہ سدا بہار گلشن کوئی
جب دیکھا داغ داغ پایا ہم نے

ہر طرف سائے ہی سائے غم کے لہرانے لگے
حادثے اب میرے گھر میں پرورش پانے لگے

--••☆••--

انور شعورؔ

انور شعورؔ ۱۱ر اپریل ۱۹۴۳ء کو جیونی ' سی پی (بھارت) میں پیدا ہوئے- ان کے والد اشفاق حسین تھے جن کا تعلق یوسف زئی خاندان سے تھا- وہ کراچی میں جعفر گروپ کے یہاں ملازم تھے- تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں انور شعور کے والد ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی- اس وقت انور شعور کی عمر ۴ سال تھی- کراچی آنے کے بعد انور شعورؔ کو حسینی ہائی اسکول ناظم آباد میں داخل کرایا گیا- لیکن ان کی طبیعت میں لاابالی پن تھا اس لیے تعلیم کی طرف توجہ نہ دی اور پانچویں کلاس کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیا-

ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے مختلف جگہوں پر کام کیا- جس زمانے میں مشفق خواجہ انجمن ترقی اردو سے منسلک تھے اسی دوران انور شعورؔ بھی وہاں کام کرتے تھے- انجمن ترقی اردو کے بعد انور صحافت سے منسلک ہوکر ''اخبار جہاں'' میں کام کرتے رہے- انہوں نے شکیل عادل زادہ کے ساتھ ''سب رنگ ڈائجسٹ'' میں بھی خدمات انجام دی ہیں- ۱۹۹۸ء سے وہ روزنامہ ''جنگ'' کے لیے روز ایک قطعہ لکھتے ہیں جو بے حد پسند کیے جاتے ہیں- تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود انور شعورؔ نے وہ مقام حاصل کر لیا جو عموماً اس طرح کے بہت کم لوگوں کو ملتا ہے- انہوں نے ۱۱ سال کی عمر ہی سے شاعری شروع کر دی تھی- انور شعورؔ متفقہ طور پر اردو کے منفرد اور صاحب طرز شاعر ہیں- ان کے بارے میں ممتاز ادیب و شاعر قمر جمیلؔ مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ انور شعور کی زبان ہر شخص سمجھ سکتا ہے' بول سکتا ہے مگر لکھ نہیں سکتا-

انور شعورؔ کے اب تک دو شعری مجموعے آچکے ہیں- پہلا مجموعہ کلام ''اندوختہ'' کے عنوان سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ کلام ''مشقِ سخن'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا- جبکہ تیسرا مجموعہ کلام زیر ترتیب ہیں-

ایک انٹرویو میں جب انور شعورؔ سے ان کی شاعری کے بنیادی موضوعات کے بارے میں پوچھا گیا

توانہوں نے جواب دیا کہ الحمد للہ میں بنیاد پرست نہیں ہوں اس لیے میری شاعری کے بنیادی موضوعات کیا ہو سکتے ہیں- جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ عہد ساز شعرا کے یہاں نثر نگاری کی بے پناہ قوت نظر آتی ہے مگر آپ نے نثر نگاری نہیں کی- اس کی وجہ بیان کریں- اس کے جواب میں انور نے کہا ''معاف کیجیے گا میں عہد ساز شاعر نہیں ہوں، نثر نگاری میں پتا مارنا پڑتا ہے، جم کے بیٹھنا پڑتا ہے اس کی مجھ میں ہمت نہیں ہے اور میری غزل گوئی کی مقدار بھی زیادہ نہیں ہے- میں تو کاہلی کے باعث اپنے آپ سے بس شرمندہ شرمندہ رہتا ہوں-

انور شعور کی ایک غزل برائے مطالعہ پیش خدمت ہے، ملاحظہ کیجیے ۔

ہوگیا ہے یہ ٹھکانا دوسرا — کیا بسائیں آشیانہ دوسرا
ہم قفس میں ہیں نشیمن کے بجائے — بلبلو! اب گیت گانا دوسرا
کردیا کام ایک ہی نے شکر ہے — ورنہ پڑتا تازیانہ دوسرا
بے سرو ساماں ہیں بے مایہ نہیں — ہے فقیروں کا خزانہ دوسرا
جو بناتا تھا ہمارے ڈھب کے لوگ — تھا وہ کوئی کارخانہ دوسرا
پہلے خط میں رہ گئی تھی ایک بات — کردیا ہم نے روانہ دوسرا
دل نہ آئے راہ پر سیدھی طرح — تو طریقہ آزمانا دوسرا
بالمشافہ مل کے اندازہ ہوا — تھا تعارف غائبانہ دوسرا
ترکِ مے کے بعد مرنے کے لیے — چاہیے کوئی بہانہ دوسرا
وضع داری تابہ کے انور شعور — ہے میاں جی یہ زمانہ دوسرا

--••☆••--

انیس خورشید' ڈاکٹر

ان کا اصل نام محمد انیس الدین ہے جو ان کے والدین نے رکھا تھا- بعد میں ان کے استاد نے جو انہیں اُردو اور فارسی پڑھاتے تھے' ان کے نام کے آخر میں خورشید کا اضافہ کر دیا- ان کے والد کا نام محمد خورشید حق تھا- اس طرح ان کا نام محمد انیس الدین سے محمد انیس الدین خورشید ہوا- ان کے پردادا محمد عبداللہ مئو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں کے سرپنچ تھے- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے مومن برادری کے زرخیز آباد علاقوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا- مومن برادری کے دل برداشتہ لوگوں نے اپنے سرداروں کی سربراہی میں نقل مکانی شروع کر دی- ایک قافلہ سرپنچ محمد عبداللہ کی سربراہی میں مئو اعظم گڑھ سے ۱۸۵۹ء میں کامٹی کے نو آباد علاقہ میں آبسا- انیس خورشید کے دادا منشی محمد سعید کامٹوی ایک معروف شاعر تھے- دادا کی وفات کے بعد سرپنچ کی پگڑی انیس خورشید کے والد محمد خورشید حق کے سر باندھی گئی- ذریعہ معاش کے لیے محمد خورشید حق نے دیوری میں ایک پارٹی کی شراکت میں ایک مل لگا لیا تھا- ان کا شمار کامٹی کے شرفا اور معزز لوگوں میں ہوتا تھا-

انیس خورشید ۲ ستمبر ۱۹۲۴ء کو کامٹی میں پیدا ہوئے- کامٹی ضلع ناگپور کا سب سے بڑا شہر ہے- انیس نے ابتدائی تعلیم مدرسۃ المسلمین میں حاصل کی- تیسری جماعت کے بعد ۱۹۳۷ء میں پرائمری کا امتحان کنٹونمنٹ پرائمری اسکول سے پاس کیا- پھر اسی سال پرائمری اسکالرشپ کا امتحان دیا جس میں کامٹی کے وہ واحد کامیاب طالب علم تھے- سنہ ۱۹۴۳ء میں ایم ایم ربانی ہائی اسکول کامٹی سے میٹرک کرنے کے بعد بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن، راجپوتانہ (بھارت) سے انٹر کا امتحان پاس کیا- معاشی حالات ابتر تھے اس لیے انہوں نے میٹرک کے بعد ٹرانس پورٹ ٹریننگ سینٹر کامٹی میں بحیثیت کلرک ملازمت اختیار کر لی- اس کے بعد انیس خورشید کو فوجی کیمپ پوسٹ آفس میں سیکنڈ گریڈ کلرک کی ملازمت مل گئی بعد ازاں انہیں کامٹی سٹی پوسٹ آفس میں مقرر کیا گیا- کامٹی پوسٹ آفس کے بعد انہیں پوسٹ ماسٹر جنرل ناگپور کے آفس میں جگہ مل گئی-

ہندوستان کی تقسیم ہوئی توانہیں پاکستان میں ملازمت کرنے کا آپشن ملا-ان کی شادی ہوچکی تھی اوراللہ تعالٰی نے ایک بیٹابھی دیدیاتھا- حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انیس خورشید نے پاکستان جانے کا آپشن منظور کیااور تنہاپاکستان آگئے-پاکستان آکر وہ بہتر ملازمت کی کوشش کرتے رہے-آفس کی طرف سے پی اینڈٹی کالونی میں کوارٹر ملاہواتھا-اس وقت انہیں بی اے کرنے کی ضرورت شدّت سے محسوس ہوئی- بہرحال۱۹۵۴ء میں انیس نے اسلامیہ کالج سے بی اے کرلیا-

بی اے کرنے سے پہلے۱۹۵۲ء میں وہ کراچی لائبریری ایسوسی ایشن کاکورس پاس کرچکے تھے-اس کورس کوپاس کرلینے کا فائدہ یہ ہوا کہ انہیں کراچی یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اوراپنی گیارہ سالہ نوکری چھوڑدی-پچھلی نوکری میں پی اینڈٹی کالونی میں کوارٹرمل جانے کے بعدوہ کامٹی سے اپنی بیوی بچے کولے آئے تھے-۱۹۵۷ء میں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے اوّل درجہ میں ڈپلومہ کورس پاس کیا-اسی سال انہیں رٹگرس یونیورسٹی آف امریکہ سے ماسٹرآف لائبریری سائنس کی اسکالرشپ ملی-امریکہ جانے اورآنے کے اخراجات ایشیافاؤنڈیشن نے دیے جبکہ فل برائیٹ نے دوسرے اخراجات پورے کیے- ۱۹۵۹ء میں رٹگرس یونیورسٹی امریکہ سے ماسٹرآف لائبریری سائنس کی ڈگری حاصل کرکے واپس آئے توکراچی یونیورسٹی میں لیکچررمقررہوئے اور۱۹۶۲ء میں انیس خورشیدکوشعبۂ لائبریری کا سربراہ بنادیا گیا-۱۹۶۵ء میں انہیں پی ایچ ڈی کے لیے امریکہ سے ہی پھراسکالرشپ ملی-چنانچہ۱۹۶۶ء میں وہ دوبارہ امریکہ گئے اور۱۹۶۹ء میں پٹس برگ یونیورسٹی آف امریکہ سے پی ایچ ڈی کیا-اس عرصے میں وہ لائبریری اسکول میں انٹرنیشنل لائبریری انفارمیشن سینٹر میں پہلے لائبریرین کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دیتے رہے-

امریکہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کرواپس آئے توانہوں نے جامعہ کراچی میں اسلامک لائبریری انفارمیشن سینٹرقائم کیا جس کے وہ اعزازی ڈائریکٹر تھے-سنہ۱۹۸۵ء میں انیس خورشید نے جامعہ کراچی میں پہلی کمپیوٹرلائبریری قائم کی جس نے فہرستیں مرتب کرنے کے لیے مقامی طور پر سافٹ ویئر کی تیاری میں مدد دی-یونیورسٹی گرانٹ کمیشن میں بحیثیت چیئرمین انہوں نے لائبریری اینڈانفارمیشن سائنس کے نصاب کی معیاربندی بھی کی-ڈاکٹرانیس خورشیدکویہ بھی اعزازحاصل ہے کہ وہ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے بانی رکن اورسیکریٹری جنرل رہے-انہوں نے ملکی سطح پر

لائبریریز کا سروے کر کے ایک پبلک لائبریری کے قیام کے لیے جامع رپورٹ پیش کی جو ۱۹۸۵ء میں حکومت کی طرف سے شائع ہوئی-مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد ۱۹۸۶ء میں انیس خورشید ریٹائر ہوگئے-لیکن ریٹائر ہونے کے بعد بھی جامعہ کراچی اور مرکزی وزارتِ تعلیم میں وہ یو-جی-سی کا کام کرتے رہے-انیس خورشید نے ملک میں لائبریری اور انفارمیشن سائنس کو ایک علمی مضمون کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے-انہوں نے جامعہ کراچی کی لائبریری سائنس کی ماسٹر ڈگری کو امریکہ میں منظور کرایا ہے-

انیس خورشید کراچی یونیورسٹی میں مختلف عہدوں پر فائز رہے -انہوں نے بحثیت کلاس فائز اسسٹنٹ لائبریرین' پارٹ ٹائم لیکچرر' لیکچرر فل ٹائم ریڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ' لیکچرر، اسسٹنٹ پروفیسر' لائبریرین' ریڈر رایسوی ایٹ پروفیسر' چیئر مین ڈیپارٹمنٹ آف لائبریری سائنس' آنریری ڈائریکٹر اور پروفیسر کی خدمات انجام دیں-ان کی صلاحیت اور کارکردگی کے اعتراف میں انہیں ۱۹۹۷ء میں صدارتی انعام سے نوازا گیا-تصنیفات میں کچھ مندرجہ ذیل کتابیں ہیں:

(۱) Cataloging of Pakistani Name یہ کتاب نصاب میں شامل ہے- (یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے وقت مجلّے کی شکل میں چھاپی گئی-)

(۲) جدید کیڈلاگ سازنگ یہ کتاب ایم اے کے نصاب میں شامل ہے (مقتدرہ قومی زبان نے شائع کیا)

(۳) Standard of Library Education South Asia یہ کتاب انیس صاحب کا تھیسز ہے جو پٹس برگ یونیورسٹی آف امریکہ نے شائع کی-

(۴) قائداعظم کی توضیحی کتابیات (۲ جلدوں میں) انگریزی اُردو دونوں زبانوں میں-

(۵) "Making of Librarianship in Pakistan" جسے سید جلال الدین نے مرتب کیا-

(۶) "Trends in Librarianship"

(۷) Status of Library Resourses Pakistan یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی-

---••☆••---

انیس فاطمہ بریلوی، سیدہ

برِّصغیر پاک وہند میں بے شمار ایسی خواتین پیدا ہوئی جنہوں نے اپنی تمام عمر علمی وقومی کاموں میں گزار دی ان ہی خواتین میں ایک نام سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کا ہے۔ سیدہ انیس فاطمہ ۱۹۱۰ء کو بریلی کے متوسط خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ناظرہ قرآن کے بعد عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم بھی حاصل کی۔ چند سال پرائمری اسکول میں بھی پڑھا۔ پندرہ سال کی عمر میں ان کی شادی سید الطاف علی بریلوی سے ہوئی ۔ سید صاحب ایک نابغۂ روزگار ہستی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر انتہائی اہم علمی وقومی کاموں میں گزار دی۔ وہ انجمن ادبی رسائل کراچی کے وائس پریسیڈنٹ رہے اور تقریباً چھ (۶) سال تک کراچی یونیورسٹی سینیٹ کے ممبر رہے۔ ایوب خان کے دورِ حکومت میں بی ڈی نظام کے تحت عثمانیہ کالونی یونین کے چیئر مین بلا مقابلہ منتخب ہوئے پھر غیر معمولی اکثریت سے کراچی میونسپل کارپوریشن کے ممبر منتخب ہوئے۔ ساری عمر قوم کی خدمت میں گزار کر سید الطاف علی بریلوی ۲۳ر ستمبر سنہ ۱۹۸۶ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ سید الطاف علی بریلوی دبستان سرسید کی ایک نفیس یادگار تھے۔

سید صاحب جب مستقل طور پر اپنے وطن بریلی آ گئے تو ان کی نگرانی میں انیس فاطمہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور وہ مسلسل تحقیق، مطالعہ اور لکھنے میں مصروف ہو گئیں۔ بریلی میں ایک قدیم کتب خانہ میونسپلٹی کا قائم تھا۔ جس میں انیس فاطمہ نے بھرپور استفادہ کیا۔ انہوں نے لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی اور پھر ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں خوب خوب پڑھا اور لکھتی رہیں۔ انہوں نے ایک کتاب ''مسلمانانِ بنگال کی اقتصادی تاریخ''، لکھی جس کا مسودہ ۱۹۴۷ء کی ہجرت کی نذر ہو گیا۔ ۴۳-۱۹۴۲ء میں انہوں نے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جس میں جنگِ آزادی کے تین ہیروز کا تحقیقی انداز میں ذکر کیا تھا۔

(۱) جنرل بخت خاں روہیلہ، کمانڈر افواج دہلی ۱۸۵۷ء

(۲) بیگم حضرت محل والیۂ لکھنؤ، بہ زمانہ جنگ آزادی اول ۱۸۵۷ء

(۳) جنرل محمود خاں، والی بجنور، یوپی، بھارت، بہ زمانہ جنگ آزادی اول ۱۸۵۷ء

ان مضامین کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اوران پرمبنی ایک کتاب ''۵۷ء کے ہیروز'' کے عنوان سے ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی جس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس کتاب کا پیش لفظ پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسی معروف شخصیت نے لکھا۔ منیجر روزنامہ ''ڈان'' دہلی، علی اظہر برلاس نے ان مضامین کا انگریزی ترجمہ شائع کیا اور نظام گجراتی میں گجراتی ترجمے چھپے۔

پاکستان آنے کے بعد سیدہ انیس فاطمہ نے مہاجرت کے مصائب جھیلے بلکہ قریب کی جھگیوں میں آباد مہاجر بستیوں میں سماجی کاموں کے سلسلے میں اپنے مشاہدات کو قلم بند کیا۔ انہوں نے معاشی ذہنی مشکلات کے باوجود اپنے شوہر (جو میونسپل کارپوریشن کراچی کے ممبر تھے) کے ساتھ ساتھ گلبہار، جلال آباد، فردوس کالونی، مسلم لیگ کوارٹرز، عثمانیہ کالونی اور رضویہ کالونی میں حتیٰ الامکان سماجی کام کیے۔ اس دوران انہوں نے کئی کتابیں لکھیں جن کے کئی ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔ ان کے مزاج میں قدیم وجدید علوم وفنوں کا حسین امتزاج اور روہیل کھنڈی کی غیور خواتین کی مانند دلیری، سیر چشمی اور عامتہ الناس سے غیر معمولی ہمدردی کا مادہ قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ انیس فاطمہ نے ۴۷-۱۹۴۶ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کو اغیار سے بچانے کے واسطے صاحب سنگھ مہرہ آنجہانی مدیر ''جنتا یگ ہندی'' علی گڑھ کے ساتھ یونیورسٹی اور شہر سے ملحق ہندو بستیوں میں جا کر مسلمانوں کے خلاف جذبات ٹھنڈے کیے اور ماحول بدلنے کی کامیاب کوششیں کیں جس کا ذکر مصطفیٰ علی بریلوی نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''۱۹۴۷ء کے آنسو'' میں کیا ہے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۵ء کو انیس فاطمہ دارِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔ سخی حسن قبرستان میں محوِ ابدی ہیں۔ مندرجہ ذیل ان کی تالیفات اور تصنیفات ہیں:

(۱) ''۵۷ء کے ہیرو'' (۲) ذکر وفکر (۳) ''پاکستان کا معاشی پس منظر'' (۴) ''چوتھی دنیا''

(۵) ''ادب منزل بہ منزل'' (۶) ''تاثرات ومشاہدات'' (۷) ان کہی کہانیاں''

--••☆••--

اویس احمد ادیب، پروفیسر

مشہور و معروف تنقید نگار اویس احمد صدیقی یکم جنوری سنہ ۱۹۱۷ء کو جھانسی کے تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد سرکاری ملازم تھے جن کا آئے دن مختلف شہروں میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ البتہ ان کی ملازمت کا زیادہ عرصہ الہ آباد میں گزرا اس طرح اویس احمد نے ساری تعلیم الہ آباد میں رہ کر حاصل کی۔ انہوں نے بی اے (آنرز) اور ایم۔اے اسناد الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ ان کے اساتذہ میں پروفیسر اعجاز حسین، ضامن علی اور دیب صاحب تھے۔ اویس احمد صاحب کے دورِ طالب علمی میں دیب صاحب کا شمار الہ آباد یونیورسٹی کے نامور اساتذہ میں ہوتا تھا۔ ان کا تعلق انگریزی ادب کے شعبہ سے تھا۔ اویس احمد ادیب کو ڈرامہ سے جو دلچسپی ہوئی وہ دیب صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد اویس احمد صاحب نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ پہلے وہ الہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے اس کے بعد وہ اردو ادب کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہو کر حلیم مسلم کالج کانپور چلے گئے۔ یہیں سے ان کی ادبی خدمات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جب قلم کی قلمرو پر ان کا اقتدار مسلم ہوا تو باقاعدہ کتابیں تصنیف کرنا شروع کیں جن میں تحقیق اور تنقید کے علاوہ تخلیقی ادب بھی پیش کیا۔ تخلیقی ادب میں ان کے ڈرامے بڑی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ دو ڈرامے پرتھال یا حور دکن اور عفراء یا ماہ عرب پانچ ایکٹ پر مشتمل ہیں جبکہ کئی ڈرامے ایک ایکٹ کے بھی لکھے ہیں جن میں نکر، دودھاری وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔

تقسیم کے بعد اویس احمد ادیب پاکستان آ گئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ یہاں پر وہ ایس ایم کالج میں معاشیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ قبل تقسیم انہیں اردو ادب سے بے حد لگاؤ تھا لیکن پاکستان آنے کے بعد ان کی توجہ معاشیات کی طرف مبذول ہو گئی۔ معاشیات میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا اور اسی کی تدریس بھی کرتے رہے۔ بحیثیت معاشیات کے استاد انہوں نے

سید غوث علی شاہ (وزیر اعلیٰ سندھ، وزیر تعلیم حکومت پاکستان)، نواز علی خاں مروت اور سید ظفر علی شاہ جیسے بڑے قابل اور ہونہار شاگرد پیدا کیے۔

ڈاکٹر سید سعید احمد صاحب اپنی کتاب ''شہر ادب کانپور'' میں اویس احمد ادیب کی ادبی، تحقیقی اور تخلیقی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اویس احمد ادیب نے تحقیق کے میدان میں بڑے وقیع کام کیے ہیں مثلاً اردو کا پہلا شاعر مدون۔ ولی دکھنی (۱۹۴۰)ء اردو کا پہلا ناول نگار۔ نذیر احمد (۱۹۳۲)ء اردو زبان کی نئی تحقیق (۱۹۴۱) اور اردو کا پہلا ڈرامہ نگار۔ واجد علی شاہ۔ ان تصانیف کو اولیات کا درجہ حاصل ہے کیونکہ جس وقت یہ کتابیں شائع ہوئیں۔ اس وقت ان موضوعات پر بہت کم کام ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ بعد کے محققین اور ناقدین نے ان کتب کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان کتابوں کے علاوہ جستہ جستہ مضامین میں فسانہ عجائب کے ماخذوں کا کھوج (زمانہ کانپور جون ۱۹۴۵ء) اور علامہ راشد الخیری کی طرز تحریر (زمانہ کانپور مارچ ۱۹۳۲ء) اور اس جیسے دوسرے مضامین جو مختلف رسائل میں ملتے ہیں اور جس سے ان کے ذوقِ تحقیق پر روشنی پڑتی ہے۔

تنقیدی کتب میں چند کے نام یہ ہیں:

تنقیدی مطالعے، تنقیدیں، نئی و پرانی تنقیدیں اور ادبی تعارف

ان میں مختلف ادباء اور شعراء پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان میں قدیم اور جدید دونوں اہلِ قلم شامل ہیں۔ ''تنقیدیں'' پہلی بار کانپور میں شائع ہوئی تھیں لیکن اس کا دوسرا ایڈیشن قمر کتاب گھر اردو بازار کراچی نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ اس کے چند عنوانات پر نظر ڈالنے سے ہی ادیب صاحب کے علم کی وسعت اور حاسۂ انتقاد کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً ایک مضمون میں مثنوی سحر البیان میں مافوق الفطرت عناصر پر بحث کی ہے دوسرے میں علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری کو فن کی کسوٹی پر پرکھا ہے اسی طرح عزیز لکھنوی کی قصیدہ گوئی، کلام حسرت میں سیاست کے اشارے، مرثیہ کا تدریجی ارتقاء، امراؤ جان ادا کی ادبی قدر و قیمت اور خطوط نویسی میں غلام غوث بے خبر کا مقام جیسے

مضامین ان کی ناقدانہ حیثیت متعین کرتے ہیں-
تخلیقی کاموں میں ان کے ڈرامے ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں- دو ڈرامے ایک ایکٹ کے بھی لکھے ہیں جن میں ٹکر' فرزانہ اور دودھاری وغیرہ بہت مشہور ہوئے- متعدد ریڈیائی ڈرامے بھی تحریر کیے جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے تھے- بچوں کے لیے کچھ کہانیاں بھی لکھیں''

۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو اویس احمد ادیب دارِ فانی سے رخصت ہو گئے-

---••☆••---

بزمؔ انصاری

بزمؔ کا اصل نام سید محمد، بزمؔ تخلص اور بزمؔ انصاری قلمی نام ہے۔ان کی پیدائش ۲رجنوری سنہ ۱۹۲۲ء کو یوپی (بھارت) کے مردم خیز شہر امروہہ میں ہوئی۔ان کے والد محمد عبدالہادی انصاری کا امروہہ کے معتزلوگوں میں شمار تھا۔ابھی بزمؔ انصاری شیر خوار ہی تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ فریضۂ رضاعت ان کی بڑی بہن نے انجام دیا۔اِس بہن کے سوا بزمؔ کا کوئی حقیقی بھائی یا بہن نہیں تھا۔بزمؔ انصاری کے والد بڑے خوشحال تھے لیکن ان کی وفات کے بعد حالات اس قدر نامساعد اور ناسازگار ہو گئے کہ امروہہ میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم، فیس معاف کرا کے حاصل کی۔عہد طفلی میں والدین کی وفات بہت بڑا غم تھا جس نے انہیں شاعری کی طرف مائل کر دیا۔وہ خود بھی اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں:

"میں نے امروہہ کی سخن پرور زمین سے اپنی شعرگوئی کا آغاز اس وقت کیا جب بقول خود ؎

ابھی تو دن تھے مرے عیش و شادمانی کے
ابھی تو معنی بھی سمجھے نہ تھے جوانی کے

..........زندگی کے سولھویں برس میں تھا کہ زندگی کے انتہائی نامساعد اور ناسازگار حالات سے پیدا شدہ غم نے مجھے شعرگوئی کی طرف مائل کیا اور میں نے اپنی سرگزشت "آپ بیتی" کے عنوان سے نظم کہی۔"

بزمؔ انصاری فرماتے ہیں کہ انہوں نے شعرگوئی میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔تاہم شاعری کے فنی نکات و رموز کی تفہیم کی خاطر حیاتؔ امروہوی اور اپنے خالہ زاد بھائی شعیب حزیں سے مشورہ کرتے رہے۔سنہ ۱۹۴۱ء میں وہ میرٹھ گئے جہاں سنہ ۱۹۴۲ء میں میرٹھ کی نوچندی کے میلے پر آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام و انصرام ان کے سپرد ہوا۔یہاں پر بزم انصاری کو سید ذوالفقار علی بخاری، شکیل بدایونی، مولانا ماہر القادری اور نخشب جارچوی سے دوستی اور رفاقت کا موقع ملا۔اس کے بعد سنہ ۱۹۴۳ء میں بزمؔ انصاری

نے دہلی جا کر ایئر ہیڈ کوارٹرز میں ملازمت اختیار کر لی اور اس کے ساتھ ہی آل انڈیا ریڈیو سے بحیثیت شاعر وابستہ ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو پر وہ نعت کے علاوہ غزل اور نظم بھی پڑھتے تھے۔ ریڈیو سے وابستگی کے باعث مختلف شہروں میں مدعو کیے جانے لگے اور اس طرح شاعری ذریعہ معاش بن گئی۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۲۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو بزمؔ انصاری پاکستان آ گئے۔ یہاں آ کر ریڈیو اور ایئر ہیڈ کوارٹرز کی ملازمت چھوڑ کر اپنی تمام تر توجہ تعلیمی ادارے قائم کرنے پر صرف کی۔ اس نئے میدان میں جناب رئیس امروہوی اور شکیلہ خانم کی دستگیری سے انہوں نے کئی قابلِ فخر ادارے قائم کیے۔ شاعری کے معاملے میں ان کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ انہوں نے جو کچھ کہا اسے صحیح طور پر محفوظ نہیں رکھ سکے۔ رئیس امروہوی کی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے بزمؔ انصاری لکھتے ہیں:

''حضرتِ رئیس امروہوی کو کم و بیش نصف صدی سے جو تعلق خاص اِس ناچیز سے ہے اس کا اندازہ زیرِ نظر مجموعے پر اُن کے تبصرے سے لگایا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے سب سے زیادہ فیض و اثر بھی اُن ہی سے قبول کیا ہے۔ اُن ہی کی مسلسل تحریک اور سرپرستی کے باعث یہ چند منتشر صفحات ''آب جو'' کی صورت میں اشاعت کی منزل تک پہنچے ہیں۔''

بزمؔ انصاری کے مجموعہ کلام کے بارے میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ فرماتے ہیں:

''سنہ ۴۷ء سے قبل دہلی میں شعر و سخن کی جو روح پرور مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں۔ بزمؔ انصاری ان محفلوں کے رکنِ رکین تھے۔ میں اُسی وقت سے جناب بزمؔ انصاری کے کلام سے متاثر ہوں۔ اب جو مرتب شکل میں ان کا مجموعۂ کلام نظر سے گزرا تو دل پر ایک عجیب عالم گزر گیا۔''

بزمؔ انصاری کے مجموعہ کلام ''آب جو'' کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے۔

دل و دماغ میں باہم تھیں قُربتیں کیا کیا ۔۔۔ اُسے بُھلا کے بھی یاد آئیں صحبتیں کیا کیا

سفر تمام ہوا دے کے داغ ہم سفری ۔۔۔ خیال و خواب ہوئی ہیں رفاقتیں کیا کیا

ٹھہر ٹھہر کے بجھا آخرش شرارۂ دل! ۔۔۔ وفا نے آج دِلائی ہیں غیرتیں کیا کیا

ابھی تو عذرِ ملاقات ہی تک آئے ہیں ۔۔۔ ابھی تو دیکھیے ہوں گی قباحتیں کیا کیا

وہ بزمؔ جو دل و جاں سے عزیز تھا ہم کو ۔۔۔ اسی عزیز نے دی ہیں اذیتیں کیا کیا

سیرِ گل کیا تری فرقت میں خزاں بختوں کو
آمدِ صبحِ بہاراں بھی گراں گزری ہے

سوچا تھا کڑی دھوپ میں یاروں کے محل ہیں
دیکھا تو کہیں سایۂ دیوار نہیں تھا

میں کیا کہوں لبِ گویا نے ساتھ چھوڑ دیا
وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ شرحِ آرزو تو کرے

دم تو لینے دو اب اتنی بھی عنایت نہ کرو
آدمی بارِ عنایت سے بھی مرجاتا ہے

گیا وہ جلوہ، وہ جذبہ، وہ محفلیں بھی گئیں
نہ اب وہ شمعِ فروزاں نہ وہ پروانے

کسے گماں تھا کہ بن جائیں گے رقیب وہی
وہ خیر خواہ! جو آتے تھے ہم کو سمجھانے

وہ جاں نثاریٔ باہم وہ پاسِ عہدِ وفا
وہ لوگ بزمؔ کہاں کھو گئے خدا جانے

زمانہ اتنا بھی ناقدر و ناشناس نہ تھا
جو بزمؔ کوئی بڑا کام کر گئے ہوتے

کم نہ ہوگی تری پرستاری
ہم نہ ہوں گے تو دوسرا ہوگا

---••☆••---

بشارت علی، ڈاکٹر

عمرانیات کے نامور عالم ڈاکٹر بشارت علی پہلی جنگِ عظیم کے دوران حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد عثمانیہ یونی ورسٹی سے سوشیالوجی میں بی اے کیا۔ اس میں درجہ اوّل میں کامیاب ہونے کی وجہ سے انہیں وظیفہ دے کر اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی بھیجا گیا۔ جرمنی جاکر بشارت علی صاحب نے فرسٹ کلاس پی ایچ ڈی کیا۔ پی ایچ ڈی میں ان کے مقالہ کا نام ''سوشیل پرابلم آف اکبر گورنمنٹ'' تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ الیگزینڈر فن ہم بولڈ کے ریسرچ اسکالر مقرر ہوئے اور انہوں نے دوسرا مقالہ ''اورنگ زیب کے عمرانی مسائل'' کے موضوع پر لکھا اور نمایاں کامیابی کی بناء پر اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز جرمنی میں تاریخ اور اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ برلن کے علاوہ انہوں نے فرانس اور لندن میں بھی تعلیم حاصل کی۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ملاقات نہ صرف ہٹلر بلکہ عمرانیات کے عالمی شہرت یافتہ علما سے بھی ہوتی رہی جو جرمنی میں مقیم تھے۔

ہٹلر کے برسرِ اقتدار آجانے کے بعد ڈاکٹر صاحب حیدرآباد دکن واپس آگئے اور جامعہ عثمانیہ میں سوشیالوجی کے لیکچرار مقرر ہوگئے۔ بعدازاں حکومت حیدرآباد کے اصلاحی نظام کی بناء پر ان کا تقرر محکمہ الیکشن میں بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر عمل میں آیا۔ تقسیم ہند کے بعد بشارت علی صاحب پاکستان آگئے اور لاہور میں قیام کیا۔ یہاں پر انہوں نے آفیشل لینگویج کمیٹی، جیل ڈیپارٹمنٹ اور ری کنٹرکشن ڈیپارٹمنٹ میں خدمات انجام دیں۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی میں عمرانیات اور اسلامیات کے شعبے میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے اور جرمن زبان کے لیکچرر بھی رہے۔ ۱۹۶۴ء میں وہ کراچی منتقل ہوگئے اور جامعہ کراچی کے شعبہ عمرانیات سے وابستہ رہے اور عمرانیات کو مقبول بنایا۔ ڈاکٹر صاحب نے قرآنی عمرانیات کو ایک جداگانہ مضمون کی صورت دے کر اس کو پوری دنیا میں متعارف کرایا۔ قرآنی عمرانیات کے موضوع پر انہوں نے ایک درجن سے زیادہ اعلیٰ پائے کی تحقیقی کتابیں تصنیف کیں اور ابن سینا، ابن رڈ، ابن خلدون، فارابی اور غزالی کے نظریات کو آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کس مپرسی کے باعث یہ شاندار علمی ذخیرہ طبع نہ کرا سکے۔ شاید حکومت کے کسی مخلص اہل کار یا کسی بڑے دردمند ناشر کی توجہ اس طرف مبذول ہو اور ملت اسلامیہ کے لیے انتہائی مفید ان علمی و تحقیقی تالیفات کی اشاعت کا انتظام ہوسکے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں اپنی زندگی کی ایک تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سنہ ۱۹۵۰ء میں میری زندگی میں تبدیلی آئی - پنجاب یونی ورسٹی میں عمرانیات پڑھاتے ہوئے مجھے امریکن لائبریری سے تعلق پیدا ہوا - چونکہ جرمن سوشیالوجی کا پاکستان میں پڑھایا جانا درخور اعتنا نہ تھا اور میں امریکن سوشیالوجی سے واقف نہ تھا - جس سے آگاہی کے لیے امریکن لائبریری سے میرا تعلق قائم ہوا - ہمارے ہاں ایم اے کے لڑکوں کو امریکی عمرانیات پڑھائی جاتی ہے جس کا انحصار عمرانی علم کے بجائے مستھلات کی تعلیم ہے - چندگنی چنی اصطلاحوں پر عمرانیات کا انحصار ہے - اس طرح ہمارے طلبہ عمرانیات کے باضابطہ علم سے واقف نہ ہونے کی بنا پر تذبذب کے عالم میں پڑ جاتے ہیں اور ان کو کوئی علمی بصیرت اور آگاہی نہیں ہوتی - اب تو زیادہ تر انحصار شماریات پر ہے - اسی طرح علمی اور فلسفے کے اساس پر جو ترقی جرمنی کے علاوہ فرانس اور روس میں ہوئی ہے اس سے طلبہ واقف نہیں ہیں -
پاکستان آنے کے بعد میری نظر بائبل کی سوشیالوجی پر پڑی - اسی کے ساتھ میں نے کئی کتابیں 'سوشیالوجی آف مسیح' پر دیکھیں - ان دو کی وجہ سے میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر منسوخ شدہ بائبل کی سوشیالوجی ہو سکتی ہے تو قرآن کی سوشیالوجی کیوں نہیں ؟ یہ پہلو میری زندگی کو بدلنے کا موجب ہوا اور میں نے قرآنی عمرانیات پر کام شروع کیا - دنیا میں ، میں ایک ہی ہوں جسے قرآنی عمرانیات کے پیش کرنے کا فخر حاصل ہے - ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے پذیرائی کی اور قرآنی عمرانیات کا ایک شعبہ کراچی یونی ورسٹی میں قائم کیا -''

ڈاکٹر بشارت صاحب اس مضمون کو شعبۂ عمرانیات اور شعبۂ اسلامیات میں برسوں تک پڑھاتے رہے - ڈاکٹر صاحب نے تحقیقاتی اور تدریسی کام اپنی ضعیفی تک جاری رکھا - ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا:

''اب میں اس قدر ضعیف ہو گیا ہوں کہ تحقیقاتی کام میں سستی پیدا ہو گئی ہے - لیکن پھر بھی تحقیقاتی کام، مضمون نگاری کا کام اور تدریس کا کام جاری ہے - پاکستان جیسے اسلامی ملک میں چاہیے تو یہ تھا کہ اس مضمون کی پذیرائی ہوتی - لیکن یہ توقع ایک خوشگوار خواب ہے -
بہرحال زندگی کا یہ مشن کوئی ساتھ دے یا نہ دے سانس اکھڑنے تک جاری رہے گا - میں

نہیں جانتا کہ میری تصانیف کا کیا حال ہوگا اور میرے کتب خانے کا کیا حشر ہوگا- لیکن اسلام کی سنت کو جاری رکھنا میرا ایمانی فرض ہے-"

ڈاکٹر بشارت صاحب نے تدریسی کام کے علاوہ ملک کے مختلف جرائد میں ہزاروں مضامین اس موضوع پر لکھے ہیں- تدریسی کام کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری کے علاوہ عمرانیات پر کتابی شکل میں بھی کم وبیش ایک لاکھ صفحے لکھے ہیں- ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر صاحب دارفانی سے رخصت ہوگئے-

---••☆••---

پاشا رحمٰن

پاشا رحمٰن صوبہ بہار کے دارالحکومت عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آئے اور ڈھاکہ میں رہائش اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم رحمت اللہ ماڈل ہائی اسکول ڈھاکہ میں حاصل کی۔ قائداعظم کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ ڈھاکہ گورنمنٹ کالج، جس کا شمار ملک کے بہتری کالجوں میں ہوتا تھا، سے منسلک ہوگئے۔ انہوں نے اس کالج میں بحیثیت پروفیسر ساڑھے تین سال تک پڑھایا۔ پاشا رحمٰن نے مشرقی پاکستان کے مشہور روزنامہ ''مارننگ نیوز'' میں بھی چند دن سب ایڈیٹر کے فرائض انجام دیے تھے۔ اسی دوران وہ اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں شریک ہوئے اور اس میں کامیاب ہوکر مرکزی حکومت کے ایک محکمہ سے وابستہ ہوگئے۔

پاشا رحمٰن کا تعلق اس تاریخی بستی سے ہے جہاں نامور شاعر، نقاد، عالم اور دانشور پیدا ہوئے ہیں اور جسے عظیم آباد کہا جاتا ہے۔ انہیں بچپن ہی سے ادب سے دلچسپی رہی ہے۔ اسکول کی فضا نے ان کے ادبی ذوق میں مزید اضافہ کیا جہاں نہایت قابل اساتذہ پڑھاتے تھے۔ اس اسکول سے ایک ادبی ماہنامہ ''شاہین'' کے نام سے نکلتا تھا جسے ادبی ذوق رکھنے والے بہت پسند کرتے تھے۔ اسی زمانے میں پاشا رحمٰن شعر بھی کہنے لگے تھے لیکن سنانے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر کبھی انہوں نے سنائے بھی تو کچھ احباب نے ایسی تنقیدیں کیں کہ جن سے انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن ان کے ایک استاد جناب حسن رضا صاحب نے ان کی بڑی ہمت افزائی کی اور انہیں شعرگوئی کی ترغیب دیتے رہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں پاشا رحمٰن لکھتے ہیں:

''میری شاعری پر دو واقعات نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اول تو وہ ناکامیاں، نامرادیاں، حسرتیں، صعوبتیں، پریشانیاں، مشکلیں اور کسک جو میرا مقدر بن گئیں۔ دوم مشرقی پاکستان کے سقوط کا اندوہناک سانحہ..........! قیام پاکستان کے لیے اس قوم نے کیا کیا

قربانیاں نہیں دیں اوران قربانیوں کے بعد پاکستان حاصل ہوا تو اس کا ایک بازو کٹ گیا۔''

۱۹۷۱ء میں پاشا رحمٰن کا تبادلہ کراچی ہوگیا تو وہ یہاں چلے آئے۔ یہاں پر وہ محکمہ انکم ٹیکس سے وابستہ رہے۔ کراچی آنے سے پہلے انہوں نے ایک مختصر شعری محفل کا اہتمام کیا جس میں معروف شعراء شریک ہوئے اس محفل کے مہمان خصوصی ممتاز شاعر و ادیب شمس شیدائی تھے۔ پاشا رحمٰن کے مجموعۂ کلام میں اس محفل کا ذکر اقسر ماہ پوری نے بھی اس طرح کیا ہے:

سنہ ۱۹۷۱ء کے اوائل کی بات ہے۔ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوجیں بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھیں، بظاہر حالات مائل بہ سکون نظر آرہے تھے۔ اسی اثناء میں پاشا رحمٰن کا تبادلہ کراچی ہوگیا۔ کراچی روانہ ہونے سے پہلے انہوں محمد پور میں اپنے گھر پر ایک مختصر شعری محفل کا اہتمام کیا۔ اس محفل میں ہمارے مشترک دوست اور مشرقی پاکستان کے ممتاز شاعر وادیب شمس شیدائی مہمان خاص تھے، پاشا کی دعوت پر میں بھی شریک محفل تھا۔

پاشا رحمٰن نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے برصغیر کے معروف شاعر فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

''شاعری کے پردے میں پاشا رحمٰن نے قلب ونظر کی جو منزلیں طے کی ہیں، ''نشاط کرب'' اُس راہ کا بہت نمایاں سنگ میل ہے۔ زندگی کی تہ داریوں کا حساس مگر سرمست راہی قلب کی گہرائیوں کے اندر اور باہر جو مسافتیں طے کرتا ہے یہ مجموعہ انہیں کا ایک موثر اور مرصع مرقع ہے۔

پاشا رحمٰن بیشتر اُسی ہزار گونہ عذاب کے ترجمان ہیں جو دورِ حاضر میں حساس دل کو مضطرب رکھتا ہے۔ لیکن یہی کرب نشاط اظہار کا ضامن بھی ہے اور نشاط آرزو کا محرک بھی۔ نشاط و کرب کا دلآویز امتزاج اہلِ دل کے لیے باعثِ اہتزاز ہوگا۔''

ریٹائر ہونے کے بعد آج کل پاشا رحمٰن کراچی میں انکم ٹیکس پریکٹس کرتے ہیں۔ ان کا کلام ملاحظہ کیجیے۔

اس دنیا میں ہم نے دیکھے کیسے کیسے لوگ
روپ تو اُن کا چندا جیسا لیکن من میں روگ

آش نراش کے عالم میں یہ جیون سارا بیتا
لیکن بھاگ میں لکھا کب تھا دو دل کا سنجوگ

پاشا جی! کیوں رو رو کر ہلکان ہوئے جاتے ہو تم؟
دنیا تو ہے آنی جانی کس کا کب تک سوگ

کبھی تو آؤ کہ گزرے دنوں کو یاد کریں
گزر گئے ہیں بہت دن بھی تم کو آئے ہوئے

چاندنی رات ہے بیداری ہے تنہائی ہے
ہائے کس وقت تری یاد مجھے آئی ہے

پھول کھلتے ہیں تو زخموں کا گماں ہوتا ہے
لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے

راہ تاریک ہے ملتا نہیں منزل کا سُراغ
ہائے قسمت مجھے کس موڑ پہ لے آئی ہے

اب اسی شہر میں برساتے ہیں پتھر ہم پر
ہم جہاں لائے گئے تھے بڑی توقیر کے ساتھ

زلفیں کسی کے رُخ پہ پریشاں ہیں اس طرح
سورج نے جیسے ابر بچھایا تھا دھوپ میں

چپکے چپکے شمع سوزاں رات بھی روتی رہی
رکھ کے اپنے سامنے محفل میں پروانے کی خاک

میری تربت پہ لگا دینا یہ کتبہ یارو!
"ہے یہ وہ شخص کہ لڑتا رہا تقدیر کے ساتھ"

کسی سے کیسے کہے، کوئی تجربہ دل کا
عجیب سانحہ ہوتا ہے، سانحہ دل کا

رات تھی کتنی گھٹن، اس کا عالم نہ پوچھئے
جس سے گھبرا کے نکلا، گھر کے باہر سو گیا

جب وہ آسیب زدہ دشت سے گزرا تو لگا
جیسے نوخیز سی بیوہ کا ہے آنچل دریا

شہر آشوب میں گلہائے وفا کس کو دوں؟
کون مخلص ہے، میں الزامِ جفا کس کو دوں؟

شہر کے شور میں صحراؤں کا سناٹا ہے
دیر سے سوچ رہا ہوں کہ صدا کس کو دوں؟

وہ تو یوسف تھا مگر کوئی بھی یعقوب نہیں
خوں میں ڈوبی ہوئی میں اُس کی قبا کس کو دوں؟

---••☆••---

پنہاںؔ بریلوی، سپہر آرا خاتون عرف رابعہ

اصل نام سپہر آرا، عرفیت رابعہ اور تخلص پنہاں ہے۔ ۷/اگست ۱۹۰۶ء کو سہارن پور (یوپی) بھارت میں پیدا ہوئیں۔ وہ بریلی کے ایک سربرآوردہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد عبدالاحد صاحب ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم الہٰ آباد کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا شمار بریلی کے معزز و معتبر لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کی چار بیٹیاں ہوئیں جن میں پنہاںؔ بریلوی منجھلی تھیں۔ عبدالاحد خود تو شاعر نہیں تھے لیکن ان کی چاروں بیٹیوں کو شعروسخن سے دلی لگاؤ تھا۔ پنہاںؔ جب شعر کہنے لگیں تو خود ہی اپنا تخلص پنہاںؔ تجویز کیا۔ ان کے ساتھ ان کی دوسری بہنیں بھی شعر کہنے لگیں۔

اس زمانے میں مسلمان لڑکیوں کو تعلیم عموماً گھروں ہی میں دی جاتی تھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ لڑکیوں کے اسکول بھی کم تھے دوسری وجہ لڑکیوں کو اسکول بھیجتے ہوئے والدین گھبراتے تھے۔ عبدالاحد صاحب کے گھر کا ماحول چونکہ علمی و ادبی تھا اس لیے بچوں کو بھی اس سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ ان چاروں لڑکیوں نے بیشتر تعلیم گھر پر اپنے والد صاحب سے حاصل کی۔ سپہر آرا رابعہ نے اُردو فارسی کے بعد انگریزی بھی پڑھی۔ ابھی وہ کم عمر تھیں کہ اُردو میں مضامین بھی لکھ لیتی تھیں۔ پنہاںؔ بریلوی نے ابتدا میں ماجد علی اور بعد میں طالب علی طالبؔ سے اصلاح لینا شروع کی۔ طالب علی طالبؔ عبدالاحد کے دوست کے بیٹے تھے جو الہٰ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ جب نظم ونثر میں سپہر آرا پنہاں کو خاصی دسترس اور عبور حاصل ہوگیا تو طالب علی طالبؔ نے انہیں فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔

۱۹۲۴ء میں پنہاں کے والد کا انتقال ہوگیا، جس کے بعد اس خاندان کو الہٰ آباد کی سکونت ترک کر کے اپنے آبائی شہر بریلی منتقل ہونا پڑا۔ یہاں آنے کے تین سال بعد ۱۹۲۸ء میں سپہر آرا رابعہ کا نکاح اُن کے اپنے ایک قریبی عزیز صوفی صغیر حسین صاحب سے ہوگیا۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ کئی شہروں میں رہے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج الہٰ آباد میں بحیثیت پرنسپل کی بھی خدمات انجام دیں۔ خوش قسمتی سے

رابعہ کے شوہر صوفی صغیر حسین صاحب بھی علمی ادبی ذوق کے آدمی تھے۔اس طرح پنہاںؔ کے ذوق کی تکمیل وترقی میں بڑے مددگار ثابت ہوئے۔بیگم نواب اسمٰعیل خاں نے میرٹھ میں انجمن خواتین قائم کی تو رابعہ پنہاںؔ بھی اس کی ممبر بنیں۔اس انجمن میں سب سے پہلا مشاعرہ انہی کے ایماء پر ہوا تھا۔دہلی اور لکھنؤ ریڈیو پر ہونے والے مشاعروں میں بھی رابعہ حصہ لیتی تھیں۔پنہاںؔ کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں چھپتا رہا ہے۔

رابعہ کو اپنے والد مولوی عبدالاحد صاحب کے انتقال سے بہت بڑا صدمہ پہنچا۔اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے والد سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھیں۔اس اندوہ ناک سانحہ سے متاثر ہو کر انہوں نے بہت سی نظمیں کہی تھیں، جن کا مجموعہ ''اشکِ خونیں'' کے عنوان سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔تقسیم سے قبل تک اُن کا کلام متحدہ ہندوستان کے بیشتر رسائل وجرائد میں کثرت سے چھپتا رہا ہے۔وہ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کرتی تھیں، دونوں زبانوں پر بخوبی دسترس حاصل تھی اور نظم نثر دونوں پر قدرت رکھتی تھیں۔غزل، نظم اور افسانہ ان کے خاص میدان تھے۔

تقسیم کے بعد ۱۹۴۹ء کو رابعہ اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ پاکستان آگئیں اور کراچی میں مقیم ہوئیں۔کراچی آنے کے بعد ان کے شوہر نے یہاں بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور مختلف کالجوں میں پرنسپل کے فرائض انجام دیتے رہے۔یہاں آ کر رابعہ کو اپنے ایک جواں سال بیٹے کی موت کا بہت بڑا صدمہ اٹھانا پڑا۔ان کے ایک بیٹے محمد بشیر خالد جو بزنس ریکارڈر میں تھے، قاہرہ جانے والے جہاز کے المناک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ایک جوان بیٹی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔اولاد کے غم نے رابعہ کو نڈھال کر دیا تھا۔۹/اکتوبر ۱۹۷۲ء کو پنہاںؔ بھی ملکِ عدم کو رخصت ہو گئیں۔ان کا کلام ملاحظہ کیجیے:

شاخِ گل پر چار دن اپنا نشیمن اور ہے
مضطرب کس واسطے ہیں برق و باد و باغباں

دورِ خوش کامی یہ اپنا ہے فقط دو روز اور
پھر یہی کنجِ قفس ہوگا ہمارا آشیاں

اس نشاطِ عارضی سے دل لگا کر کیا کریں
چھوٹ ہی جائے گا ہم سے چار دن میں آشیاں

دورِ خوش کامی گیا، عہدِ نشاط افزا گیا
باغباں دشمن، عدو گل ہیں خفا ہے بوستاں

یاد کر لینا کسی آوارہ قسمت کو کبھی
آئے جب دورِ بہار، اے اہلِ بزمِ بوستاں

زخمِ دل میں آہ ٹیسیں بے شمار اٹھنے لگیں
کر گیا ٹکڑے جگر کے، سوزِ پنہاںؔ کا بیان

حادثاتِ زندگی کے طول افسانوں کو ہم
داستانِ زندگی کا تھا یہی لب لباب
میں اک طرف ہوں، شکلِ خزاں، پایمالِ یاس
عشقِ جنوں نواز چلا بزم ناز میں
مرہم سے بے نیاز ہیں، پنہاںؔ! یہ زخمِ دل
جیسے سناٹا سکوت موت کا
بجھ گیا آخر چراغ شام بھی

ایک ہچکی کی مدد سے مختصر دیکھا کیے
کچھ بگولے زیرِ گردوں منتشر دیکھا کیے
اک سمت وہ بہار کا جلوا لیے ہوئے
اِک اضطراب و شوق کی دنیا لیے ہوئے
کیا کیا فسوں ہے چشمِ دل آرا لیے ہوئے
دل کی ویرانی کا یہ انداز تھا
اک یہی باقی مرا ہمراز تھا

شہرِ خموشاں

سامنے کیا منظرِ عبرت نما ہے خاک پر
شہر خاموشاں ہے یعنی بستیِ اندوہ و یاس
یہ عمارت عجیبہ یہ مکانات غریب
اُف یہ عالم ہو کا، اور یہ رات کی سنسانیاں
یہ خموشی یہ اداسی اور یہ رنگ ہراس!
آہ یہ حسرت کی منزل آہ یہ غم کا مکاں
اُف تڑپ کر آہ سینہ سے لبوں پہ آگئی
آہ اے گوشہ نشینوں، کچھ سناؤ دردِ دل

دل تڑپ جاتا ہے جس کی حسرتِ غم ناک پر
چھا رہا ہے جس کے ہر ذرہ پر اک خوف و ہراس
اور مکیں ہیں بے زباں، غم آشنا، حسرت نصیب
اُف یہ تاریکی، یہ سناٹا، یہ حسرت کا سماں
اور اس منزل کے رہنے والوں کا اندازِ یاس
اور اس ویرانہ میں آباد ہے اتنا جہاں
منظرِ جاں سوز سے آنکھوں میں حسرت چھا گئی
کیوں ہے اس وحشت کدے میں یہ قیام مستقل

فارسی کلام

جمالش زینتِ دل بود، شب جائے کہ من بودم
نگاہم بر تجلائے رُخِ آینہ رخسارے!
دلم پرداخت بایادِ جمالِ دوست و او بامن
چناں دل محوِ ساز و زیادِ کیفِ دوشینہ
خطِ رنگیں کہ بر پیشانیِ بسمل کشد تیغے
خم زلفِ نگارے کرد پنہاںؔ طرفہ اعجازے

چشمِ دہر باطل بود، شب جائے کہ من بودم
سرم بر پائے قاتل بود، شب جائے کہ من بودم
وجود غیر باطل بود، شب جائے کہ من بودم
دلم نخچیرِ قاتل بود، شب جائے کہ من بودم
نشانِ عشقِ کامل بود، شب جائے کہ من بودم
خیالم درسلاسل بود، شب جائے کہ من بودم

---••☆••---

تاج بلوچ

تاج بلوچ ۲۵ رمئی ۱۹۴۲ء کو پنو عاقل میں پیدا ہوئے۔ اِن کا خاندانی نام میر تاج محمد خان بلوچ اور اِن کے والد بزرگوار کا نام میر نور محمد خان بلوچ ہے۔ تاج بلوچ کا تعلق علمی وادبی گھرانے سے ہے۔ اِن کے آباو اجداد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جنگِ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جس کی پاداش میں اِن کے خاندان کے لوگوں نے جیلوں کی صعوبتیں بھی اُٹھائیں۔ یہ لوگ خلافتِ تحریک اور ریشمی رومال تحریک میں بھی شامل رہے۔ تاج بلوچ کی شاعری کا محرک بھی جنگِ آزادی تھا۔ علی گڑھ کے کلچر کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ علی گڑھ کا کلچر انسان دوستی اور محبتوں کا کلچر ہے۔

تاج بلوچ نے ابتدائی تعلیم پنو عاقل میں حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء میں کراچی بورڈ سے میٹرک اور ۶۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے انٹر پاس کیا۔ اِس کے بعد ۱۹۷۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی اے اور پھر ۸۲ء میں پوسٹ گریجویٹ کیا۔ تاج بلوچ کو سندھی، سرائیکی، اُردو اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری مادری زبان سرائیکی ہے لیکن علاقائی زبان سندھی اور اُردو ہماری روح کی زبان ہے۔

تاج بلوچ معروف صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب، ایک دانشور، شاعر، سیاسی وسماجی کارکن اور بے باک اور نڈر صحافی بھی ہیں کہ سچ بات کہنے میں وہ کبھی نہیں گھبراتے۔ سندھ کی معاشی بدحالی، محرومی اور ناانصافی پر اُنہوں نے ہمیشہ آواز اُٹھائی ہے اور کبھی خوف نہیں کھایا۔ وہ کئی کامریڈ رہنماؤں کے ساتھ بھی کام کر چکے ہیں۔ ایک بے باک صحافی ہونے کے ناتے اِنہیں بڑی پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تاج صاحب نے ریڈیو اور ٹی وی پر بھی بہت کام کیا ہے اور کئی علمی وادبی پرچوں سے بھی منسلک رہے ہیں۔ آج کل وہ کراچی سے ایک ماہنامہ ''سوجھرو'' نکال رہے ہیں۔ اس کے علاوہ تاج بلوچ صاحب کئی علمی ادبی اداروں میں بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اُن کی تصانیف میں ورد جو صحرا (۱۹۷۰)، خوشبو جو سحر (۱۹۸۷ء)، ملفظن جو ماتم (۱۹۹۴ء) دل جزیرو دانس سپنن جو (۲۰۰۰ء)

چار دیوان چھپ چکے ہیں اور میگھار (اُردو شاعری) تنقید (تنقیدی مضامین) زیرِ طباعت ہیں- تاج بلوچ کو اُن کی علمی ادبی خدمات پر متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے- اِن کے پہلے شعری مجموعے درد صحرا پر رائٹر گلڈ نے بہترین سندھی شعری مجموعے کا ایوارڈ دیا-

اُن کی ایک نظم ملاحظہ کیجیے جو آمریت کے خلاف جدو جہد کی عکاسی کرتی ہے-

سرکش چیخ

شہر کے شور میں جو دب نہ سکی!
درد کی چیخ تھی کچھ اتنی عجیب
کہ وہ تیزی سے بڑے بُرجوں سے
سر کو ٹکراتے ہوئے
شہر کے سب سے بڑے چوک پہ آ پہنچی ہے
جہاں لوگوں کے ہجوم
درد کی چیخ کو پہلی بار
بڑی حیرانی سے اور ہنستے ہوئے گھورتے ہیں
اپنی جیبوں میں رکھے
اپنے حصے کو عذابوں کی شباہت کو
چیخ سے کر کے تقابل
آہ بھرتے ہوئے
چوک سے دور نکل جاتے ہیں
کوئی بھی چیخ کا ادراک نہیں کر پاتا
چیخ تنہا وہیں رہ جاتی ہے
درد کی چیخ بظاہر جو بڑی سرکش تھی
شہر کے شور میں دب جاتی ہے

--••☆••--

تسنیم مینائی، اسماعیل احمد

برِ صغیر میں انیسوی صدی کے اختتام پر علم وادب کی دنیا عظیم ہستیوں سے معمور تھی اور ان کی پُر شکوہ اور دل نشین آوازوں سے گونج رہی تھی۔ان میں ایک منفرد اور جامع شخصیت اودھ کے مشہور اور جامع کمالات منشی امیر احمد مینائیؔ کی تھی جو شاعری، نثر نگاری، علوم دینیہ، عربی، فارسی اور ہندی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے جن کا لوہا ان کے ہم عصر اور بعد کے ذی شعور علماء و فضلاء نے مانا ہے

منشی امیر احمد مینائی کے بڑے فرزند محمد احمد مینائی المتخلص بہ صریرؔ بھی شاعر تھے۔صریرؔ کے بڑے بیٹے اسماعیل احمد تسنیمؔ مینائی ۱۳ر جنوری ۱۹۱۰ء کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم مراد آباد اور فیض آباد میں ہوئی جہاں سے امتیازی نمبروں میں میٹرک پاس کرنے کے بعد انہوں نے کرسچن کالج الٰہ آباد سے ایف ایس سی اور پھر الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا۔الٰہ آباد میں ان کے علم وادب سے ذوق اور شاعری کے شوق میں بہت اضافہ ہوا۔وہ مشاعروں اور علمی جلسوں کا اہتمام کرتے اور ملک کی سیاسی وسماجی سرگرمیوں سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

الٰہ آباد سے گریجویشن کے بعد ان کے چچا لطیف احمد مینائی (اختر یار جنگ) نے ان کو حیدر آباد دکن بلالیا جہاں سے انہوں نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور سارے صوبے میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔اب ان کے سامنے عدالتِ اعلیٰ کے دروازے کھل گئے۔وہ منصفی کے اعلیٰ عہدوں پر حیدر آباد دکن کے مختلف اضلاع میں تعینات رہے۔حیدر آباد دکن میں سنہ ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن ہوا جس کے بعد ریاست حیدر آباد دکن ہندوستان کی جمہوریہ میں ضم ہوگئی۔اس حادثے کا گہرا اثر سارے خاندان بالخصوص اسماعیل احمد مینائی پر ہوا جن کے تمام اعزا، دوست احباب، شاعر و ادیب متاثر ہوئے۔ایسے حالات دیکھ کر انہوں نے مجبوراً پاکستان ہجرت کر جانے کا فیصلہ کیا۔

اسماعیل احمد مینائی سنہ ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے اپنے اعزا کے ساتھ کراچی آگئے۔یہاں آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد انہیں سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ کا سیکریٹری مقرر کیا گیا۔یہاں کچھ عرصہ کام

کرنے کے بعد جناب اے ٹی نقوی صاحب نے انہیں میونسپل کارپوریشن کا چیف آفیسر مقرر کیا۔ اس عہدے پر وہ مسلسل کئی سال تک کام کرتے رہے۔ میونسپل کارپوریشن میں ان کے آخری دور میں راقم الحروف نے بھی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ آرکیٹیکٹ میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت اس محکمہ کے سربراہ جناب ایس اے حکیم مرحوم تھے۔ میونسپل کارپوریشن سے ریٹائر ہونے کے بعد اسماعیل احمد مینائی کو جناب یوسف ہارون صاحب نے انٹرکونٹی نینٹل میں بحیثیت ڈائریکٹر لے لیا۔ یہاں پر بھی انہوں نے کئی سال تک خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوشی حاصل کر لی۔

تسنیم مینائی بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا اور مشکل وقت میں ان کی مدد کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ برِصغیر کے مشہور و معروف شاعر ماہر القادری جو ماہنامہ ''فاران'' نکالتے تھے ان کے قریب ترین دوست تھے۔ ان کے انتقال کے بعد تسنیم مینائی نے ماہنامہ ''فاران'' کی ایڈیٹری سنبھالی نیز ایک سہ ماہی رسالہ ''اسلامک آرڈر'' بھی جاری کیا۔ علامہ حیرت بدایونی، ذوالفقار علی بخاری، محشر بدایونی اور تابش دہلوی وغیرہ بھی ان کے قریبی دوست تھے۔ ان کی ایک بہن آمنہ کمال سرسید گرلز کالج کی پرنسپل رہی ہیں۔ تسنیم مینائی حسرت موہانی، جگر مرادآبادی اور فانی بدایونی جیسی نابغہ روزگار ہستیوں کے صحبت یافتہ تھے۔ وہ جہاں بھی رہے علمی ادبی حلقوں میں بے حد مقبول رہے۔ وہ الہ آباد اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، بزم احباب رامپور کے صدر اور انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے بہت فعال کارکن اور مشیر رہے۔ کراچی میں معیاری مشاعروں کا انعقاد میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

تسنیم مینائی کے مضامین رسالہ ''الناظر'' میں چھپتے رہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''لال چنری'' اور تنقیدی جائزہ ''میخانہ ریاض'' کے نام سے حیدرآباد دکن میں چھپا۔ ''دو میرزا'' کے نام سے مرزا یگانہ اور مرزا غالب کا تقابلی موازنہ کتابچے کی شکل میں شائع کیا۔

افسوس کہ ایسی آوازیں ہمارے معاشرے میں گم ہوتی جاتی ہیں اور ان کی صدائے بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی۔ ۲ رمئی ۱۹۹۱ء کو تسنیم مینائی دارِفانی سے رخصت ہو گئے۔ سوسائٹی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ ان کے کلام کے کچھ اشعار جو ہمیں مل سکے ہیں درج کیے جاتے ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

ایسے بس اک وہی بہ جہانِ شعور ہیں — پیشِ نگاہ رہتے ہیں اور دُور دُور ہیں

ظلمت کے کچھ نشان بھی پایانِ نور ہیں — یعنی بہت ہی پاس جو ہیں وہ بھی دُور ہیں

تیرا فراق مرگِ مسلسل سے کم نہیں
لیکن ترے فراق میں جیتے ضرور ہیں

جوشِ جنوں نے مشغلۂ دل بدل دیا
دریا کے اضطراب نے ساحل بدل دیا

کچھ دُور ہی گیا تھا ابھی کاروانِ عشق
رہبر نے چھپ کے جادۂ منزل بدل دیا

آئی بھنور میں ناؤ تو ساحل کے پاس بھی
طوفاں نے اُٹھ کے نقشۂ ساحل بدل دیا

ناکامیوں نے رہ کے میرے ساتھ عمر بھر
سب کچھ سوائے حسرتِ حاصل بدل دیا

پروانہ بن کے گردِ رُخِ یا شمع نے
عنوانِ جاں فُروشیِ محفل بدل دیا

تسلیم اس سے بڑھ کے ستم کیا کہ حسن نے
دل جو تھا اعتبار کے قابل بدل دیا

شکستِ دل پہ ہوں اندوہ گیں ہم
اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہم

کریں کیا اپنی ہستی کا یقیں ہم
ابھی سب کچھ ابھی کچھ بھی نہیں ہم

جہادِ زندگی کی کشمکش میں
فرازِ دار پر کرسی نشیں ہم

تمہاری یاد اور اپنی وفا کو
بھلاتے ہیں مگر بھولے نہیں ہم

--••☆••--

تمنا عمادی مجیبی پھلواروی، سید حیات الحق محمد محی الدین

تمنا عمادی ۱۴ر جون سنہ ۱۸۸۸ء کو پھلواری شریف میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام حیات الحق تھا جو اُن کے والدین نے رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے ننھیالی نام محمد محی الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد شاہ نذیر الحق فائز نے ساری زندگی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزاری۔ وہ ایک معروف شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ ''دیوانِ فائز'' کے عنوان سے ڈاکٹر خواجہ افضل امام (پٹنہ یونیورسٹی) نے مرتب کر کے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا ہے۔ تمنا عمادی نے درسِ نظامی کی تکمیل اپنے والد نذیر الحق سے کی۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ذریعہ معاش کے لیے درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ابتدا میں وہ مدرسۂ حنفیہ، پٹنہ میں 'جو محمدی جان بیگم کے نام سے موسوم تھا' ملازم ہوئے۔ اِس مدرسہ میں تمنا عمادی ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۸ء تک عربی فارسی کے مدرّس رہے۔ مدرسۂ محمدی جان بیگم کے بعد وہ صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے قائم کردہ وِدّیا پیٹھ (بہار) میں عربی فارسی پڑھاتے رہے۔ یہاں سے الگ ہوئے تو پھر انہوں نے کہیں بھی ملازمت نہیں کی اور پٹنہ کے مسلمان وکلاء کو قرآن پاک پڑھانے لگے۔ سر فخر الدین (ف ۱۹۳۳ء) فقہی معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ جب اُن کا انتقال ہو گیا تو تمنا عمادی عبدالعزیز بیرسٹر (ف ۱۹۴۸ء) وزیرِ تعلیم بہار کے مشیرِ خاص اور دستِ راست بن گئے۔ جب عبدالعزیز صدر امورِ مذہبی بن کر حیدر آباد دکن گئے تو ان کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں ان کا بھی سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا جو انہیں سقوطِ حیدر آباد تک ملتا رہا۔

۱۹۴۸ء کو تمنا عمادی اپنے اہلِ خانہ کو ساتھ لے کر مشرقی پاکستان چلے گئے۔ مشرقی پاکستان جانے سے پہلے اپنے علمی ذخیرہ میں سے جو دس پندرہ الماریوں میں محفوظ تھا کچھ خانقاہ مجیبیہ، خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف اور اُردو کی مطبوعہ کتابیں گورنمنٹ اُردو لائبریری پٹنہ کے حوالے کر دیں۔ تین ٹرک کتابیں سمندری جہاز پر لاد کر مشرقی پاکستان آ گئے۔ حکومتِ پاکستان کو جب کتابوں کی خبر ملی تو ان کے لیے ایک وسیع مکان کا بندوبست کر دیا۔ یہاں پر وہ ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن سے قرآن کا درس بھی دیتے تھے۔

ان کے ایک لڑکے انعام الدین جو انجینئر ہیں چاٹ گام میں ٹھیکے وغیرہ کا کاروبار کرنے لگے۔

تمنا عمادی اگرچہ شعروسخن اور فن عروض وقوافی میں ید طولیٰ رکھتے تھے لیکن ان کا اصل ذوق تدبر قرآن مجید تھا۔ سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے تھے۔ ان کے بہت سے عربی قصائد ومثنویاں طبع ہوچکی ہیں۔ ان کی عربی دانی کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۸ء میں جب وہ ڈھاکہ میں مقیم تھے تو فلسطین کا ایک وفد ڈھاکہ آیا۔ اُس وفد میں مولانا شبیر احمد عثمانی بھی کراچی سے شامل ہوگئے تھے۔ وفد کے استقبال کے لیے اہلِ ڈھاکہ نے ارمنی ٹولہ میدان میں ایک عظیم الشان جلسے کا انتظام کیا۔ تمنا عمادی کو اس وفد کے آنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے ایک قصیدہ عربی زبان میں لکھ کر حیرت صاحب کو دے دیا کہ وہ اِسے جلسہ میں پڑھ دیں۔ چنانچہ اُس جلسے میں جب حیرت صاحب نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا تو پہلے ہی دو چار شعر سن کر رئیسِ وفد نے بے اختیاری میں حیرت صاحب کو گلے لگالیا اور تعریف وتحسین کے کلمات کہنا شروع کردیے۔ حیرت صاحب نے مولانا عثمانی کی طرف دیکھا اور ان سے کہا یہ کلام مولانا تمنا عمادی کا ہے جو اس جلسے میں خود شریک نہیں ہوئے۔ چنانچہ ارکان وفد کے اصرار پر ڈپٹی کلکٹر کو بھیج کر تمنا صاحب کو جلسہ گاہ میں بلایا گیا اور اِتنی دیر تک جلسے کی کارروائی ملتوی رہی۔

کچھ عرصہ ڈھاکہ میں قیام کرنے کے بعد تمنا عمادی اپنے بیٹے کے پاس چاٹگام چلے گئے۔ ان کی کچھ تصانیف عرصۂ دراز سے نامکمل پڑی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ کراچی جاکر ہی مکمل ہوسکیں گی۔ اس کے علاوہ ان کی بینائی بھی جواب دیتی جارہی تھی۔ چنانچہ وہ چاٹ گام سے نقلِ مکانی کرکے کراچی میں اپنے کسی عزیز کے پاس آگئے۔ کچھ عرصے کے بعد جب ان کے لڑکے نے بھی اپنا کاروبار کراچی منتقل کرلیا تو اُس کے ساتھ رہنے لگے۔ یہاں اُن کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ آنکھوں کی روشنی تو بحال ہوگئی لیکن فوراً ہی وہ حلق کے کینسر میں مبتلا ہوگئے جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اُن کی تصانیف میں ''اعجاز القرآن اور اختلاف قرآن''، ''امام زہری وامام طبری''، ''انتظار مہدی ومسیح''، ''جمع القرآن'' ''مذاکرہ''، ''وراثت اور کلالہ قرآن کی روشنی میں'' شامل ہیں۔ تمنا عمادی کا کچھ کلام اُن کے پوتے جناب سید نعمان بزمی انعام نے سنہ ۲۰۰۲ء کو ''سخنہائے تمنا'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ تمنا عمادی کی شاعری اور علمی ادبی ذہانت کے بارے میں مالک رام اپنی کتاب ''تذکرۂ معاصرین ۲'' میں لکھتے ہیں:

''تمنا عمادی کو علم وفضل اور شعرگوئی تمنا کو ورثے میں ملی تھی۔ وہ اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں

میں شعر کہتے تھے۔ زبان و بیان اور عروض میں مہارتِ تامہ تھی، جو انہوں نے اپنے والد سے سیکھے تھے۔ اسلامی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، ہر ایک میں اجتہادی نقطۂ نظر تھا اور ان کی بیشتر تصانیف انہی علوم سے متعلق ہیں۔ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ مدتوں وظائف و اوراد کے پابند رہے، بلکہ ننھیالی سلسلے میں خود حضرت مخدوم منہاج الدین جیلانیؒ کے سجادہ نشین بن سکتے تھے، لیکن قرآن کے غائر مطالعے کے بعد انہوں نے ان سب چیزوں سے کنارہ کر لیا وہ انہیں بدعت سے کم نہیں سمجھتے تھے۔''

۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء کو اُردو فارسی اور عربی کے شاعر تمنا عمادی دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ گلشن اقبال کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے کلام کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

دلبری کی رہے روز ایک نئی گھات رہے — اپنا دل گر نہ ہو چھوٹا تو بڑی بات رہے
عید کا چاند وہاں تم تو یہاں میں دیکھوں — بس وہیں دونوں نگاہوں کی ملاقات رہے
ساتھ نامے کے میرا دل بھی لیے جا قاصد — نذر کی نذر یہ سوغات کی سوغات رہے
وہ تو آئے بھی، گئے بھی، میں رہا محو کا محو — جانے اس وقت کہاں عشق کے جذبات رہے
شب کو تو محتسب و شیخ بھی پی لیتے ہیں — رند وہ ہے جو اِسی شغل میں دن رات رہے
یہ جھڑی اور یہ بزم اور یہ دور مئے ناب — دس برس تک تو لگاتار یہ برسات رہے
کیا تمنا ہو ترا حال عیاذاً باللہ — تیرے ہر جرم کی ہوتی جو مکافات رہے
مرنے کا ڈر لگا ہے تو پھر زندگی کہاں — بے جی کے جینے میں لگتا ہے جی کہاں
کیا بیتتی ہے زیر لحد، کس سے پوچھئے — جانے کے بعد لوٹ کے آیا کوئی کہاں
جو گیا شباب! تو ہی، تو گئیں وہ ساری باتیں — نہ وہ عشرتوں کے دن ہیں نہ وہ راحتوں کی باتیں
آنکھیں کیوں سرخ ہوئیں کس کے مقدر جاگے — رات سوئے تھے کہاں آپ کہ شب بھر جاگے
دونوں جاگیں، یہ تو ممکن ہی نہیں اے غمِ عشق — سوئے قسمت تری، جب میرا مقدر جاگے
ایسا سوئے، کہ نہ آنکھیں کبھی مَل کر جاگے — اور جاگے بھی تو ہم خواب کے اندر جاگے
کروٹیں لے رہے ہیں سیکڑوں فتنے ہر سمت — اور یہاں قوم ہی جاگی ہے رہبر جاگے

---••☆••---

ثناء الحق صدیقی، مولوی

مولوی ثناء الحق صدیقی ۷ر ستمبر ۱۹۱۹ء کو دیو بند (یوپی) کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دیو بند کے معزز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ثناء الحق کے دادا حاجی ظہور الدین دار العلوم دیو بند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے۔ ان کی نانہیال قصبہ تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) کی مشہور فاروقی خاندان میں تھی۔ اس خاندان میں مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا شیخ محمد تھانوی محدث' حافظ ضامن علی شہید' حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، قاضی محمد اعلیٰ تھانوی وغیرہم علم وفضل اور اصحاب شریعت وطریقت میں نامور اور قابل ذکر ہیں۔ ثناء الحق کا خاندانی پیشہ زمینداری تھا۔

مولوی ثناء الحق نے ابتدائی تعلیم دیو بند میں اور اعلیٰ تعلیم دہرہ دون اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے اوّل درجہ میں میٹرک پاس کیا۔ میتھ میں انہوں نے امتیازی نمبر حاصل کیے تھے۔ ثناء الحق صدیقی نے سنہ ۱۹۳۸ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انٹر اور ۱۹۴۰ء میں بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں انہوں نے مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج سے بی ٹی کیا اور سنہ ۱۹۴۴ء میں ایم اے (اُردو) کیا۔ بعد ازاں الہ آباد بورڈ سے .Language Exam اور ہندی کے امتحانات پاس کیے

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ذریعہ معاش کے لیے درس وتدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا اور شعبۂ تعلیم سے منسلک ہوگئے۔ اسی زمانے میں ملک تقسیم ہوگیا تو وہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں مستقل رہائش اختیار کی۔ یہاں پر بھی وہ محکمہ تعلیم ہی سے وابستہ رہے۔ اپنے پورے دورِ ملازمت میں وہ نہایت نیک نام رہے۔ ثناء الحق جس اسکول میں رہے وہاں بچوں کے رسائل جاری کراتے تھے۔ وہ اپنی نگرانی میں بچوں سے مسلمان مورخ' مسلمان سائنسدانوں اور مسلمان جغرافیہ دانوں پر مضامین لکھواتے تھے۔ مدت ملازمت ختم ہونے پر سنہ ۱۹۷۹ء میں وہ ریٹائر ہوگئے۔ اپنے علمی وادبی اور تصنیفی ذوق کی بنا پر ملک کے مشہور علمی ادارے انجمن ترقی اردو کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے منسلک ہوگئے۔

علمی محافل ومجالس میں شرکت کے ساتھ مولوی ثناء الحق صاحب کا محبوب مشغلہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف رہا ہے-اُردو‘فارسی اور انگریزی زبانوں میں انہیں اعلیٰ دسترس حاصل تھی-عربی‘ہندی‘ فرانسیسی اور اسپینی زبانوں سے بھی حسب ضرورت کام نکال لیتے تھے-ریاضی‘اُردو ادب‘تاریخ اسلام‘ موسمیات‘ ارضیات‘فلکیات اور اثریات میں امتیاز حاصل تھا-ان علوم میں ان کی کئی تصنیفات ہیں-ثناء الحق صاحب آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے سہ ماہی ”العلم“ کے تبصرہ نگار اور ”انجمن اسلامیہ میگزین“ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے-۹ر اپریل ۱۹۹۲ء کو ثناء الحق صدیقی زندگی کا سفر ختم کر کے ملک عدم کو رخصت ہو گئے-پاپوش نگر کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں-

ثناء الحق صاحب کے علمی وادبی‘تصنیفی اور تالیفی کاموں کا احاطہ کرنا مشکل ہے-انہوں نے اُردو ادب‘آثار و باقیات‘ اثریات‘فلکیات اور تصوف وغیرہ میں کتابیں لکھیں-کئی کتابوں کی ترتیب اور ترجمہ بھی کیا اور بہت سے علمی وتحقیقی اور تاریخی مضامین بھی لکھے جو برصغیر کے ممتاز رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں-ذیل میں مولوی ثناء الحق کی تالیفات وتراجم کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

(۱) ہمارے پیارے نبی ﷺ (بچوں کے لیے) (۲) تحقیق وحدۃ الوجود والشہود (۳) مبادیات علم مثلث (۴) بزم انجم (۵) تصوف کی حقیقت (۶) مولانا محمد علی جوہر-جہات اور تعلیمی نظریات (۷) میری ماں (۸) اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ (کتابچہ) (۹) تاریخ اندلس قبل از اسلام (۱۰) زوالِ سلطنت مُغلیہ (۱۱) غزواتِ نبوی ﷺ (۱۲) میرؔ وسوداؔ کا دور (۱۳) مرج البحرین (ترجمہ فارسی سے) (۱۴) شرح رباعیات (ترجمہ فارسی سے) (۱۵) مہ وانجم (ترجمہ انگریزی سے) (۱۶) آثار و باقیات (ترجمہ انگریزی سے) (۱۷) قرآن اور جدید سائنس (۱۸) بائبل‘قرآن اور سائنس (۱۹) کتاب الرسول (۲۰) نقوش مائل (ان کے ادبی ذوق کی یادگار ہے) (۲۱) دیوانِ یقین (۲۲) مسلمان اندلس میں (مورس ان اسپین کا ترجمہ) (۲۳) چند مکاتیب (۲۴) علمائے سلف اور نابینا علماء (مفتی انتظام اللہ شہابی کے اشتراک سے)

---••☆••---

ثنا قریشی

اصل نام علیم النساء قریشی ثنا تخلص اور قلمی نام ثنا قریشی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں شعر و سخن کی بستی بسہم ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے آبا و اجداد کا تعلق متوسط زمیندار گھرانے سے تھا۔ ان کے والد محمد حنیف شیخ زمینداری کے جھمیلوں کو خیر باد کہہ کے ممبئی چلے گئے اور اپنا تجارتی کاروبار شروع کیا۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں حالات کا جائزہ لینے وہ کراچی آئے اور پھر واپس جا کر ۱۹۴۸ء میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ کراچی آ گئے اور برنس روڈ کے فلیٹوں میں رہائش پذیر ہوئے۔ یہاں آ کر انہوں اپنا وہی تجارتی کاروبار شروع کیا اور جلد ہی شمالی ناظم آباد میں مکان بنا کر وہاں منتقل ہو گئے۔

علیم النساء نے ابتدائی تعلیم مسلم گرلز اسکول برنس روڈ سے حاصل کی پھر مورس والا گرلز ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے سرسید گرلز کالج کے توسط سے جامعہ کراچی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے فوراً بعد انجنیئر انصار الحق قریشی صاحب سے ان کی شادی ہو گئی۔ بچوں کی نگہداشت، پرداخت اور تعلیم پر توجہ کی وجہ سے انہیں مزید تعلیم ترک کرنی پڑی۔ لیکن ان کی خواہش تھی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ جب بچے سمجھدار اور بڑے ہو گئے تو انہیں پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے اُردو کالج کے توسط سے اسلامک اسٹڈیز میں ایک ریگولر طالب علم کی حیثیت سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور ساتھ ہی الھیمن سے عربی ایڈوانس کورسز بھی کیے اور قرآنی عربی کورس (مکمل) پروفیسر خالد عمر سے پڑھا اور معارف قرآن وسنہ جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کی امیدوار ہیں۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان "پاکستانی نژاد بچوں کی امریکی معاشرے میں اسلامی تربیت" ہے۔

ثنا قریشی کے شوہر تو شاعر ہیں لیکن ان کی اپنی شاعری کی ابتدا ۱۹۹۵ء میں ایک عجیب انداز سے ہوئی۔ ہوا یہ کہ ایک دن ان کی بیٹی جو امریکہ میں مقیم ہیں، کا فون آیا۔ ثنا اپنی بیٹی سے بڑی محبت اور پیار سے باتیں کرتی رہیں۔ بیٹی سے بات کر کے وہ اس قدر خوش تھیں کہ جذبات میں آ کر کچھ شعر لکھ

ڈالے جنہیں سن کر گھر کے افراد اور ان کے شوہر بھی حیران ہو گئے اور ان کے اشعار کو بہت پسند کیا اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ گھر میں شعر سخن کا ماحول تو پہلے ہی تھا اب ثنا صاحبہ نے بھی طبع آزمائی شروع کر دی اور خوب خوب غزلیں اور بچوں کے لیے نظمیں لکھیں۔ انہوں نے شاعری میں جناب عبدالعلیم کے۔ طالب سے اصلاح لی۔ عبدالعلیم کئی کتابوں کے خالق ہیں' ادبی حلقوں میں مستند شاعر کی حیثیت سے شمار ہوتے ہیں۔

ثنا قریشی کا پہلا مجموعہ کلام ''مہکتے پھول'' کے عنوان سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا جس میں غزلیات 'منظومات' بچوں پر نظمیں اور قومی ترانے شامل تھے۔ اس کتاب کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ ۲۰۰۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ ان کے کلام ''مہکتے پھول'' میں ان کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے برصغیر کے معروف شاعر جناب راغب مرادآبادی لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک محترمہ ثناء کی شاعری کا تعلق ہے ان کے مسودے کے کمپوز شدہ صفحات پر نظر ڈالنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے خیالات متنوع' پاکیزہ اور بلند ہیں۔ زبان و بیان پر بھی اچھی خاصی گرفت ہے اور اندازِ بیان میں بھی دلکشی ہے۔''

محترم پروفیسر جناب اقبال عظیم صاحب ان کی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''جہاں تک ثناء کی غزلوں کی خصوصیات کا تعلق ہے ان میں دھیما دھیما لہجہ' نرم و نازک اندازِ بیاں' پاکیزہ خیالی' صحت زبان' اصول فن اور محاورہ اور روزمرّہ کا استعمال ہے۔ جب کہ چھوٹی بحروں میں کہی ہوئی ان کی غزلیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔............ یہ بھی سمجھ میں آیا ہے کہ یہ اُس شاعرہ کا کلام ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو کے متعلق اور پاکستانی معاشرے کی ضرورت کے حقائق سے وابستہ مضامین پر بھرپور اظہار خیال کی صلاحیت ہے۔''

''کرن کرن روشنی'' جس میں غزلیات' منظومات' ہائیکو' قطعات' ترانے اور بچوں پر نظمیں ہیں' ثناء صاحبہ کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ اس کے بھی دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ''نورحق'' ان کی تیسری تخلیق ہے۔ یہ بھی ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ ''نورحق'' میں حمد' نعتیں اور قرآنی و اسلامی موضوعات پر قطعات شامل ہیں۔ اپنی مذہبی شاعری کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

> ''حمد اور نعتوں کے اس مجموعے میں بھی میں نے اسی انداز میں شعر کہے ہیں۔ بیشتر اشعار ایسے

ہیں جو قرآن کے ترجمے سے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ اشعار خود بخود میرے ذہن میں آئے۔ میں نے قرآن سامنے رکھ کر ترجمہ نہیں کیا۔ البتہ لکھنے کے بعد قرآن ضرور دیکھا تا کہ کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ غلطیوں سے درگزر کریں اور اس کلام کو شرف قبولیت بخشیں"

مجموعہ "تیری ہی حمد وثنا" جو ۲۰۰۲ء میں طبع ہوا وہ تمام تر حمدیہ کلام پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے بارے میں جناب محسن بھوپالی کے اظہار خیال سے اقتباس پیش ہے:

"تری ہی حمد وثناء" علیم النساء کا چوتھا مجموعہ ہے جو ان کے حمدیہ کلام پر مشتمل ہے۔ اب تک حمد کا مکمل مجموعہ تصنیف کرنے کا افتخار صرف دو شاعرات کو حاصل ہے۔ لیکن "تری ہی حمد وثناء" کو یہ افضلیت حاصل ہے کہ اس میں قرآنی آیات کے حوالے سے حمدیہ اشعار اور اسمائے حسنیٰ کے معانی ومفہوم کے ترجمان قطعات شریک اشاعت ہیں.........."

ثناء قریشی کا کلام ملاحظہ کیجیے۔

دل میں ہیں زخم درد سینوں میں　　کیسے آنسوں ہیں آبگینوں میں
بات ہو لاکھ دل دکھانے کی　　ہم کو عادت ہے مسکرانے کی

عزت اور ذلت دینے والا

جسے چاہے شاہ کر تو جسے چاہے کر گدا　　جسے چاہے مرتبہ دے جسے چاہے دے سزا
ترے ہاتھ میں بھلائی جسے چاہے کر عطا　　وتعزُّ من تشآء ، وتذلُّ من تشآء

سورہ فاتحہ کا ترجمہ

ہے ابتداء تجھی سے ربّ کریم تو ہے　　تو مہرباں ہے بے حد، بے حد رحیم تو ہے
ہے حمد صرف تیری تو ربّ دوجہاں ہے　　تو ہی رحیم تو ہی بندوں پہ مہرباں ہے
مالک تو یوم دیں کا مالک جزا کے دن کا　　ہے اختیار تجھ کو یارب سزا کے دن کا
راہ نجات تو ہی ہم کو دکھانا یارب　　جو سیدھا راستہ ہے اس پر چلانا یارب
انسانیت کی آپؐ سے ہے شان یارسولؐ　　لے آئیں کیوں نہ آپ پہ ایمان یارسولؐ
رحمت ہے مومنوں کے لیے باعثِ شفا　　اترا جو آپ پر ہے یہ قرآن یارسولؐ

---••☆••---

ثمرؔ نظامی

اصل نام لئیق احمد نظامی، ثمرؔ تخلص اور ثمرؔ نظامی قلمی نام تھا۔ ۴؍جولائی ۱۹۲۸ء کو امروہہ ضلع مرادآباد یوپی کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ننھیال اور ددھیال دونوں کا سلسلہ شیخ الاسلام حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ سے ملتا ہے۔ ان کے والد عزیز احمد نظامی معروف وکیل تھے جو میرٹھ میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے خاندان کے سب افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بلند اور اہم مناصب پر فائز رہے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی خلیق احمد نظامی علی گڑھ یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر اور وائس چانسلر تھے۔ اندرا گاندھی نے اپنے دورِ حکومت میں خلیق احمد نظامی کو شام کا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ ۶؍جنوری ۱۹۹۸ء کو ان کا علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ ان کے دوسرے بھائی زیڈ اے نظامی کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے ڈائریکٹر جنرل رہے ہیں اور اب وہ سرسید یونیورسٹی کراچی کے چانسلر ہیں۔ ان کی ایک بہن ڈاکٹر جمال آرا نظامی اُردو ڈیپارٹمنٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

ثمرؔ نظامی کی پیدائش تو امروہہ میں ہوئی لیکن تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی جہاں ان کے والد وکالت کرتے تھے۔ انہوں نے فیضِ عام کالج میرٹھ سے انٹر کیا۔ وہ اپنے کالج کی یونین کے صدر، مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری اور اسٹوڈینٹس نیشنل گارڈ کے سپہ سالار تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔ ثمرؔ نظامی بھی سیاست اور ان تحریکوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر وہ انٹر سے آگے تعلیم حاصل نہیں کرسکے۔ ۱۹۴۶ء میں سرکاری ملازمت سے منسلک ہو کر دہلی چلے گئے۔ دہلی جو ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا وہاں رہ کر ادب سے بے نیازی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ نہالؔ سیوہاروی، کرارؔ نوری اور جناب بیخودؔ دہلوی کی شاگردگی میں انہوں نے باقاعدگی سے شعر کہنے شروع کیے اور اسی دور میں افسانے بھی لکھے جو ماہنامہ آریہ ورت اور ہفت روزہ جماعت میں شائع

ہوئے۔ان کی نظمیں اور قطعات روزنامہ ''الہلال'' میں شائع ہوتے تھے۔

اپنے دہلی کے قیام میں وہ ادبی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔محمد شفیع دہلوی کی ہفت روزہ نشستوں اور مقامی مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنا کلام بھی سناتے تھے۔تقسیم ہند کے بعد ثمر نظامی پاکستان آ گئے۔سرکاری ملازمت کے سلسلے میں وہ کافی عرصہ تک راولپنڈی میں رہے۔ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔پاکستان میں پہلے ''یومِ آزادی'' کے موقع پر روزنامہ جنگ کراچی میں ان کا قطعہ شائع ہوا تھا۔اس کے بعد ان کے قطعات کا سلسلہ مختلف اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔روزنامہ ''صداقت'' کراچی میں مسلسل تین سال تک نہ صرف قطعات لکھے بلکہ روزانہ ایک طنز و مزاح کا کالم ''نظر نظر میں'' لکھتے رہے۔

ثمر نظامی انتہائی خوش مزاج اور فراخ دل شخصیت کے مالک تھے۔دوست احباب کی مہمان نوازی کر کے بہت خوش ہوتے اور اکثر اپنے گھر پر ادبی اور موسیقی کی محفلیں منعقد کرتے رہتے تھے۔

وہ اپنے بیٹوں کے پاس امریکہ گئے ہوئے تھے کہ ۱۹/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ثمر صاحب کا امریکہ میں انتقال ہو گیا۔جسد خاکی کراچی لایا گیا اور سخی حسن قبرستان میں تدفین ہوئی۔ان کی غزلوں، نظموں اور قطعات کے دو مجموعے ''رَت جگے'' اور ''دن ڈھلے'' شائع ہوئے۔ان کا کلام ملاحظہ کیجیے:

عمر بھر کے رَت جگوں نے دل کو بوجھل کر دیا
اب کسی ویراں گلی میں بیٹھ کے سو جاؤں گا
شہر کی یہ رونقیں آوارگی تک ساتھ ہیں
گھر میں جب بھی رات کو جاؤں گا تنہا جاؤں گا

خواہشِ بے ثبات کرتے ہیں
آرزوئے حیات کرتے ہیں
چند لمحوں کی زندگی پاکر
لوگ برسوں کی بات کرتے ہیں

یوں تو وہ میرے دل میں ہمیشہ بسے رہے
لیکن تمام عمر بڑے فاصلے رہے
حالانکہ ایک ایک شناسا تھا شہر میں
آواز دی تو لوگ کھڑے دیکھتے رہے

دنیا تو آئینہ ہے عمل کے حساب کا
چاٹا لہو جنہوں نے لہو تھوکتے رہے!
کیسے کیسے لوگ تھے جو بزمِ ہستی سے گئے
کیسی کیسی محفلوں کی رونقیں لیتے گئے

پاپابیوں کا شوق بھی مہنگا پڑا ہمیں
گہرے سمندروں میں اترنا پڑا ہمیں
برگِ آوارہ بنوں گا لاکھ روندا جاؤں گا
میں نویدِ زندگی شاخوں کو دیتا جاؤں گا

بے ضرورت شہر کی سڑکوں پہ روشن تھے چراغ　　میرا گھر تاریکیوں میں رات بھر ڈوبا رہا
ایک سمٹا ہوا نقطہ ہے مری ذات ابھی　　جب میں پھیلوں گا زمانے کو دکھائی دوں گا
میں نے اسی خیال سے مانگی نہ موت بھی　　کیسی ہی نامراد سہی زندگی تو ہے
غم کو ہنس کر نہ سہہ سکا کوئی　　ورنہ انساں سے کیا نہیں ہوتا

اپنی فطرت کے تقاضوں کو بدل کے دیکھوں
بَرف بن جاؤں تو سانسوں سے پگھل کے دیکھوں

تھک گیا ہوں کوئی پہلو تو بدل کے دیکھوں
زندگی تیرے حصاروں سے نکل کے دیکھوں

ایک تو ہی نہیں اور بھی ہوں گے لیکن!
تجھ سے روٹھوں تو کہیں اور نکل کے دیکھوں

اب مجھے کتنے سرابوں سے بہلنا ہوگا!
میں ترے ساتھ ذرا دُور تو چل کے دیکھوں

--••☆••--

جاذبؔ قریشی

اصل نام محمد صابر تخلص جاذبؔ اور قلمی نام جاذبؔ قریشی ہے۔ ۳راگست ۱۹۴۰ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کا آبائی وطن لکھنؤ تھا۔ ان کے والد محمد افضل گورنمنٹ پریس کلکتہ میں پرنسپل سُپر وائزر تھے۔ جاذب قریشی ابھی پانچ سال کے تھے ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور اس طرح ان کی تعلیم پر توجہ دینے والا کوئی نہ رہا۔ مالی حالات بھی اچھے نہیں تھے لہٰذا جاذب کو اسکول سے اٹھا کر ڈھلائی کے کام پر لگا دیا گیا۔ اس وقت وہ گورنمنٹ پرائمری اسکول میں دوسری کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ جاذب کو علم حاصل کرنے کی بڑی لگن تھی لیکن حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ جاذبؔ قریشی نے اپنی زندگی میں بڑے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ لیکن مشکل ترین حالات اور حادثات کے باوجود وہ چٹان کی طرح سینہ سپر ہوکر جادۂ حیات میں قدم بڑھاتے رہے۔ ذریعہ معاش، حصولِ تعلیم اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے انہوں نے مختلف محنت طلب کام کیے۔

مئی ۱۹۵۰ء میں جاذب اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آئے اور لاہور میں مقیم ہوئے۔ یہاں آ کر انہیں ذریعہ معاش کی تلاش تھی۔ ابتدا میں انہوں نے ایک پریس میں کام سیکھا اور تھوڑے ہی دنوں میں انہیں کمپوزیٹر کی ملازمت مل گئی۔ ان ہی دنوں انہیں شعروسخن کا ذوق ہوا۔ ابتدائی غزلیں انہوں نے ایک بزرگ شاکر دہلوی کو، جو سائل دہلوی کے شاگرد تھے، دکھائیں۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۲ء میں جاذب قریشی مستقل طور پر کراچی آ گئے۔ انہوں نے میٹرک سے بی اے تک امتحانات پرائیویٹ طور پر لاہور اور کراچی سے پاس کیے۔ ایم اے کا امتحان انہوں نے جامعہ کراچی سے ریگولر طالب علم کی حیثیت سے پاس کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد جناح کالج کراچی میں بحیثیت لیکچرر ملازم ہوگئے۔ اسی زمانے میں جاذبؔ قریشی ایک فلم ''پتھر کے صنم'' بنانے میں بھی مصروف تھے۔ فلم کی شوٹنگ کے لیے انہوں نے ایک ہفتہ کی چھٹی کی درخواست دی لیکن کالج کی انتظامیہ نے منظور نہیں کی۔ لہٰذا انہوں نے کالج کی ملازمت ہی چھوڑ دیا۔

لاہور سے کراچی آنے کے بعد انہوں نے شمس زبیری کے ڈائجسٹ ''نقش'' اطہر صدیقی کے ''سات رنگ'' ناصر محمود کے ''نگارش'' طفیل جمالی کے ''نمکدان'' اور مختلف جگہ کام کیا۔ طفیل جمالی کے ''نمکدان'' میں انہوں نے طنزیہ مضامین بھی لکھے۔

جاذبؔ قریشی ایک اچھے شاعر ہیں۔ ملک کے نامور دانشوروں، نقادوں، شاعروں سے ربط ضبط رہا ہے۔ شاعری کے ساتھ تنقید نگاری میں بھی اپنا مقام بنایا ہے۔ انہوں نے غزلیں، نظمیں، نعتیں، نغمے، گیت اور ترانے لکھے ہیں۔ غرض کہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور متعدد شعری مجموعے شائع کیے ہیں جن میں ''نیند کا ریشم''، ''شیشے کا درخت''، ''پہچان''، ''اُجلی آوازیں'' (ہائیکو)، ''جھرنے'' (نغمے اور گیت) وغیرہ شامل ہیں۔ ذیل میں ان کے مجموعہ کلام سے منتخب اشعار درج ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

سمندروں کا سفر ہے مگر اُداس نہ ہو
ترے، بچھڑنے کا کوئی گماں نہیں مجھ میں

میں اپنے آپ میں اک بے کنار موسم ہوں
کوئی زمین کوئی آسماں نہیں مجھ میں

مجھے تو اندھی ہواؤں کے پار اترنا ہے
کوئی ستارہ کوئی بادباں نہیں مجھ میں

در و دیوار بناتے رہو گھر ہونے تک
رات کو رات ہی کہنا ہے سحر ہونے تک

تجربے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ڈر لگتا ہے
میں نے دیکھا ہے بگولوں کو شجر ہونے تک

سائباں تجھ کو بناؤں تو بدن اور جلے
تری پرچھائیں میں سورج کی تمازت دیکھوں

میری آنکھیں مرے خوابوں سے ہم آہنگ نہیں
گھر سجاؤں در و دیوار پہ وحشت دیکھوں

اُجالے بُجھ گئے بینائیوں کے
کہ گھر میں رنگ ہیں پرچھائیوں کے

شکستہ عکس مجھ میں چیختے ہیں
بہت ارماں تھے سچائیوں کے

پرندے کیوں پلٹ کر آئیں جاذبؔ
شجر جب کٹ گئے انگنائیوں کے

---••☆••---

جاوید منظؔر

خاندانی نام کاظم جاوید عالم، تخلص منظؔر اور جاوید منظؔر قلمی نام ہے۔ ۲۷؍ستمبر ۱۹۴۸ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ جاوید منظؔر کا تعلق شعر وسخن کی بستی بدایوں کے علمی وادبی گھرانے سے ہے۔ ان کے دادا مولوی محمد اقتدار عالم بدایوں کے معروف وکیل اور عالم دین تھے۔ ان کے دادا کے بھائی مولوی محمد اکرام عالم سماجی شخصیت ہونے کے علاوہ مسلم لیگ کے رکن، قائد اعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ جاوید منظؔر کے والد ڈاکٹر الحاج حسن ممتاز عالم بھی معروف شاعر تھے جن کے حلقۂ احباب میں اہل علم ودانش کی بڑی تعداد تھی جن میں نواب بہادر یار جنگ، حضرت یاس یگانہ چنگیزی (غالب شکن)، مولانا ماہؔر القادری، تابؔش دہلوی شامل تھے۔ حضرت یاس یگانہ چنگیزی سے ان کی خط وکتاب بھی رہتی تھی۔ جاوید منظؔر کی والدہ محترمہ بھی شاعرہ تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے والدین ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ پہلے ان کا قیام خیر پور (سندھ) میں رہا اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی آ گئے۔ ابتدا میں ان کا قیام پیر الٰہی بخش کالونی میں رہا۔

جاوید منظؔر نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ اسکول جیل روڈ میں پڑھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ اسکاؤٹنگ میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بوائے اسکاؤٹس کی پہلی انٹرنیشنل ہائیک عراق اور ایران میں منعقد ہوئی تو اس میں جاوید منظؔر نے بھی شرکت کی تھی۔ جاوید منظؔر نے بی کام تک اپنی تعلیم مکمل کی۔

تعلیم سے فارغ ہوئے تو ذریعہ معاش کے لیے سلطنت عمان چلے گئے جہاں وہ محکمۂ دفاع میں اکاؤنٹس کے اہم محکمے سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں اُردو کے ممتاز نثر نگار اور سیاسی تجزیہ نگار ظفر محی الدین سے تعلقات پیدا ہوئے۔ وہ حیدر آباد سندھ سے سلطنت عمان آئے تھے۔ جاوید منظؔر اپنی گھریلو ذمہ داریوں کے سبب سلطنت عمان کی ملازمت زیادہ عرصہ جاری نہیں رکھ سکے اور کراچی واپس آ گئے۔ اکاؤنٹس میں وسیع تجربہ ہو چکا تھا اس لیے پاکستان اسٹیل میں بحیثیت اسسٹنٹ منیجر آڈٹ مقرر ہو گئے۔ پاکستان اسٹیل

کے مختلف شعبوں سے گزرتے ہوئے اب پاکستان اسٹیل کے محکمہ انشورنس کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جاوید منظر آرٹس کونسل آف پاکستان کی رکنیت کے علاوہ پاکستان اسٹیل کی بزم ادب کے صدر، آفیسر کلب کی ادبی کمیٹی کے رکن اور کلچر کمیٹی پاکستان اسٹیل کی رکنیت رکھتے ہیں۔

اپنے گھر میں شعر سخن کا ماحول دیکھا تو جاوید منظر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دوران تعلیم تیرہ سال کی عمر میں ان کو بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ حضرت صبا متھراوی نے جو ان کے استاد تھے، جاوید منظر کے جذبۂ شعر وسخن کی حوصلہ افزائی کی۔ ۱۹۶۷ء کے سہ ماہی ''سیپ'' میں ان کی پہلی غزل نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ جب سے ان کی تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ ریڈیو پاکستان کے ممتاز پروڈیوسر یاور مہدی نے جاوید منظر کو بزم طلبہ اور پھر ریڈیو پاکستان کے مشاعروں میں شریک بزم رکھا۔ ۱۹۸۶ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''خواب سفر'' شائع ہوا جس میں زمانہ طالب علمی سے ۱۹۸۵ء تک کے دور کی شعری تخلیقات ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ان کا ایک اور مجموعہ ''بے صدا بستیاں'' کے عنوان سے شائع ہوا جس کی اہلِ سخن نے بڑی پذیرائی کی۔ ذیل میں جاوید منظر کے مجموعۂ کلام ''بے صدا بستیاں'' سے منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

دلوا سکے نہ جب بھی سزا مجرموں کو لوگ
انصاف کی وہاں پہ توقع فضول ہے

واپس ہوئے بہ دیدۂ پُرنم گھروں کو لوگ
حقدار کہہ رہے ہیں جہاں غاصبوں کو لوگ

! دورِ گمرہی کو ضرورت ہے نوح کی
منظر میں تھک چکا ہوں یہی ڈھونڈتے ہوئے

ساحل بدست پھر وہی طوفا دکھائی دے
اس دورِ ناشناس میں انساں دکھائی دے

محبت کا اپنی نگر اب کہاں
جو تھا جذبۂ بے خودی کیا ہوا

وہ گلیاں، وہ گھر اور در اب کہاں
وہ اُلفت، وہ اہلِ ہُنر اب کہاں

جو شامیں بہاروں کی تھیں ڈھل گئیں
وہ ہمدم کہاں، ہمسفر اب کہاں

اَماں ملی نہ کسی کو ملا قرار کبھی
بٹیں گے ہم بھی قبیلوں میں یہ نہ سوچا تھا

کوئی بھی اپنی زمیں سے نہ ہو فرار کبھی
ملے گا خوف زدہ ایسا ریگزار کبھی

میں چل دیا ہوں جو منظر اس یقین کے ساتھ
ہم جو بچھڑے ہیں تو آنکھوں کو بھگوتے ہی رہے

کوئی نہ جائے گا اس طرح سوئے دار کبھی
موتی پلکوں پہ ہمہ وقت پروتے ہی رہے

اس جدائی کی سیہ رات نے سونے نہ دیا
ہم تری یاد کے لمحوں کو پروتے ہی رہے

جب تم وہ تم رہے نہ ہمارے خیال میں
پھر کیا کشش رہے گی تمہارے جمال میں

تنہا ہوئے تو روگ وہی ہم کو لگ گئے
پھر سے اُلجھ گئے ہیں اُنہی ماہ و سال میں

منظرؔ میں اُس حسین کی تڑپ کس طرح نہ ہو
جس کا کمالِ شوق نہ آیا زوال میں

ماضی کے شاہکار دفینے ہیں آج کل
زیرِ زمیں وہ سارے نگینے ہیں آج کل

منظرؔ اگر وطن کی سیاست یہی رہی
ہوں گے وہ محترم جو کمینے ہیں آج کل

--••☆••--

جمالؔ احسانی

ممتاز شاعر جمالؔ احسانی ۲۱؍اپریل 1951ء کو سرگودھا شہر کے متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا تعلق پانی پت (مشرقی پنجاب) سے تھا۔ جمالؔ احسانی کو سرگودھا سے' جہاں اُنہوں نے اپنے بچپن کے دن گزارے تھے' ہمیشہ پیار رہا ہے۔ تعلیم کے بعد ذریعہ معاش کی تلاش میں وہ کراچی چلے آئے اور محکمہ اطلاعات و نشریات سندھ سے منسلک ہوگئے۔ اس کے علاوہ جمالؔ احسانی روزنامہ ''حریت''، روزنامہ ''سویرا'' اور ''اظہار'' کراچی سے بھی وابستہ رہے جہاں انہوں نے معاون مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

جمالؔ احسانی کو شعر و سخن کا شوق بچپن سے ہوا جب وہ زیرِ تعلیم تھے۔ اس کے بعد کراچی کے ادبی ماحول میں رہ کر ان کے ذوقِ سخن میں مزید اضافہ ہوا۔ شاعری میں ان کی ابتدائی تربیت احسان امروہوی کے زیرِ سایہ ہوئی۔ اس کے علاوہ اُن کو سلیم احمد اور قمر جمیل کا قرب بھی حاصل رہا ہے۔ راقم الحروف سے بھی بہت اچھی یاد اللہ تھی۔ اُن سے میری پہلی ملاقات گارڈن ایسٹ میں جونؔ ایلیا کے گھر پر ہوئی تھی۔ اُن دنوں میں کراچی بلڈنگ کنٹرول میں بحیثیت چیف کنٹرولر آف بلڈنگ کام کر رہا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے ملنے میرے دفتر آجاتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے گھر کلفٹن پر اپنے دوست واحباب کی دعوت اور ایک چھوٹی سی شعری نشست کا اہتمام کیا تھا جس میں انہوں نے مجھے بھی بڑا اصرار کر کے بلایا تھا۔ کھانے کے بعد فرشی نشست ہوئی جس میں کچھ شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ اِن شاعروں میں ایک فوجی افسر بھی شامل تھے جنہوں نے اپنی ایک نظم ہائیکو میں سنائی۔

آج جمالؔ احسانی ہمارے درمیان نہیں ہیں' صرف ان کی ایک دُکھ بھری یاد ہمارے پاس باقی ہے۔ وہ آج بھی ہماری یادوں میں باقی ہے۔ اُن کے نغموں کی صدائے بازگشت ہمیشہ مدہوش کرتی رہے گی۔ دنیا ایک مسافر خانہ ہے جہاں ملکِ عدم کے مسافر کچھ دن آرام کرنے ٹھہر جاتے ہیں اور پھر تازہ دم

ہوکر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں- اسی طرح جمالؔ احسانی بھی کچھ دن گزار کر رخصت ہو گئے-

جمالؔ احسانی نے زندگی میں بڑے نشیب وفراز دیکھے- جدوجہد کے باوجود وہ معاشی طور پر بہت پریشان رہے- ان ہی پریشانیوں میں انہیں جگر کے عارضے نے آگھیرا- تقریباً ایک سال اس عارضے میں مبتلا رہے- ۱۰ فروری ۱۹۹۸ء کو اپنے اہل وعیال اور دوستوں کو سوگوار کر کے دارِ فانی سے رخصت ہو گئے- گلستانِ جوہر کے قبرستان میں تدفین ہوئی- جمالؔ احسانی کے دوشعری مجموعے 'ستارۂ سفر' اور ''رات کے جاگے ہوئے'' شائع ہوئے تیسرا مجموعہ 'ستارے کو مہتاب کیا' زیرِ ترتیب تھا- ان کے کلام سے منتخب کچھ اشعار ذیل میں درج ہیں' ملاحظہ کیجیے۔

محبتوں کی بلندی پہ ہے یقیں تو کوئی
گلے لگائے مری سطح پر اُتر کے مجھے

چراغ بن کے جلا جس کے واسطے اک عمر
چلا گیا وہ ہوا کے سپرد کر کے مجھے

یوں سمجھ لو کہ بے گھری کو مری
در و دیوار کی سہولت ہے

برس برس سے مجھے انتظار تھا جس کا
پلک جھپکنے سے پہلے وہ لمحہ بیت گیا

نگار سینہ و آفت رسیدہ لوگوں سے
یہ ساری رونقیں ہیں آب دیدہ لوگوں سے

یہ پیرہن کی چمک کیوں اُداس کرتی ہے
کبھی یہ پُوچھ تو دامن دریدہ لوگوں سے

بڑھا کے اُس سے رہ ورسم اب یہ سوچتے ہیں
وہی بہت تھا جو رشتہ دُعا سلام کا تھا

کفِ شامِ ہجر میں کچھ نہ تھا سرِ شاخسار کوئی نہ تھا
وہ گھڑی بھی عشق میں آئی جب پسِ انتظار کوئی نہ تھا

کہتا نہ تھا میانہ روی ہے بُری جمالؔ
صحرا کے ساتھ، ہاتھ سے گھر بھی نکل گیا

چراغ بُجھتے چلے جارہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

پرند لوٹ کے آنے ہی پر نہیں راضی
کوئی تو بات ہے جو آشیانہ ہوتے ہوئے

عجب وہ لوگ تھے آزار بھی عجب اُن کے
زمین چھوڑ گئے آب و دانہ ہوتے ہوئے

دل میں یادِ رفتگاں آباد ہے
ورنہ یہ دل بھی کہاں آباد ہے

---••☆••---

جمالؔ پانی پتی

اصل نام گلزار احمد، قلمی نام جمال پانی پتی اور تخلص جمالؔ کرتے ہیں۔ جمالؔ صاحب ۱۵ر جون سنہ ۱۹۲۷ء کو گنور اور پانی پت کے درمیان ایک قصبے سنجا لکہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی مذہبی تعلیم گھر اور مدرسے میں حاصل کرنے کے بعد پرائمری اسکول سے مڈل تک سنجا لکہ اور پانی پت کے اسکولوں میں زیر تعلیم رہے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں حالیؔ مسلم ہائی اسکول پانی پت سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد جمالؔ صاحب کو ان کے برادرِ بزرگ نے، جو محکمہ خارجہ میں اسسٹنٹ سیکریٹری تھے، اپنے پاس شملہ بلا لیا۔ اسی زمانے میں انہیں شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اس کے بعد جمالؔ کے بھائی نے ان کو گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ زراعت دہلی میں ملازم کرا دیا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جمالؔ اختیاری طور پر پاکستان آ گئے اور تقریباً ۷ا سال تک مرکزی حکومت کے مختلف محکموں سے وابستہ رہے۔ پاکستان آ کر انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری کیا جو میٹرک کے بعد منقطع ہو چکا تھا۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں جمالؔ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر نیشنل پریس ٹرسٹ سے منسلک ہو گئے اور ۹ سال تک اس ادارے میں اپنی خدمات انجام دیں۔ جب اس ادارے کا ہیڈ آفس اسلام آباد منتقل ہونے لگا تو جمالؔ نے استعفیٰ دے دیا اور نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی اور یہیں سے سنہ ۱۹۸۷ء میں ریٹائر ہوئے۔

جمالؔ پانی پتی اپنے ذوقِ سخن کے بارے میں بتاتے ہیں:

> ''اکا دکا نظموں سے قطعِ نظر میری شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ اور میں نے آگے چل کر بھی زیادہ غزل ہی لکھی۔ لیکن اپنی شاعری کے درمیانی دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب میرے اندر ایک تحریک دوہا نویسی کی پیدا ہوئی اور میں نے اچھے خاصے دوہے اس زمانے میں کہہ ڈالے۔ علاوہ ازیں دوہا نویسی سے پہلے کچھ توجہ تنقید نگاری کی طرف بھی ہو چلی تھی۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے جب عزیز حامد مدنی کی شاعری پر میرا ایک طویل

تنقیدی مضمون ''سات رنگ'' کراچی کے آخری شمارے میں شائع ہوا۔اور بہت پسند کیا گیا۔سلیم احمد نے اس شمارے کے اداریہ میں میرے مضمون کی خصوصیت کے ساتھ تعریف کی اور میری تنقیدی صلاحیت سے بڑی توقعات وابستہ کرلیں۔''

جمالؔ پانی پتی کی تصنیف وتالیف میں (۱) ادب وروایت (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) مطبوعہ المدثر اکیڈمی (۲) قدیم تہذیبیں (تدریسی کتاب) مطبوعہ فیڈرل اکادمی پیرالٰہی بخش کالونی کراچی (۱) افہام وتفہیم (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) اکادمی بازیافت فیڈرل بی ایریا کراچی وغیرہ ہیں۔جمال پانی پتی نے ،فرانسیسی مفکر رینے کی کتاب CRISIS OF THE MODERN WORLD کا ترجمہ ''عہدِ جدید کا بحران'' کے نام سے کیا ہے جو ابھی شائع نہیں ہوا۔جمالؔ پانی پتی کے کلام کے چند اشعار اور دوہے ملاحظہ کیجیے ۔

سدا رہے تیرا غم سلامت' یہی اثاثہ ہے آبرو کا
یہ دولتِ دل بہم نہ ہوتی توکون پرساں تھا آرزو کا

قبائے جاں تارتار اپنی ہوئی بہت کاوش رفو میں
مگر اسی سے کھلا ہے آخر بھرم ہر اک چاک ہر رفو کا

جو میری احساسِ بے زباں کو زباں ملی تو چمک اٹھا ہے
شرارہ بن کر کہیں نوا کا' چراغ بن کر کہیں لہو کا

ظالم وقت کا دھارا کیسے کیسے رشتے توڑ چلا
تم بھی اگر جاتے ہو' جاؤ' تم بھی بہت یاد آؤ گے

حسن بھی دھوکا عشق بھی دھوکا یہ تو ہمیں تسلیم مگر
اس دھوکے سے بچنے والو' دیکھو دھوکا کھاؤ گے

دوہے:

رات گئے جب سن کے مُرلیا مدھر سنائے بول
کویتا رانی ہولے ہولے نین پٹ دے کھول

سوچ کی کرنیں رنگ برنگی کیا کیا چھب دکھلائیں
دھیان کی اوٹ سے، پل پل جھانکیں اور چھپ جائیں

جھوٹی سچی باتوں سے کوئی کب تک من رچائے
سچے شبد کی چھوٹ پڑے تو کوئی امر ہو جائے

--••☆••--

جمیلؔ عظیم آبادی

محمد جمیل احسن اصل نام، تخلص جمیلؔ اور قلمی نام جمیلؔ عظیم آبادی ہے۔ان کے والد کا نام محمد یوسف ہے۔جمیلؔ صاحب ۷؍جنوری سنہ ۱۹۲۸ء کو عظیم آباد پٹنہ، بہار کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کا آبائی وطن موضع کہٹہ ضلع پٹنہ بہار تھا۔ان کے دادا مولانا محمد اسماعیل عالم دین تھے اور فارسی میں اشعار بھی کہتے تھے۔لہذا جمیل عظیم آبادی کو شعروسخن کا ذوق خاندانی ورثہ میں ملا۔انہوں نے میٹرک پٹنہ یونیورسٹی سے اور بی کام ڈھاکہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔اس کے بعد جمیلؔ صاحب نے ایچ ایم بی کا امتحان پاس کیا۔قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان آئے اور سقوط ڈھاکہ تک وہیں مقیم رہے۔سنہ ۱۹۷۲ء میں کراچی آ کر محکمہ ٹیلی فون کراچی کے دفتر میں بحیثیت اکاؤنٹس آفیسر مقرر ہوئے اور مدّت ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہو گئے۔ریٹائرمنٹ کے بعد آجکل وہ ہومیوپیتھی کی پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیلؔ پُرگو اور قادرالکلام شاعر ہیں۔شاعری میں انہوں نے نظم گوئی سے ابتدا کی تھی لیکن اب حمد، نعت، غزل، نظم، دوہے، گیت سبھی صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔بقول جمیلؔ عظیم آبادی انہیں اسکول کے ابتدائی دور سے ادبی ذوق رہا ہے اور تقریباً ہر مشاعرے میں بہ حیثیت سامع شریک ہوتے تھے اور اسکول کے دَور ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔وہ کہتے ہیں کہ پہلے ان کی پسندیدہ صنف سخن غزل اور دوہے تھی لیکن اب حمد و نعت ہے۔جمیلؔ عظیم آبادی کی زندگی کا بیشتر حصہ پیشہ ورانہ مصروفیتوں میں گزرا ہے لیکن ان مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے ہر دَور میں اشعار کو خوش آمدید کہا۔جمیلؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی نے شاعری کو اختیار کیا یا شاعری نے انہیں اختیار کیا یہ توجہ طلب مسئلہ ہے۔غالبؔ نے ''شعر خود خواہش آن کرد کہ گردد فنِ ما'' کہہ کر شاعری اور اپنا دونوں کا بھرم رکھ لیا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے

مشغلے تو سیکڑوں ہیں روز وشب کے اے جمیل
مجھ کو ہر شے سے مگر شغلِ سخن اچھا لگا

کہہ کر اپنے ذوقِ شعر کی صراحت کر دی ہے۔ صراحت کیا کر دی، سارا معاملہ صاف کر دیا۔ شغلِ سخن کا ہر شے سے اچھا لگنا دردمندی، ناصبوری اور وحشتِ دل کا وہ بلیغ اشارہ ہے جس سے بھرم کی پوری کیفیت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے۔

جمیل غم کو بھلانے کا یہ بہانہ ہے
لگی جو چوٹ کوئی دل پہ شاعری کر لی

یہ نسخہ لکھ کر ڈاکٹر صاحب نے سارے مریضانِ سخن کا بھلا کیا ہے۔ شعر کہنا ہے تو پہلے دل پر چوٹ کھاؤ، پھر شعر کا نام زبان پر لاؤ۔"

جمیل عظیم آبادی کبھی مشرقی پاکستان کے ادبی حلقوں کی ایک محبوب شخصیت تھے۔ اب کراچی میں بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ جمیل نثر نگاری کی حیثیت سے بھی اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ "روایت کے قیدی" زیرِ طباعت ہے۔ اب تک ان کے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تصانیف میں "دل کی کتاب" (غزل)، "گیان درپن" (دوھے اور گیت)، "وحدت ومدحت" (حمد ونعت)، "آب وسراب" (نظمیں)، "گل ہائے صد نگار" (غزلیں)، "گلِ سہ برگ" (ثلاثی ماہیے اور ہائی کو) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ حمد ونعت کے بالترتیب دو مجموعے "الرحمٰن اور المدثر" ہیں۔ جمیل عظیم آبادی کی ایک غزل پیش ہے، ملاحظہ ہو۔

صنم تراشوں کی ہم نے بھی پیروی کر لی
خطا معاف کہ تقلیدِ آزری کر لی

بہار راس نہ آئی تو عندلیبوں نے
گلوں کو چھوڑ کے گل چیں سے دوستی کر لی

شبِ حیات کی تاریکیوں سے گھبرا کر
جلا کے گھر کے اثاثے کو روشنی کر لی

تلاشِ آب سے صحرا میں تھک گیا ایسا
شریک اپنے مقدر میں تشنگی کر لی

عجب ہے حال ہمارے نگاہ بانوں کا
فصیلِ شہر پہ دشمن سے دوستی کر لی

جمیل غم کو بھلانے کا یہ بہانہ ہے
لگی جو چوٹ کوئی دل پہ شاعری کر لی

مشکل ہے شعرگوئی بھی اس دور میں جمیل
جب فن کی ناؤ فکر کی پتوار سے چلے

ایک سے ایک حسیں لوگ ہیں محفل میں مگر
یاد ہم کو تو وہی خاک بسر آوے ہے

بیزار بھی گلشن سے ہیں دیتے ہیں دعا بھی
کس خاک کی تخلیق ہیں ہم اہل وفا بھی

آئے تھے گلستاں میں کہ پھولیں گے پھلیں گے
افسوس کہ راس آئی نہ گلشن کی ہوا بھی

موجود ہیں کچھ لوگ اس شہر وفا میں
جو آگ بجھاتے بھی ہیں دیتے ہیں ہوا بھی

اتنا کہاں تھا ہوش ہمیں انقلاب میں
اپنے ہی گھر کو پھونک دیا اضطراب میں

کب تک شبِ حیات تکے راہ صبح کی
کب تک رہے امید کی دنیا عذاب میں

تشنہ ذہن رہے لب دریائے ریگ ہم
یوں ہی کٹی ہے زندگی اپنی سراب میں

ویرانیِ گلشن کو بہاروں کی طلب ہے
اجڑے ہوں اگر دل تو وہ بستے ہیں بہت کم

وہ شعلہ بیاں ہیں مجھے تسلیم ہے لیکن
بادل جو گرجتے ہیں، برستے ہیں بہت کم

اشعار میں گہرائی جمیلؔ آئے کہاں سے
ہم فکر کے معیار پر کہتے ہیں بہت کم

--••☆••--

جوہر سعیدی

اصل نام سید محمد علی، تخلص جوہر اور قلمی نام جوہر سعیدی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ریاست ٹونک کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید سلامت علی معروف شاعر تھے اور تخلص سلامت فرماتے تھے۔ جوہر سعیدی نے ابتدائی تعلیم میں سب سے پہلے قرآن شریف حفظ کیا پھر اس وقت کے دستور کے مطابق اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے الہ آباد سے منشی کا امتحان پاس کیا۔ جوہر سعیدی اردو فارسی کی اہم کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کرتے تھے۔ ذوقِ سخن انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ اس طرح بچپن ہی سے ان کی طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی جس کی تکمیل کے لیے انہوں نے حضرت بسمل سعیدی کی شاگردی اختیار کرلی۔ اس زمانے میں ٹونک کی ادبی فضاؤں پر حضرت بسمل سعیدی چھائے ہوئے تھے۔ جوہر سعیدی بتاتے ہیں کہ انہیں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز سنہ ۳۷-۳۸ء میں ہوا۔ ذریعہ معاش کے لیے جوہر سعیدی دہلی چلے گئے اور مسلسل کئی سال تک وہیں رہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد جوہر سعیدی پاکستان آ گئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ یہاں آنے کے بعد بسمل سعیدی سے اصلاح لینے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد پھر انہوں نے کسی سے اصلاح بھی نہیں لی لیکن اپنے شعر و سخن کا سلسلہ جاری رکھا۔ جوہر سعیدی نے قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں لیکن غزل ان کی محبوب ترین صنف سخن رہی ہے۔ ان کا پہلا مجموعۂ غزلیات ''بادِ سُبک دست'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جوہر سعیدی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے سلیم احمد لکھتے ہیں:

''جوہر سعیدی کی شاعری ہمارے تاریخی تسلسل کا حصّہ ہے اور اگر اسے اور اس قسم کی دوسری شاعری کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہماری روایت کی ایک کڑی گم ہو جائے گی، جہاں تک جوہر سعیدی صاحب کے موضوعات کا تعلق ہے، وہ بدلتے ہوئے زمانے، ٹوٹتے ہوئے انسانی رشتے، اخلاقی پستی، انحطاط اور روایاتِ حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ

جوہر سعیدی صاحب کا تجربہ انہیں براہِ راست زندگی میں شرکت سے ہوا ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ زندگی سے پیدا ہو کر زندگی ہی کو آئینہ دکھاتا ہے۔"

پروفیسر انجم اعظمی فرماتے ہیں:

"اس دور میں غزل گوئی کی مقبولیت پہلے سے بھی کچھ زیادہ ہے غزل کہنے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن سچ پوچھیے تو غزل کے نازک اور لطیف فن کا یہ تقاضہ ہے کہ اگر کسی میں جوہر سعیدی جیسا فن کو برتنے کا سلیقہ موجود نہیں تو اسے غزل کہنے کا حق بھی نہیں پہنچتا۔ جوہر سعیدی کراچی کی مضافاتی بستی لانڈھی میں رہتے ہیں جو شہر سے اچھے خاصے فاصلے پر ہے اور ان کے یہاں آنے جانے میں دشواریاں پیش آتی ہیں لیکن شعراء کی خاصی بڑی تعداد اور بطورِ خاص مغربی یوپی، ٹونک اور دلی کے کئی شاعر ہر موسم میں ان سے فیض اٹھاتے ہیں"

۲۰ رفروری ۱۹۹۷ء کو جوہر سعیدی دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ وہ ایک کہنہ مشق بزرگ شاعر تھے۔ مختلف انجمنوں کی طرف سے ان کو متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ان کے کلام کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں ملاحظہ کیجیے ۔

اب ذہن میں آتا ہی نہیں اُس کے سِوا کچھ
کیا مصرفِ عمرِ گزراں دے کے گیا وہ

ٹوٹ جائے گا مِرا سلسلۂ تارِ نفس
تیرے غم نے بھی اگر راہ نہ پائی مجھ میں

قربت کی تمنا کے خدوخال سنوارنے
جب ذوق طلب مرحلۂ دید سے نکلا

الزام نہ دے عشق کی شوریدہ سَری کو
ہے تنگ اگر دشت نوردی سے تو گھر جا

فضائے آخرِ شب کی لطافت
سحر کے نام ہے نذرانۂ شب

ٹھہراؤ کِس کی ذات سے ہے کائنات میں
بہتے ہوئے حیات کے دھاروں میں کون ہے

مِرے خیال میں جو شخص رنگ بھرتا ہے
نہیں ہے سامنے لیکن کمال کرتا ہے

جوہر، تمام عُمر ہے، سونے کے واسطے
مانو، ہماری بات، ابھی جاگتے رہو

قصۂ شب ہیں، نہ رودادِ سحر ہیں ہم لوگ
اپنے خوابوں کے جزیروں کا سفر ہیں ہم لوگ

ٹوٹ جاتے ہیں صدا اُن کے شکستِ دل کی
ساکنِ قریۂ اربابِ نظر ہیں ہم لوگ

ہم سے بچ بچ کے گزرتے ہیں رفیقانِ سفر
جیسے اک سنگ سرِ راہ گزر ہیں ہم لوگ

چند بیتی ہوئی یادیں ہیں، ہماری ہمدم
چند گزرے ہوئے لمحوں کا سفر ہیں ہم لوگ

منزلیں گردِ رہِ شوق رہی ہیں ہم سے
کیا ہوا آج اگر خاک بسر ہیں ہم لوگ

ہم کو پڑھ لوگے تو بن جاؤ گے جوہر انساں
قصۂ دردِ دل و دیدۂ تر ہیں ہم لوگ

---••☆••---

حاصل مرادآبادی

حاصل ۱۹۳۲ء کو مرادآباد یوپی کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام ابن علی خاں، قلمی نام حاصل مرادآبادی اور تخلص حاصل ہے جو برصغیر کے معروف شاعر احسان دانش نے عطا کیا تھا۔ حاصل نے ابتدائی تعلیم محلّہ کٹار شہید، مرادآباد کے مڈل اسکول میں حاصل کی۔ معروف شاعر نسیم فروغ ان کے ہم جماعت تھے۔ اسی زمانے میں ان کو شعروسخن کا ذوق پیدا ہوا۔ ادیب اور ادب نوازی، شعروسخن اور نغمہ وسرود کی محفلیں منعقد کرنا ان کے خاندان کی اعلیٰ اقدار میں شامل تھا۔ مڈل اسکول کی تعلیم کے بعد انہوں نے منشی ادیب کے امتحانات پاس کیے۔ چوں کہ شعرگوئی سن شعور ہی سے شروع ہوگئی تھی لہذا تعلیم کا سلسلہ پیچھے رہ گیا اور گریجویشن کرنے کا موقع نہ مل سکا۔
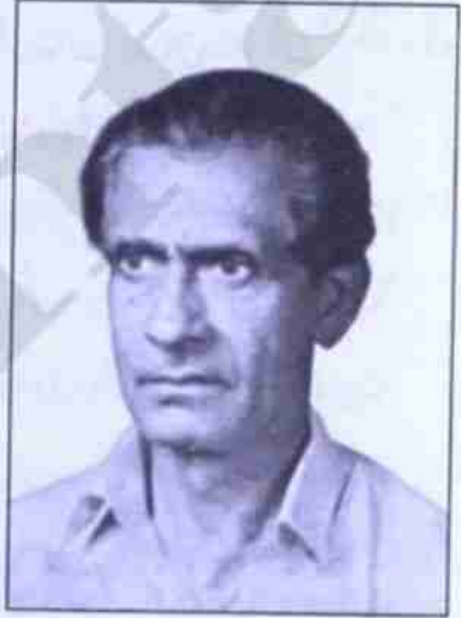
تعلیم کے بعد حاصل صاحب محکمہ ریلوے میں اپرینٹس بھرتی ہوگئے۔ تقسیم کے وقت انہوں نے پاکستان جانے کا آپشن دیا لیکن اہل خانہ نے اجازت نہیں دی۔ ۱۹۵۲ء میں وہ پاکستان آگئے اور ڈی ایس آفس کراچی ریلوے میں ملازمت اختیار کر لی اور یہیں سے ۱۹۸۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بہادر یار جنگ اکادمی سے منسلک ہوگئے اور آج بھی وہ اسی ادارے میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مرادآباد جہاں جگر مرادآبادی جیسے عظیم شاعر پیدا ہوئے ہمیشہ سے شعروسخن کا گہوارہ رہا ہے۔ اسی بستی کے ماحول میں رہ کر حاصل صاحب نے بچپن ہی میں شعر کہنے کی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ وہ ہر صنف میں شاعری کرتے ہیں لیکن غزل ان کی پسندیدہ صنف سخن ہے۔ ابتدا میں انہوں نے جناب رشید مولائی اور بعد میں فخر غزل حضرت قمر مرادآبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جگر مرادآبادی مستقل طور پر گونڈہ میں سکونت اختیار کر چکے تھے اور مرادآباد میں شہاب الدین اثر، صہبا، نامی، قمر، جالب، راحت مولائی، رشید مولائی، عادل ادیب اور رئیس امروہوی جیسے دانشوروں کی طوطی بول رہا تھا۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' میں جناب صلاح الدین لکھتے ہیں:

حاصلؔ کا کبھی کسی ایسی ادبی تنظیم سے تعلق نہیں رہا جس کا مقصد صرف شہرت حاصل کرنا رہا ہو جہاں تک میرے علم کا تعلق رہا ہے انہوں نے حصول شہرت کی خاطر ذرائع ابلاغ کے چکر بھی نہیں لگائے جس سے انہیں خاطر خواہ شہرت مل سکتی ہو۔اس ضمن میں یہی کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حاصلؔ نے اپنے طور پر جو کچھ حاصل کرنا چاہا وہ انہیں حاصل ہوگیا یعنی وہ ایک منفرد شاعر ہونا چاہتے تھے،سو ہو گئے۔اب باقی کام اہلِ اختیار کا رہ گیا ہے بقول جگرؔ

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں ۔۔۔ میرا پیغام......محبت ہے جہاں تک پہنچے

گویا حاصل مرادآبادی نے اپنا فرض پورا کر دکھایا"

آخر میں حاصلؔ مرادآبادی کے کلام سے لیے گئے چند اشعار ملاحظہ کیجیے

سرگزشتِ زندگی لکھنے کا آیا تھا خیال ۔۔۔ واقعے کچھ ایسے یاد آئے قلم رکھنا پڑا

فرشِ گل آبلہ پاؤں کے مقدر میں کہاں ۔۔۔ آپ آسودۂ منزل ہیں سفر میں ہم ہیں

وصال و ہجر کے موسم انہیں مبارک ہوں ۔۔۔ جو کم نگاہ تجھے دل سے دُور جانتے ہیں

کوئی بھی گوشہ حریم جاں کا تابندہ نہیں ۔۔۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہم مرچکے زندہ نہیں

کیسے اپنائیں ضمیروں کی تجارت کا اُصول ۔۔۔ سانحہ یہ ہے کہ ہم بھی اسی بازار میں ہیں

کتنے طوفانوں کی زد میں ہے مرا خاکی وجود ۔۔۔ جرم اتنا ہے کہ میں تہذیب کا گھوارہ ہوں

جب ہوا معلوم اس میں دوستوں کا ہاتھ ہے ۔۔۔ زندگی بھر پھر ہمیں زخمِ جگر اچھا لگا

علامت کس قدر واضح ہے یہ تشکیلِ ہستی کی ۔۔۔ میں اک تارِ نفس ہوں اور تو مضراب جیسا ہے

دلوں کے زخم کہیں مرہموں سے بھرتے ہیں ۔۔۔ علاج ان کا محبت بھری زبان میں ہے

جہاں میں سینہ بہ سینہ تلاش کرتا ہوں ۔۔۔ وہ دل کہ جس میں سمائے ہوں پرائے بھی

کسی سے کیا کوئی پیمان دوستی باندھے ۔۔۔ یہاں تو خود سے بچھڑنے کا احتمال بھی ہے

کہاں وصال کی خوشبو کہاں فراق کا سوز ۔۔۔ وہ چاند کا سفر تھا، یہ آفتاب کا ہے

ضمیر بیچتے اپنا تو مقتدر ہوتے ۔۔۔ خیالِ عظمتِ انساں ہمیں تو مار گیا

گھومنے نکلا تو کتنی بھیڑ تھی ۔۔۔ سوچنے بیٹھا تو تنہا رہ گیا

--••☆••--

حسرتؔ ترمذی

ان کا اصل نام سید احمد، قلمی نام حسرت ترمذی اور تخلص حسرتؔ تھا۔ حسرتؔ ترمذی مارچ سنہ ۱۹۰۶ء کو جہاں آباد (کوڑہ) فتح پور ہسوہ کے ایک علمی ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا بڑے پایہ کے عالم اور شاعر تھے۔ ترمذی کی والدہ بھی عربی فارسی پڑھی ہوئی اور بہت قابل خاتون تھیں۔ اپنے گھر کے علمی ادبی ماحول میں رہ کر حسرتؔ ترمذی نے بھی سولہ سال کی عمر میں فارسی اور عربی میں اچھی استعداد حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے، ایل ایل بی کر کے سنہ ۱۹۲۸ء میں وہ حیدر آباد دکن چلے گئے اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد کے ہوم آفس میں انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور جلد ہی ترقی کر کے اسسٹنٹ ہوم سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ حسرتؔ صاحب کو ذوقِ سخن ورثہ میں ملا تھا چنانچہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ تذکرۂ شعرائے پاکستان میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''میرے نانا مشہور عالم اور شاعر تھے میری والدہ فارسی اور اُردو میں قابل تھیں اور شعر کہتی تھیں۔ میرے چچا احمؔر ترمذی عُمر شعر کہتے تھے۔ یہ میرا ابتدائی ماحول تھا بعض حالات کی وجہ سے مجھے ابتدائے سنِ شعور سے مشاہدات اور تجربات کا موقع ملتا رہا اور چونکہ میری طبیعت کا رجحان شروع سے غزل گوئی کی طرف تھا۔ اس لئے آیندہ جب میں محبت کی لذتوں اور تلخیوں سے آشنا ہوا تو غزل ہی کہنے لگا۔ عام طور پر میری شاعری خالص غزل کی شاعری ہے جس میں جذباتی شاعری نمایاں ہے۔''

ان کے عربی کے استاد مولانا عبدالرحمٰن دیوبندی کی حوصلہ افزائی اور اپنے ایک عزیز ترین دوست حسن عبداللہ حسنؔ غازی پوری کے فیضِ صحبت سے ذوقِ شاعری میں اضافہ ہوتا گیا۔ الہ آباد کے مشاعروں اور باکمال شعراء کی ملاقاتوں نے حسرتؔ کے شاعرانہ جوہر کو اور آبدار بنا دیا۔ پروفیسر حمید الدین شاھدؔ ''سب رس'' یادگارِ رفتگان نمبر (حصہ دوم) میں لکھتے ہیں:

> ''الہ آباد کے سالانہ مشاعروں اور باکمال شعراء کی ملاقاتوں نے حسرتؔ کے شاعرانہ جوہر کو اور چمکا دیا۔ حیدآباد کا علمی وادبی ماحول صحیح معنوں میں ان کے ذوقِ شعروادب کو پروان چڑھانے میں ممدو معاون ثابت ہوا۔ قیامِ حیدر آباد کا اکیس سالہ زمانہ دراصل ان کی شاعری

کا درخشاں دور ہے۔ حیدر آباد کے شعر پرور ماحول میں حسرت ترمذی کی شاعری نے ارتقائی منازل طے کیے اور مشاعروں میں ان کا کلام بڑے شوق سے سنا جاتا تھا۔

حسرت کی شاعری اور زندگی میں بڑی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے تنگنائے غزل میں اپنی زندگی کے مشاہدات، تجربات اور نظریات کو بڑی خوبی سے اُجاگر کیا ہے۔ کسی سے باقاعدہ تلمذ نہیں رہا۔ البتہ جوش ملیح آبادی نے قیامِ حیدر آباد کے زمانے میں مختلف اوقات میں ان کی (۲۰) غزلوں پر اصلاح دی تھی۔"

جون سنہ ۱۹۴۹ء میں حسرت ترمذی کراچی (پاکستان) منتقل ہو گئے اور شہری ہوابازی کے محکمے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ لیکن سنہ ۱۹۵۸ء کی اسکریننگ میں سیکڑوں لوگوں کے ساتھ وہ بھی زبردستی ہٹا دیے گئے۔ اچانک اس طرح نکالے جانے کے بعد انہیں ایسا صدمہ ہوا اور ایسے حالات سے دوچار ہوئے کہ پھر زندگی بھر کھڑے نہ ہو سکے۔ اسمٰعیل احمد تسنیم مینائی "سب رس" یادگارِ رفتگان حصہ دوم میں لکھتے ہیں:

"سنہ ۱۹۵۸ء کے غیر آئینی انقلاب کے بعد اپنے جیسے ہزاروں کی طرح "اسکریننگ" میں گھر بٹھا دیے گئے۔ چندے فضلی نے اپنے دبستان میں سہارا دیا۔ پھر نخشب جارچوی نے کچھ روز سرپرستی کی لیکن پھر وہ پنپے نہیں۔ ملیر کالونی میں مکان بنوالیا تھا وہیں گوشہ نشین ہو گئے۔ شاعری، بذلہ سنجی، احباب نوازی، کسی سے کوئی واسطہ نہیں رہا، غنیمت ہے کہ غزل گوئی کا مشغلہ باقی رکھا گو غزل سرائی سے تائب ہو گئے، ان کے احباب ماہر القادری، تابش دہلوی، نخشب، فضلی اور راقم الحروف سب نے کوشش کی لیکن حسرت ترمذی نے پھر کسی سے سروکار نہ رکھا اور اسی گوشہ نشینی کے عالم میں دسمبر سنہ ۱۹۷۷ء کی ایک سرد اور اداس سہ پہر کو چپکے سے لیں آنکھیں موند، یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا۔

ماڈل کالونی کے خاموش، سنسان اور اندھیرے گورستان میں سچی اور پُر تاثیر غزل گوئی کا یہ سخنور جس کے اشعار پر حسرت موہانی کا دھوکا ہوتا ہے اور جس کی بعض ابیات پر حسرت موہانی نے بھی رشک کیا، ۷ / دسمبر سنہ ۱۹۷۷ء کو سرِ شام نیند قیامت کی سو گیا۔ کسی کو خبر ہوئی اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔"

حسرتؔ ترمذی کا کلام نہ تو حیدر آباد میں چھپا اور نہ پاکستان میں چھپ سکا۔ ترمذی صاحب کے کچھ اشعار پیش ہیں، ملاحظہ ہوں۔

سینے میں زخم، لب پہ ہنسی، دل تو دیکھنا
اے تیرِ ناز ہمتِ بسمل تو دیکھنا

مشکل قدم قدم پہ ہے مشکل تو دیکھنا
اے شوقِ راہبر مری منزل تو دیکھنا

موجوں کی یہ تڑپ یہ تلاطم یہ اضطراب
اے ناخدا خموشیٔ ساحل تو دیکھنا

آئی بہار اور خزاں بن کے رہ گئی
اے ہمنشیں بہار کا حاصل تو دیکھنا

کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں
اے شامِ بے کسی مری محفل تو دیکھنا

حسرتؔ کے دم سے ہیں تری محفل کی رونقیں
حسرتؔ کے بعد رونقِ محفل تو دیکھنا

یہ بے قرار موجیں یہ دلفگار موجیں
افسانہ کہہ رہی ہیں ساحل کی بے حسی کا

کچھ اور تلخیاں بھی ترے میکدے میں ہیں
ساقی تری شراب میں لذت نہیں رہی

میکدہ میں دورِ جامِ عیش چلتا ہی رہا
غم زدہ آنکھوں سے موجِ غم اُبلتی ہی رہی

جب یہ دنیا بے نیازِ خیر و شر ہو جائے گی
زندگی دشوار سے دشوار تر ہو جائے گی

---••☆••---

حسن عابد

اصل نام سید حسن عابد زیدی، تخلص حسن اور قلمی نام حسن عابد ہے۔ ۱۷ مئی سنہ ۱۹۳۵ء کو سیتاپور، یوپی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید محمد ساجد گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھے۔ حسن کی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ اسکول گونڈہ میں ہوئی اور میٹرک کا امتحان انہوں نے سنہ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ اسکول پرتاب گڑھ یوپی سے پاس کیا۔ جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب ماہر اور بی اے لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔ سنہ ۱۹۵۷ء میں حسن عابد پاکستان آ گئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ یہاں آ کر ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے نائٹ پوسٹ آفس میں ملازمت اختیار کی اور اپنے تعلیمی سلسلے کو جاری کیا۔ پوسٹ آفس کی ملازمت کے بعد ایرانیان ٹیکنیکل اسکول کھارادر میں پڑھایا اور پھر گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ دورانِ ملازمت انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو)، ایم اے (فارسی) اور پھر بی ایڈ کے امتحانات پاس کیے۔ گورنمنٹ اسکول کے بعد وہ حبیب کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ حبیب کالج بند ہو جانے کے بعد ان کا تبادلہ اسلامیہ کالج میں ہوا اور پھر ڈی جے سائنس کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوئے اور یہیں سے مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

حسن عابد نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں ہر فرد کو ذوقِ سخن سے لگاؤ تھا۔ ان کی دادی جو پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن اپنے مذہبی جذبات کا اظہار وہ شعروں میں کرتی تھیں۔ حسن کے والد سید محمد ساجد بھی شاعر تھے لیکن ان کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ انہیں مذہب سے بڑا لگاؤ تھا اور علامہ اقبال کے بہت معترف تھے۔ انہوں نے حسن کو بچپن ہی میں اقبال کی کئی نظمیں یاد کرا دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن ہی سے حسن صاحب کا میلان شاعری کی طرف ہوا۔ دورانِ تعلیم وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں بھی شرکت کرنے لگے تھے۔ حسن عابد شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں: ''شاعری میرے نزدیک کسی سوئے ہوئے انسان کی بڑبڑاہٹ نہیں ہے بلکہ یہ ایک باشعور انسان کا ذریعۂ اظہار ہے۔'' حسن عابد کے مجموعۂ کلام پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری فرماتے ہیں:

''حسن عابد نے ''ہوا'' کے لفظ کو تباہی و بربادی کی علامت بنا کر بہت سے اشعار کہے ہیں، جن میں انکل سام جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں صرف دو شعر دیکھیے ۔

جب بھی آئی کسی آنگن وہ ہوا
ہوا کرتی ہے اپنا کام اور شمعیں بجھاتی ہے

آئے گردش میں وہاں کے پتے
ہم اپنا کام کرتے ہیں بجھی شمعیں جلاتے ہیں

اس شعر کی اوپری سطح پر نہ جایئے، لفظوں کے اندر جھانک کر دیکھیے۔ ''ہوا'' اپنے علامتی روپ میں صاف کہہ رہی ہے کہ جہاں کہیں ''انکل سام'' کی منحوس پرچھائیں پڑتی ہے یا جو علاقہ امداد کے نام سے ان کے زیرِ سایہ آتا ہے، وہ پہلے سے بھی زیادہ بربادیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ واقعات یہی بتاتے ہیں کہ جس جس کو چچا نے امداد دی اس کے معاشی حالات اور بھی گھمبیر ہو گئے۔

دوسرے شعر کے اصل معنی کا اطلاق بھی ''انکل سام'' پر ہوتا ہے۔ اس میں انکل سام کے ظلم پیہم کے خلاف مظلوموں کے ردِ عمل کا اظہار ہے کہ ظالم اپنا کام کیے جاتا ہے تو مظلوم بھی اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ ظالم کے جبر و ستم کے سامنے حوصلہ نہیں ہارتے بلکہ جینے اور جیے جانے کا وسیلہ پیدا کرتے ہیں۔''

حسن عابد ٹورنٹو کینیڈا سے شائع ہونے والے ''اُردو انٹرنیشنل'' کے معاون رہے ہیں۔ آج کل وہ ''ارتقا'' سے منسلک ہیں۔ ''ارتقا'' سماجیات اور ادبی مسائل پر لکھنے والا کتابی سلسلہ ہے۔ حسن عابد کے تین شعری مجموعے ''سوچ نگر''، ''رنگ لایا ہے جنوں'' اور ''آشنائیاں'' ایک ساتھ ملا کر ''روز و شب'' کے عنوان سے شائع کیے گئے ہیں۔ ان کے کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

چل اے دل پھر سے چل کے محفلِ رنداں سجاتے ہیں
بہت دن ہو گئے یارانِ خوش دل یاد آتے ہیں

شگفتِ شوق کے وہ رنگ ساماں دلکشا موسم
ہمیں آواز دے کر پھر وہی موسم بلاتے ہیں

ابھی تک روشنی ہے شمعِ انگشتِ حِنائی کی
ابھی تک میری پلکوں پر ستارے جگمگاتے ہیں

تمنا جن کی دل کو رات بھر بے چین رکھتی ہے
وہ چہرے آنسوؤں کے آئینے میں جھلملاتے ہیں

پھرا کرتی ہیں تصویریں سی ان آنکھوں میں گلشن کی
ہمیں گزرے ہوئے موسم سہانے یاد آتے ہیں

فسانے کتنے خوش آہنگ و نسیاں خیز ہیں یعنی
حقیقت جو بھی ہو ہم رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں

جانِ بہار اَب کبھی بھول کے بھی نہ آئیں گے لمحے فراقِ یار کے اور نگر بسائیں گے
کیسے بھلا سکے گا دِل ہجر کشی کے روز و شب لاکھ بُرے سہی مگر دِن تو وہ یاد آئیں گے
جھوٹ تھا جو کہا گیا سچ نہ تھا جو لکھا گیا تُم ہمیں بھول جاؤ گے ہم تُمہیں بھول جائیں گے

جاتا نہیں یہ عشق کا آزار دیکھنا پھر در پہ آگئے ترے بیمار دیکھنا
اک بے قرار دل ہے کہ پاتا نہیں قرار جاتی نہیں ہے خواہشِ دیدار دیکھنا
ہر شام ڈھونڈنا اسے دشتِ سیاہ میں ہر صبح جا کے مصر کا بازار دیکھنا
زنبیلِ فتوا ہائے فقیہانِ شہر کا پھر کھل گیا ہے منہ سرِ بازار دیکھنا
اس شہرِ بے نظیر میں فتووں سے کفر کے کیسے سجے ہیں سب در و دیوار دیکھنا

--••☆••--

حمرا خلیق

حمرا خلیق ۸/اپریل سنہ ۱۹۳۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد صوفی صغیر حسین صاحب علمی و ادبی ذوق کے آدمی تھے۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں کئی شہروں میں رہے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج الہٰ آباد میں بحیثیت پرنسپل بھی خدمات انجام دیں۔ حمرا خلیق کے نانا عبدالاحد صاحب ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم الہٰ آباد کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا شمار بریلی کے معزز و معتبر لوگوں میں ہوتا تھا۔ حمرا خلیق کی والدہ سپہر آرا خاتون عرف رابعہ برصغیر کی نامور اور صاحب طرز شاعرہ تھیں جو پنہاںؔ تخلص کرتی تھیں۔ وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتی تھیں۔ ان کی خالائیں بلقیس جمالؔ اور میمونہ غزالؔ بھی اپنے دور کی مشہور شاعرات تھیں۔ ان کی ایک خالہ آمنہ عفتؔ نثر نگار تھیں۔ حمرا خلیق کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو علم و ادب شعر و سخن کا گہوارہ تھا۔ پھر ان کی شادی بھی ایسے عظیم انسان سے ہوئی جس کا نام دنیائے ادب میں بڑے ادب سے لیا جاتا ہے۔ یہ ہیں برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت جناب خلیق ابراہیم خلیقؔ۔ حمرا خلیق کے ایک صاحبزادے حارث خلیق بھی اُردو انگریزی کے شاعر ہیں۔ ان کی اُردو شاعری کے دیوان ''آج جب ہوئی بارش''، ''سارے کام ضروری تھے'' اور ''پُرانی نمائش'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

حمرا خلیق نے سنہ ۱۹۵۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی ہی سے انٹرمیڈیٹ اور پھر سنہ ۱۹۵۷ء میں بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے بعد حمرا خلیق نے سنہ ۱۹۵۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی ایڈ کرنے کے بعد سنہ ۱۹۶۳ء میں ایم اے کیا۔ ۱۹۹۵ء میں انہوں کراچی یونیورسٹی سے ایل بی بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔

تعلیم کے دوران حمرا خلیق درس و تدریس سے وابستہ ہوگئی تھیں۔ بی ایڈ کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۱ء تک انہوں نے کاسموپولیٹن گرلز سیکنڈری اسکول کراچی میں پڑھایا۔ سنہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک گورنمنٹ گرلز سیکنڈری اسکول ناظم آباد میں تعلیم دیتی رہیں۔ اس کے بعد حمرا خلیق نے سنہ ۱۹۶۴ء سے

سنہ ۱۹۶۶ء تک فضل الرحمٰن گرلز سیکنڈری اسکول میں پڑھایا-سنہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۸ء تک انہوں نے فضل الرحمٰن انٹر کالج میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں-

اس خاندان کے ہر فرد نے علمی وادبی سرگرمیوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں-حمرا خلیق بھی بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کی شوقین رہی ہیں-ان کی کہانیاں ملک کے مختلف مقتدر جرائد ''افکار''، ''ارتقاء''، ''روشنائی''، ''ارتکاز''، ''مکالمہ''، ''دنیازاد''، ''پہچان'' (میر پور خاص) ''نورونار'' لاہور اور صحیفہ لاہور وغیرہ میں چھپتی رہتی ہیں-وہ ایک صاحب طرز مترجم بھی ہیں-حال ہی میں ان کے ترجمہ کی ہوئی ایک کتاب ''مشرق ومغرب کے افسانے'' شائع ہوئی ہے-ان کی طبع زاد کہانیوں کی ایک کتاب زیر ترتیب ہے-حمرا خلیق ڈراموں اور مباحثوں میں بھی بڑی دلچسپی لیتی ہیں-

---••☆••---

حمید نسیم

تخلص نسیم اور اصل نام حمید نسیم تھا۔ ۶ / اکتوبر ۱۹۲۰ء کو شاہ پور کنڈی، ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالعزیز جنہیں شعر و سخن کا ذوق تھا، محکمہ پولیس میں تھانیدار کے منصب پر فائز تھے۔ حمید نسیم اپنے والدین کی آخری اولاد تھے۔ جب وہ چار سال کے ہوئے تو انہیں ابتدائی تعلیم کے لیے مسجد بھیج دیا گیا اور انگریزی پڑھانے کے لیے گھر پر ایک استاد مقرر کر دیا گیا۔ اُردو قاعدہ ختم ہونے کے بعد کلمے اور سورۃ فاتحہ حفظ کرائی گئی۔ جب عبدالعزیز کا تبادلہ لاہور ہوا تو وہ اپنے خاندان کو لے کر لاہور آ گئے۔ یہاں پر حمید نسیم کو مزنگ کے ایم۔ بی۔ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں سے انہوں نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ مسلم ہائی اسکول امرتسر سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد امرتسر کے ایم اے او کالج سے انٹرمیڈیٹ اور خالصہ کالج لاہور سے بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۴۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے پاس کیا۔ بعد ازاں ایم اے فلسفہ کی کلاس میں داخلہ لے کر دو سال تعلیم حاصل کی لیکن امتحان نہیں دے سکے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ڈاکٹر محمد تاثیر اے ایم او کالج امرتسر میں پرنسپل ہو کر آئے تو اس وقت حمید نسیم انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر تاثیر جن سے حمید نسیم کے آخری دم تک تعلقات رہے، انہوں نے حمید نسیم کو کالج کے میگزین کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اس طرح وہ تین برس تک اپنے کالج کے میگزین کے ایڈیٹر رہے۔

۱۹۴۳ء میں ذریعہ معاش کی تلاش ہوئی تو لاہور آ گئے اور اخبارات اور ریڈیو کے لیے نظمیں، تبصرے اور دیگر اسکرپٹ لکھنے لگے۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ریڈیو پشاور میں پروگرام اسسٹنٹ کی عارضی آسامی پر ملازم ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد جب ریڈیو پاکستان نے نشریات شروع کیں تو ۱۹۴۷ء میں ان کا تبادلہ لاہور ریڈیو اسٹیشن پر کر دیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں انہیں موسیقی کے شعبے کی ذمہ داری سونپی گئی جس کے دوران ایک روز وہ لاہور کی ایک سڑک سے اک تارہ بجانے والے ایک ملنگ کو اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن لے آئے۔ چنانچہ ملنگ کے اُس اک تارے کی دھن ریڈیو پر نشر ہوئی جو بے حد پسند کی گئی اور ملنگ

بھی ''سائیں مرنا'' کے نام سے مشہور ہوگیا-حمید نسیم کو ہوش سنبھالتے ہی موسیقی سے شوق ہوگیا تھا-

انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے حادثات پیش آتے ہیں جن سے انسان کی زندگی کا رُخ بدل جاتا ہے-ایسا ہی ایک واقعہ حمید نسیم کے ساتھ بھی پیش آیا-ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے ایک دنبہ ذبح ہوتے اور اس کا خون بہتے ہوئے دیکھا تو خوف اور صدمے سے بے ہوش ہوگئے-یہ دنبہ ان کے بڑے بیمار بھائی کی صحت کے لیے قربان کیا گیا تھا-اس حادثہ کے بعد حمید نسیم دو ماہ تک سخت بیمار رہے-ان کی دیکھ بھال اور بہلانے کے لیے ایک روشنی نامی خاندانی میراثن کو بلایا گیا جو انہیں روزانہ آ کر گود میں لیتی اور مدھر اور شانت سُروں میں لوریاں اور گیت سناتی تھی-روشنی میراثن کی مسیحائی نے جسم کا مرض تو دور کر دیا لیکن اس کے میٹھے میٹھے سُر ساری عمر نیش زن رہے-اور یہی سچے میٹھے سُر حمید نسیم کی زندگی اور شخصیت کے لیے فیصلہ کن بن گئے-

جولائی ۱۹۴۸ء میں جب ریڈیو پاکستان کراچی کا آغاز ہونے والا تھا تو حمید نسیم کا تبادلہ کراچی کر دیا گیا- چار سال بعد ۱۹۵۲ء میں انہیں ترقی دے کر اسٹیشن ڈائریکٹر بنا دیا گیا اور اسی سال ریڈیو پاکستان کے ہیڈ کوارٹرز میں ڈائریکٹر آف پروگرامز کے عہدے پر ترقی دے دی گئی-اس کے بعد فروری ۵۵ء کو ریڈیو نشریات کی تربیت کے لیے لندن گئے-وہاں سے واپسی پر حمید نسیم کو حیدر آباد کے ریڈیو اسٹیشن پر ڈائریکٹر مقرر کیا گیا- مئی ۵۹ء میں کراچی اسٹیشن پر ڈائریکٹر ایکسٹرنل سروسز مقرر ہوئے-حمید نسیم نے بہت سے ملکوں کے سرکاری دورے کیے-۱۹۵۹ء میں ریڈیو کی کوریج کے سلسلے میں وہ جنرل محمد ایوب خان کے ہمراہ ایران اور ترکی کے دورے پر بھی گئے-۱۹۶۳ء میں امریکہ کی برینڈ آئس یونیورسٹی، میساچیوسٹس میں ٹیلی ویژن کے تربیتی کورس میں شریک ہوئے اور چار ماہ تک امریکہ کے طول وعرض کا مطالعاتی دورہ کیا-۱۹۷۱ء میں انہوں نے ریڈیو پاکستان سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کر لی-

حمید نسیم ایک علمی ادبی اور شعروسخن سے ذوق رکھنے والی شخصیت کے مالک تھے-شعروسخن میں انہوں نے ڈاکٹر محمد دین تاثیر سے اصلاح لی-نسیم تخلص کرتے تھے-ریڈیو پاکستان سے سبکدوش ہونے کے بعد بستر مرگ پر پہنچنے تک وہ تصنیف وتالیف کا کام ایک فریضے کی ادائیگی کے طور پر کرتے رہے-اس دوران اُن کی جو تصانیف شائع ہوئیں ان میں خودنوشت ''ناممکن کی جستجو''، شاعری کے مجموعے ''در دِ تحیر'' (مجموعۂ غزلیات)، ''جستِ جنوں'' (مجموعۂ غزلیات) اور ''گردِ ملال'' کے علاوہ تنقیدی مقالات ''علامہ

اقبال ہمارے شاعر'' ،'' پانچ جدید شاعر'' ہیں۔ادبی تصانیف سے بڑھ کر ان کا اہم کام عالمی فلسفۂ مذاہب کے تناظر میں پانچ جلدوں پر مشتمل قرآن مجید کی تفسیر ہے جو'' تعارف الفرقان'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ۲۸ رستمبر ۱۹۹۸ء کو حمید نسیم زندگی کا سفر ختم کر کے ملک عدم رخصت ہو گئے۔گبول ویلفیئر قبرستان، گلشن اقبال میں محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان کے کلام کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

سوال دل کا شام غم کو اور اُداس کر گیا
ترے وجود میں جو ایک ''میں'' تھا وہ مر گیا

ہر ایک دَور منفرد تھا، اب بھی دل پہ نقش ہے
گیا تو یوں لگا کہ جی کا ایک حصّہ مر گیا

میں یاس کی اتھاہ پستیوں کا ذکر کیا کروں
سیاہ یخ سی بے حسی میں جی ٹھٹھر ٹھٹھر گیا

اے دوستو، پھر زیست کا موسم کبھی ایسا نہیں ہوگا
یہ حُسن کی دھج، شوق کا یہ رنگ دوبارہ نہیں ہوگا

آتی ہیں رُتیں ایک تسلسل سے، بہر رنگ بر طور
دیکھے جو دن ہم نے زمانہ کوئی اُن سا نہیں ہوگا

جن لہروں کی لے ہم نے سُنی' جا چکی ہوں گی وہ بہت دُور
ہم دیکھ رہے ہیں جسے، کل وہ تو یہ دریا نہیں ہوگا

آج تو دل سے بھی ٹپکا ہے لہو سَر کی طرح
عکسِ گُل اُترا اس آئینے میں پتھر کی طرح

ایک وہ دن بھی تھے ہر رات تھی اک خوابِ جمیل
ہر سحر آتی تھی شاداب گُلِ تر کی طرح

اُس کی آنکھوں نے کہا آج سے تو تنہا ہے
یہ خبر گھوم گئی جان میں نشتر کی طرح

سنائیں جا کے کسے، کون اپنا حال سُنے گا
فروش گاہ میں کوئی غمِ آشنا نہیں ہوتا

جو خود میں گُم رہے، اُس کا کبھی بھلا نہیں ہوتا
جو حرفِ حق نہ کہے، بندۂ خُدا نہیں ہوتا

کیا کیا نہ عرضِ شوق کے عنوان یاد تھے
چپ لگ گئی جب اس سے ہوا سامنا کبھی

جاتا ہوں شہر جب کبھی، لوٹتا ہوں شکستہ دل
رہتا ہے نیش زن، قحطِ رجال کا خیال

ہوا ہے شہر میں کل شب جو قتلِ عام کا جشن
گلی گلی میں ہے آج اس کے انتقام کا جشن

گھروں کا گھور اندھیر افضا کا سناٹا
شہِ فلک کے لہو میں نہائی شام کا جشن

جو کھیل جاتے ہیں جانوں پہ حرفِ حق کہہ کر
وہ زندہ لوگ منائیں گے میرے نام کا جشن

پیچھے مُڑ کر دیکھو پل بھر، کیا کیا خوش قامت تھے لوگ
اُن کے پاؤں کی خاک کو بھی کبھی پا نہ سکیں ہم ایسے لوگ

---••☆••---

حنیف اسعدی

اصل نام حنیف احمد اسعدی، تخلص حنیف اور قلمی نام حنیف اسعدی ہے۔ یکم جولائی ۱۹۱۹ء کو یو پی (بھارت) کے ضلع شاہ جہان پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت اسعد شاہجہان پوری معروف شاعر تھے۔ اسعد شاہجہان پوری کے والد محمد ولی صاحب ریاست اندور میں فوجی ملازمت میں صوبہ دار تھے اور ان کے دادا امام بخش صاحب بسلسلۂ ملازمت اودھ سے شاہجہان پور آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ تقسیم سے قبل تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مسلم لیگ کے جلسوں میں مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے اسعد شاہجہان پوری جوشیلی نظمیں پڑھتے تھے۔
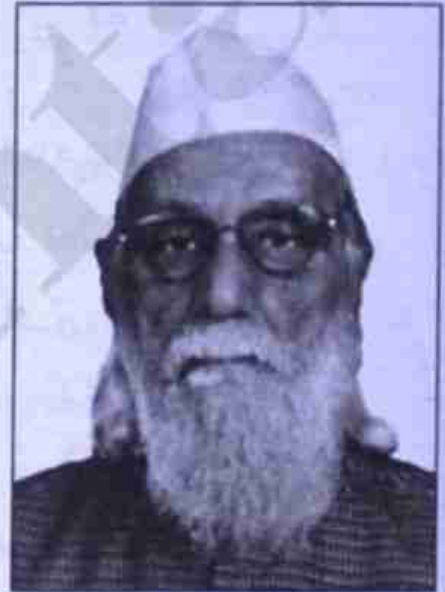
حنیف اسعدی کی ابتدائی تعلیم شاہ جہان پور میں ہوئی۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بے اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اُردو اور فارسی کے متعدد امتحانات بھی پاس کیے۔ تقسیم کے بعد اپنے والدین کے ساتھ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ یہاں آنے کے بعد وہ پاکستان نیوی سے وابستہ ہو گئے اور یہیں سے مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ پاکستان نیوی سے ریٹائر ہونے کے بعد ذریعہ معاش کے لیے حنیف اسعدی ہومیو پیتھک کی پریکٹس کرتے ہیں۔

حنیف اسعدی کو شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا۔ شعر و سخن میں وہ اپنے والد سے اصلاح لیتے رہے۔ انہوں نے غزل، نظم اور نعت سب ہی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا ایک نعتیہ مجموعہ ''آپ ﷺ'' شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے غزلیں، تاریخی قطعات اور نظمیں خاصی تعداد میں کہی ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ حنیف اسعدی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے برِصغیر کے معروف بزرگ شاعر تابش دہلوی لکھتے ہیں:

حنیف اسعدی نے ان اشعار میں تقریباً تمام فضائلِ نبویؐ کا احاطہ کرنے کی نہایت دلکش انداز میں کوشش کی ہے اور اپنے شاعرانہ اسلوب سے تاثر اور تاثیر کی نہایت دلکش

فضا پیدا کی ہے، حنیفؔ اسعدی کی نعتوں میں دل گداختگی کا ایسا پیرایہ ملتا ہے جو ان کو دوسے نعت گو شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔"

نمونہ کلام ملاحظہ ہو

ایک ہی رستہ تھا تسکینِ تمنا کے لئے
میں نے دنیا چھوڑ دی ہے اہلِ دنیا کے لیے

ایک دنیا اور بھی ہے ماورائے چشم وگوش
سیر گاہیں کم نہیں ذوقِ تماشا کے لیے

دشت جاں کو فصلِ گل سے کوئی نسبت ہی نہ تھی
ابر اٹھا تھا مگر بیرونِ صحرا کے لیے

میں نے غم چاہے تو تھے لیکن اب اتنے بھی نہیں
عاقبت اندیش ہوں رکھ لوں گا فردا کے لیے

میرے خشک وتر ٹھکانے لگ گئے انجام کار
قطرہ دریا کے لئے تھا ذرّہ صحرا کے لیے

میرے دم سے بھی تھی رونق دارِ فانی میں حنیفؔ
اک تماشا میں بھی تھا چشمِ تماشا کے لیے

نعتیہ اشعار

کوئی ہادی اب نہ آئے گا نہ اُترے گی کتاب
رتک کے واسطے فرمانِ پائندہ ہیں آپ

کیا مرتبہ ہے اُس تنِ عنبر سرشت کا
جس نے کبھی گلہ نہ کیا سنگ وخشت کا

ہر دَور ہر دیار ہے جس کے محیط میں
قرآں وہ معجزہ ہے رسالت مآب کا

کیسا اثر ہے آپ کے حُسنِ بیان میں
اس کا یقین دیا جو نہ آئے گمان میں

تاریخ کہہ رہی ہے کہ سیرت حُضور کی
قرآں کا ترجمہ ہے عمل کی زبان میں

یارب یہ تمنا ہے کہ نازل ہو وہ ہم پر
جو نعت ابھی قرض ہے قرطاس وقلم پر

---••☆••---

حیاؔ لکھنوی

حیاؔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یوپی کے شہر فیض آباد میں پیدا ہوئیں- ان کا آبائی وطن قصبہ ستر کھ ضلع بارہ بنکی ہے- ان کا اصل نام کنیز فاطمہ تھا اور حیاؔ تخلص کرتی تھیں- چونکہ قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہا اس لیے ادبی دنیا میں حیاؔ لکھنوی کے نام سے مشہور ہوئیں- ان کے والد چودھری نعمت اللہ صاحب کا شمار لکھنؤ کے کامیاب بیرسٹروں میں ہوتا تھا- وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے جج اور چیف جسٹس تھے- انہیں ''سر'' کا خطاب دیا جانے والا تھا لیکن اس بنا پر نہیں دیا گیا کہ انہوں نے قصہ خوانی بازار کی فائرنگ سے متعلق صوبہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بے لاگ رپورٹ پیش کی جو انگریزی حکام کو پسند نہیں آئی-

اس زمانے میں عموماً لڑکیوں کو تعلیم گھر ہی پر دی جاتی تھی- یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ حیاؔ ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئیں- انہوں نے اُردو فارسی اور کچھ تھوڑی بہت انگریزی کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اور اپنے ذاتی مطالعہ کی بدولت نہ صرف اُردو فارسی کی اچھی دسترس حاصل کی بلکہ شعر وادب کا ذوق بھی پیدا کیا- بچپن ہی سے انہیں شعر وسخن سے لگاؤ ہوا اور اپنا تخلص حیاؔ بھی خود ہی رکھا- انہوں نے شاعری میں کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی بس اپنے گھر والوں ہی کو دکھا دیا کرتی تھیں- ان کی پہلی نظم ''گلاب'' تہذیب نسواں لاہور میں شائع ہوئی تھی-

کنیز فاطمہ کی عمر ابھی پندرہ سولہ سال کی تھی کہ ان کی شادی چودھری عبدالرحمٰن صاحب سے ہوگئی- عبدالرحمٰن ہردوئی کے ایک رئیس خاندان کے فرد تھے- یہ خاندان ہردوئی سے لکھنؤ جا کر آباد ہو گیا تھا- لکھنؤ میں شعر وسخن کا ماحول میسر آیا تو حیاؔ نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی- ان کے شوہر کو شاعری سے کوئی دلچسپی تو نہیں تھی لیکن بیگم کے اشعار سن لیا کرتے تھے-

اس زمانے میں اور بھی لڑکیاں پردے میں رہ کر شاعری کرتی تھیں لیکن مشاعروں میں نہ تو لڑکیاں شریک ہوتی تھیں اور نہ ہی انہیں مدعو کیا جاتا تھا- اس سلسلے میں کنیز فاطمہ نے لڑکیوں کے مشاعرے کے

لیے ایک تحریک چلائی جس کے نتیجے میں قیصر باغ لکھنؤ میں ایک زنانہ مشاعرہ منعقد ہوا- غیر منقسم ہندوستان میں یہ پہلا زنانہ مشاعرہ تھا جس میں پڑھنے والی تمام شاعرات تھیں اور سننے والی بھی بکثرت خواتین تھیں- مرد سامعین کے لیے پردے کا انتظام کیا گیا تھا- اس وقت ایک اخبار ''سرپنچ'' میں اس مشاعرے کی مخالفت اور مذاق اڑایا گیا- اس مخالفت کے باوجود یہ مشاعرہ بڑا کامیاب رہا- اس کے بعد سے خواتین کے مشاعرے بھی ہونے لگے-

حیاؔ کو پڑھنے لکھنے کا بچپن ہی سے شوق تھا- شادی کے بعد بھی انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور منشی کا امتحان پاس کیا- انہوں نے لکھنؤ سے ایک پرچہ ''حیا'' بھی جاری کیا جو دو چار سال شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا- لکھنؤ میں جب ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو ریڈیو پر خواتین کی تقاریر کا ایک پروگرام رکھا گیا جس میں وجے لکشمی (پنڈت جواہر لال نہرو کی ہمشیرہ) نے ہندی میں اور حیاؔ نے اُردو میں تقریر کی- تقسیم کے بعد حیاؔ اپنے شوہر چودھری عبدالرحمٰن کے ساتھ پاکستان آ گئیں- ابتدا میں ان کا قیام لاہور میں رہا جہاں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا-

ادبی دلچسپیوں سے قطع نظر انہیں تہذیبی و اصلاحی کاموں سے بھی شغف تھا- بیگم زاہدہ خلیق الزماں، بیگم سروری عرفان اللہ اور دوسری خواتین کے ساتھ مل کر حیاؔ بھی تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں- یونی کیرین کے مجلے میں وہ لکھتی ہیں: ''مسلم لیگ میں بہت کام کیا- بلکہ ''خواتین مسلم لیگ'' میری ہی رہائش گاہ پر فاطمہ جناح نے آ کر بنائی تھی-''

حیاؔ نے شاعری کے ساتھ ساتھ ڈرامے اور افسانے بھی لکھے جو شائع نہ ہو سکے- ۱۰ر جون ۲۰۰۱ء کو خوش فکر و قادر الکلام شاعرہ حیاؔ دنیائے فانی سے رخصت ہو گئیں- ۱۹۹۶ء میں ''ارمغانِ حیا'' کے نام سے ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا- ذیل میں ان کے مجموعۂ کلام سے لیے گئے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

اُف مئے عشق سے لبریز ہے میخانۂ دل — کہ چھلک جائیگا اک دن یونہی پیمانۂ دل

آہ مٹ جانے کو ہے ہستی پروانۂ دل — اب بھی اغماض سراپا ہے وہ بیگانۂ دل

ساز خاموش کے نغموں میں شرر دیکھیں گے
ان کو ضد ہے کہ حیاؔ دردِ جگر دیکھیں گے

نہ بلبل کا ترنم اور نہ گل کی داستاں لکھوں — مرا دل چاہتا ہے بچھڑے پیاروں کا بیاں لکھوں

میرے جذبات لفظوں میں سما سکتے نہیں ہرگز — بتا ہمدم میں کیسے زندگی کی داستاں لکھوں
آج پھر یادِ وفا آئی ہے غافل کے قریب — کیونکہ اک احساس شیریں ہے مرے دل کے قریب
اے جفا پیشہ مقدر یہ تو بتلا دے ذرا — راستہ ایثار کا کتنا ہے منزل کے قریب
آبلہ پائی نہ وہ صحرا نوردی کے مزے — اب نہ وہ لیلیٰ نہ وہ مجنوں ہے محمل کے قریب
پھر تخیل میں سمایا آستانہ دوست کا — پھر پرستش کی ہوس ہے سعی حاصل کے قریب
اب تو ہر سود و زیاں احساس سے عاری ہوا — کتنے زخمی دل پڑے ہیں تیری محفل کے قریب
کامیابی تیرا حصہ میرا ناکامی نصیب — عیش وابستہ ہے تیرا رقص بسمل کے قریب
آشیاں اُجڑے ہوئی مدت حیاؔ پر آج بھی — اک خلش اک ٹیس اور اک درد ہے دل کے قریب

مجھ سے کہتی ہے یہ اُٹھ اُٹھ کے گھٹا ساون کی — باغ میں جھولا جھلاتی ہے ہوا ساون کی
اس کے ہر جھونکے میں بچھڑی ہوئی سکھیوں کی ہے بو — ان سے مل کر ابھی آئی ہے ہوا ساون کی
لطف ساون کا ہے مل جاؤ گلے سب آ کر — آج رہ رہ کہ یہ آتی ہے صدا ساون کی

یہ خاروں کی فراوانی تو دیکھو — گلوں کی یہ نگہبانی تو دیکھو
وہ مشت خاک بن کر آگئے ہیں — عقیدت میں یہ قربانی تو دیکھو
مظالم پر مظالم ہو رہے ہیں — گناہوں کی یہ ارزانی تو دیکھو
جہاں میں دیدہ ور آئے کہاں سے — محمدؐ کی دُر افشانی تو دیکھو
مئے توحید سے سر شار ہے دل — ذرا جذبے کی تابانی تو دیکھو
ہواؤں سے بھی بچ کر چل رہی ہے — حیاؔ کی پاک دامانی تو دیکھو

--••☆••--

خالدؔ علیگ

خالد علیگ ۱۹۲۵ء میں فرخ آباد کے ایک قصبہ قائم گنج میں پیدا ہوئے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ شعروسخن کا آغاز انہوں نے دوران تعلیم ہی سے شروع کردیا تھا۔علیگڑھ کے شعری وادبی ماحول نے ان کے ذوقِ سخن کو مزید جلا بخشی ۔برصغیر کے معروف شاعر مجازؔ بھی اس زمانے میں علیگڑھ میں تھے۔اسی زمانے میں جب بنگال میں قحط پڑا تو اس دور کے تمام ترقی پسند اور انسان دوست شاعروں نے اسے اپنا موضوع بنایا۔اس پر ایک نظم خالد نے بھی کہی تھی۔ شعروسخن کے ساتھ خالدؔ علیگ کو صحافت سے بھی ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔علی گڑھ کے زمانے میں وہ چودھری خلیق الزماں کے اخبار روزنامہ ''تنویر'' لکھنؤ میں خبریں بھیجتے تھے۔خالدؔ علیگ لکھنؤ کے ایک مشہور اخبار 'ہمدم' سے جو مولانا جمال فرنگی محلی نکالتے تھے' سے بھی وابستہ رہے۔اس کے علاوہ اترپردیش کے انگریزی اخبار نیشنل ہیرالڈ میں ان کی بھیجی ہوئی خبریں شائع ہوتی تھیں۔

۱۹۴۷ء میں خالدؔ صاحب ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ابتدا میں اوکاڑہ پھر لاہور میں قیام کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء وہ سندھ آگئے۔سندھ میں ان کا قیام سکھر اور میرپورخاص میں رہا۔خالدؔ علیگ بنیادی طور پر سول انجینئر ہیں۔انہوں نے پی ڈبلیوڈی (محکمہ انہار) حکومت سندھ میں تقریباً ۱۱ سال خدمات انجام دیں۔اس کے بعد انہوں نے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔سکھر کے قیام کے دوران خالدؔ علیگ کا رابطہ حسن حمیدی مرحوم، فتح اللہ عثمانی ایڈوکیٹ (ضلع سکھر کی نیشنل عوامی پارٹی کے روح رواں) اور آفاق صدیقی سے ہوا۔ خالدؔ علیگ موجودہ دور کے قدآور ترقی پسند اور نظریاتی شخصیت کے مالک ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ وہ کبھی ترقی پسند تنظیم کے رکن نہیں رہے۔

۱۹۶۰ء میں خالدؔ علیگ کراچی آگئے۔یہاں آنے کے بعد خالدؔ علیگ فخر ماتری کے اخبار ''حریت'' سے منسلک ہوگئے۔سنہ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے روزنامہ ''مساوات'' کراچی سے وابستگی اختیار کرلی اور

اب تک وہ اس اخبار میں خدمات انجام دے رہے ہیں- درمیان میں البتہ روزنامہ ''مشرق'' کراچی اور ''سندھ پوسٹ'' میں بھی کام کیا- خالدؔ علیگ ہمیشہ سے صحافت کے پیشے میں زیادہ دلچسپی رہی ہے- شاعر ہونے کے ساتھ وہ ایک بے باک صحافی بھی ہیں- اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن ہی سے ایک سماجی اور سیاسی شعور رکھنے والے طالب علم تھے اور دورانِ تعلیم سے ہی وہ طالب علموں اور مزدور تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تھے- اس سلسلہ میں وہ متعدد بار گرفتار ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں-

خالدؔ علیگ بزرگ شاعر ہیں- وہ ۷۵ برس سے شعر کہہ رہے ہیں- اس قد و قامت کا کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو اس کے کئی شعری مجموعے شائع ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے کلام کو چھپوانے میں کبھی دلچسپی نہیں لی یہاں تک کہ اپنا کلام لکھ کر محفوظ بھی نہیں کیا- کراچی پریس کلب کی ادبی کمیٹی نے ان کا مجموعہ مرتب کرنا چاہا مگر باوجود کوشش کے وہ چند صفحات ہی کا مواد جمع کر سکے- خالدؔ کی نظموں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ریاض صدیقی لکھتے ہیں:

> خالدؔ علیگ کی چند نظمیں ایسی ہیں جن کے غیر ملکی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے- الجزائر کے نمائندے محمد کلو کوان کی نظم ''الجزائر'' اس قدر پسند آئی تھی کہ اُس نے نظم کا عربی ترجمہ کروا کر بڑی تعداد میں شائع کرایا تھا- یہ وہ زمانہ ہے جب الجزائر میں فرانسیسی نو آبادیاتی تسلط کے خلاف قومی آزادی کی جنگ جاری تھی- ۱۹۵۹ء میں یہی نظم لندن کے اخبار روزنامہ ''ٹائمز'' کے نمائندے نے حاصل کی تھی اور اس کا انگریزی ترجمہ ''ٹائمز'' نے شائع کیا تھا-''

خالدؔ علیگ، جناب جوشؔ ملیح آبادی، جناب فیض احمد فیضؔ اور حبیب جالب کے بعد چوتھی شخصیت ہیں جنہیں کراچی پریس کلب کی تاریخ میں اس اعزاز سے نوازا گیا- ان کے شعری مجموعہ میں شائع ہونے والے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں- یہ شعری مجموعہ جناب زبیر منصور صاحب نے بڑی کاوشوں کے بعد ترتیب دیا ہے-

یہ عہد کم نگہی ' اس میں قدرِ جوہر کیا ''غزالِ دشتِ سگاں'' ہوں مرا مقدر کیا

قدم قدم پہ صلیبیں ہیں سولیاں ہیں تو پھر مری زمین سے اٹھے گا کوئی پیمبر کیا

میں ڈرا نہیں، میں دبا نہیں، میں جُھکا نہیں، میں بِکا نہیں

مگر اہلِ بزم میں کوئی بھی تو اَداشناسِ وفا نہیں

فقیرِ خاک نشیں تھے کسی کو کیا دیتے
مگر یہی کہ وہ مِلتا، تو دعا دیتے

گھروں میں آگ لگا کر بھی کیا ملا خالدؔ
دلوں میں آگ لگی تھی اسے بجھا دیتے

آخر شب ہے چراغوں سے دھواں اٹھتا ہے
بات کیجیے تو دماغوں سے دھواں اٹھتا ہے

پھر ہے نزول تیرہ شبی، روشنی کی خیر
اپنوں کی خیر بلکہ ہر ایک اجنبی کی خیر

پھر آدمی کے ہاتھ میں خنجر ہے دوستو
اور میں یہ سوچتا ہوں کہ اب ''آدمی'' کی خیر!

وہ چراغِ بزمِ وفا ہوں میں، جسے بزم نے یہ صلا دیا
سرِشام مجھ کو جلا دیا، سرِصبح مجھ کو بجھا دیا

مرے زخم زخم یہ جسم وجاں، میں نفس نفس میں دھواں دھواں
مجھے زندگی سے بھی کیا ملا، مجھے زندگی نے بھی کیا دیا

رم خوردہ تھے صحرا میں، ہم آہو کی طرح تھے
آوارہ مگر پھول کی خوشبو کی طرح تھے

اے نرگسِ بیمار کوئی غیر نہ تھے ہم
ہم بھی ترے دکھتے ہوئے پہلو کی طرح تھے

موتی تو نہیں تھے کوئی پلکوں سے جو چُنتا
ہم آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسو کی طرح تھے

پس کارِصبح فراق تھی کہ جو شامِ ہجر سے آملی
یہ حیاتِ یک دو نفس ملی، یہ اگر ملی بھی تو کیا ملی

نہ وہ سیلِ نکہت ونور تھا نہ ہجومِ حور وقصور تھا
سر بزم صبح کو نوحہ گر، جو ملی تو صرف صبا ملی

یہ ستم ظریفیٔ وقت ہے، یہ کرم نمائی بخت ہے
جسے زندگی کی ہوس نہ تھی اسے زندگی کی سزا ملی

عمر بھر ترسا کیے اک ایک پیمانے کو ہم
جانے کیا سمجھے تھے ساقی! تیرے میخانے کو ہم

مقتلِ ہستی میں سر لائے ہیں نذرانے کو ہم
پھر کوئی عنوان دیے جاتے ہیں افسانے کو ہم

یہاں کوئی نہیں جو ظرف دیکھے پینے والوں کا
یہاں چلتا ہے اب بھی سکۂ نام ونسب ساقی!

---••☆••---

خالدہ شفیع، ڈاکٹر

معروف افسانہ نگار خالدہ شفیع پنجاب کے شہر چنیوٹ میں پیدا ہوئیں-ان کے والد میاں محمد شفیع کلکتہ میں چمڑے کا کاروبار کرتے تھے-تقسیم کے بعد لوٹ مار اور بلووں سے بچتے ہوئے خالدہ شفیع گھر کے دیگر افراد کے ساتھ اپنے نانا محمد اسمٰعیل کے پاس سندھ آ گئیں-ان کے نانا بھی سندھ کے شہر خیر پور ناتھن اور میر پور خاص میں چمڑے کا کاروبار کرتے تھے-تقسیم کے وقت ان کے والد اپنے کاروبار کے سلسلے میں چنیوٹ میں مقیم تھے-ابتدا میں خالدہ شفیع کے بھائیوں نے اپنا کاروبار سندھ میں شروع کیا لیکن بعد میں وہ کراچی منتقل ہو گئے-

گورنمنٹ اسکول بھیم پورہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خالدہ شفیع کو کھارادر کے رونق اسلام گرلز اسکول میں داخل کیا گیا-اسی اسکول سے انہوں میٹرک کا امتحان پاس کیا-خالدہ شفیع پڑھنے لکھنے کی شوقین اور اپنے خاندان میں پہلی میٹرک کرنے والی لڑکی تھیں-مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انہوں نے کراچی کالج برائے طالبات میں داخلہ لیا اور اوّل درجہ میں گریجویشن کیا-طالب علمی کے دور میں انہوں نے نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بہت سے انعامات حاصل کیے-۱۹۶۵ء میں خالدہ نے نفسیات میں ایم اے امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور تیسری پوزیشن حاصل کی-انہوں نے علم نفسیات کے حوالے سے تحقیقی مضامین اور مقالے لکھے-اس کے علاوہ انہوں نے انٹر اور بی اے کے طالب علموں کے لیے ایک کتاب "حسابی نفسیات" بھی لکھی-ایم اے کی تعلیم کے دوران افسانہ نگاری کا مقابلہ ہوا جس میں انہوں نے فیض احمد فیض سے انعام وصول کیا-

تعلیم سے فارغ ہوئیں تو درس و تدریس سے وابستہ ہو گئیں-ایم اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی وہ اپنے کالج میں بحیثیت لیکچرر منتخب ہو گئیں تھیں-کالج کے علاوہ دو سال تک انہوں نے جامعہ کراچی کے شعبہ نفسیات میں معاون استاد کی حیثیت سے بھی پڑھایا-کراچی میں کلینی کل سائیکولوجی کورسز شروع ہوئے تو انہوں نے بھی داخلہ لیا-جامعہ کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف کلینی کل سائیکولوجی کی بنیاد پڑی تو

خالدہ شفیع نے ہیروئن زدہ لوگوں کی زندگی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مندرجہ بالا تعلیم کے ساتھ خالدہ شفیع کو ہمیشہ اردو ادب سے بھی لگاؤ رہا ہے۔ اسکول کے زمانے ہی سے انہیں کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق رہا ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''ننھی'' کے عنوان سے چھپا۔ ان کی کہانی ''لکیریں کہتی ہیں'' شائع ہونے کے بعد انہیں مختلف رسائل، اخبارات کی طرف سے افسانے اور کہانیاں لکھنے کے لیے کہا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد ان کی کہانیاں، ناولٹ ''افکار'' کراچی، ''سیپ'' اور ''نیرنگ خیال'' وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۸۴ء میں ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''بدلتے رنگ شگوفوں کے'' منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ ''سیپ'' کراچی نے شائع کیا۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''آدھی چاندنی'' ہے۔ اس کے علاوہ چار ناولٹ اور نابینا افراد سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے۔ خالدہ شفیع کیوں لکھتی ہیں؟ اس کا جواب انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں اس طرح کیا:

''مجھ سے آج تک کسی نے نہیں پوچھا کہ میں کیوں لکھتی ہوں۔ حالانکہ بچپن سے شوق ہو تو کیا حرج ہے...... ایک چور بے چارہ پکڑا گیا۔ حالانکہ جو پکڑا جائے وہ چور نہیں ہوتا۔ ایک احمق جج نے پوچھا ''میاں تم کب سے چوری کر رہے ہو'' وہ بولا ''جناب مجھے بچپن سے شوق ہے...... تو بس شوق تو شوق ہوتا ہے اگرچہ اکثر شوک (Shock) بن جاتا ہے۔ مجھے شوق تو کئی ایک تھے۔ کیا کیا بتلائیں۔ کسی لڑکی کا شوقین ہونا یوں بھی زیادہ بے حیائی کی بات ہوتی ہے۔ ہم نے فرائڈ نہ پڑھا تھا لیکن خواہشوں اور شوق کی بدبودار کھاد سے غالباً پھول کھلانا اور پھل اُگانا جان گئے تھے۔ میرے خیال میں لکھنے کا شوق دیگر تمام مشاغل اور شوق کے مقابلے میں ایک شریفانہ اور آزاد شوق ہوتا ہے۔ اس میں حرج نہیں آتا، کسی فرد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک اکیلا آدمی کافی ہوتا ہے جہاں کہیں ہو جیسی حالت میں ہو اسے پورا کر سکتا ہے۔ اپنے محدود وسائل کے پیشِ نظر ہم نے اپنی ذہنی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے لکھنا شروع کیا تاکہ بالائی شعوری منزل پاک صاف رہے اور غیر ضروری ناپسندیدہ جذبات کی نکاسی ہوتی رہے۔

اس زمانے میں بہت سارے اچھا لکھنے والے تھے۔ ہم نے بڑی جاندار، زبردست اور خوبصورت تحریریں پڑھیں۔ لیکن جب ہمارا وقت آیا تو پتا چلا اَدب مر گیا، اس پر جمود

طاری ہو گیا- ہمارے ساتھ ہر شعبہ میں یہی ہوا- اعلیٰ تعلیم پائی تو پتا چلا تمام اعلیٰ شعبوں میں سینئر اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین اپنا رنگ جما چکی ہیں- سرکاری افسروں سے شادیاں رچا کر سماجی بہبود اور اعلیٰ عہدوں سے وابستہ ہیں- پڑھنا اور لکھنا وہی شوق پالنے کی کوشش کی تھی- (وہی اچھا کھانا اور اچھا پہننا اور پھر ادھڑ و نجے کیے بیر کھانے والی بات) یہ سارے میلے ٹھیلے سادہ لوح دیہاتی کا کمبل چرانے کے لیے کیے جاتے ہیں-"

خالدہ شفیع کی افسانہ نگاری پر معروف نقاد میرزا ادیب نے اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے ہیں:

"خالدہ شفیع کا فن- ایک افسانہ نگار کا فن ہے- افسانہ لکھ لینا کوئی بڑی بات نہیں- افسانہ نگار کا فن کارانہ کمال یہ ہے کہ وہ اپنی نوکِ قلم پر وہی کچھ لائے جو لوگوں کے دلوں میں ہے مگر اپنے منفرد اسلوب کے ساتھ- اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے اور خالدہ شفیع نے یوں تو کہی جانے والی عام باتیں ہی کہی ہیں لیکن اپنی فن کارانہ انفرادیت اور اسلوبی تشخص ہر جگہ برقرار رکھا ہے- علامہ اقبال نے اسی خوبی کو 'بے ہمہ شدٗ باہمہ اوٗ' کے الفاظ سے واضح کیا ہے-"

وہ مطالعے کی بے حد شوقین ہیں- انہوں نے بہت سے مشرقی اور مغربی ادیبوں کا مطالعہ کیا ہے- عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور قدرت اللہ شہاب وغیرہ سے بے حد متاثر ہیں- وہ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتی ہیں لیکن اپنی ڈائری تک- غالبؔ، فیضؔ، اقبال اور مجاز وغیرہ ان کے پسندیدہ شاعر ہیں-

---••☆••---

خمارؔ انصاری

اصل نام نجم الحسن انصاری، تخلص خمارؔ اور قلمی نام خمار انصاری ہے۔ ۲۳ر جولائی سنہ ۱۹۳۰ء کو ڈبائی ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام فیض الحسن انصاری تھا۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد خمارؔ انصاری نے سینٹرل ایکسائز کے محکمہ میں ملازمت اختیار کرلی۔ تقسیم کے بعد ہجرت کر کے وہ پاکستان آگئے اور سکھر میں آباد ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں وہ سکھر سے مستقل طور پر کراچی آگئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ایم اے اُردو اور ایم۔ اے فارسی کراچی یونیورسٹی سے پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے AGPR میں ملازمت اختیار کی۔ وہ محکمۂ کسٹوڈین میں ڈپٹی کسٹوڈین مقرر ہوئے۔ ملازمت پوری ہونے کے بعد سنہ ۱۹۹۱ء میں وہ ریٹائر ہوگئے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد علمی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ انہوں نے انجمن فروغ ادب سکھر میں بھی بحثییت سیکریٹری خدمات انجام دیں۔
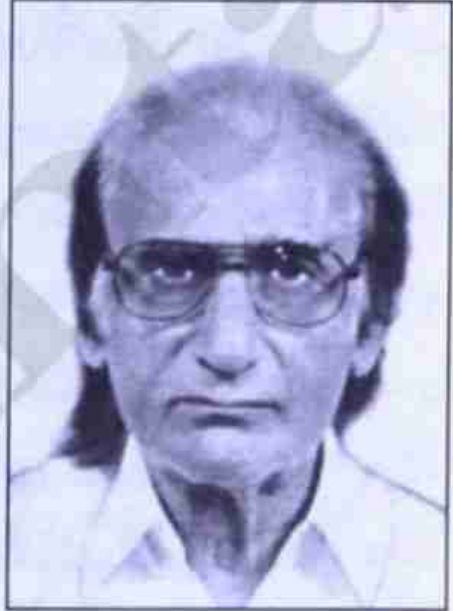
خمارؔ نے اپنی شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی ہی سے کردیا تھا۔ وہ مشاعروں میں بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے اور اپنا کلام ترنم سے سناتے تھے۔ سنہ ۱۹۷۷ء میں ان کا شعری مجموعہ ''حرف حرف تیشہ'' (غزلیں اور قطعات) کے عنوان سے شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۹۵ء میں دوسرا مجموعہ ''تابندگی'' (نعت ومنقبت) کے عنوان سے شائع ہوا۔ سنہ ۲۰۰۱ء میں ''عذابِ تشنہ لبی'' شائع ہوا۔

ان کے کلام ''عذابِ تشنہ لبی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب تابش دہلوی لکھتے ہیں:

''غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہیں مگر اب غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا نہیں ہیں۔ اب غزل کی گرفت میں معاشرتی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی، مسائل ہیں ان مسائل کی کثرت سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اظہار کے اُسلوب بھی اسی شمار سے میسر آگئے اور اب شاعر بہ آسانی ان مسائل کو انسانی رویوں کی مطابقت سے بیان کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔

خمارؔ انصاری غزل کے معروف شاعر ہیں اور وہ تقریباً پچاس برس سے اُنہی موضوعات سے اپنی شاعری کے دلکش مُرقعے تیار کرتے ہیں ان کی شاعری کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہ دلکش استعاروں، حسین تشبیہوں، سادہ الفاظ اور مترنم بحروں، اور مضامین کی تازہ کاری سے ان مسائل کو بیان کرتے ہیں اور اس طرح وہ اقدار کا احترام خُوب وزشت کی شناخت، تہذیب نفس کی نگہداشت، تجربوں کی توانائی، حُسن ومحبت کے معاملات کی پاکیزگی اور جذبوں کی سچائی سے تاثیر اور تاثر کی ایسی فضا تیار کرتے ہیں جو قاری اور سامع کو دیر تک اپنی گرفت میں رکھتی ہے اور یہ سب کچھ اُس تہذیبی ورثہ کا نتیجہ ہوتا ہے جوان کو اپنے بزرگوں سے حاصل ہوا ہے وہی شاعر بڑا ہے جس کا تہذیبی ورثہ بڑا ہے۔''

آخری عمر میں خمار صاحب حلق کے کینسر میں مبتلا ہو گئے تھے۔تقریباً تین سال بیماری کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ۲۱ر نومبر ۲۰۰۳ء کو دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ان کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہم سو گئے تو وقت ہمارا نہیں رہا — جب دن گزر گیا تو اُجالا نہیں رہا
کیا وقت تھا کہ حلقۂ یاراں تھی زندگی — کیا دور ہے کہ کوئی شناسا نہیں رہا
کتنی یادیں وابستہ ہیں ماضی کے افسانے سے — کتنے رشتے مستحکم ہیں درد کے تانے بانے سے
یہ نکتہ ہم سمجھے یہ عرفان ملا پروانے سے — جینے کے وہ اہل نہیں جو ڈرتے ہیں مرجانے سے
برس کے تشنہ زمینوں کو کر گئی سیراب — وہ رحمتوں کی گھٹا جو اُٹھی مدینے سے
ساتھیو! کیا ملا بہاروں سے — خوں ٹپکتا ہے لالہ زاروں سے
دیکھتے کیا ہو انتظارِ سحر — روشنی چھین لو ستاروں سے

عشرت اس کی ہے جو ہر غم سے گزر آتا ہے
رات کے بعد ہی ہنگام سحر آتا ہے
اب غم دل ہی نہیں ہے غم دنیا بھی تو ہے
اب ترا ذکر بہ انداز دگر آتا ہے

---••☆••---

خمارؔ فاروقی

مسرور عالم فاروقی نام، تخلص خمارؔ اور قلمی نام خمارؔ فاروقی ہے- خمارؔ فاروقی یکم دسمبر ۱۹۴۳ء کو امروہہ کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے- اِن کے والد کا اسم گرامی رئیس عالم فاروقی اور دادا کا نام فیض عالم فاروقی تھا- اِن کا خاندان امروہہ کا معزز فاروقی خاندان ہے- خمارؔ فاروقی نے ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی- ۱۹۵۷ء میں وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور راولپنڈی میں سکونت اختیار کی- ۱۹۵۹ء میں میٹرک اور ۱۹۶۳ء میں گورنمنٹ کالج پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا- وہ کالج کے میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں- بی اے کرنے کے بعد وہ کراچی آ گئے اور یہاں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں-

تعلیم سے فارغ ہوئے تو خمارؔ فاروقی نے سنہ ۱۹۶۵ء میں بحیثیت Scrutinize وفاقی شماریاتی آفس میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا- وفاقی شماریاتی بیورو منسٹری آف فنانس میں بحیثیت Chief S.O خدمات انجام دے چکے ہیں- انہوں نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کئی ٹریننگ ورکشاپس اور سیمینار میں شرکت کی ہے اور SIAP-Tokyo-Japan سے General Statistic Course بھی مکمل کیا ہے- اس کے علاوہ جاپانی زبان میں سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیے ہیں-

خمارؔ فاروقی نے شعر و سخن کی بستی امروہہ میں ہوش سنبھالا تو بچپن ہی سے شاعری کا شوق پیدا ہوا- امروہہ میں وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ شعری محفلوں میں شرکت کرتے تھے- معروف شاعر جونؔ ایلیا انہیں اُردو عربی کا درس دیتے تھے- خمارؔ نے اپنی غزلیں ابتدا میں جونؔ ایلیا کو اصلاح کے لیے پیش کیں- پاکستان میں انہوں نے نظم اکبر آبادی کو دکھائیں- اس کے بعد غزل میں حضرت تابش دہلوی اور مرثیوں میں نسیم امروہوی سے اصلاح لی-

خمارؔ فاروقی نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، جیسا کہ

انہوں نے خود اپنے شعری مجموعے ''ناکشیدہ'' کی حکایتِ ذات میں لکھا ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ناکشیدہ سنہ ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ایک مرثیہ آتشِ غم بھی زیورِ طبع سے مزین ہو چکا ہے اس کے علاوہ ان کے کئی شعری مجموعے جن میں مراثی بھی شامل ہیں طباعت کے مراحل میں ہیں۔ان کی شاعری کے چند نمونے پیش ہیں ملاحظہ کیجیے۔

ایسے ملا ہے ہم سے شناسا کبھی نہ تھا
وہ یوں بدل بھی جائے گا سوچا کبھی نہ تھا

یوں تو گھرا ہوں مجمعٔ احباب میں مگر
تنہا ہوں جتنا آج میں اتنا کبھی نہ تھا

اب موسموں کی دھوپ بھی لگتی نہیں بھلی
اب چاہتوں کے سارے گھروندے بکھر گئے

اب زندگی میں کوئی لطافت نہیں رہی
گویا تمہارے ساتھ ہی شام وسحر گئے

مل کر جدا ہوئے تو خبر تک نہ ہو سکی
لمحہ گزر گیا کہ زمانے گزر گئے

اس شہرِ بے وفا کا یہ دستور ہے عجب
کچھ دن ہر اک کو یاد کیا پھر بھلا دیا

ہوش وحواس، عیش وطرب، عقل و آگہی
دارفتگیٔ شوق میں سب کچھ لٹا دیا

اک اشکِ غم بھی زینتِ مژگاں نہیں رہا
دل کیا بجھا کہ جشنِ چراغاں نہیں رہا

اک گردشِ حیات یہی ہے متاعِ دل
کیا فائدہ اگر غمِ جاناں نہیں رہا

دیوار و در سے اپنے ٹپکتی ہے بیکسی
پہلو میں جب سے اک دلِ ویراں نہیں رہا

جو زخم دے گئے تھے مجھے وہ تو بھر گئے
میرے رفیق میرے شناسا کدھر گئے

دل دھڑکنے کی صدا بھی نہیں آتی اب تو
عالمِ شوق میں تنہائی سی تنہائی ہے

کس کے قدموں کے نشان ڈھونڈتا ہے ریت پہ تُو
ساعتیں بیت گئیں جن کا تمنائی ہے

بستیاں ڈوب گئیں سیلِ بلا میں لیکن
پھر بھی دنیا کی وہی انجمن آرائی ہے

---••☆••---

خورشید علی خاں

خورشید علی خاں سنہ۱۹۲۲ء کو ریاست حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ان کے والد یحییٰ خاں صاحب کا تعلق موضع حسن پور لوہاری ضلع مظفر نگر یوپی سے تھا۔یحییٰ صاحب اور ان کے خاندان کے دیگر افراد عرصہ دراز سے حیدر آباد میں مقیم تھے۔ ان کے سرپرست نواب لطف یار جنگ تھے۔یحییٰ خاں بھی محکمہ آبکاری سے منسلک تھے۔خورشید اور ان کے بہن بھائیوں نے حیدر آباد دکن ہی میں تعلیم حاصل کی۔خورشید علی خاں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے سنہ۱۹۴۴ء میں بی اے اور ۱۹۴۶ء میں ایل ایل بی کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دن وکالت کرتے رہے۔لیکن تھوڑے دن وکالت کرنے کے بعد وہ محکمہ پولیس سروس کے امتحان میں شریک ہوئے اور پھر پولیس ٹریننگ کے لیے چلے گئے۔اسی زمانے میں سقوطِ حیدر آباد کا سانحہ پیش آیا اور مملکتِ آصفیہ تاراج ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ ان کی ملازمت بھی اس انقلاب کی نذر ہوگئی۔۱۹۴۹ء میں خورشید صاحب پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ہندوستان کے نامور شاعر کیفی اعظمی مرحوم خورشید علی صاحب کے بہنوئی تھے۔
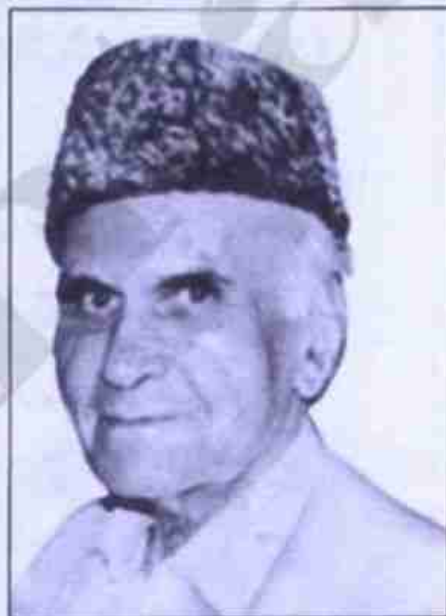
پاکستان آکر انہوں نے محکمہ کسٹم میں ملازمت اختیار کر لی۔سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ۱۹۸۲ء تک وہ اس محکمہ میں رہے اور ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے کسٹم کے سینیر عہدے تک پہنچے۔سنہ۱۹۸۲ء میں مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد وہ ریٹائر ہو گئے۔خورشید علی خاں کو لکھنے پڑھنے کا شوق شروع ہی سے تھا اور شعروادب میں ہمیشہ دلچسپی لیتے تھے۔ان کا رجحان ترقی پسندی کی طرف تھا۔جب تک وہ ہندوستان میں رہے ترقی پسند مصنفین سے بڑی قربت رہی۔جناب اختر حسن (ایڈیٹر روزنامہ پیام حیدر آباد اور بلیٹز ممبئی) کے علاوہ مخدوم محی الدین، صدق جائسی، مسلم ضیائی، مولانا ماہر القادری، ابراہیم جلیس، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری کے حلقۂ احباب میں تھے۔کراچی میں وہ حضرت جوش ملیح آبادی کے حلقۂ ادارت میں شامل تھے۔

خورشید علی خاں سماجی کاموں میں بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے۔شاہ بلیغ الدین نے اپنی کتاب ''تذکرۂ عثمانین'' میں خورشید علی خاں کے پاکستان میں ابتدائی دور کے مختصر حالات لکھے ہیں۔انہوں نے بتایا کہ:

''ہجرت کے ابتدائی زمانے میں بہادر یار جنگ میموریل سوسائٹی کی طرف سے اسکول کی امداد کے لئے خواجہ معین الدین کا ڈرامہ زوال حیدر آباد پیش کیا گیا۔خورشید اور نعمت دونوں نے اس میں حصہ لیا۔جو آمدنی ہوئی اس سے تمام اداکاروں کو بھی مناسب معاوضہ پیش کیا گیا۔''

خورشید علی خاں کی تین کتابیں (۱) ''کیفی اعظمی ...... شخصیت اور فن'' (۲) ''ہمارے جوش صاحب'' اور تیسری کتاب ''فکرِ غالبؔ'' شائع ہوئیں۔فکرِ غالب خورشید علی خاں کی یہ تیسری کتاب بڑی اہم ہے جس میں اشعار کو عصرِ حاضر کی فکر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔انہوں نے اس کتاب میں غالبؔ کے اشعار کی ہر پہلو سے تشریح کی ہے اور اس کے حُسن کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

---••☆••---

دلاور فگار

اصل نام دلاور حسین، تخلص فگاؔر اور قلمی نام دلاور فگاؔر ہے۔ ۸؍جولائی ۱۹۲۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاکر حسین بدایوں کے ایک کالج میں ٹیچر تھے۔ دلاور فگاؔر کے خاندان میں بیشتر لوگ شاعر اور ادیب ہوئے ہیں جن میں شمائل حسین راغبؔ، منورؔ بدایونی اور محشرؔ بدایونی قریبی اعزا میں تھے۔ دلاور فگاؔر کے جدّ امجد علی حاتم معروف طنز نگار تھے۔ لیکن ان کے والد شاعری کے سخت مخالف تھے اور انہیں مشاعروں میں جانے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔ دلاور فگاؔر کہتے ہیں کہ اُس وقت میں اپنے والد کی اس رائے کو غلط سمجھتا تھا لیکن اب سمجھ میں آیا کہ شاعر ہو کر آدمی کچھ ابنارمل اور غیر معمولی ضرور ہو جاتا ہے۔

۱۹۴۸ء میں ان کے والد سخت بیمار ہو گئے اور چلنے پھرنے کی سکت نہ رہی۔ جس کی وجہ سے گھر میں پیسہ کی تنگی ہو گئی اور کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہیں تھا۔ لہٰذا انیس ۱۹ سال کی عمر میں ڈاک خانے کی ملازمت اختیار کر لی اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھا۔ ڈاکخانے کی ملازمت کے دوران دلاور فگاؔر سے ایک غلطی یہ سرزد ہو گئی کہ انہوں نے اخلاقی طور پر ایک شخص کے بارے میں یہ تصدیق کر دی کہ میں ان سے واقف ہوں۔ اُس آدمی نے دلاور صاحب کی تصدیق کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے ایک ہم نام کے سیونگ اکاؤنٹ سے کچھ رقم نکال لی۔ بہر حال اس معاملہ میں دلاور کو پریشانی تو ضرور ہوئی لیکن کسی گرفت میں نہیں آئے۔ اس کے بعد انہوں نے اس ملازمت کو ہی ترک کر دیا اور کسی دوسری ملازمت کی تلاش کرنے لگے۔ اس دوران انہوں نے بی اے اور ٹریننگ کورس بھی پورا کر لیا تھا اور ذریعہ معاش کے لیے ٹیوشنوں کا سہارا لیا اور اس طرح وہ درس و تدریس سے منسلک ہو گئے۔ ابتدا میں بدایوں کے مختلف اسکولوں میں تعلیم دی اور پھر بدایوں کے اسلامیہ کالج میں مستقل ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت کے دوران انہوں نے پرائیویٹ طور پر معاشیات میں ایم اے اور پھر اُردو کا ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اوّل پوزیشن حاصل کر کے گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ وہ انگلش میں بھی ایم اے کرنا چاہتے

تھے لیکن پریوس میں نمبر خراب دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔

دلاور فگار نے آنکھ کھولتے ہی اپنی بستی اور گھر میں شعر و سخن کا چرچا پایا۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ انہیں بھی اس کا شوق نہ ہوتا۔ ابتدا میں فگار سنجیدہ غزل کہتے تھے۔ ان کی سنجیدہ غزلوں کا ایک مجموعہ "حادثے" کے عنوان سے شائع بھی ہوا تھا۔ لیکن اچانک وہ سنجیدہ غزل گوئی سے مزاح نگاری کی طرف مائل ہو گئے جس نے ہندوستان میں انہیں بڑی شہرت بخشی۔ اب یہ ہر مشاعرے میں مدعو کیے جانے لگے۔ اِسی دور میں انہوں نے بہت سی مزاحیہ نظمیں لکھیں جو بڑی مقبول ہوئیں۔ یہاں ان کی ایک مزاحیہ نظم جو انہوں نے ہندوستان میں ایک خستہ حال لاری (بس) پر لکھی تھی، ذرا ملاحظہ کیجیے:

گھر آنے کو جب مِل نہ سکی کوئی سواری
سوچا کہ چلو چل کے پکڑلیں کوئی لاری

اپنے سے بھی ناراض پسنجر سے بھی برہم
آمادۂ پیکار تھا، کنڈکٹرِ اعظم

اس سوچ میں تھا بس کو چلائے نہ چلائے
ڈر تھا کہیں رستہ میں دُھرا ٹوٹ نہ جائے

جب چڑھ گئی ہر ایک سواری پہ سواری
اُس وقت بریلی سے روانہ ہوئی لاری

اللہ رے لاری کی وہ اِٹھلاتی ہوئی چال
میکے سے دُلہن چلنے لگی جانبِ سسرال

لاری کو گوارا ہی نہ تھی منتِ مہمیز
آزاد طبیعت تھی کبھی سست کبھی تیز

رستے میں ہر افتاد و مصیبت کا تھا اِمکاں
لاری ہی پہ لکھا تھا کہ "اللہ نگہباں"

سیدھی عدم آباد کو جاتی تھی یہ لاری
مخلوق کو خالق سے ملاتی تھی یہ لاری

دلاور فگار کی شہرت اور قدر دانی کو دیکھتے ہوئے ان کے اپنے ہی شہر کے لوگوں کے دلوں میں بغض و کینہ پیدا ہو گیا۔ یہ صورتِ احوال ان کے لیے سوہانِ روح بن گئی۔ آخر کار سنہ ۱۹۶۸ء میں اپنے کالج کے پراویڈنٹ اور اثاث البیت پر لعنت بھیج کر پاکستان آ گئے اور کراچی میں اپنے برادر نسبتی جناب امیر حسنین صاحب (کراچی کے ممتاز ٹرانسپورٹر) کے گھر مقیم ہوئے۔ لیکن اپنی بہن کے گھر زیادہ عرصہ قیام کرنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ پی ای سی ایچ میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور اپنے چھوٹے بھائی ضمیر حسین حمیدی کے ساتھ رہنے لگے۔ کراچی کے مشاعروں میں جب ان کے مزاحیہ قطعات اور نظمیں یہاں سنی گئیں تو ان کی شاعری بڑی مقبول ہوئی اور پھر پاکستان کے دوسرے شہروں کے مشاعروں میں بھی بلائے جانے لگے اور ان کا کلام ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں کی زینت بننے لگا۔

دلاور فگارؔ جو سب کچھ اپنا ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے مالی طور پر بہت کمزور تھے- وہ ابھی ذریعہ معاش کی تلاش میں تھے کہ ان ہی دنوں کراچی کسٹمز میں ایک آل پاکستان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں لاہور، راولپنڈی، ڈھاکہ، حیدرآباد اور کراچی کے شعراء نے شرکت کی تھی- اتفاق سے اس مشاعرہ میں کراچی ڈیویلپمنٹ اتھارٹی کے سابق ڈائریکٹر جنرل جناب عزت اعوان جو بڑے ادب نواز اور ادب دوست ہیں، بھی شریک تھے- اس موقعہ پر دلاور فگارؔ نے بھی اپنا منتخب کلام پیش کیا جو بے حد پسند کیا گیا- مشاعرے کے بعد اعوان صاحب نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور ان سے کہا کہ کسی سلسلے میں تمہیں میری مدد درکار ہو تو میں حاضر ہوں- دلاور فگارؔ عزت اعوان صاحب کی اس حوصلہ افزابات اور ادب دوستی سے بہت متاثر ہوئے- ایک دن پریشانی کے عالم میں دلاور حسین عزت اعوان صاحب کے پاس کے ڈی اے چلے گئے اور ان کو اپنے معاشی حالات بتائے اور کسی مناسب جگہ ملازمت کے لیے درخواست کی- عزت اعوان صاحب نے انہیں اپنے یہاں ماسٹر پلان میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر مقرر کر لیا- سنہ ۱۹۷۲ء میں اپنے ایک نئے افسر سے کچھ اختلاف کے سبب انہوں نے استعفیٰ دے دیا- اس کے بعد وہ مختلف اخبارات اور رسائل میں کام کے ساتھ شعر و شاعری کرتے رہے-

پاکستان آ کر دلاور فگارؔ نے سیکڑوں نظمیں، قطعات لکھے اور مشاعروں میں پڑھے، ریڈیو اور ٹیلیویژن کے لیے بھی بہت کچھ لکھا- ۲۵ رجنوری ۱۹۹۸ء کو یہ خوش کلام، خوش گو شاعر جو مغموم چہروں کو ہنس مکھ چہروں میں بدل دینے کی قدرت رکھتا تھا، دنیائے فانی سے رشتہ توڑ کر مالکِ حقیقی سے جا ملا- پاپوش نگر کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہا ہے- اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، آمین-

رشوت ستانی کے خلاف ایک قطعہ:

حاکمِ رشوت ستاں فکرِ گرفتاری نہ کر
کر رہائی کی کوئی آسان صورت، چھوٹ جا
میں بتاؤں تجھ کو تدبیرِ رہائی، مجھ سے پوچھ
لے کے رشوت پھنس گیا ہے، دے کے رشوت چھوٹ جا

---••☆••---

رسؔا چغتائی

اصل نام مرزا محتشم علی بیگ، تخلص رسؔا اور قلمی نام رسؔا چغتائی ہے۔سنہ ۱۹۲۸ء کو سوائی مادھوپور، ریاست جے پور میں پیدا ہوئے۔میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکے لیکن پھر بھی رسؔا صاحب نے علم و ادب اور صحافت میں بڑا نام پیدا کرلیا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔رسؔا چغتائی نے مختلف اداروں میں خدمات انجام دی ہیں۔روزنامہ ''حریت'' کراچی سے بھی منسلک رہے۔شعر وسخن میں وہ حضرت بینش سلیمی سے تلمذ کا تعلق رکھتے ہیں۔ رسؔا چغتائی کے کلام ''زنجیر ہمسائیگی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور نقاد پروفیسر احمد علی لکھتے ہیں:
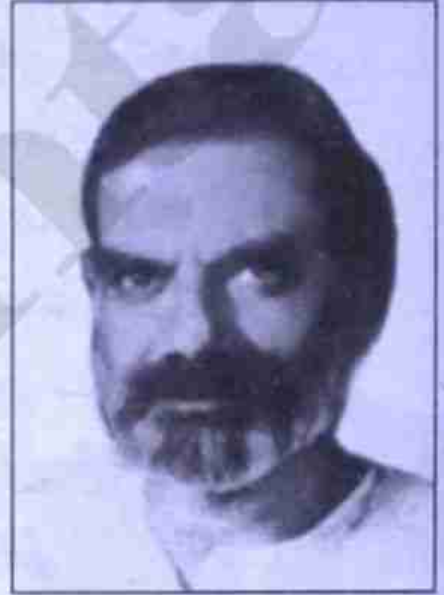
''ایک ایسی دنیا میں جہاں بے معنی تمثیلوں کے ہجوم سے تخیل کو قدم قدم پر صدمہ پہنچتا ہے، رسؔا چغتائی کی شاعری ایک ایسی مسرت سے دوچار کرتی ہے جس سے ہم مانوس اور آشنا ہیں۔اس کی خیال آفرینی کے مناظر میں آسودگی کو کہیں منتشر اور مجروح نہیں کرتا اور جہاں کہیں کوئی نئی اور اجنبی تمثیل یا اظہار اس کی شاعری میں دَر آیا ہے، اپنے اس تضاد کے باوجود وہ قاری کے سکون و مسرت میں اضافہ ثابت ہوا ہے۔فن کا فریضہ ہمیں مسرت عطا کرنا اور ہماری تہذیب نفس کرنا ہے۔اگر یہ کہیں چونکاتا بھی ہے تو اس کا مقصد نئی مسرتوں سے ہمکنار کرنا ہے۔فن کا مقصد انتشار میں نظم اور ہم آہنگی پیدا کرنا تو ہے اس کے برعکس نہیں۔اُس کا مقصد انتشارِ ذہنی اور خوف و دہشت کی حبس زدہ عکاسی تشبیہوں اور استعاروں کا کاؤس یا لسانی طور پر ناممکن اظہارات کی نعشوں کی بے ہنگم نمایش نہیں۔رسؔا کی شاعری چاہے معاشرے کی تاریکیاں دور نہ کر سکے اور یوں بھی کوئی فن اس پر قادر نہیں لیکن رسؔا کی نظمیں اور غزلیں یقیناً ہوش مندی کی بازیافت میں ہماری مدد کرتی ہیں اور شاعری پر ہمارا اعتماد بحال کرتی ہیں اور یہ بھی ثابت کرتی ہیں کہ شاعری نہ تو دیوانگی ہے نہ کسی مجذوب

کا خواب۔"

رساؔ چغتائی کی تصانیف میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "ریختہ" کے نام سے سنہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرا شعری مجموعہ "زنجیر ہمسائیگی" سنہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

کس طرف کوچ کر گئے سارے — کیا ہوئے روشنی کے مینارے

کس جہنم کا رزق ہو کہ رساؔ — پھول لگتے ہیں مجھ کو انگارے

کہاں جاتے ہیں آگے شہرِ جاں سے — یہ بل کھاتے ہوئے رستے یہاں سے

یہ شیشے کی طرح ٹوٹے ہوئے لوگ — یہ سر پر پتھروں کے سائباں سے

رشتۂ جسم و جاں بھی ہوتا ہے — ٹوٹنے کا گماں بھی ہوتا ہے

ہم سے عزت نشیں بھی ہوتے ہیں — عرصۂ لامکاں بھی ہوتا ہے

ہم بھی ہوتے ہیں اس کی محفل میں — رقصِ سیارگاں بھی ہوتا ہے

بادِ صحرائے جاں بھی ہوتی ہے — نغمۂ آبِ رواں بھی ہوتا ہے

تیرے آنے کا انتظار رہا — عمر بھر موسمِ بہار رہا

اپنی تو عمر ساری عرضِ ہنر میں گزری — شامِ فراق کیسی روزِ وصال کیسا

زندگی فلسفہ سی لگتی ہے — آپ جب سوچنے لگتے ہیں

مدّت سے اس اُمید پہ جلتا رہا ہوں میں — شاید کوئی چراغ جلے اس چراغ سے

وہ جو اک شخص مرے ساتھ چلا تھا گھر سے — راہ میں چھوڑ گیا ہے مجھے تنہا کیسا

اِن گلیوں اِن بازاروں کی نوک پلک کے متوالے
کیسے کیسے لوگ تھے جن کے نام چھپے اخباروں میں

---••☆••---

رسول احمد کلیمؔی

نام رسول احمد کلیمؔی اور تخلص کلیمؔی کرتے ہیں۔ وہ چشتی نذیر احمد کلیمی کے فرزند ہیں۔ کلیمؔی صاحب ۱۱؍دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء کو گورکھپور یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک پی آئی بی کالونی ہائی اسکول سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور دسویں پوزیشن حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے انٹر سائنس میں فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی اور گیارھویں پوزیشن پائی۔ ڈی جے کالج سے بی ایس سی میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے اور تھرڈ پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد این ای ڈی کالج سے فرسٹ ڈویژن اور تھرڈ پوزیشن میں انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ ان امتحانات کے علاوہ انہوں نے ہومیوپیتھی کا امتحان بھی پاس کیا اور پورے پاکستان میں ٹاپ کیا اور گولڈ میڈل سے نوازے گئے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سنہ ۱۹۶۷ء سے سنہ ۱۹۶۹ء تک این ای ڈی کالج میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ دوسال کے بعد وہ انوسٹمنٹ ایڈوائزری سنٹر آف پاکستان (وزارتِ صنعت) میں ملازم ہوگئے اور ۶۹ء سے ۷۳ء تک کام کرتے رہے۔ ۷۲ء میں انہوں سوڈان کے لیے ٹیکسٹائل پلان بھی بنایا۔ ۱۹۷۴ء میں وہ نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن اور پھر نیشنل بینک آف پاکستان میں تعینات ہوئے اور ۱۹۸۳ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد بینک الجزیرہ سعودی عرب جوائن کیا اور سنہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۲ء تک اپنی خدمات انجام دیں۔ یہاں وہ بہت ہی کم وقت میں وائس پریسیڈنٹ سے جنرل منیجر کے عہدے تک پہنچے۔ بعدازیں سینئر ایگزیکیٹو وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے پھر نیشنل بینک آف پاکستان میں آگئے۔ آج کل وہ کنیڈا میں مقیم ہیں۔

سابقہ مشاغل میں فیچر نگاری، ڈرامہ نگاری، اخبارات کا مطالعہ، رسائل میں مضامین، شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اپنی شاعری کے بارے میں یہ فرماتے ہیں:

''اس کتاب میں شائع شدہ شاعری نہ سیاسی ہے نہ سماجی' نہ حقیقی ہے نہ مجازی' نہ عاشقانہ ہے

نہ باغیانہ رزمیہ ہے نہ بزمیہ نہ بورژوائی ہے نہ پرولتاری نہ حکیمانہ ہے اور نہ مریضانہ لہٰذا اس کو خود پڑھنے کے بجائے اگر چہ پڑھوا کر سن لینا بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر فالتو وقت ملے تو اس کا مطالعہ کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ کیونکہ شاید اس میں کہیں کوئی ایسا شعر موجود ہو جو زندگی میں کسی موقع پر کبھی آپ نے خود کہنا چاہا ہو۔ اس لیے کہ یہ ایک عام انسان کی شاعری ہے۔"

کلیمؔی صاحب نے غالبؔ کی زمین میں تضمین بھی لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے غالبؔ کی دو معروف زمینوں میں طبع آزمائی بھی کی ہے، جن کے ذیل میں چند شعر یہ ہیں، ملاحظہ ہوں ۔

سائل خوش نوا ذرا میرؔ کی پھر غزل سنا ۔۔۔ ذکرِ چراغ و دل ہی کیا شہر ہی سارا بجھ گیا
کوئی شدید واقعہ کوئی مہیب سانحہ ۔۔۔ ہوتا نہیں اگر تو پھر لگتا ہے کچھ عجیب سا
کج کلاہی ہے یہ سب رنگِ دگر ہونے تک ۔۔۔ تجھ کو آئے گا یقیں اس کا، مگر ہونے تک
رقصِ بیتاب بگولوں کا مرے آنگن میں ۔۔۔ اب نہ کم ہوگا مرے گھر کے کھنڈر ہونے تک
اپنا غم خانہ بھی ہنگامے سے خالی نہ رہا ۔۔۔ جشنِ ماتم ہی رہا عمر بسر ہونے تک
راحت و غم میں فاصلہ کیا ہے ۔۔۔ اک نہیں ہے تو دوسرا کیا ہے
ہاں مگر تم ہی جب ملے نہ ہمیں ۔۔۔ پوچھتے کیا ہو پھر ملا کیا ہے
ماتمِ بیکسی جو دے مہلت ۔۔۔ ہم دکھائیں تمہیں وفا کیا ہے

کلیمی صاحب جس منصب پر آج پہنچے ہیں اس کی راہیں بہت کٹھن اور دشوار گزار تھیں جن کی عکاسی ان کی اس نظم سے ہوتی ہے:

بہت سال بیتے مگر یاد سب ہے ۔۔۔ یہاں کچی اینٹوں کا اک جھونپڑا تھا
فروکش غریبی جہاں۔ بے خطر تھی ۔۔۔ جہاں بدنصیبی کا خیمہ گڑا تھا
تھے ہر سمت خوش حال لوگوں کے مسکن ۔۔۔ اور اک جھونپڑا بس یہی درمیاں تھا
عجب لوگ تھے جھونپڑے کے مکیں بھی ۔۔۔ گوارا جنہیں ہر طرح کا اَلم تھا
تھا غربت، مشقت، شرافت سے رشتہ ۔۔۔ کہ چہروں پہ ہجرت کا قصہ رقم تھا
سبب کیا کہیں کیا تھا لیکن کسی کو ۔۔۔ نہیں تھی یہاں روز کھانے کی عادت

پرانے ہی کپڑوں میں ہوتی تھیں عیدیں
کہ اس سے زیادہ نہ تھی استطاعت

یہیں تھے وہ ماں باپ جن کو ہمیشہ
رکھا مفلسی نے پریشان و مضطر

کبھی قرض خواہوں کے پیہم تقاضے
کبھی کوئی یلغارِ آلامِ دیگر

اُنہیں اتنی فرصت نہ دی زندگی نے
سُہانے سے کچھ خواب وہ بھی سجائیں

کریں آرزو وہ بھی اچھے دنوں کی
امیدوں کے کچھ دیپ وہ بھی جلائیں

سڑک پر لگے بلب کی روشنی میں
نہیں اتنا آسان راتوں کو پڑھنا

کتابوں میں لکھا تو بے شک ہے لیکن
چراغوں سے پوچھو ہے کیا کام جلنا

سوائے مرے، بچو نہ ہرگز بھلانا
وہ سب مشکلیں ساری قربانیاں تم

شب و روز کی محنتیں یاد رکھنا
نہ آساں سمجھنا یہ آسانیاں تم

ملے جب بھی فرصت تمہیں زندگی میں
ضرور اس جگہ چند لمحوں کو آنا

نشاں ہے یہ محنت کی اک داستاں کا
یہیں پہ تھا آباد میرا گھرانا

---••☆••---

رشیدہ رضویہ

معروف افسانہ نگار رشیدہ رضویہ ۲۰/جنوری ۱۹۳۷ء کو کراچی کے علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد حافظ سید شریف کراچی کے بہت بڑے تاجر تھے۔ وہ مسلمانوں میں پہلے شخص تھے جن کی سندھ میں ایک فیکٹری بھی تھی جو ۱۹۳۱ء میں سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بند ہوگئی تھی۔ حافظ صاحب خلافت کمیٹی کے سرکردہ سیکریٹری اور سیاست میں بھی عملی طور پر حصہ لیتے تھے۔ سر عبداللہ ہارون کے قریبی دوست اور مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی سے بھی ان کے گہرے روابط تھے۔ ابتدا میں وہ کانگریس پھر جمعیت علمائے ہند سے وابستہ ہوگئے تھے۔ لاہور سے نکلنے والے اخبارات ''زمیندار''، ''انقلاب'' وغیرہ میں ان کے مضامین بھی چھپتے تھے۔ تجارتی کاروبار کے سلسلے میں انہوں نے ایک دفتر بغداد میں بھی قائم کیا تھا۔ رشیدہ رضویہ کی والدہ مریم زمانی بھی سماجی کارکن تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے کراچی کی مسلمان خواتین کے اندر تعلیم اور سماجی شعور پیدا کرنے کے لیے انجمن مسلم خواتین کی بنیاد رکھی اور مختلف جرائد میں مضامین بھی لکھتی تھیں۔

رشیدہ نے ابتدائی تعلیم اکیڈمی اسکول اور مدرسہ والا اسکول کراچی سے حاصل کی۔ سندھ یونیورسٹی سے میٹرک اور سینٹ جوزف کالج کراچی سے بی اے کیا۔ اس کے بعد ایم اے کے لیے انہوں نے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں داخلہ لیا لیکن دو چار ماہ کے بعد ارادہ ترک کردیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے عربی کی تعلیم بغداد میں مدرستہ الاغراض البنات سے حاصل کی۔ انگریزی ادب لندن کے سٹی آف لندن کالج سے پڑھا۔

رشیدہ رضویہ نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں بابائے اردو، دتاتریہ کیفیؔ، شبر حاتمی، ماہر القادری جیسی نامور علمی و ادبی شخصیات کا آنا جانا تھا۔ اسی ماحول کے زیر اثر رشیدہ نے چھ برس کی عمر سے کہانیاں لکھنا شروع کردیا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں ان کا پہلا افسانہ ماہنامہ ''ساقی'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے سیکڑوں افسانے لکھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ رشیدہ کے افسانوں کا ایک

مجموعہ ''کھنڈر کھنڈر بابل'' کے عنوان سے شائع ہوا- یہ مجموعہ انہوں نے خود شائع کرایا تھا- افسانوں کے ساتھ رشیدہ رضویہ نے ناول بھی لکھے اور بچوں کی کہانیاں بھی- ان کے دو ناول ''اُسی شمع کے آخری پروانے'' اور ''لڑکی ایک دل کے ویرانے میں'' التحریر اور شیش محل کتاب گھر لاہور سے شائع ہوئے- ایک ناول ''گھر میرا راستے غم کے'' کتاب نما راولپنڈی سے شائع ہوا- بچوں کے لیے کہانی کی کتاب ''سڑک کے بچے'' شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے چھپی-

---••☆••---

رضوان صدیقی

اصل نام رضوان احمد صدیقی اور قلمی نام رضوان صدیقی ہے- یکم دسمبر ۱۹۴۱ء کو ریاست الور کے ایک قصبہ نرائن پور میں پیدا ہوئے- ان کے والد قاضی ظہور احمد صدیقی معروف قانون گو تھے- تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے اور حیدرآباد سندھ میں مقیم ہوئے-

رضوان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی- سندھ کالج آف کامرس سے بی کام اور جناح لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی- بعدازاں جامعہ سندھ سے صحافت میں ایم اے کیا- رضوان صدیقی زمانۂ طالب علمی ہی سے بڑے سرگرم اور فعال تھے- طلبہ کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے- صدر ایوب خاں کے خلاف تحریک میں شامل تھے اور اس کی پاداش میں گرفتار بھی ہوئے- انہوں نے بہت سے بین الکلیاتی مباحثوں میں شرکت کی اور ایک کامیاب اور شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا- وہ کالج کی بزم اردو کے صدر رہے-

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۶۱ء میں رضوان ریڈیو پاکستان سے ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے وابستہ ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے- ریڈیو پاکستان کے مختلف اسٹیشن سے ان کے لکھے ہوئے فیچرز ڈرامے اور تقاریر نشر ہو چکی ہیں-
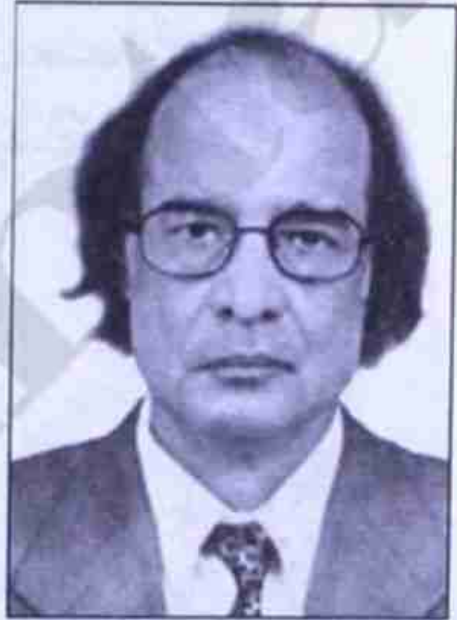
۱۹۶۵ء میں فیملی پلاننگ آفیسر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا- ۱۹۸۱ء میں ادارہ ترقیات کراچی سے منسلک ہوئے اور سات برس تک وہ اس ادارے میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ رہے- رضوان صدیقی ۸۷-۱۹۸۶ء میں وزیراعظم محمد خان جونیجو کے "اسپیچ رائٹر" رہے اور کئی وفاقی وزراء کے پی- اے- آر- اور سندھ کے پانچ گورنرز کے پریس سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں- لندن سے روڈ سیفٹی ایجوکیشن کی تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ پانچ سال تک کراچی کے روڈ سیفٹی آفیسر رہے اور عوام میں ٹریفک شعور بیدار کرنے کے لیے ریڈیو اور ٹیلیویژن کے لیے تقریباً ۷۰ پروگرام تیار کیے اور ایک درجن کم دورانیے کی تشہیری فلمیں بنائیں-

رضوان صدیقی کی اب تک پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کی پہلی کتاب ''ایک گاؤں کی کہانی'' پر انہیں ''صدارتی ایوارڈ'' ملا۔ ان کی دوسری کتاب ایک خوبصورت اور دلچسپ سفرنامہ ہے جو ''آستانے سے پیرس تک'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ روزنامہ ''جنگ'' میں بھی قسط وار شائع ہوا۔ ان کا دوسرا سفرنامہ ''روشن اندھیرے'' ہے جو ''اُردو نیوز'' نیویارک سے قسط وار شائع ہوا اور بعدازاں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ انہوں نے ایک سفرنامہ ''جھیل سیف الملوک'' کے عنوان سے لکھ کر شائع کیا جو شمالی علاقہ جات کے پُرفضا مقامات کے بارے میں ہے۔ ایک کتاب ''جواہر طراز'' کے عنوان سے بھی مرتب کر چکے ہیں۔ آج کل ان کی ایک ناول اور افسانو کا مجموعہ زیرِ طباعت ہے۔ رضوان صدیقی کے سفرناموں کے بارے میں ملک کے متعدد ممتاز نقادوں' دانشوروں اور ادیبوں نے امید افزا خیالات کا اظہار کیا ہے۔

رضوان صدیقی شعبہ صحافت سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ زمانہ طالب علم میں کالج میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ پندرہ روزہ جریدہ ''راہنما'' حیدرآباد اور ''فکر و عمل'' کے سب ایڈیٹر رہے۔ وہ فیملی پلاننگ محکمہ کے جریدے کے بھی سب ایڈیٹر تھے۔ ماہنامہ ''اہل نظر'' کے ایڈیٹر اور روزنامہ ''جراءت'' کراچی کے ایگزیکیٹو ایڈیٹر اور آرٹس کونسل کے ''خبرنامہ'' کے چیف ایڈیٹر رہے ہیں۔

رضوان صدیقی تیس سال سے مختلف اخبارات ورسائل میں مضامین اور کالم لکھتے ہیں۔ گزشتہ پچیس سال سے وہ محافل نعت کا انعقاد بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے ''نقیب محفل'' کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔ کراچی اور ملک کے مختلف شہروں کے علاوہ رضوان صدیقی بیرونِ ملک مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں بہت سے ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

---••☆••---

رضی اختر شوقؔ

خواجہ رضی الحسن انصاری نام، شوقؔ تخلص اور قلمی نام رضی اختر شوقؔ تھا۔ رضی اختر شوق کا آبائی وطن سہارنپور (بھارت) ہے جہاں وہ ۲۳/اپریل سنہ ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ذریعہ معاش کی تلاش میں حیدر آباد گئے تو پھر وہیں شہر گلبرگہ میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ مملکتِ حیدر آباد میں ملازم تھے۔ اس طرح رضی اختر شوقؔ کی تعلیم وتربیت بھی حیدر آباد میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے انہوں نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں آ کر انہوں نے جامعہ کراچی سے ایم اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے ریڈیو پاکستان سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ ابتدا میں انہوں پروڈیوسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور پھر ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے ریڈیو پاکستان کے سینٹرل پروڈکشن یونٹ کے سربراہ ہوئے۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن گریجویٹس نے رضی اختر شوقؔ کو بہترین پروڈیوسر ہونے کا ایوارڈ بھی دیا تھا۔

رضی اختر شوقؔ حیدر آباد دکن کی ایسی فضا میں پلے بڑھے جہاں شعر وسخن کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ جب وہ گلبرگہ میں طالب علم تھے اسی وقت سے وہ شعر کہنے لگے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں بھی پختگی آتی گئی۔ اپنا کلام سناتے ہوئے ان کا لب ولہجہ اس قدر دلنشین تھا کہ ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ رضی اختر شوقؔ ایک خوبصورت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ڈرامہ نگار بھی تھے۔ ریڈیو پاکستان کے حوالے سے ان کی ایک پہچان ڈرامے بھی تھے جو انہوں نے ریڈیو کے لیے لکھے۔ وہ ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر یا پیش کار بھی تھے اور ڈرامے پیش کرنے میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ مشہور ومعروف ڈرامہ نگار سلیم احمد کے بعد ڈرامہ نگاری میں رضی صاحب ہی کو شہرت ملی تھی۔

رضی اختر شوقؔ کے کلام ''میرے موسم میرے خواب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

''شوق کی اصل شناخت اس کا لہجہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جو دو چار شاعر اپنے لہجے سے پہچانے گئے ان میں شوق بھی شامل ہے۔ اس کا لہجہ سب سے الگ اور منفرد ہے جو آتش بار ہوتے ہوئے بھی اس نرمی اور نغمگی کا حامل ہے جسے صرف اعلیٰ درجے کی شاعری ہی میں دیکھا جاسکتا ہے' لیکن اس کی صدا بقول غالبؔ ''جلوۂ برقِ فنا'' نہیں' زندگی کے حسن کو قائم ودائم دیکھنے کا ایک مسلسل خواب ہے۔ خوب صورت رنگوں میں رچا ہوا' کبھی ختم نہ ہونے والا ایک موسم ہے۔''

رضی اختر کے کلام ''جست'' پر حمید نسیم کا تبصرہ:

''میں رضی اختر شوقؔ سے بہت قریب رہا ہوں' اب سے بتیس برس پہلے جب وہ ایک نوجوان ریڈیو پروڈیوسر کی حیثیت سے میرا رفیق کار تھا تو میں اس کا ایک شعر سُن کر اس کے جوہر پر فدا ہوگیا تھا' وہ شعر یہ تھا۔

کتنا پھیلے گا یہ اک وصل کا لمحہ آخر کیا سمیٹو گے کہ اک عُمر کی تنہائی

ایسے زندہ و پائندہ شعر رضی اختر شوقؔ کے ہاں قاری کو یہاں وہاں ملیں گے' میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ رضی اختر شوقؔ نے بلند پایہ غزل لکھی ہے اور وہ یاد رہنے والا شاعر ہے۔

وقت کی گرد جو جھوٹے نگوں کو اپنے جیسا افسردہ بے جان بنا دیتی ہے' شوقؔ کی شاعری کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گی' سو برس بعد کا قاری اس کے اچھے اشعار سے ویسا ہی لُطف اندوز ہوگا جیسا اس لمحۂ موجود میں' میں ہو رہا ہوں۔''

مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد رضی اختر شوقؔ سنہ ۱۹۹۲ء میں ریڈیو پاکستان کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ عمر کے آخری دنوں میں وہ اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو گئے تھے علاج معالجہ بہت ہوا لیکن طبیعت نہیں سنبھلی۔ جمعہ ۲۲ رجنوری سنہ ۱۹۹۹ء کو شوقؔ صاحب اس دارفانی سے رخصت ہوگئے۔ عزیز آباد کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کا کلام ملاحظہ کیجیے۔

روز اک شخص چلا جاتا ہے خواہش کرتا ابھی آجائے گا بادل کوئی بارش کرتا

زندگی بھر ترے قامت کی ستائش کی ہے پھر بھی حسرت ہے کہ میں تیری ستائش کرتا

ان زمینوں ہی پہ کیا خوشۂ گندم کے لیے آسمانوں سے چلا آیا ہوں سازش کرتا

اور کیا مجھ سے تری کوزہ گری چاہتی ہے
میں یہاں تک تو چلا آیا ہوں گردش کرتا

شہر جاناں کیا اور مانگے ہے کرن بھر روشنی
اک دیا چاہت برابر دل برابر روشنی

میں بہت تنہا ہوں لیکن کوئی ایسا مجھ میں ہے
بجھنے لگتا ہوں تو کر جاتا ہے آ کر روشنی

وہ محفلیں کہ جن میں جلاتا رہا چراغ
پھر یہ ہوا چراغ جلانے لگے مجھے

اپنی طرف سے اپنی طرف آ رہا تھا میں
اور اس سفر میں کتنے زمانے لگے مجھے

تھامری جست پہ دریا بڑی حیرانی میں
کیوں مرا عکس بہت دیر رہا پانی میں

سزا یہ ہے کہ شاخیں کٹ رہی ہیں
خطا یہ ہے کہ سایہ کر رہا ہوں

ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ
اے سنگ زنو! کانچ کا پیکر ہمیں جانو!
اک بار جو بکھرے تو نہ ہاتھ آئیں گے ہم لوگ

---••☆••---

رضی حیدر، خواجہ

خواجہ رضی حیدر نام، تخلص رضی اور خواجہ رضی حیدر قلمی نام ہے۔ ۵؍فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو پیلی بھیت کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ رضی حیدر کے والد مولوی حکیم قاری احمد پیلی بھیت کے معروف عالمِ حدیث حضرت مولانا وصی احمد صاحب کے محدث سورتی کے پوتے اور سلطان الواعظین حضرت مولانا عبدالاحد محدث پیلی بھیتی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔

رضی حیدر تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو) کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ابتدا میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور روزنامہ ''حُریت'' سے منسلک ہوگئے۔ پندرہ سال صحافتی خدمات انجام دینے کے بعد وہ تحقیقی ادارہ ''قائدِ اعظم اکادمی'' سے منسلک ہوگئے جہاں بحیثیت ڈائریکٹر جنرل کے منصب پر فائز ہیں۔ وہ شعبۂ تحقیق میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ رضی حیدر کی تالیفات اور تراجم بے شمار ہیں اور سب کا موضوع پاکستان اور مطالعہ پاکستان ہے۔ محقق کی حیثیت سے انہوں نے قائدِ اعظم اور دورِ آخر کے علمائے کرام پر کئی تاریخی کتابیں اور متعدد مضامین قلم بند کیے ہیں۔

محقق ہونے کے ساتھ ساتھ خواجہ رضی حیدر ایک بلند پایہ شاعر بھی ہیں۔ بہت سے دانشوروں کا تجزیہ ہے کہ رضی حیدر کی اصل شناخت کا حوالہ ان کی شاعری ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام ''بے دیارِ شام'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نیز علامہ رشید ترابی کا مجموعہ ''شاخِ مرجان'' اور سوز شاہ جہان پوری کا مجموعہ ''کلیاتِ سوز'' مرتب کیا۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''خواجہ رضی حیدر کی غزل میں ایک عجیب نوع کی دل گرفتگی، خستگی اور دردمندی ہے۔ میں نے اسے کراچی کے معتوب شہر سے منسوب کیا ہے، اس سے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے جلتے ہوئے نگر کو دیکھ کر میر تقی میرؔ جیسا سوز یہاں بھی پیدا کیا ہے۔ لیکن مجھے ان کے ہاں ناصر کاظمی کے اسلوب میں میرؔ کی تجدید کا زاویہ نظر نہیں آتا۔ شاعری میں رضی حیدر نے اپنی

طرح نوا ایجاد کی ہے لیکن جب میں نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے تو مجھے ان کی دردمندی اور خستگی کا رشتہ ایک خانوادہ تصوف کے ساتھ بھی بندھا ہوا نظر آیا۔"

یہ جذب مہر علی تھا جو کھینچ لایا تھا — کہ پہلی بھیت تھا پنجاب سے بہت ہی دور
اِک پیر گولڑہ کا مجھ پر رضی کرم ہے — احوال میرا اہل پنجاب پوچھتے ہیں
یہ میرے نام کی تاثیر ہے رضی حیدر — ہجوم رنج میں بھی فیض خواجگان نہ گیا

اور اب مجھے یوں محسوس ہوا کہ خواجہ رضی حیدر شاعری کے بجائے سلوک کر رہے ہیں اس نوع کی شاعری کے ساتھ زندگی کے چند لمحے گزارنے کا موقعہ بھی مل جائے تو روح کا بہت سا زنگ اتر جاتا ہے۔ میں ان خوش نصیبوں میں ہوں جنہیں اِس قسم کے بہت سے لمحات نصیب ہوئے ہیں اور اب مجھے کوئی افسوس نہیں کہ "بے دیار شام" نے ابتداء میں میرے ساتھ سد مہر شام جیسا برتاؤ کیا تھا۔"

خواجہ رضی حیدر کے مجموعۂ کلام کے چند اشعار پیش ہیں' ملاحظہ کیجئے ؎

کوئی آہٹ ہے نہ سایہ ہے چلو سو جائیں — شب گزرنے کا بھی دھڑکا ہے چلو سو جائیں
دید کی آس تو کیا رات بھی اب ڈوب گئی — دل بھی اب ڈوبنے والا ہے چلو سو جائیں
رونقِ کوچہ و بازار سلامت لیکن — گھر کا سناٹا بلاتا ہے چلو سو جائیں
یہ در و بام اداسی کے مکاں لگتے ہیں — بند اب وہ بھی دریچہ ہے چلو سو جائیں
اس کا احوال بھی کچھ اپنے برابر ہے رضی — درمیاں ہجر کا رشتہ ہے چلو سو جائیں
جب تلک گھر میں رہا بات مری گھر میں رہی — گھر سے نکلا تو مرے ساتھ مسافت نکلی
اک نقشِ کفِ پا ہے مرے ساتھ سفر میں — اک نقشِ کفِ پا مجھے روتا ہے کہیں دور
حسرتوں کے موڑ پر اک شخص کو دیکھا رضی — سانس لیتی تھی نظر آواز دیتا تھا بدن
حسرتوں کے موڑ پر اک شخص کو دیکھا رضی — سانس لیتی تھی نظر آواز دیتا تھا بدن
متاعِ چشم ہے اب ایک بابِ حیرانی — کہ رسم و راہ ہماری بھی تھی دریچوں سے

---••☆••---

رضیہ انورؔ

سرزمین امروہہ نے، جس کے خمیر میں شعروسخن شامل ہے، جہاں ہزاروں شاعروں کو جنم دیا وہاں بہت سی شاعرات کو بھی پیدا کیا- ان ہی شاعرات میں ایک نام رضیہ انور کا ہے- ان کا اصل نام انوری خاتون تھا جوان کے بزرگوں نے رکھا تھا لیکن شاعری کی دنیا میں رضیہ انورؔ کے نام سے شہرت پائی- وہ اپنا تخلص انورؔ کرتی تھیں- رضیہ انورؔ ۱۹۱۹ء کو محلّہ ملّانہ امروہہ یوپی میں پیدا ہوئیں- ان کے والد الحاج قطب الدین کا تعلق امروہہ کے معزز خاندان صدیقی سے تھا- وہ سرکاری ملازم تھے- ملازمت کے سلسلے میں وہ برسوں شملہ میں رہے- رضیہ انورؔ کے ایک بھائی منوّر علی کراچی پولیس میں ایس ایس پی کے اہم عہدے پر خدمات انجام دے چکے ہیں-

رضیہ انور نے اُردو فارسی کی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی- اس کے بعد ادیب فاضل کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا- امروہہ جہاں گھر گھر شعروسخن کا ماحول تھا رضیہ انور بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں- وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگی تھیں- تعلیم وتربیت سے فارغ ہوئیں تو ۱۹۳۷ء میں ان کی شادی عتیق احمد عباسی سے ہوگئی- تقسیم کے بعد ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا اور مارٹن روڈ کراچی میں رہائش اختیار کی- یہاں آنے کے بعد بھی رضیہ انور کا شعری ذوق جاری رہا اور مطالعے کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوتا رہا-

شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ رضیہ انورؔ ایک اعلیٰ ظرف کشادہ ذہن اور روشن خیال خاتون تھیں وہ اپنے شوہر کی خدمت گذار اور بڑی فرمانبردار تھیں- ان کے شوہر بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے- اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو تمام خوشیوں سے نوازا لیکن اولاد کی نعمت سے محروم رہے- سترہ سال اولاد کی محرومی کے بعد رضیہ انورؔ کی خواہش پر ان کے شوہر نے دوسری شادی کر لی- دوسری بیوی سے جب پہلا بیٹا پیدا ہوا تو ان کے شوہر نے اپنی دوسری بیوی سے کہا کہ رضیہ انور نے اولاد کی خاطر میری دوسری شادی کرائی ہے- اس بیٹے پر تم سے زیادہ حق رضیہ کا ہے لہٰذا اپنے اس بیٹے کو تم رضیہ کو دے دو- دوسری

بیوی نے بھی اپنے شوہر کی اس خواہش کو پورا کرتے ہوئے اپنا بیٹا رضیہ انور کو دے دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ اُس نے انہیں پھر دوسرا بیٹا دیدیا۔ اس طرح دونوں بیویاں ایک ایک بیٹے کی ماں بن گئیں۔

رضیہ انور ایک خوبصورت شاعرہ تھیں جنہوں نے نظمیں، گیت، نعتیں اور غزلیں کہیں لیکن ان کی محبوب صنفِ سخن غزل تھی۔ ان کے کلام میں سادگی کے ساتھ ساتھ اہم مسائل و واقعات اور درس کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کا کلام ملک کے نامور جرائد ''عصمت''، ''خاتونِ پاکستان''، ''جام نو''، ''زیب النساء''، ''اصلاحِ نسواں'' اور ''ہمدم'' میں چھپتا رہا ہے۔ ان کا دیوان ''دشتِ تنہائی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹؍دسمبر ۱۹۹۷ء کو رضیہ انور سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ سوسائٹی کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کلام ملاحظہ کیجیے:

ہم نشیں! تو ہی بتا، عید مناؤں کیسے — دلِ غمگیں کو جو روتا ہے مناؤں کیسے
نغمۂ عیش و طرب تجھ کو سناؤں کیسے — درد جو دل میں نہاں ہے وہ دکھاؤں کیسے

ہم نشیں! تو ہی بتا، عید مناؤں کیسے

اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو میں پالوں پہلے — دین اسلام کی شوکت کو بڑھالوں پہلے
جذبۂ شوقِ شہادت کو جگالوں پہلے — دشمن دین کو دنیا سے مٹالوں پہلے

ہم نشیں! تو ہی بتا، عید مناؤں کیسے

صبا جا کے محمدؐ سے مری فریاد کہہ دینا — پڑی ہے اُمتِ عاصی پہ اب افتاد کہہ دینا
سلامِ شوق کر کے پیش جالی کے قریں جا کر — جو گزری ہے مسلمانوں پہ وہ روداد کہہ دینا

آئے نہ ساجن وعدہ کر کے بیت گئیں ساری رتیاں
کچھ اپنی کہتے کچھ میری سنتے ہو جاتیں سب من بتیاں
لوٹ بھی جا اے بادِ بہاری آئی نہیں ان کی سواری
من مندر ہے ویراں ویراں سونی سونی شہر اور گلیاں
کوئل کوکو ہم کو بلائے پی پی پپیہا جی کو جلائے
گلشن گلشن ڈھونڈا ان کو چھان لی اک اک ڈالی پتیاں

کیا وعدہ نبھانا بھول گئے یا لَوٹ کے آنا بھول گئے
گھر اور آنگن سونا سونا راہ تکیں ہیں پھول اور کلیاں

تیری چُندریا کون رنگائے جھولا تجھ کو کون جھلائے
ساون تو آیا ساجن نہ آئے چھیڑ کریں ہنس ہنس سکھیاں

اے پُروا ہوا او بھیگی فضا گھنگور گھٹا جا ان کو بتا
چھلکے چھلکے نیر بہائیں درشن پیاسی دو انکھیاں

--••☆••--

رضیہ فصیح احمد

افسانہ اور ناول نگاری میں جن خواتین کے نام سرِ فہرست ہیں، ان میں رضیہ فصیح کا نام بھی سرِ فہرست آتا ہے۔ رضیہ فصیح مراد آباد (یوپی) بھارت میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم جودھ پور میں حاصل کی۔ ایف اے پنجاب سے کیا۔ رضیہ فصیح کے والد اور تایا دونوں شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ والد صاحب افسانے بھی لکھا کرتے تھے جو اکثر چھپا کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے یہ مشغلہ ترک کردیا تھا۔

۱۹۵۲ء میں ان کی شادی فصیح احمد سے ہوگئی جو فوج میں بحیثیت سیکنڈ لیفٹیننٹ ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ بحری جہاز کے ذریعہ پاکستان آ گئیں۔ فوجی ملازمت کے سلسلے میں ان کے شوہر کا مختلف شہروں میں تبادلہ ہوتا تو رضیہ فصیح بھی ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ انہی تبادلوں کے دوران رضیہ فصیح نے اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھا۔ انہوں نے پشاور یونیورسٹی سے اوّل درجے میں بی اے کیا اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کیا۔

رضیہ فصیح نے افسانہ نگاری میں بچپن ہی سے دلچسپی لینا شروع کردیا تھا۔ ان کے گھر مختلف جرائد ''عصمت'' ''ہمایوں''، ''ادب لطیف'' اور نیرنگ خیال آتے تھے جن میں مختلف مضامین اور افسانے انہیں پڑھنے کو ملتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ ذوق انہیں والد سے ورثہ میں بھی ملا تھا۔ رضیہ فصیح نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۴۸ء سے کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''تصویرِ ناتمام'' کے عنوان سے رسالہ ''عصمت'' میں شائع ہوا جو ایک سچے واقعے پر مبنی تھا۔ شادی کے بعد چند سال بہت کم لکھا۔ اب سنہ ۱۹۵۹ء سے باقاعدہ لکھ رہی ہیں۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کا بھی ذوق ہے اور خوبصورت غزلیں اور نظمیں لکھتی ہیں۔ انہوں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد ان کی یاد میں ایک نظم لکھی تھی جو شائع نہ ہوسکی۔

روزنامہ ''جنگ'' کراچی ۱ اکتوبر ۲۰۰۳ء میں انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں بتایا:

''امریکہ جانے کے بعد یہ سلسلہ چلا کہ میں خود بھی حیران ہوں-ایک دن یا چوبیس گھنٹے میں دو، تین، چار غزلیں ہونے لگیں-میں گھبرانے لگی کہ یہ کیا ہونے لگا' احباب کو سنائیں تو انہوں نے بھی حوصلہ بڑھایا، مجھے یہ شاعری آتو گئی، مگر اس کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ اچھی ہے یا بُری-جب باذوق لوگوں نے یقین دلایا کہ ''ٹھیک ٹھاک ہے'' پھر بھی میرا ارادہ نہیں تھا مجموعہ چھپوانے کا-چنانچہ میں نے یہ کام پاکستان آنے کے بعد کیا-''

رضیہ فصیح کئی برسوں سے شکاگو (امریکہ) میں رہائش پذیر ہیں لیکن تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد پاکستان آتی رہتی ہیں-پاکستان میں منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں وہ باقاعدگی سے شریک ہوتی ہیں- ۱۹۹۵ء سے انہوں نے شاعری کا بھی آغاز کر دیا ہے-

رضیہ فصیح نے تین ناول ''یمیں''، ''آبلہ پا'' اور ''انتظار موسم گل'' کے عنوان سے لکھے-''آبلہ پا'' کو سنہ ۱۹۶۴ء میں آدم جی ایوارڈ ملا-افسانہ نگاری کے آغاز کے وقت بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو ۱۹۵۱ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئیں-بچوں کے لیے دوسری کتاب ''میرا پاکستان'' ہے جس پر ترقی اردو بورڈ کی طرف سے انعام ملا-ان کی تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں:

آبلہ پا (ناول ۱۹۶۴ء)، انتظارِ موسم گل (ناول ۱۹۶۵ء)، اک جہاں اور بھی ہے (ناول ۱۹۶۶ء)، متاعِ درد (ناول ۱۹۶۹ء)، آزارِ عشق (ناول ۱۹۷۱ء)، دوپاٹن بیچ (افسانے ۱۹۶۶) آنکھ مچولی (بچوں کے لیے کہانیاں ۱۹۵۱ء)، بے سمت مسافر (افسانے ۱۹۷۸ء)، بارش کا آخری قطرہ (افسانے ۱۹۸۴ء)، سیرِ پاکستان (بچوں کے لیے ناول کی شکل میں سفرنامہ ۱۹۶۵ء) وغیرہ-آجکل ان کا قیام شکاگو میں ہے-

---••☆••---

رعنا اکبر آبادی

شکور احمد نام، رعنا تخلص اور قلمی نام رعنا اکبر آبادی تھا۔ ۱۸۹۵ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی نثار احمد محکمہ بندوبست میں انسپکٹر منصرم اور تحصیل دار تھے۔ مذہبی تعلیم کے بعد اُردو کی تعلیم شروع کی۔ فارسی کی تعلیم انہوں نے مفتی مولوی محمد اعظم سے حاصل کی۔ انگریزی کی تعلیم کے لیے انہیں ان کی بہن کے پاس غازی آباد بھیج دیا گیا جہاں رعنا صاحب نے فارسی کے علاوہ عربی اور انگریزی زبان پر بھی خاصی دسترس حاصل کرلی۔ اس کے بعد علمی استعداد میں مزید اضافہ کے لیے انہوں نے دہلی جا کر منشی عالم اور مولوی فاضل کا نصاب مکمل کیا۔

رعنا اکبر آبادی نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جہاں پشتوں سے شعروسخن اور ادب کا چراغ روشن تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی دنیائے شعروادب میں بڑا نام پیدا کیا۔ شاعری میں انہوں نے نجم آفندی سے اصلاح لی اور ایک عرصے تک مشقِ سخن کے بعد نظمیں کہنا شروع کیا۔ تقریباً دوسو نظمیں بچوں کے لیے اور سو سے زیادہ قومی نظمیں لکھیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں نعت و منقبت کا ایک مجموعہ "ذکروفکر" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں نظمیں، سلام، رباعیات اور قصائد وغیرہ ہیں۔ انہوں نے آگرہ سے ایک تجارتی رسالہ بھی نکالا جو تقریباً آٹھ سال تک جاری رہا۔ چار پانچ سال انہوں نے ریلوے میں بھی ملازمت کی اس کے بعد اپنا کاروبار شروع کیا۔ تقسیم کے بعد رعنا اکبر آبادی پاکستان آگئے اور کراچی میں آباد ہوئے۔ یہاں آکر بھی انہوں نے اپنا ہی کاروبار جاری رکھا۔

رعنا اکبر آبادی کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہوئے جن میں "غزالِ رعنا"، "منظوماتِ رعنا" اور "رباعیاتِ رعنا" اور "ذکروفکر" وغیرہ شامل ہیں۔ اب بھی ان کا بہت سا کلام طبع ہونے سے رہ گیا ہے۔ رعنا صاحب کو دین سے بہت لگاؤ تھا اس لیے انہوں نے نعت، منقبت اور مرثیہ بھی کہے ہیں۔ ۱۵؍جنوری سنہ ۱۹۷۹ء کو رعنا اکبر آبادی دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ سوسائٹی کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کے کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے

پلک جھپکتے ہی رُخ پھر گیا زمانے کا
یہ ماجرا ہے چمن سے قفس تک آنے کا
نقاب ان کا اُلٹنا ارے معاذ اللہ
نہ یاد رکھنے کا عالم نہ بھول جانے کا
الجھے گی خموشی سے کیا قوتِ گویائی
سو عشق کے افسانے اک حسن کی انگڑائی
اک نہ اک روز تو ہے موت کا احساں ہونا
آ سکھادیں تری زلفوں کو پریشاں ہونا

یہاں کے گوشے گوشے میں خدا کا نُور پھیلا ہے
نہایت شان سے ذاتِ حبیب کبریا آئی

گل معنی کھلا جب رحمۃ للعالمیں آئے
مشیت تھی کہ آخر میں بہارِ اولیں آئے
ستارے رہ گئے سارے تڑپ کر بامِ قدرت پر
زمیں کے چاند بن کر جب یہ بالائے زمیں آئے
پکار اُٹھے رُخِ روشن پہ گیسو دیکھنے والے
خلیلی شان لے کر صاحب جبل المتیں آئے
ر طرف سلسلۂ انجمن آرائی ہے
کثرتِ جلوہ بھی آئینۂ یکتائی ہے
نہ ہوا تیری مشیت کا اشارہ جب تک
نہ خزاں آئی نہ گلشن میں بہار آئی ہے

تیرا انعام ہے رعنؔا کا یہ اندازِ سخن
تیرے ہی لُطف سے یہ شعر کی رعنائی ہے

---••☆••---

رعنا فاروقی

اخبار ''جنگ'' کی پبلیکیشن ''اخبار جہاں'' کے معروف کالم ''تین عورتیں تین کہانیاں'' کی بانی مصنفہ رعنا فاروقی ۱۱رجولائی ۱۹۴۶ء کو بھرت پور بھارت میں پیدا ہوئیں۔ان کے آبا و اجداد کا وطن دہلی تھا۔ رعنا کے والد سفارش حسین فاروقی پہلے فوج میں تھے۔وہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے محکمہ کسٹم میں بحیثیت سپرنٹنڈنٹ ملازمت اختیار کر لی تھی۔تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں سفارش حسین فاروقی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ پاکستان آ گئے اور منڈی بہاالدین میں سکونت اختیار کر لی۔چند سال کے بعد ان کا انتقال ہو گیا تو یہ خاندان رعنا فاروقی کے برادر بزرگ عارف حسین فاروقی کی سرپرستی میں منڈی بہاالدین سے ڈیرہ غازی خان منتقل ہو گیا۔ عارف حسین فاروقی ڈیرہ غازی خان میں مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔وہ معروف شاعر راز مراد آبادی کے علی گڑھ کالج کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔

رعنا فاروقی نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ گرلز اسکول ڈیرہ غازی خاں سے حاصل کی اور پھر یہیں سے میٹرک پاس کیا۔اُس وقت ڈیرہ غازی خان میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کالج کی سہولت نہیں تھی۔ رعنا نے اس زمانے کے نمائندہ اخبار ''نوائے وقت''، ''امروز'' میں لڑکیوں کے کالج کے قیام کے لیے مضامین اور مراسلات کی شکل میں مسلسل اپیلیں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔موثر اور پُر زور اپیلوں نے بالآخر حکام اعلیٰ کو متوجہ کر لیا اور انہوں ڈیرہ غازی خان کے بوائز کالج میں مخلوط تعلیم کی منظوری دے دی۔ چنانچہ رعنا فاروقی نے اپنی عملی زندگی کی جدوجہد کا آغاز لڑکیوں کے کالج کے قیام کی کوششوں سے کیا۔اس طرح لڑکیوں کے لیے بھی کالج کی تعلیم کی سہولت پیدا ہو گئی۔رعنا فاروقی کی اس جدوجہد کو کامیاب ہونے کے بعد انہیں بوائز کالج کی پہلی طالبہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔رعنا فاروقی نے ڈیرہ غازی خان میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔وہ معروف شاعر راز مراد آبادی کے علی گڑھ

کالج کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔

رعنا فاروقی نے مضامین اور بچوں کی کہانیاں لکھنے کا آغاز بچپن ہی سے کر دیا تھا۔ اخبارات کے علاوہ اُس زمانے کے بچوں کے معروف رسائل ''کھلونا''، ''تعلیم و تربیت'' اور ''بچوں کی دنیا'' وغیرہ میں ان کی کہانیاں اور مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ کالج میں داخلے کے بعد فرسٹ ایر میں ہی انہیں کالج میگزین ''الغازی'' کی مدیرہ کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔ اسی دوران انہوں نے فنون میں افسانے لکھنے کا آغاز کیا جنہیں قارئین نے بہت پسند کیا۔

گریجویشن کے بعد رعنا لاہور آ گئیں۔ یہاں انہوں نے اورنٹیل کالج میں ایم اے میں داخلہ لیا لیکن کچھ ناگزیر وجوہ کی بنا پر ۱۹۶۹ء میں انہیں تعلیمی سلسلہ ختم کر کے کراچی جانا پڑا۔ یہاں مرکزی بنک میں شعبۂ تعلقات عامہ میں ملازمت مل جانے کی وجہ سے رعنا فاروقی مستقل طور پر یہیں شفٹ ہو گئیں۔ اس ملازمت کے ساتھ انہوں نے جز وقتی طور پر ''اخبار جہاں'' میں نائب مدیرہ کے فرائض بھی سنبھال لیے۔ رعنا فاروقی نے ہفت روزہ 'اخبار جہاں' میں مشہور و مقبول سلسلہ 'تین عورتیں تین کہانیاں' لکھنے کی بنیاد ڈالی۔

رعنا فاروقی کا ان سچی کہانیوں کو افسانوی انداز میں لکھنے کا مقصد عوام الناس کی توجہ ان مسائل اور ناانصافیوں کی طرف مبذول کرانا تھا جو انہوں نے دوران تعلیم سیکڑوں دیہات کا سروے کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ افسانوں کی صورت میں سچی کہانیاں لکھنا 'اخبار جہاں' کی شناخت اور اہم ضرورت بن گیا۔ ان کہانیوں نے نہ صرف صحافتی دنیا میں ہلچل مچا دی بلکہ ادبی ذوق کے حامل لوگوں کو بھی متوجہ کر لیا۔ چنانچہ صحافتی طبقے میں انہیں رپورٹیں اور ادبی حلقے میں ان کہانیوں کو دلچسپ افسانے کہا جاتا تھا۔

۱۹۷۵ء میں بنک دولت پاکستان کی ملازمت برقرار رکھتے ہوئے رعنا نے ''اخبار جہاں'' چھوڑ کر ''دوشیزہ'' نامی ایک پرچے کی ادارت سنبھال لی اور رفتہ رفتہ اپنی محنت سے اسے ادبی پرچے کی حیثیت سے تسلیم کرایا۔ تین عورتیں تین کہانیاں کا کالم اپنی ترقی اور مقبولیت کی سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ مارچ ۸۲ء میں دوشیزہ نے اس مقبول سلسلے کا ایک نمبر شائع کیا۔ دوشیزہ کی وساطت سے ان کے افسانوں کی برصغیر میں ہر جگہ بڑی مقبولیت اور پذیرائی ہوئی۔ ابوالخیر کشفی، شوکت صدیقی اور بھارت

کے معروف افسانہ نگار رام لعل نے رعنا کے اس فن کی بڑی تعریف کی۔ حقیقت یہ ہے افسانوی ادب میں اتنے دلچسپ، ناقابل فراموش اور کامیاب افسانے کسی نے بھی اس افراط سے نہیں لکھے۔

سنہ ۲۰۰۲ء میں رعنا فاروقی نے بنک دولت پاکستان سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ اب وہ زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزارتی ہیں۔ تین عورتیں تین کہانیاں کے ساتھ ساتھ وہ جنگ کے بدھ وار میگزین میں ناقابل فراموش سے عنوان سے ایک کالم لکھتی ہیں۔ آج کل وہ غالب لائبریری کی جنرل سکریٹری ہیں۔

رفعت القاسمی

محمد ابوالقاسم اصل نام ہے ،ادبی حلقوں مین رفعت القاسمی کے نام سے مشہور ہیں-تخلص کبھی قاسمی اور کبھی رفعت دونوں استعمال کرتے ہیں-ان کے والدماجدمولانا حبیب الرحمٰن علوم دینی کی معتبر شخصیت تھے-رفعت القاسمی ۱۹۳۴ء میں شیخ پور (ضلع مونگیر) صوبہ بہار میں پیدا ہوئے-اُردو فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد گلستان، بوستاں، منطق الطیر ،اور سکندرنامہ وغیرہا مولانا عبدالغنی رحمانیؒ مولف تذکرہ رسولؐ سے پڑھیں-علامہ عبدالعزیز میمنی بھی ان کے استاد رہے ہیں- ہائی اسکول کے بعد انہیں مزید تعلیم کے لیے کلکتہ بھیج دیا گیا جہاں رفعت القاسمی نے تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے تاریخ اسلامی میں ایم اے کیا-عربی ادب میں الشہادۃ العالیہ کی سندامتیاز کے ساتھ حاصل کی-

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے الہ آباد بنک کلکتہ سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور یہیں پر بنکاری کا وسیع تجربہ اور پوری تربیت حاصل ہوئی-تقسیم کے بعد پاکستان آئے اور بینک آف بھاولپور میں چھ سال منیجر اور پھر چیف اکاؤنٹس آفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے-خرابی صحت کی بناپر مستعفی ہوکر کراچی چلے آئے-حسین شہید سہروردی کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں دوایک دوستوں کے ساتھ مل کر انہوں نے نیشنل کمرشیل بنک لمیٹڈ قائم کرنے میں نمایاں حصہ لیا اور اس کے چیف اکاؤنٹس آفیسر مقرر ہوئے-اس کے بعد وہ سٹی بنک میں انسپکٹر آف برانچز کے عہدے پر فائز ہوئے-بینکاری کا وسیع تجربہ ہونے کی بنیاد پر ۱۹۶۳ء میں انہوں نے پریمیر بنک لمیٹڈ قائم کرنے کی اجازت اپنے ذاتی نام پر حاصل کی-اس وقت صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان تھے-بنک قائم ہونے کے بعد رفعت القاسمی بنک کے ڈائریکٹر اور مشیر اعلیٰ مقرر ہوئے-وزیر خارجہ (بعد میں وزیر اعظم پاکستان) ذوالفقارعلی بھٹوشہید سے رُفعت القاسمی کے نیازمندانہ مراسم تھے-انہوں نے بنک کے قیام میں بہت مدد بھی کی تھی-اس بنک کی

افتتاحی تقریب انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو سابق وزیر خارجہ سے کرائی- دنیا کی بنکاری کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا جس میں خطبہ استقبالیہ اُردو میں پیش کیا گیا اور وزیر خارجہ نے بھی اس کا جواب اُردو میں دیا- ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ اپنی ایک تصویر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قسمت بھی کیا گل کھلاتی ہے- ان کے ساتھ میری ایک اچھی سی تصویر تھی- اسے لے کر میں ان کی کوٹھی پر گیا- سائیں ادا! اس پر اپنے دستخط کر دیجیے- خود پرستی اور انا پرستی کی اتنی شان میں نے کبھی کسی میں نہیں دیکھی- کہنے لگے- ''جانتے ہو کس کے ساتھ تمہاری تصویر ہے؟'' ایشیا کے عظیم لیڈر کے ساتھ، میں نے برجستہ جواب دیا- لیکن بے اختیارانہ چھوٹے منہ سے ایک بڑی بات نکل گئی- سائیں آپ کے علاوہ دنیا کے ایک عظیم انسان کے ساتھ بھی میری تصویر ہے- پیشانی پہ بل پڑ گئے- وہ کون ہے؟ علامہ عبدالعزیز میمنی میرے استاد، میں نے کہا- اور دستخط کی ہوئی تصویر انہوں نے پھاڑ کے پھینک دی- دل میں گرہ پڑ گئی- اس کے بعد پھر میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی-''

رِفعت القاسمی عجز وانکسار، سادگی اور فقر وقناعت، جس کا درس ان کی ماں نے ان کے سر سے اپنا سایہ سمیٹتے ہوئے دیا تھا، آج بھی فخر کرتے ہیں- اپنے مجموعۂ کلام میں وہ لکھتے ہیں کہ میری زندگی میں ایسا دور بھی آیا ہے کہ دووقت کی روٹی کے لالے پڑ گئے- آفرین ہے اس شخص پر جو ممتاز بنکار رہا ہو، جس کی بنکاری پر عملداری رہی ہو، اہم مناصب پر فائز رہا ہو اور ملک کی قدآور شخصیات سے اس کے بہت قریبی مراسم رہے ہوں پھر بھی وہ زندگی میں کبھی کبھی دووقت کی روٹی کے لیے پریشان رہا لیکن اپنی سادگی اور فقر کو داؤں پر نہیں لگایا-

پاکستان کی بنکاری کی ڈائرکٹری میں ایک ممتاز بنکار کی حیثیت سے ان کے سوانح حیات درج کیے گئے ہیں- وہ ایک عرصہ تک ایک مقامی کالج میں عربی کا درس بھی دیتے رہے ہیں- رِفعت القاسمی اُردو، فارسی، عربی اور مغربی زبانوں سے گہرا شغف اور واقفیت رکھتے ہیں- وہ جہاں بنکاری کے تجربہ کار ایڈمنسٹریٹر ہیں، وہاں ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر بھی ہیں- مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے، اور نہ کسی سے تلمذ کا تعلق رہا- شعر وسخن کا ذوق انہیں بچپن سے ہے- وہ پاکستان اردو اکادمی کے نائب صدر، ادارہ ادبیات اردو کے جنرل سکریٹری اور پاکستان عربی اکادمی کے رکن رہے ہیں- مشہور ادبی ماہنامہ

''مہر نیمروز'' کے ادارۂ تحریر سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں۔ اکثر علمی ادبی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے دو دیوان ''دُکھ پیغمبری کے'' اور ''عشق ناتمام'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مجموعہ ''دُکھ پیغمبری کے'' اور ''عشق ناتمام'' سے منتخب کیے گئے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

دیے ہیں تُو نے دُکھ پیغمبری کے الٰہی! یہ مرا رُتبہ نہیں تھا

قاسمی سر اُٹھاؤ سجدے سے ہو گئی صبح کی اذان میاں

یوں سمجھ لو کہ قریۂ جاں میں دل ہے دکھ درد کا مکان میاں

تیری یادوں کا سلسلہ ٹوٹا گر پڑا گھر کا سائبان میاں

نہ راس آئی یہاں بھی ہوائے آزادی وطن سے آئے تھے رفعت لٹے لٹائے ہوئے

کہاں پہ لائی ہے میری خودی کہاں سے مجھے نہ اپنے دل سے غرض ہے نہ اپنی جاں سے مجھے

نہ اس جہان سے نسبت نہ اُس جہاں سے مجھے بس ایک ربط ہے دنیائے بے نشاں سے مجھے

اے موسم گُل کہیو ذرا دیدۂ تر سے چھائی ہے گھٹا غم کی تو پھر جھوم کے برسے

وہ بات جو اس دل کے اُجالوں کا سبب تھی کاجل کے تئیں پھیل گئی دیدۂ تر سے

اک عمر کا آزار ہے یہ کارِ جنوں بھی جانے کا نہیں عشق کا سودا کبھی سَر سے

کیا جانے کھوگئی ہے کہاں منزلِ حیات یارو! ابھی ابھی تو رُکے تھے ذرا سے ہم

تھے محوِ خواب گردشِ دوراں سے بے نیاز چونکے مگر زمانے کی آوازِ پا سے ہم

زندگی کو عمر بھر مرمر کے رکھتے ہیں عزیز زیست سے بیزار ہوتے ہیں تو مر جاتے ہیں ہم

فصیلِ شہر کو دیکھیں کہ بام و دَر دیکھیں تمام آگ لگی ہے کِدھر کِدھر دیکھیں

یہ بے گھری ہے بہت شب زدوں کی بستی میں متاعِ درد لُٹائیں تو اپنا گھر دیکھیں

جو اہلِ درد ہیں چہروں کی بھیڑ میں گُم ہیں چراغ دل کے جلا کر شناخت کر دیکھیں

جنوں تمام ہوا' عشق ناتمام رہا دلوں کی راکھ سمیٹیں کہ چشمِ تَر دیکھیں

اب عشرتِ گناہ کی وہ لذتیں کہاں وہ دن بدل گئے' وہ زمانے بدل گئے

رفعتؔ دل و نگاہ کی وسعت کے باوجود ہم اپنے ہی مزاج کی حِدّت سے جل گئے

--••☆••--

رفیق خاور

رفیق خاور ۱۵رفروری ۱۹۰۸ء کوراولپنڈی میں پیدا ہوئے- اصل نام محمد رفیق حسین اور قلمی نام رفیق خاور ہے- خوش قسمتی سے رفیق خاور نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کی فضا انتہائی علمی اور شاعرانہ تھی- ان کے والد میاں محمد بخش علمی وفنی ذوق رکھتے تھے- رفیق خاور کی ایک بہن اور سات بھائی تھے اور سب کو شعرو ادب سے شدید لگاؤ تھا- ڈاکٹر محمد صادق پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور اور جدید اُردو شاعری میں جدید نظم کے بانی تصدق حسین خالد ان کے بڑے بھائی تھے- علمی ادبی اور شاعرانہ ماحول میں پرورش پانے والے رفیق خاور دوسری تیسری جماعت ہی سے شعروشاعری میں تک بندی کرنے لگے تھے- اس طرح ان کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز شاعری سے ہوا- پانچویں چھٹی جماعت میں تھے کہ اقبال اور غالب سے وہ بہت متاثر تھے- اقبال کی ''اسرارخودی'' اور دیوانِ غالب بذریعہ شرح پڑھ کر روشناس ہوئے-

رفیق خاور نے اسلامیہ کالج لاہور سے امتیازی نمبروں کے ساتھ بی اے (فارسی) کیا- اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (انگریزی)' ایم اے (فارسی) اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں- رفیق خاور ایم اے سے پہلے علم ریاضی اور سائنس ہی سے شغف رکھتے تھے اور ہمیشہ امتیاز حاصل کرتے رہے جو انعامات کی صورت میں افادیت سے خالی نہ تھا- لیکن بی اے میں ان سے روگرداں ہو کر ادبیات کی طرف رجوع ہو گئے اور بی اے (فارسی) میں ریکارڈ نمبر حاصل کیے-

حصول تعلیم کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرر مقرر ہوئے- دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے جہاں انہوں نے بحیثیت براڈ کاسٹر خدمات انجام دیں- تقسیم کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں وزارت محنت اور وزارت اطلاعات میں کام کرتے رہے- وہ سرکاری رسالہ ''ماہِ نو'' کے نائب مدیر اور پھر مدیر بھی رہے- بعدازاں وہ ڈپٹی ڈائریکٹر ہوئے- سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر وہ ''اُردو لغت بورڈ'' سے منسلک ہو گئے-

رفیق خاور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ محقق بھی تھے اور نقاد بھی، شاعر بھی تھے اور بہترین مترجم بھی۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ شاعر، نقاد، محقق اور مترجم کی حیثیت سے انہیں دنیائے ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ انہوں نے انگریزی، فارسی اور پنجابی نظموں کے ایسے اعلیٰ اُردو ترجمے کیے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ غالبؔ کی مثنوی ''ابر گہر بار''، ''ہیر وارث شاہ'' اور علامہ اقبالؔ کی تصانیف ''جاوید نامہ''، ''مسافر''، ''پس چہ باید کرد'' اور ''پیامِ مشرق'' کے منظوم ترجمے ان کی قادرالکلامی کا ثبوت ہیں۔ ''شکوہ جواب شکوہ'' کا فارسی میں اور ''بانگ درا'' اور ''پیامِ مشرق'' کا پنجابی میں ترجمہ کیا۔ غالبؔ کی فارسی مثنوی ''گہر بار'' کو اُردو نظم اور پنجابی زبان کے لازوال شاہکار ''ہیر وارث شاہ'' کو اردو نظم میں منتقل کیا۔ اسی طرح فضل کریم فضلی کے ناول ''خونِ جگر ہونے تک'' کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ٹی ایس ایلیٹ کی شہرۂ آفاق نظم ''ویسٹ لینڈ'' کا اُردو ترجمہ کیا جو کراچی کے رسالہ ادب میں شائع بھی ہوا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کی ''الفاروق'' کا انگریزی اور شاہ لطیف بھٹائی کے کلام کا انتخاب اُردو زبان میں منتقل کیا۔

رفیق خاور نے نظمیں بھی لکھیں اور نثر میں بھی بہت کچھ لکھا۔ ان کی تصانیف میں (۱) ریختہ رشک فارسی (کتاب کا یہ نام غالب کے اس شعر سے ماخوذ ہے)

جو یہ کہے ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی   گفتۂ غالب اک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

(۲) خاقانی ہند (۳) اقبال اور اس کا پیغام (۴) ابر گہر بار (۵) پدما سے چناب تک (۶) ہماری موسیقی (۷) پاکستان کے گیت (۸) گیت مالا (۹) گاندھی نامہ (۱۰) اپنی بھاوج بیگم تصدق حسین کی شرکت میں ایک ناول ''قلوپطرہ'' پیش کیا جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ایک ڈرامہ ''شاہ جہاں'' شائع کیا جو اس صنف کے نمونوں میں نادر حیثیت رکھتا ہے۔ (۱۱) حرفِ نشاط آور

نامور محقق، نقاد شان الحق حقی ''حرفِ نشاط آور'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''حرفِ نشاط آور'' دنیائے ادب کا ایک معجزہ ہے جس کی نظیر کسی سرزمین پر کسی دور یا کسی زبان میں نہیں مل سکتی۔ کولرج کی نظم ''قبلا خان'' کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہ اس نے خواب میں لکھی تھی۔ بیدار ہوا تو ذہن میں تازہ تھی اور قلمبند کر لی۔ اس سے ملتے جلتے واقعات دوسرے شاعروں کے ساتھ بھی ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں مگر ایک پوری کتاب منظم، مربوط معجزہ گر نیست کرامات مہست۔

اس سے قطع نظر کہ یہ کتاب عالمِ خواب میں تصنیف ہوئی یا بیداری میں اور اقبال کی روح نے لکھوائی یا خود رفیق خاور کی روحِ بیدار نے' یہ اپنی جگہ ایک ادبی تصنیف کی حیثیت سے اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ مہارتِ سخن کا نادر نمونہ' سبک ہندی کی روایت سے الگ' مگر سرزمینِ ہند میں تخلیق ہونے والا فارسی زبان کا ایک اچھوتا کارنامہ۔ مشکل ہے کہ آئندہ کوئی فارسی میں اس طرح دادِ سخن گستری دے سکے۔ جناب رفیق خاور ایک مٹتی ہوئی بلکہ مٹی ہوئی روایت کے آخری نام لیوا ہیں۔''

۱۴رمئی ۱۹۹۰ء کو یہ عظیم شخص دنیائے ادب کو بیش بہا اثاثہ دے کر دارِ فانی سے رخصت ہوگیا۔ ان کا کلام ملاحظہ کیجیے۔

مرے دیدۂ ترکی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
مرا دل' مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کا لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں اسیر
موجوں کا سمندر میں تلاطم دیکھو — شوریدہ عناصر کا تصادم دیکھو
پھر میرے جنونِ شوق سے سینے میں — ہنگامۂ بے تابی قلزم دیکھو
صبحیں عشق کی صبحیں ہیں اور شامیں عشق کی شامیں — جھوم اُٹھتا ہے دل رہ رہ کر اک سرمست فضا میں
تند حوادث کے یہ جھونکے اور یہ بلا کا طوفان — اپنا بدن دیوار ہے جس کو گرتے گرتے تھامیں
اتنے شوق اور اتنے ارماں' اتنے امنڈتے طوفاں — موجیں ہی موجیں لہریں ہی لہریں جیسے ہو دریا میں
صبحیں بے چینی لاتی ہیں' شامیں بے خوابی لاتی ہیں — دل لاتی ہیں سیماب نما' آنکھیں سیلابی لاتی ہیں
کبھی نوش سمجھ کے اسے جو چکھا بھی تو ہرج ہی کیا — جو تھا نیش وہ نیش ہی تھا جو ہو تلخ نبات ہی کیا
سیلاب بند ہو نہ سکا گیر و دار ضبط — جو رُک گئیں ادھر تو اُدھر ندیاں چڑھیں

--••☆••--

رؤف پاریکھ، ڈاکٹر

ڈاکٹر صاحب کا اصل نام حاجی رؤف اور قلمی نام رؤف پاریکھ ہے۔ رؤف صاحب کا تعلق میمن برادری سے ہے۔ ان کا آبائی وطن صوبہ گجرات (بھارت) کا ایک چھوٹا سا شہر اپلیٹا ہے اور خاندانی پیشہ ہمیشہ سے تجارت رہا ہے۔ ان کے والد حاجی عبدالغفار خوش قسمت ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے نیک سیرت اور ذہین بیٹا عطا کیا۔ رؤف پاریکھ ۲۶ راگست ۱۹۵۸ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت کراچی میں ہوئی۔ یہاں یہ بات قابل تعریف ہے کہ رؤف صاحب نے اپنے خاندانی اور پیشہ ورانہ تجارتی ماحول میں رہنے کے باوجود اعلیٰ تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دی اور اُردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے ابتدائی تعلیم باغ ہلار اسکول نشتر روڈ (سابق لارنس روڈ) کراچی میں حاصل کی۔ ۷۶-۱۹۷۶ء میں سیفیہ اسکول پاکستان چوک سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۸۴ء میں انہوں نے جامعہ کراچی سے اوّل درجہ میں ایم۔ اے (اردو) کیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۲ء میں انہوں نے جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع ''اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر'' تھا جس کی نگرانی ڈاکٹر معین الدین عقیل نے کی۔ یہ مقالہ ۱۹۹۴ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔

ڈاکٹر رؤف کو لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ سیفیہ اسکول میں ان کی ذہانت اور حصول تعلیم کا شوق دیکھ کر ان کے اساتذہ میں سید محمد طاہر اور محمد احمد قرار نے ان کو زیادہ سے زیادہ کتابیں اور نظمیں پڑھنے کی ہدایت کی۔ سید محمد طاہر پٹنہ یونیورسٹی کے سابق طالب علم اور محمد احمد قرار ماہر ریاضی اور شاعر تھے۔ اپنے استادوں کی ہدایت پر رؤف صاحب نے مختلف میگزینوں، رسالوں اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ اس سلسلے میں وہ لائبریریوں میں جاتے اور کرائے پر بھی کتابیں لا کر پڑھتے تھے۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ انہوں نے قلم اٹھایا اور لکھنا بھی شروع کر دیا۔

رؤف صاحب نے لکھنے کی ابتدا بچوں کے رسائل سے کی۔ان کی پہلی تحریر ۱۹۷۳ء میں ''تعلیم وتربیت'' میں شائع ہوئی۔اس کے بعد وہ ''ہمدرد نونہال'' (کراچی) اور ''تعلیم وتربیت'' لاہور میں مستقل ۲۰ سال تک لکھتے رہے۔اس کے بعد ان کی پہلی تصنیف کتابی شکل میں ''خفیہ پیغام'' کے عنوان سے ۱۹۷۸ء میں فیروز سنز نے شائع کی۔یہ ایک جاسوسی ناول ہے جو انہوں نے بچوں کے لیے لکھا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے طنزیہ کالم نگاری کی طرف قدم اٹھایا اور روزنامہ ''حریت'' کراچی، ''اُردو ڈائجسٹ'' لاہور، ''ہمدرد صحت'' کراچی، اور ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد دکن میں طنزیہ کالم لکھتے رہے۔۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۰ء تک روزنامہ ''جسارت'' میں ادبی کالم لکھے اور ساتھ ہی ساتھ ''جسارت''، فرائیڈے اسپیشل کراچی اور سہ ماہی مکالمہ کراچی میں کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔

ذریعہ معاش کے لیے رؤف صاحب نے درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ابتدا میں انہوں نے حبیب بینک میں لائبریرین، استاد اور ہاؤس جرنل کے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ان کی اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف میں انہیں طلائی تمغہ سے نوازا گیا۔اس کے بعد ایک پرائیویٹ کالج اور بحریہ یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔آج کل وہ اردو لغت بورڈ سے منسلک ہیں اور بحیثیت مدیر اعلیٰ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان کی دلچسپی کے موضوعات بچوں کا ادب، طنز ومزاح، لغات ولسانیت، تاریخ اور مذہب ہے۔ڈاکٹر رؤف پاریکھ ایک نامور محقق، نقاد، ناول نگار ہیں اور اُردو لغت بورڈ کے جواں سال مدیر اعلیٰ ہیں۔ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) خفیہ پیغام (بچوں کے لیے ناول ۱۹۷۸ء) (۲) پٹاخوں کا ہنگامہ (بچوں کے لیے مزاحیہ کہانیاں) (۳) ہوائیاں (طنزیہ ومزاحیہ مضامین) (۴) نازک صاحب کا بکرا (بچوں کے لیے کہانیاں) (۵) اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر (پی ایچ ڈی کا مقالہ) جو ۱۹۹۴ء میں انجمن ترقی نے شائع کیا۔(۶) سرخاب کے پر (انگریزی مزاح کے تراجم) (۷) عصری ادب اور سماجی رجحانات (۸) اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۱۹ (مدیر اعلیٰ اُردو لغت بورڈ، کراچی)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی انگریزی تحریروں میں تنقید ولسانیات پر مضامین اور تبصرے روزنامہ ''ڈان'' میں شائع ہو چکے ہیں

---••☆••---

رئیس فاطمہ

رئیس فاطمہ ۱۷ر جولائی سنہ ۱۹۴۶ء کو گنگا جمنا کے سنگم الہ آباد میں پیدا ہوئیں- دلّی جسے ''بائیس خواجہ کی چوکھٹ'' کہا جاتا ہے' جو ہندوستان کی راجدھانی اور خواجہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی ابدی آرام گاہ ہے' رئیس فاطمہ کا آبائی وطن ہے- ان کے والد جناب محمد بخش مرحوم برطانوی حکومت کے' ایک اعلیٰ افسر تھے جو بسلسلہ ملازمت الہ آباد میں مقیم تھے- تقسیم ہند کے وقت ان کے والد محکمہ شہری ہوابازی (سول ایوی ایشن) کراچی میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے- اس وقت تک رئیس فاطمہ' اُن کے بہن بھائی' والدہ اور دادی صاحبہ ہندوستان میں مقیم تھے جو بعد میں پاکستان آئے- ان کے والد کا علمی اور ادبی ذوق نہایت شستہ اور اعلیٰ تھا- انہوں نے موسیقی کی بھی باقاعدہ تعلیم اور تربیت حاصل کی تھی اور ستار' وائلن بجانے میں انہیں کامل دسترس حاصل تھی- رئیس فاطمہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں اسی لیے وہ اپنے والد کی لاڈلی تھیں-

رئیس فاطمہ نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے اِرد گرد کتابیں دیکھیں اور کلاسیکی موسیقی کے اسرار و رموز پر گفتگو سنیں- لہذا والد کی صحبت اور گھر کے ماحول سے انہیں بھی بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ ہوا- انہوں نے ابتدائی تعلیم سینٹ زیویئر اور سوشل کیمبرج اسکول سے حاصل کی- اس کے بعد اسلامیہ کالج فار ویمن سے میٹرک کیا- سنہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کالج فار ویمن سے گریجویشن کیا اور یہیں سے اِن کی تحریروں کا سلسلہ چلا- وہ یہاں ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۸ء تک کالج یونین کی صدر اور جنرل سیکریٹری' بزمِ ادب کی نائب صدر رہیں- اسی کالج میں وہ بزمِ نفسیات کے ترجمان مجلّے (تجزیہ) کی نائب مدیرہ اور کالج میگزین کی ایڈیٹر اور مینجنگ ایڈیٹر رہی ہیں- اِسی زمانے میں انہوں نے مختلف اخبارات حریت' انجام' مشرق' اخبار خواتین اور روزنامہ جنگ میں لکھنا بھی شروع کر دیا تھا- گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۰ء میں فرسٹ کلاس اُردو ادب میں ایم اے کیا-

میٹرک کرنے سے پہلے ہی ایک کہانی ''سات نکتے'' کے عنوان سے لکھی جو ہمدرد نونہال میں

چھپی-ان کا سب سے پہلا افسانہ ''اخبار خواتین'' میں شائع ہوا-اس کے بعد سے کہانیاں لکھنے کا سلسلہ چل نکلا جو آج تک جاری ہے-۱۹۷۹ء میں ان کی شادی برصغیر کے نامور عالم' ادیب اور محقق قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی مرحوم کے فرزند قاضی محمد اختر سے ہوئی جنہیں خود بھی ادب سے لگاؤ اپنے والد کے وِرثہ میں ملا ہے-قاضی احمد میاں اختر' جن کا تذکرہ دبستانوں کا دبستان کراچی (جلد اول) میں کیا جا چکا ہے' کسی تعارف کے محتاج نہیں-رئیس فاطمہ خوش نصیب ہیں کہ ان کی شادی بھی علمی ادبی گھرانے ہوئی-رئیس فاطمہ کو لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا-اسکول و کالج کے زمانے میں بھی وہ نصابی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتی رہی ہیں-وہ کہتی ہیں اُردو کے افسانوی ادب کے حوالے سے جن ادیبوں کی تحریروں نے انہیں خاص طور پر متاثر کیا ہے اُن میں احمد اکبر آبادی' عزیز احمد' کرشن چندر' عصمت چغتائی راجندر سنگھ بیدی' سعادت حسین منٹو اور قرۃ العین حیدر کے نام نمایاں اہمیت رکھتے ہیں-اُردو کے ناقدین اور محققین میں اُن کے اپنے خسر قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی (ولی گجراتی پر خصوصی تحقیق کے حوالے سے)' فراق گورکھپوری' مجنوں گورکھپوری' محمد حسن عسکری' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' ڈاکٹر سید عبداللہ' آلِ احمد سرور کی تحریروں کے مطالعہ ان کے لیے ہمیشہ فکر انگیز اور بصیرت افروز رہا ہے- اُردو شعراء کے حوالے سے وہ فرماتی ہیں کہ بلاشبہ میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کے بعد فیضؔ اور ناصرؔ کاظمی کے کلام نے ان کے دل و دماغ پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں-رئیس فاطمہ نے غیر ملکی ادیبوں کا بھی مطالعہ کیا ہے جن میں موپساں' چیخوف اور او ہنری کی تحریریں ہیں-

رئیس فاطمہ نے سنہ ۱۹۷۴ء سے ۲۰۰۰ء تک مختلف کالجز میں پڑھایا اور ۲۰۰۰ء سے تا حال دہلی گورنمنٹ کالج کریم آباد سے بحیثیت صدر شعبہ اُردو وابستہ ہیں-فی الوقت ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر کام کر رہی ہیں-اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''گلاب زخموں'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے-دو ناولٹ ''اُداسیوں کا موسم'' اور ''شاخِ نہالِ غم'' زیر طبع ہیں-روزنامہ ایکسپریس کے سنڈے ایڈیشن میں گزشتہ ایک برس سے مختلف سماجی اور معاشرتی مسائل کے حوالے سے کالم لکھ رہی ہیں-

---••☆••---

رئیس فروغ

اصل نام سید محمد یونس حسن، رئیس تخلص اور قلمی نام رئیس فروغ ہے۔ ۱۵ر فروری سنہ ۱۹۲۶ء کو شعرو سخن کی بستی مراد آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے، جہاں آئے دن شعروادب کی محفلوں کا انعقاد اور گلی کوچوں میں ہر طرف شعروادب کا چرچہ رہتا ہے۔ ان کے والد کا نام سید محمد یوسف تھا۔ دورانِ تعلیم محفلوں، ادبی انجمنوں اور مشاعروں نے رئیس فروغ کے اندر چھپے ہوئے شعری جذبہ میں ہیجان پیدا کیا۔ ابتدائی دور میں انہوں نے قمر مراد آبادی کی شاگردی اختیار کی۔ وہ اپنے شعر اصلاح کے لیے انہیں دکھاتے تھے۔ مشہور شاعر جگر مراد آبادی کے بعد قمر مراد آبادی کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اُنہوں نے رئیس فروغ کی شعری صلاحیتوں کو اجاگر کیا اور ان میں سلیقہ پیدا کیا۔ بقول رئیس فروغ، انہیں شاعری کا ذوق قدرتی طور پر ہوا تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا ان کے خاندان یا آباؤ اجداد میں کوئی شاعر پیدا ہوا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ انہیں اپنے خاندان سے محض شاعری کا ذوق ملا ہے۔

تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ابتدا میں انہوں نے ٹھٹھہ میں قیام کیا پھر کراچی آ کر مستقل سکونت اختیار کی۔ یہاں پر انہوں نے تلاش معاش میں بڑی پریشانیاں اٹھائیں۔ آخر کراچی پورٹ ٹرسٹ میں انہیں ملازمت مل گئی۔ وہ تقریباً پندرہ سال کراچی پورٹ ٹرسٹ سے منسلک رہے۔ یہاں پر انہوں نے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ ''بزمِ ادب کے پی ٹی'' کی بنیاد ڈالی اور اس کے سیکریٹری رہے۔ وہ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ادبی مجلّہ سہ ماہی ''صدف'' کے مدیر بھی رہے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے بعد رئیس فروغ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ براڈ کاسٹنگ کارپوریشن میں وہ بحیثیت اسکرپٹ رائٹر مقرر ہوئے اور آخری وقت تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔

رئیس فروغ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے لیکن انہوں نے نظمیں، قطعات اور گیت بھی لکھے

ہیں- شاعری کے ساتھ ساتھ وہ مضمون نگار اور مترجم بھی تھے- انہوں نے طنز و مزاح افسانے اور ڈرامے بھی خاصی تعداد میں لکھے- بچوں کے لیے ان کی نظموں کا مجموعہ ''ہم سورج چاند ستارے'' شائع ہوا اور ایک شعری مجموعہ ''رات بہت ہوا چلی'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوا- ۱۵/ اگست ۱۹۸۲ء کو رئیس فروغ ملک عدم کے سفر پر روانہ ہو گئے- رئیس فروغ کے کلام کے کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں ۔

اب کی رُت میں جب دھرتی کو برکھا کی مہکار ملے
میرے بدن کی مٹی کو بھی رنگوں میں نہلا دینا

ہم بھی لَے کو تیز کریں گے بوندوں کی بوچھار کے ساتھ
پہلا ساون جھولنے والو تم بھی پینگ بڑھا دینا

فصل تمہاری اچھی ہو گی جاؤ ہمارے کہنے سے
اپنے گاؤں کی ہر گوری کو نئی چُنریا لا دینا

دھوپ مسافر چھاؤں مسافر آئے کوئی جائے کوئی — گھر میں بیٹھا سوچ رہا ہوں آنگن ہے یا رستہ ہے
آنکھیں جن کو دیکھ نہ پائیں سپنوں میں بکھرا دینا — جتنے بھی ہیں روپ تمہارے جیتے جی دکھلا دینا
گلیوں میں آزار بہت ہیں گھر میں جی گھبراتا ہے — ہنگامے سے سناٹے تک میرا حال تماشا ہے
اپنے حالات سے میں صلح تو کر لوں لیکن — مجھ میں روپوش جو اک شخص ہے مر جائے گا

بچوں کے لیے ایک نظم

ہم ہی تو گھروں کی زینت ہیں — بستی کے گھروں سے کہہ دینا
سب رنگ ہمارے دم سے ہیں — تتلی کے پَروں سے کہہ دینا
کھلتے ہیں دلوں کے ہم سے کنول — شہروں کی فضا سے کہہ دینا
ہم سے ہی دلوں کی ٹھنڈک ہے — جنگل کی ہوا سے کہہ دینا

---••☆••---

ساحرعباسی

اصل نام معشوق علی تخلص ساحراور قلمی نام ساحرعباسی تھا۔ ۳۰ رنومبر سنہ ۱۹۲۷ء کو شعروسخن کی بستی امروہہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد صابر علی عباسی امروہہ کے معززلوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ساحرعباسی نے ابتدائی تعلیم امروہہ کے نرسری بنگلہ اسکول میں حاصل کی اور سینٹ اسٹیفن اسکول دہلی سے میٹرک پاس کیا۔باقی تعلیم اینگلوعربک کالج دہلی میں حاصل کی۔

ساحرعباسی پاکستان بننے سے پہلے مقبول عوامی شاعر تھے۔انہوں نے قیام پاکستان کے سلسلے میں تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان کی قومی نظموں پر مشتمل ایک کتابچہ قاضی عزیز احمد عباسی مرحوم نے پاکستان کلب امروہہ سے پہلی بار شائع کیا۔ساحرعباسی نے اپنی قومی نظمیں ان جلسوں میں پڑھیں جن کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی۔ان کی ایک نظم جس کا مصرع یہ تھا:

''باطل کے پرستاروں سے کہو وابستۂ پاکستان ہیں ہم''

قائداعظم نے بہت پسند کیا اور VERY GOOD اور WELL RECITED کہہ کر انہیں داد دی۔ ساحر کم عمری ہی میں صحافت سے وابستہ ہوگئے تھے۔وہ روزنامہ ''انصار'' دہلی کے مدیر رہے۔آزادی کے بعد وہ سنہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔پاکستان آکر ''انجام'' کراچی سے وابستہ ہوئے اور ماہنامہ ''برابط'' کے مدیر بھی رہے۔بعدازاں انہوں نے اپنا ذاتی ماہنامہ ''ساون'' اور ہفتہ وار انگریزی اخبار ''PIONEER'' نکالا۔وہ اربن اینڈ ایگریکلچر بینک کے ڈائریکٹر، کراچی مائیکروفون اسٹیشن کے ڈائریکٹر اور پاک عربین کوآپریٹیو بینک کے منیجنگ ڈائریکٹر بھی رہے۔قائداعظم اور قیام پاکستان سے متعلق بننے والی فلم ان کے تعاون سے تیار کی گئی۔پاکستان اور روس کے تعلقات شگفتہ ہوتے ہی حکومتِ روس کی دعوت پر حکومتِ پاکستان کی طرف سے ۱۹۶۴ء میں

ساحرؔ عباسی Leader of The Generlist Delegation بن کر روس کے دورے پر گئے- جب روس کا وفد پاکستان آیا تو بحیثیت میزبان انہوں نے ہی تقریباً ۲۳ ممالک کے سفرا کے اعزاز میں عصرانہ دیا تھا- اُس وقت پاکستان میں پہلی بار روسی فلموں کا میلہ بھی بمبینو سنیما میں منعقد ہوا تھا جس کا افتتاح بیگم نصرت بھٹو نے کیا تھا-

ساحرؔ ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے- مترنم بحریں، سُبک الفاظ اور غنائیت ان کے کلام کی دل کشی اور دل آویزی کا خاصہ تھی- پاکستان آ کر انہوں نے شاعری تقریباً ترک کر دی تھی- مگر زندگی کے آخری ایام میں بہت سی غزلیں کہیں- ۲۵ر مارچ سنہ ۱۹۷۸ء کو ساحر عباسی نے داعی اجل کو لبیک کہا- ساحرؔ عباسی کی وفات کے بعد سنہ ۱۹۷۸ء میں ان کا کلام "ابرِ صحرا" کے عنوان سے رئیس امروہوی کی نگرانی میں شائع ہوا- ساحرؔ کا کلام ملاحظہ کیجیے ۔

ابھی جان و دل کے قریب تھے، ابھی جان و دل سے گزر گئے
نگہِ طلب پہ نہ کھل سکا وہ کدھر سے آئے کدھر گئے

نہ جنونِ شوق بہل سکا جو شریکِ اہلِ جنوں ہوئے
نہ ملا فروغِ نظر کبھی جو قریبِ اہلِ نظر گئے

ہو ترا ارادۂ زندگی ازل و ابد سے بلند تر
یہ حیات کوئی حیات ہے ابھی جی اُٹھے ابھی مر گئے

تری آرزو کی یہ برکتیں تری انجمن کی یہ رونقیں
جو اُٹھے وہ آہ بلب اُٹھے جو گئے بہ دیدۂ تر گئے

وہ کمالِ عالمِ بے خودی، وہ جنوں کی جذبہ طرازیاں
وہ نگاہ کیسی نگاہ تھی جو بگڑ گئے تھے سنور گئے

یہ نسیمِ صبح کی شوخیاں کہ بہار کی ہیں شرارتیں
جو چُنے تھے تم نے مرے لیے وہ تمام پھول بکھر گئے

☆☆

کس طرح کہیں ہم برق تمہیں کیونکر یہ کہیں سیماب ہیں ہم
مضطر ہو مگر خاموش ہو تم ساکن ہیں مگر بے تاب ہیں ہم

دہرائیں کہانی کیا اپنی سمجھا نہ سمجھ سکتا ہے کوئی
تعبیر نہیں ملتی جس کی وہ ایک پریشاں خواب ہیں ہم

دل ڈوب رہا ہے رہ رہ کر عالم ہے عجب کچھ شام وسحر
محسوس یہ ہوتا ہے اکثر جیسے کہ تہہِ گرداب ہیں ہم

آغاز جنونِ الفت میں خود ہم نے جسے دُہرایا تھا
ساحرؔ اُسی رنگیں قصّے کا غمناک سا اب اک باب ہیں ہم

نہ کسی کا جذبۂ شوق ہوں نہ کسی کا جلوۂ ناز ہوں
جو کبھی سمجھ میں نہ آسکا میں وہ راز تھا میں وہ راز ہوں
مجھے بیکسی کا الم نہیں بخدا اُمیدِ کرم نہیں!!
جہاں کوئی محرمِ غم نہیں میں وہاں بھی وقفِ گداز ہوں
مری زندگی ہمہ آرزو میری آرزو ہمہ رنگ و بو!
کبھی حُسن ہوں کبھی عشق ہوں کبھی سوز ہوں کبھی ساز ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ دلرُبا میں نہیں ہوں نالۂ مبتلا
مجھے کیا سُنے گا کوئی بھلا! کہ نوائے پردۂ راز ہوں
جو ہے سحرِ عشق کا مدّعی میں وہی ہوں ساحرؔ زندگی
کبھی محوِ عالم غزنوی کبھی وقفِ حسنِ ایاز ہوں

---••☆••---

ساقیؔ امروہوی

اصل نام قائم رضا، تخلص ساقیؔ اور ساقیؔ امروہوی قلمی نام ہے- ۱۹۲۵ء میں امروہہ کے سادات خاندان میں پیدا ہوئے- ان کے والد سید علی قاسم اور دادا سید علی اسلم جاگیردار تھے- ساقیؔ کے والدین کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا مقام حاصل کرے- جب وہ پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئے تو ابتدائی تعلیم کے لیے انہیں ایک مکتب میں داخل کیا گیا- ساقیؔ امروہوی اپنے والد کی اولاد میں سب سے بڑے اور لاڈلے فرزند تھے- والدین کے لاڈ پیار نے انہیں لاابالی اور خودسر بنا دیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ کر اکھاڑوں میں کشتی لڑنے اور مشاعروں میں جانے کا شوق پیدا ہو گیا- اپنی پہلوانی کے زعم میں دنگے فساد کرنا' بے وجہ جھگڑے مول لینا اور فطری صلاحیت کی بنیاد پر اشعار میں فنی نقائص کی نشان دہی کرنا ان کا بہترین مشغلہ بن گیا- امروہہ ایک شعروادب کی بستی ہے جہاں ذوقِ سخن کی طرف مائل ہونا تقاضائے فطری تھا- ساقیؔ امروہوی کی آوارہ مزاجی پر ان کا اپنا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

میری آوارہ مزاجی پہ شباب آنے دو　　لغزشوں کو بھی مری پیار کرے گی دنیا

تقسیم ہند کے کے بعد ساقیؔ امروہوی ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل رہائش اختیار کی- یہاں آکر ذریعہ معاش کی تلاش میں سرگرداں رہے- تعلیم نہ ہونے کے سبب کوئی ملازمت وغیرہ تو ملی نہیں- البتہ کچھ دن میونسپل کارپوریشن میں ملازم رہے- پھر پان بیچنے لگے- ایک دن رئیس امروہوی نے ان سے معلوم کیا: کیا کر رہے ہو آجکل؟...... ساقیؔ نے اپنے یہ شعر پڑھ کر جواب دیا:

شہرِ ہنر میں الگ الگ ہے دونوں کی پہچان　　تم نے اپنا فن بیچا ہے میں نے اپنے پان

جیتے جی تو کرنا ہوگا جینے کا سامان　　دنیا والو! تم ہی بتاؤ فن بیچوں یا پان

بہرحال نامساعد حالات کے باوجود ساقیؔ امروہوی اپنے ذریعہ معاش کے لیے ہمیشہ حق حلال کی

روزی کو ترجیح دیتے رہے۔

ساقیؔ امروہوی نے شاعری تو بچپن ہی سے شروع کر دی تھی لیکن باقاعدہ اصلاح پاکستان میں کہنہ مشق شاعر میر آجواد علی سے لی۔ان ہی کو وہ اپنا استاد کہتے ہیں۔ذیل میں ان کے کلام سے لیے گئے کچھ منتخب اشعار درج ہیں ملاحظہ ہوں۔

خیال راہبر بھی اب تو دل پر بار ہوتا ہے
یہ کس منزل پہ لے آئیں مجھے گمراہیاں میری

در بہ در سائے کی تلاش میں ہم
دھوپ سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں

اس پیڑ کے سائے میں سکوں کس کو ملے گا
جس پیڑ پہ چڑیوں کے بسیرے نہیں ہوتے

یہی پہچان ہے میری کہ ساقیؔ
یہ دُنیا مجھ کو پہچانی نہیں ہے

کیسے قفس میں گزرے مہ و سال کیا کہیں
کیا کیا تھی آرزوے پر و بال کیا کہیں

ساقیؔ وفا زمانے میں ناپید ہوگئی
ایسا کبھی پڑا تو نہ تھا کال کیا کہیں

میں اب تک دن کے ہنگاموں میں گم تھا
مگر اب شام ہوتی جارہی ہے

کم اپنے مقدر کا اندھیرا نہیں ہوتا
سورج تو نکلتا ہے سویرا نہیں ہوتا

خوشی کا ایکِ وہ لمحہ جو زندگی میں نہیں
یہی تو غم ہے وہ لمحہ کسی خوشی میں نہیں

آنکھیں بجھی بجھی ہیں دلوں میں ملال ہے
ہر چہرہ میرے شہر میں خود اک سوال ہے

اس عہدِ شعور میں ساقیؔ ہمارا فن
بانٹا گیا ہے لوٹے ہوئے مال کی طرح

خود میں سمٹوں تو ایک نقطہ ہوں
پھیل جاؤں تو اک جہان ہوں میں

ایک لمحے کی مسرت کے لیے کیا نہ کیا
زندگی بیت گئی ہے مری تدبیروں میں

میں اُن منزلوں سے بھی گزرا ہوں اکثر
جہاں قافلے آکے گم ہوگئے ہیں

--••☆••--

سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر سید

یوپی (بھارت) کے ضلع اعظم گڑھ، تحصیل پھول پور میں ایک گاؤں چمن پور تھا جو بعد میں بگڑ کر ''چمانواں'' کہلاتا ہے۔ روایت ہے کہ مغلوں کے زمانے میں سادات کا ایک قبیلہ ایران اور بلوچستان کے راستے اس علاقے میں داخل ہوا۔ مغل حکمرانوں نے اس خاندان کو یہ علاقہ رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ اسی گاؤں چمانوں میں ۱۴را کتوبر سنہ ۱۹۲۸ء کو سید سجاد باقر رضوی پیدا ہوئے۔ سجاد باقر رضوی کے پردادا کا نام میر سعادت علی ،دادا کا نام سید محمد باقر اور والد کا نام سید علی سجاد تھا۔ سجاد باقر رضوی کے والد سید علی سجاد گاؤں کے پہلے آدمی تھے جنہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کا اصل نام سید اولاد باقر تھا جو میٹرک کے امتحان کے لیے عمر کی مشکلات کے سبب بدل کا سید سجاد باقر رکھ لیا تھا۔ سجاد صاحب نے جس گاؤں میں آنکھ کھولی وہاں فنون سے دلچسپی رکھنے والا ایک ماحول تھا۔ لوگ رات کو اکھٹے ہوتے اور شعروشاعری کی محفل جمتی۔ وضع داری اور شائستگی اس ماحول کا ایک حصہ تھی بچپن کے کے مشاغل اور گاؤں کے اس ماحول نے سجاد صاحب کے لیے مہمیز کا کام کیا۔

تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے سجاد باقر اپنی خالہ کے ساتھ الہ آباد چلے گئے جہاں ابتدائی تعلیم ایک میونسپل اسکول میں حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان یوپی بورڈ سے پرائیوٹ امیدوار کے طور پر پاس کیا۔ جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے اِس دوران انہوں نے ملازمت بھی اختیار کی۔ اس لیے وہ باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی نہ دے سکے۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی یوپی بورڈ سے پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔ ۳را کتوبر سنہ ۴۷ء کو وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ۱۹۴۹ء میں انہوں نے سندھ مسلم لاء کالج سے ایل ایل بی کیا اور پھر سی ایس ایس کے امتحان میں شامل ہوئے۔ سول سروس کے تحریری امتحان میں کامیابی کے بعد انٹرویو کے مرحلے میں سجاد باقر کامیاب نہ ہو سکے، لیکن تحریری امتحان میں کامیابی ان کے لیے تقویت کا باعث رہی۔ ایل ایل بی کے بعد جب سجاد صاحب اے جی آفس کراچی میں کام کر رہے تھے تو

وہاں جمال الدین نقوی کے مشورہ پر کراچی یونیورسٹی سے بی اے آنرز کیا-اس دوران وہ اسلامیہ کالج کراچی کی اہم نصابی سرگرمیوں میں بھی سرگرم رہے-سنہ ۵۳-۱۹۵۲ء میں وہ کالج میگزین کے انگریزی حصے کے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی لٹریری سوسائٹی کے جائنٹ سیکریٹری بھی رہے-بی-اے آنرز کے بعد انہوں نے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا-سنہ ۱۹۸۵ء میں سجاد باقر رضوی نے کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی (اردو) کی ڈگری بھی حاصل کی-ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان یہ تھا:

''طنز ومزاح کے نظریاتی مباحث اور کلاسیکی اردو شاعری ۱۸۵۷ء تک''

سجاد باقر رضوی کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز پاکستان آنے کے بعد ہوا-جب وہ سندھ مسلم لاء کالج کراچی میں طالب علم تھے-ان کے ایک خالہ زاد بھائی سجاد حیدر نے ان کی ملاقات مجتبی حسین سے کروائی-یہی ملاقات سجاد باقر رضوی کی ادب سے وابستگی کا آغاز تھی-سجاد باقر رضوی کے فن میں تنقید اور شاعری کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری کو بھی قابل ذکر حیثیت حاصل ہے-ان کے تراجم کی ایک معقول تعداد ہے-

سجاد باقر رضوی دمہ کے پرانے مریض تھے-بسا اوقات ان کا سانس لینا ناممکن ہو جاتا تو مصنوعی آکسیجن استعمال کی جاتی تھی-آہستہ آہستہ بیماری کی نوعیت شدید ہوگئی-بالآخر ۱۳راگست سنہ ۱۹۹۲ء کو ان کا انتقال ہوگیا اور لاہور کے ماڈل ٹاؤن جی بلاک کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا-ان کے کلام کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ملاحظہ کیجیے۔

میں وہ ٹوٹا آئینہ ہوں آپ اپنے سامنے
جس میں ہول آتا ہے خود اپنی ہی صورت سے مجھے

باقر تجھے راہِ دل میں کس نے لوٹا　　دامانِ خیالِ یار کیسے چھوٹا
دے ڈھیل کہ آس کا ہے رشتہ نازک　　کھینچا تو جانِ من یہ دھاگا ٹوٹا

--••☆••--

سخاوت مرزا

ان کا پورا نام محمد سخاوت مرزا ہے۔ سنہ ۱۸۹۸ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد کا تعلق آگرہ کے ادبی گھرانے سے تھا۔ یہ لوگ چغتہ (مغل) اور سپاہی پیشہ تھے۔ سخاوت مرزا کے دادا مرزا امیر بیگ کی شادی مولوی احمد خان شیفتہ (شاگرد نظیر و اسیر) کی بھانجی سے ہوئی تھی۔ شیفتہ جب حیدرآباد دکن گئے تو ان کے ساتھ مرزا احمد بیگ بھی چلے گئے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے جن میں بڑے محمد آغا مرزا تھے جن کی اولاد میں سخاوت مرزا تھے۔

سخاوت مرزا کی تعلیم کا آغاز قرآن پاک سے اپنے والد کے زیرِسایہ ہوا۔ اس کے بعد چادر گھاٹ اسکول سے آٹھویں کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے امتحان سے پہلے وہ سخت بیمار ہو گئے جس کے سبب تعلیم منقطع کرنی پڑی۔ تھوڑے دنوں بعد نظامت کوتوالی اضلاع میں ملازمت مل گئی۔ حالات سازگار ہوتے ہی انہوں نے اپنی تعلیم کو پرائیویٹ طور پر دوبارہ جاری کیا۔ مروجہ طریقے کے مطابق بقدرِ نصاب عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے اور ۱۹۲۹ء میں ایل ایل بی کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ریاست میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ پہلے اضلاع پولیس حیدرآباد میں ملازم ہوئے۔ مدتوں محکمۂ جیل خانہ جات، دفتر ہوم سکتر اور عدالتِ عالیہ میں کام کرتے رہے۔ انتیس سال ملازمت کے بعد عدالتِ ضلع وسشن جج سے قبل ازوقت ۱۹۵۱ء میں پنشن لے لی۔

حیدرآباد دکن میں جب دکنی ادب کی بازیافت کی تحریک شروع ہوئی تو مرزا صاحب بھی اس میں دلچسپی لینے لگے۔ چنانچہ ان کا پہلا مضمون (شاہ کمال الدین بخاری) انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے "اُردو" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ مسلسل دکنی ادب کی مشہور و معروف شخصیتوں پر لکھتے رہے۔ مرزا صاحب کے بہت سے تعارفی اور تحقیقی مقالے "اُردو" (اورنگ آباد، دہلی اور بعد ازاں کراچی)، معارف (اعظم گڑھ)، نوائے ادب (ممبئی)، اُردو ادب (علی گڑھ)، قومی زبان (کراچی)، ماہ نو (کراچی)، برہان (دہلی)، اورنٹیل کالج میگزین (لاہور) وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سخاوت صاحب کئی مرتبہ کراچی آئے اور پھر مستقل کراچی آ گئے- یہاں آ کر وہ کچھ دنوں انجمن ترقی اُردو (کراچی) سے منسلک رہے اور پھر ترقی اُردو بورڈ (کراچی) میں ملازم ہو گئے- عمر کی پابندی کی وجہ سے وہ بورڈ سے ریٹائر ہو گئے- مرزا صاحب کے علمی روابط پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ایجوکیشنل کانفرنس، اقبال اکیڈمی اور دوسرے اداروں سے بھی تھے- مرزا صاحب نے مرحوم بشیر احمد ڈار (ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی) کی فرمائش پر مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کی بعض تحریروں کا ترجمہ اقبال اکیڈمی کے لیے کیا- ان میں سے بعض چیزیں اقبال ریویو (کراچی) میں بھی شائع ہوئی تھیں- مرزا صاحب نے متعدد مقالے دائرۃ المعارف اسلامیہ (لاہور) کے لیے بھی لکھے ہیں- سخاوت مرزا کے مندرجہ ذیل علمی کام ان کی یادگار ہیں:

(۱) مثنوی من لگن (شیخ محمود بحری)

(۲) تذکرۂ مخدوم جہانیاں جہاں گشت

(۳) مخزنِ اسرارِ حقیقت (یعنی مختصر حالات وملفوظات حضرت شاہ کمال الدین حیدرآبادی)

(۴) مکتوبات ابوالعلا اکبرآبادی- (نقشبندی سلسلے کے مشہور بزرگ کے مکتوبات مرتب کیے)

(۵) معراج العاشقین (دکنی اردو کی یہ قدیم کتاب حضرت بندہ نواز گیسودراز کی طرف منسوب ہے، انہوں نے اس کتاب کو مروجہ اُردو میں منتقل کیا)

سخاوت مرزا کے مقالات کی خاصی بڑی تعداد مختلف پرچوں میں منتشر پڑی ہے- ان کے چھوٹے بڑے تمام مضامین شائع کیے جائیں تو کئی مجلدات میں ہوں گے- آخری عمر میں انہیں مالی اور کچھ خانگی پریشانیاں بہت اٹھانا پڑیں- ۲۲ رجنوری ۱۹۷۷ء کو ان ہی پریشانیوں میں ملک عدم کو رخصت ہو گئے-

--••☆••--

سعید احمد، ڈاکٹر

ڈاکٹر صاحب کا نام سعید احمد، تخلص سعید اور قلمی نام سعید احمد ہے۔ ۱۳ راگست ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین نے تقسیم ہند سے قبل ہی سلطان پور (ہندوستان) سے ہجرت کر کے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹر سعید احمد نے گورنمنٹ سیکنڈری اسکول صدر کراچی سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ بعد ازاں ڈی۔ جے۔ گورنمنٹ سائنس کالج کراچی میں داخلہ لیا اور اسی کالج سے انٹر سائنس اور بی ایس سی کی تعلیم حاصل کی۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں بی ایس سی کی ڈگری کے حصول کے بعد انہوں نے جامعہ کراچی سے سنہ ۱۹۷۸ء میں معاشیات میں ایم اے کیا۔ ایس ایم لا کالج کراچی میں طالب علم کی حیثیت سے ایل ایل بی کی ڈگری ۱۹۷۷ء میں حاصل کی۔ فیڈرل گورنمنٹ اُردو کالج کراچی میں تعلیم حاصل کر کے ایل ایل ایم کا امتحان ۱۹۸۰ء میں پاس کیا اور جامعہ کراچی سے قانون میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ۲۰۰۳ء میں حاصل کی۔

سعید احمد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پاکستان کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے قانون میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۱۹۸۸ء میں سعید احمد پبلک سروس کمیشن کے تحت اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں شریک ہوئے۔ کامیابی کے بعد محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ محکمہ جاتی ترقی کی بنیاد پر آج کل ڈائریکٹر ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سعید احمد کی ادبی صلاحیتیں زمانہ طالب علمی میں ہی اُجاگر ہو گئیں تھیں۔ ڈی۔ جے۔ سائنس کالج کراچی کے سالانہ مجلّہ کے مدیر رہے۔ اپنے سابقہ وطن کے رشتے سے دورانِ طالب علمی انہوں نے بین الکلیاتی مشاعروں میں سعید سلطان پوری کے نام سے شرکت کی اور انعامات حاصل کیے۔

سعید کے مجموعۂ کلام ''لمحوں کا قرض'' کے کچھ منتخب اشعار ذیل میں درج ہیں، ملاحظہ ہوں۔

گھر سے نکلا تھا کسی کو ڈھونڈنے　　اور خود گم ہو گیا ہوں دوستو

میں بھی سقراطِ وقت ہوں شاید
زہر لگتا ہوں اس زمانے کو!

اس کو بھولے ہوئے مدت گزری
دل کے سب زخم ہیں بھرنے والے

کوئی واقف ہی نہیں سوزِ دروں سے میرے
یوں تو اس شہر میں سب سے ہی شناسائی ہے

حیرت ہے کہ اس شخص کو میں ڈھونڈ رہا ہوں
جس شخص کو اب تک کبھی دیکھا ہی نہیں ہے

روح کے بند دریچوں سے بھی جھانکا تو سعید
اپنے زخموں کا ترے گھر میں چراغاں سمجھا

بہت دنوں سے مرے گھر کے پاس رہتا ہے
وہ ایک شخص کہ اکثر اداس رہتا ہے

رونقیں کیا کیا تھیں بازاروں کے بیچ
چپ کھڑے تھے ہم خریداروں کے بیچ

اب خیال و خواب ہوکر رہ گئے
دن گزرے تھے کبھی یاروں کے بیچ

جو سلگتے ہیں کسی کی یاد میں
رقص کرتے ہیں وہ انگاروں کے بیچ

ڈاکٹر سعید احمد نے غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

جس سے ملتے ہیں نئے زخم ہی ملتے ہیں
آج بھی گھر کے در و بام اکیلے ہیں
کاش کوئی تو یہ قدرت رکھے
میرے خوابوں کو مقفل کردے
ورنہ مجھ سے یہ بصیرت لے لے

--••☆••--

سلطان جمیل نسیم

سلطان جمیل نسیم ۱۴/اگست ۱۹۳۵ء کو آگرہ (یوپی) بھارت میں پیدا ہوئے- سلطان جمیل آگرہ کے معروف ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں- ان کے والد صبا اکبر آبادی برصغیر کے نامور شاعر تھے جن کی دنیائے ادب میں بڑی خدمات ہیں- مشہور صوفی بزرگ اور معروف روحانی پیشوا حضرت خواجہ بہاالدین نقشبندی ان کے جد اعلیٰ ہیں- والد کے نقشِ قدم پر چل کر سلطان جمیل نے بھی بڑا نام پیدا کیا ہے- حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ انہیں ورثہ ملا ہے-

ابتدائی تعلیم کے بعد سلطان جمیل کو سینٹ جونس ہائی اسکول آگرہ میں داخل کرایا جہاں انہوں نے پانچویں کلاس تک تعلیم حاصل کی- تقسیم کے بعد وہ اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آگئے اور کراچی میں مقیم ہوئے- یہاں آنے کے بعد ایک سال تک سندھ مدرستہ الاسلام میں تعلیم حاصل کی اور پھر حیدرآباد چلے گئے جہاں ان کے والدین کی مستقل رہائش تھی- وہاں چند ماہ بوناونچر اسکول میں پڑھنے کے بعد غلام حسین ہدایت اللہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے- ۱۹۵۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا- میٹرک کرنے کے بعد والد صاحب نے ایس ایم کالج کراچی میں داخل کرادیا- دوران تعلیم انہوں نے محکمۂ ٹیلی فون میں ملازمت اختیار کرلی- لیکن ان کی تعیناتی حیدرآباد میں ہوئی- اس طرح ان کی تعلیم کا سلسلہ کئی برس منقطع رہا- محکمۂ ٹیلی فون کے بعد انہوں نے سیٹلمنٹ ڈیپارٹمنٹ اور پی ڈبلیوڈی میں بھی ملازمت کی- ان ملازمتوں کے دوران انہوں نے سچل سرمست کالج سے فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کیا- سنہ ۱۹۶۰ء میں وہ یونائیٹڈ بینک سے منسلک ہوگئے- بینک میں آنے کے بعد چھوٹے بڑے مختلف شہروں کی برانچوں میں ان کا تبادلہ ہوتا رہا- کراچی کی ملازمت کے دوران ۱۹۷۴ء میں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے بی اے اور ۱۹۸۰ء میں ایم اے پاس کیا- عمر کی پابندی کی وجہ سے ۱۹۹۵ء میں ریٹائر ہوئے-

سلطان جمیل نسیم نے اپنے والد کی رہنمائی میں پندرہ سال کی عمر سے ہی لکھنا لکھانا شروع کردیا تھا-

دراصل افسانہ نگاری کا ذوق انہیں دورانِ طالب علمی ہی سے پیدا ہو گیا تھا-۱۹۵۳ء میں ان کا پہلا افسانہ شایع ہوا- آہستہ آہستہ ان کی افسان نگاری نکھرتی چلی گئی -سلطان جمیل نے اب تک دوسو (۲۰۰) سے زائد افسانے لکھے ہیں-افسانہ نگاری کے علاوہ سلطان جمیل ایک مشاق ڈرامہ نگار بھی ہیں-حیدرآباد کے قیام کے دوران ۱۹۵۵ء میں انہوں نے ڈرامہ نگاری کا بھی آغاز کر دیا تھا-ریڈیو پاکستان حیدرآباد اور کراچی کے لیے پچاس سے زائد ڈرامے لکھے جو نشر ہوئے اور بڑے مقبول ہوئے- ان ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''جنگ زمین خوشبو'' کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے-

سلطان صاحب ۱۹۵۵ء سے اب تک ریڈیو کے صدہا ڈراموں میں صداکار بھی رہے-ان کے صداکار ساتھیوں میں فلم ایکٹر محمد علی، حمایت علی شاعر، ارشاد علی اور فلم ایکٹر مصطفیٰ قریشی کے نام شامل ہیں-سلطان صاحب نے ریڈیو پاکستان کراچی سے ۱۹۹۵ء میں ایک ہفت روزہ ڈرامائی فیچر ''حامد منزل'' لکھنے کا آغاز کیا اور جون ۲۰۰۱ء تک تقریباً ساڑھے تین سو قسطیں لکھیں-انہوں نے بچوں کے لیے بھی بہت سی کہانیاں اور ناول بھی لکھا جو شایع ہو چکے ہیں

ان کے افسانوں کے مندرجہ ذیل چار مجموعے شایع ہو چکے ہیں-

(۱) ''کھویا ہوا آدمی'' (۲۶ افسانے ۱۹۸۵ء)

(۲) ''سایہ سایہ دھوپ'' (۲۱ افسانے ۱۹۸۹ء)

(۳) ''ایک شام کا قصہ'' (۲۱ افسانے ۲۰۰۰ء)

(۴) ''میں آئینہ ہوں'' (۱۷ افسانے ۲۰۰۲ء)

آج وہ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں-ان کے افسانوں میں خاص بات یہ ہے کہ شروع سے آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے-

---••☆••---

سلطانہ مہر

اصل نام فاطمہ اور قلمی نام سلطانہ مہر ہے۔ان کا آبائی وطن سواشٹر ہے لیکن ان کی پیدائش ممبئی میں ہوئی۔ سلطانہ مہر کا تعلق ہالائی میمن برادری سے ہے جن کی مادری زبان میمن اور کاروباری زبان گجراتی ہے۔کراچی یونیورسٹی سے صحافت میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔

یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ مادری زبان میمن ہوتے ہوئے اُردو ادب میں جو شہرت سلطانہ مہر نے حاصل کی ہے اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بچپن ہی سے اُردو زبان سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ابتدا میں انہوں نے گیت اور بچوں کی چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھیں جو ممبئی کے رسالوں اور اخبارات میں چھپتی تھیں۔اس کے بعد انہوں نے غزلیں بھی کہیں لیکن ان کا اصل میدان صحافت' افسانہ نگاری اور تذکرہ نگاری ہے۔انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں۔سلطانہ مہر نے صحافیانہ زندگی کا آغاز روزنامہ ''ہندوستان'' ممبئی سے کیا جس کے صفحہ خواتین کی ادارت یہی کرتی تھیں۔

۱۹۵۹ء کے وسط میں فاطمہ پاکستان آ گئیں۔یہاں آ کر ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۶ء تک انہوں نے روزنامہ ''انجام'' میں کام کیا پھر ۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۹ء وہ روزنامہ ''جنگ'' سے منسلک رہیں۔اس کے بعد ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۰ء تک انہوں نے ماہنامہ ''روپ'' کراچی میں بحیثیت مدیرہ اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد وہ امریکہ چلی گئیں۔لیکن دیارِ غیر میں رہ کر بھی آج وہ جس طرح اُردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں وہ قابلِ تحسین ہے۔سلطانہ مہر کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ملک کے معروف دانشور جناب ضمیر جعفری نے انہیں ''عورتوں کی شبلی نعمانی'' کے خطاب سے نوازا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''سلطانہ مہر اُردو کی جانی مانی ناول نگار۔کہانی کار اور صحافی ہیں۔''سخن ور'' کے عنوان سے ان کے قلم سے اب تک زندہ شعراء کے دو تذکرے کتابی صورت میں سامنے آ چکے ہیں اور دونوں کتابیں قلم کاری اور جان کاری کا جرأت انگیز کارنامہ ہیں۔سلطانہ مہر نے یہ وسیع خرمن

دانہ دانہ کر کے اتنے عرصے میں جمع کیا ہے کہ اب یہ زندہ شعراء بھی مرنے لگے ہیں-سلطانہ نے مراسلت میں ہی سوڈیڑھ سو میل کاغذ یقیناً لکھا ہوگا مگر وہ تو ذاتی رابطوں کیلئے لمبے لمبے سفر بھی کرتی رہے- مجھے یاد ہے کہ محض اسی مقصد سے وہ ایک مرتبہ اسلام آباد بھی آئی تھیں- مجھے تو ان کی لگن' تلاش' لیاقت' تیاگ اور پسیہ سے یوں لگتا ہے جیسے اس بی بی نے ''ہانڈی روٹی'' کو قرطاس وقلم پر قربان کر رکھا ہے-اس حوالے سے سلطانہ مہر کو اگر چھوٹے پیانے پر ''عورتوں کی شبلی نعمانی'' کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا-''

سلطانہ مہر کی جو تصانیف اب تک چھپ چکی ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

تصانیف: ''داغ''۱۹۶۲ء

''تاجور'''(ناول ۱۹۶۶ء)

''ایک کرن اجالے کی''(ناول ۱۹۶۹ء)

''جب بسنت رت آئی''(ناول ۱۹۷۲ء)

''آج کی شاعرات''((تذکرہ،۱۹۷۳ء)

''بندسیپیاں''(افسانے ۱۹۷۶ء)

''اقبال دورجدید کی آواز''(۱۹۷۷ء)

''سخن ور''حصہ اول(تذکرہ شعرا،۱۹۷۹ء)

''دھوپ اور سائبان(افسانے ۱۹۸۰)

''دل کی آبروریزی''(افسانے ۱۹۸۸ء)

'''ساحر کا فن اور شخصیت''(تالیف ۱۹۸۹ء)

''سخن ور''حصہ دوم(بیرون پاکستان بسنے والے شعراوشاعرات کا تذکرہ ۱۹۹۶ء)

سخن ور حصہ دوم(پاکستانی شعراء شاعرات کا تذکرہ ۱۹۹۸ء)

''گفتنی''نثر نگاروں کا تذکرہ زیرِطبع

---••☆••---

سلمیٰ زمن

اصل نام اُمِ سلمیٰ اور قلمی نام سلمیٰ زمن ہے۔سنہ ۱۹۲۷ء کو فیض آباد (یوپی) کے معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ سلمیٰ زمن کے دو بھائی میجر رفیع احمد اور انیس پاکستان ملٹری میں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان کے والد فیاض علی پاکستان کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل تھے جنہیں ادب سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ان کی تصانیف میں دو ناول ''انور'' اور ''شمیم'' کے نام سے شائع ہوئے۔سلمیٰ زمن کے شوہر مختار زمن برصغیر کے مشہور و معروف طنز و مزاح نگار اور نامور صحافی تھے۔انہوں نے مختلف سرکاری عہدوں پر کام کرنے کے علاوہ اے پی پی میں بحیثیت ڈائریکٹر جنرل بھی خدمات انجام دی ہیں۔مختار زمن کا تذکرہ ''دبستانوں کا دبستان'' جلد اول میں کیا جا چکا ہے۔

سلمیٰ زمن کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔اس کے بعد اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی۔انہوں آئی ٹی کالج سے اول درجے میں بی اے کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔تقسیم ہند کے بعد اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آئیں۔ پہلے ان کا خاندان مشرقی پاکستان آیا اور وہیں مقیم ہوا۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سلمیٰ زمن نے درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔مشرقی پاکستان میں ہی مختار زمن صاحب سے ان کی شادی ہوگئی اور ۱۹۵۳ء میں اپنے شوہر کے ساتھ کراچی آئیں۔

۱۹۷۲ء میں انہوں نے لندن سے ایم فل کا امتحان بھی پاس کیا۔سلمیٰ زمن نے کراچی آ کر بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ پہلے انہوں نے اسلامیہ کالج میں پڑھایا اور پھر سرسید کالج میں تعلیم دیتی رہیں۔ترقی کرتے ہوئے وہ پہلے سرسید کالج ناظم آباد کی وائس پرنسپل اور پھر پرنسپل مقرر ہوئیں اور مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد یہیں سے سنہ ۱۹۸۵ء میں ریٹائر ہوئیں۔ بحیثیت استاد انہوں نے بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

سلمیٰ زمن کو ادبی کتابیں اور رسالے پڑھنے کا شوق ہمیشہ سے رہا ہے۔کتابیں پڑھنا ان کا مشغلہ رہا ہے۔انہوں نے مختلف نوعیت کے بہت سے مضامین بھی لکھے جو مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپتے

رہے ہیں-۱۹۸۱ء میں سلمٰی زمن نے ایک کتاب "Banners of Unfurled" کے عنوان سے لکھی جو پاکستان میں تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں ہے-اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہوا-

سلمٰی زمن نے بچوں کے ادب پر بھی بہت کام کیا ہے-انہوں نے بچوں کے لیے متعدد چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں جن میں "پاکستان کی کہانی"، "قرآنی قصے" اور "مزے مزے کی کہانیاں" کے عنوان سے شامل ہیں-سلمٰی زمن کی دو بیٹیاں ہیں سیما جلیل اور آسمہ فاروقی - سیما جلیل این ای ڈی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور آسمہ فاروقی ڈاکٹر ہیں جو آج کل لندن میں مقیم ہیں-

--••☆••--

سلیم الزماں صدیقی

عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ایک سائنسداں، ایک اچھے استاد، ایک اچھے مصور، ایک اچھے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۹ راکتوبر ۱۸۹۷ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد زمان خان ایک زمیندار اور حکومت میں تحصیلدار تھے۔ خاندان کے سارے افراد کو ذوقِ سخن سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ان سب بہن بھائیوں کی پرورش ان کے بڑے بھائی جناب خلیق الزماں صاحب نے کی۔ قرآن کریم ناظرہ ختم کرنے کے بعد ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ گلستاں و بوستاں پڑھنے کے بعد نویں، دسویں برس میں انگریزی پڑھنی شروع کی۔ تعلیم کے لیے پانچویں درجے میں حضرت گنج ہائی اسکول لکھنؤ میں داخل ہوئے اور وہیں سے سنہ ۱۹۱۴ء میں میٹرک پاس کیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے بی۔اے کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب جرمنی چلے گئے اور وہاں سے سنہ ۱۹۲۹ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی سند لے کر واپس آئے تو حکیم اجمل خاں کی معیت میں ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہلی کی بنیاد ڈالی اور جڑی بوٹیوں سے متعلق طب کے شعبے میں غیر معمولی تحقیقی کارنامے انجام دیے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ نے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو نیشنل کیمیکل لیبورٹریز آف انڈیا کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔

خود انہوں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے یا لکھا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان مرحوم نے ان کو خاص طور پر پاکستان بلایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ''ایک دن بھارتی وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے بلایا۔ میں جب پرائم منسٹر سے ملا تو انہوں نے مجھے لیاقت علی خان کا خط دکھایا اور کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں پاکستان میں سائنٹیفک ریسرچ کونسل کی بنیاد رکھی جائے۔'' ان دنوں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی انڈین کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائریکٹر تھے۔ اس موقع پر وزیر اعظم سے پوچھا 'وہ کیا چاہتے ہیں؟'' نہرو نے جواب دیا ''آپ

لوگوں نے ایک ملک بنایا ہے وہاں جائیں اور دیکھیں پھر آپ کو کچھ صحیح فیصلے پر پہنچنے میں آسانی ہوگی-''
ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ پاکستان کو ان کی ضرورت ہے اس لیے وہ پاکستان چلے آئے-

پاکستان آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ پاکستان کی تعمیر میں لگ گئے اور اس کے چیئرمین مقرر ہوئے- پاکستان نیشنل کونسل کا قیام ان کے ہاتھوں عمل میں آیا- ڈاکٹر صاحب ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری جامعہ کراچی کے بانی بھی ہیں- ان کا قائم کردہ یہ ادارہ عالمی شہرت رکھتا ہے- اعلیٰ تحقیقی خدمات کے اعتراف میں وہ متعدد عالمی اعزازات سے نوازے گئے- قومی اور بین الاقوامی اکاڈمیوں نے بھی انہیں طلائی تمغے دیے- وہ قومی اور بین الاقوامی شہرت کے متعدد اداروں کے رکن اور فیلوز تھے- اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر وہ ساری دنیا میں پہچانے جاتے ہیں- حکومت پاکستان نے دوسرے اعزازات کے ساتھ ان کو تمغۂ پاکستان اور ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا-

علم کیمیا کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب فنونِ لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے- فارسی، اردو، جرمن اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقف تھے اور ان زبانوں کے ادب سے بڑے لطف اندوز ہوتے تھے- ان کا حافظہ بلا کا تیز تھا' اردو فارسی کے بے شمار شعر ان کو ازبر تھے- اردو فارسی کے جن شعراء سے انہیں خاص نسبت تھی اور جن کے بہت سے اشعار ان کو ازبر تھے ان میں مولانا روم' عرفیؔ' بیدل' غالبؔ' میر تقی میرؔ' سوداؔ اور بعض دوسرے شاعروں کے نام آتے ہیں- مولانا روم کے وہ خاص طور پر شیدائی تھے- وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور کبھی کبھی ایسی برجستگی سے کہتے تھے کہ سننے والا حیران ہو جائے- سلیم الزماں صاحب کی برجستگی پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب ''ادبیات وشخصیات میں لکھتے ہیں:

''اس وقت ان کی برجستہ گوئی کے صرف دو واقعات یاد آ رہے ہیں- پاکستانی ثقافت کا مسئلہ ہمارے ہاں اکثر زیر بحث رہتا ہے ان بحثوں کا تعلق کبھی عمومی ثقافت سے ہوتا ہے، کبھی قومی ثقافت سے اور کبھی علاقائی ثقافت سے- ہمارے مخدوم ومحترم اُردو فارسی کے ممتاز اسکالر پیر حسام الدین راشدی مرحوم کو آثار قدیمہ، قدیم ادب اور قدیم ثقافت سے خاص دلچسپی تھی- وہ اس مسئلے پر اپنی گفتگو کو کھینچ تان کر قدیم ادب اور ثقافت تک لے جاتے تھے- ایک محفل میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور پیر حسام الدین راشدی (مرحوم) دونوں موجود تھے- پیر حسام الدین راشدی صاحب قدیم ثقافت کی اہمیت پر باتیں کر رہے تھے- ڈاکٹر صدیقی

نے پیر صاحب کی باتیں سنتے سنتے فرمایا جی چاہتا ہے کہ فانی بدایونی کے اس شعر میں تھوڑا تصرف کرلوں

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا　　　　بات پہنچی تری جوانی تک

پیر صاحب نے کہا بہت خوبصورت شعر ہے ایسا نہ ہو کہ شعر خراب ہو جائے کہنے لگے نہیں ایسا نہ ہوگا۔ پھر شعر برجستہ یوں پڑھا:

ذکر جب چھڑ گیا ثقافت کا　　　　بات پہنچی موہنجوڈارو تک

محفل زعفران زار بن گئی۔ ڈاکٹر صدیقی، خدا انہیں بہت دن رکھے، چورانوے (۹۴) سال سے اوپر ہو چکے ہیں اور ابھی تک پوری مستعدی سے کھڑے کھڑے کئی گھنٹے کام کرتے ہیں، پھر بھی بعض حضرات کو ڈاکٹر صاحب سے شکایت رہتی ہے اور ان کے وجود کو اپنی تنگ دلی اور کوتاہ نظری کے سبب، جامعہ کراچی پر ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایسے لوگوں سے بے خبر نہیں ہیں۔ خوب جانتے ہیں کہ جو لوگ ان کے حضور میں ان کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں وہی اغیار بین کیسی کیسی برائیاں کرتے ہیں اور بد دعائیں دیتے ہیں۔ اس پس منظر میں جب انہوں نے اساتذۂ جامعہ کے ایک بڑے جلسے میں اپنی تقریر کے اختتام پر یہ شعر پڑھا:

دعائیں مانگیں ہیں اغیار میرے مرنے کی　　　　خدا جو چاہے تو میں ضد میں ان کی مر کے نہ دوں

کٹنے والے کٹ گئے اور عام سامعین، ڈاکٹر صاحب کی برجستگی پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

سائنسداں، محقق، شاعر اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب ایک اچھے مصوّر بھی تھے۔
۱۴ / اپریل سنہ ۱۹۹۴ء کو سلیم الزماں صدیقی دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

--••☆••--

سہیل بخاری، محمود نقوی، ڈاکٹر سید

نقاد، محقق، ماہرِ لسانیات سہیل بخاری ۶ ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو موضع سرائے شیخ ضلع مین پوری (یوپی) بھارت میں پیدا ہوئے- ان کا اصل نام سید محمود نقوی اور سہیل بخاری قلمی نام ہے- ان کا سلسلہ نسب دسویں پیڑھی میں سید محمد ہاشم (اتالیق اورنگ زیب عالمگیر، شہنشاہ مغلیہ)، انیسویں میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور تیسویں میں امام علی نقی علیہ السلام سے ملتا ہے-

سہیل بخاری نے ابتدائی تعلیم راجپوتانہ بھارت میں پائی- اس کے بعد اے وی ٹی سی- گورنمنٹ کالج آگرہ میں پڑھا اور ۱۹۳۹ء میں انہوں نے محکمہ تعلیم یوپی بھارت سے ملازمت کا آغاز کیا جہاں وہ ۱۹۵۲ء تک خدمات انجام دیتے رہے- دوران ملازمت انہوں نے اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھا- ۱۹۴۶ء میں انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی اے اور ۱۹۵۰ء میں ناگپور یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو) پاس کیا- اس کے بعد پاکستان آکر ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا-

یہاں آنے کے بعد سنہ ۱۹۵۳ء میں وہ پی اے ایف اسٹیشن اسکول، لاہور میں پرنسپل مقرر ہوئے- یہاں دو سال پڑھانے کے بعد سہیل بخاری ۱۹۵۵ء میں صدر شعبۂ اُردو، پی اے ایف کالج سرگودھا مقرر ہوئے- ۱۹۷۶ء میں وہ اردو لغت بورڈ، کراچی سے منسلک ہو گئے جہاں انہوں نے ۱۹۷۹ء تک خدمات انجام دیں-

سہیل بخاری زبان کے عالم بھی تھے اور زبان کے رمز شناس بھی تھے- انہوں نے اپنی مادری زبان اور پاکستان کی قومی زبان اُردو کا جس زاویے سے مطالعہ کیا ہے اور نتیجے اخذ کیے ہیں وہ اُردو زبان سے ان کی والہانہ محبت کا ثبوت فراہم کرتا ہے- اپنے لسانی مطالعے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب لکھنے بیٹھتے تو غیر ضروری عربی فارسی کے مشکل الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں- چنانچہ جب وہ زبان اُردو پر لسانی نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتے ہیں اور لسانی مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں تو اپنی کتابوں کے نام اس طور پر رکھتے ہیں:

اُردو کا روپ　اُردو کی کہانی　اُردو کے بول　اردو کا اشتقاقی لغت وغیرہ

یہاں (روپ، کہانی اور بول) کی جگہ عربی فارسی کے الفاظ بھی لکھ سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اس لیے نہیں کیا کہ وہ اُردو کو خالص مقامی زبان سمجھتے تھے۔ بعض دوسرے ماہرینِ زبان کی طرح یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اُردو زبان فارسی، عربی اور ہندی وغیرہ کے الفاظ سے مل کر وجود میں آئی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ زبانیں اس طرح وجود میں نہیں آتیں بلکہ اپنے معاشرے اور زمین کی کوک سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کے زاویۂ نظر سے اُردو پر بنیادی اثر نہ تو سنسکرت کا ہے نہ پالی کا ہے نہ قدیم پراکرتوں کا ہے بلکہ برصغیر کی قدیم ترین زبان دراوڑی کا ہے۔ گویا ان کے نزدیک اُردو کا اصل ماخذ دراوڑی ہے اور اسی لیے انہوں نے اپنی لسانی بحثوں میں اُردو کا تعلق دراوڑی سے ملانے کی کوشش کی ہے۔

ان لسانی بحثوں سے قطع نظر ڈاکٹر سہیل بخاری نے اُردو تحقیق و تنقید میں بھی یادگار تحریریں چھوڑی ہیں۔ ناول نگاری پر اور داستانوی ادب پر ان کی تنقیدیں اس معیار کی ہیں کہ تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ دو قدیم کتابوں "سب رس" اور "باغ و بہار" کا انہوں نے جس انداز سے تنقیدی مطالعہ کیا ہے وہ اچھوتا ہے اور علامہ اقبال پر بھی ان کی تنقیدی تحریریں دوسرے ادیبوں کے طرزِ تنقید سے مختلف ہیں۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے تحقیق و تنقید اور زبان و مسائل زبان کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ قابل قدر ہے اور اُردو ادب کی تاریخ میں زندہ رہنے والا کام ہے۔

اُردو زبان کے رمز شناس اور ایسی قابل قدر تحقیق کرنے والے ڈاکٹر سہیل بخاری ۲۹ رجنوری ۱۹۹۰ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ دنیائے اُردو ادب ان کی اعلیٰ خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ مندرجہ ذیل ان کی تصانیف ہیں:

(۱) ناول نگاری (تاریخ و تنقید) ۱۹۶۶ء　(۲) سب رس پر ایک نظر (تحقیق و تنقید) ۱۹۶۷ء
(۳) باغ و بہار پر ایک نظر (تنقید) ۱۹۷۰ء　(۴) غالب کے سات رنگ (تنقید) ۱۹۷۰ء
(۵) اُردو کا روپ (تشریحی لسانیات) ۱۹۷۱ء　(۶) اُردو کی کہانی (تاریخی لسانیات) ۱۹۷۵ء
(۷) اقبال مجددِ عصر (تنقید) ۱۹۷۸ء　(۸) اردو کا اشتقاقی لغت ۱۹۸۲ء

--••☆••--

سہیل غازی پوری

اصل نام سہیل احمد خاں، سہیل تخلص اور قلمی نام سہیل بخاری ہے۔ ۳۰ رجون ۱۹۳۴ء کو غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد طفیل احمد خاں Veterinary غازی پور کے معزز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ سہیل نے ابتدائی تعلیم کے بعد ڈی اے وی ہائی اسکول غازی پور سے میٹرک اور پھر انٹر کیا۔ اس کے بعد اعظم گڑھ میں شبلی نیشنل کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ تقسیم کے بعد سہیل پاکستان آئے اور ڈھاکہ میں مقیم ہوئے جہاں انہوں نے اے جی آفس سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ مشرقی پاکستان میں رہنے کے بعد وہ مغربی پاکستان آ گئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ یہاں آ کر ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے پاکستان کسٹمز میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی محکمہ میں ترقی کرتے ہوئے وہ پریونٹو آفیسر کی عہدے تک پہنچے اور ۱۹۹۴ء میں مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

سہیل غازی پوری کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۱ء سے ہوا۔ ابتدا میں شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے افسانے بھی لکھے جو معروف رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے تمام تر توجہ شاعری پر مرکوز کر دی اور شاعری ہی ان کی وجہ شہرت ہے۔ سہیل غازی پوری کا شمار کہنہ مشق شعراء میں ہوتا ہے۔ شاعری میں شرف تلمذ عبرتؔ الہ آبادی سے حاصل تھا۔ وہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ انہوں نے غزلیں، نظمیں، حمد، نعت، منقبت، رباعی، گیت، دوہے اور ہائیکو وغیرہ میں اپنی جولانی طبع کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کلام پاک و ہند کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

سہیل غازی پوری کئی سال سے اُردو میں ایک منفرد سہ ماہی رسالہ ''شاعر'' کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام مواد شعر میں ہوتا ہے یہاں تک کہ اداریہ، کتابوں پر تبصرے اور اشتہارات بھی منظوم ہوتے ہیں۔ منظوم شعروں پر مشتمل ان کی ایک کتاب ''باتیں سخنوروں کی'' شائع ہو چکی ہے جس کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ شعری خدمات کے صلے میں

انہیں متعدد انعامات سے نوازا گیا ہے جن میں علامہ نیاز فتحپوری ایوارڈ اور نیشنل بینک کا ادبی ایوارڈ شامل ہیں۔

سہیل غازی پوری کے متعدد مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں جن میں ''اجالوں کے دریچے''، ''موسموں کی گرد''، ''شہرِ علم'' (نعتیہ)، ''عکس جاں''، ''ہائیکو''، ''باتیں سخنوروں کی'' اور ''لفظوں کو زنجیر کیا'' شائع ہو چکے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا زیادہ وقت ادبی مصروفیات اور سہ ماہی رسالے ''شاعری'' کی ادارت میں گزرتا ہے۔ ان کے مجموعوں سے لیے گئے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اُسی کی قدرتِ تخلیق کا نمونہ ہے
کھنچا ہوا ہے جہاں تک حصار ارض وسماء

خدا سے خیر کی مانگیں دعا کہ گلشن کو
کہیں مٹا نہ دیں گرد و غبار ارض وسماء

یہ سوچنا تھا گھروں سے ہمیں نکلتے ہوئے
کہ نفرتوں کے ملیں گے الاؤ جلتے ہوئے

حصارِ کرب میں ہم تھے تو خوب زندہ تھے
حصارِ کرب سے نکلے تو مرگئے کہ نہیں

کوئی بتائے کہ اب کون کس سے پوچھے گا
کہ قافلے سے جو بچھڑے وہ گھر گئے کہ نہیں

زمیں سے آسماں تک ذرہ ذرہ ہے فدا جس پر
رُخِ کونین پر وہ تِل محمدؐ ہیں محمدؐ ہیں

انہیں کے دم قدم سے رقص کرتے ہیں اجالے بھی
بنائے شمع آب و گل محمدؐ ہیں محمدؐ ہیں

جس نے کبھی شکوہ نہ کیا تشنہ لبی کا
ہوتا ہے اسی رند پہ ساقی کا ستم بھی

کس جُرم پہ آخر ہمیں ساقی نے اُٹھایا
اک گوشے میں اوروں کی طرح بیٹھے تھے ہم بھی

یہ وقت کی باتیں ہیں سہیلؔ آپ نہ اُلجھیں
بازار میں بکنے لگے اب اہلِ قلم بھی

آؤ پھر سمندر میں کشتیاں اُتاریں ہم
پھر فریب کھا جائیں اپنے ناخداؤں سے

میرے زخم کی قیمت صرف وہ سمجھتا ہے
جس نے زخم کھائے ہیں اپنے آشناؤں سے

فکر کے چراغوں کو کوئی تو جلائے گا
اے سہیلؔ کیا ڈرنا تند خو ہواؤں سے

خلوص ٹوٹے، دلوں کی محبتیں ٹوٹیں
کسی کے طرزِ عمل سے رفاقتیں ٹوٹیں

وہاں عذابِ الٰہی ضرور اترا ہے
جہاں بھی آئینہ کردار صورتیں ٹوٹیں

سہیلؔ اس کے بچھڑنے سے اور کیا ہوتا
یہی ہوا کہ قرابت کی چاہتیں ٹوٹیں

---••☆••---

شاہ حسن عطا

ممتاز دانشور، مذہبی اسکالر اور متحدہ عرب امارات کے قونصل خانے کے ایڈمنسٹریٹیو آفیسر شاہ حسن عطا ۲۵ مارچ ۱۹۲۷ء کو سلون رائے بریلی یوپی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ حلیم عطا بھی ایک جید عالم تھے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس خاندان کے علم و فضل اور کشف و کرامت کا ہر دور میں شہرہ رہا ہے۔ اپنے اسلاف کا یہی جذبۂ خودداری شاہ حسن عطا کو بھی ورثہ میں ملا تھا۔ شاہ حسن عطا نے دینی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں اول درجے میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ سے اول درجے میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اول درجے میں بی اے کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ایم اے (انگریزی) اور ۱۹۵۰ء میں ایم اے (فزیالوجی) کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ترکی زبان کا امتحان پاس کیا اور سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ شاہ حسن عطا علی گڑھ کے نہایت نامور اولڈ بوائے تھے۔ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے نہایت پُرجوش کارکن تھے۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے پہلے سکریٹری پھر اس کے بعد وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے جو کسی طالب علم کے لیے سب سے بڑا اعزاز تھا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شاہ حسن عطا نے عملی زندگی کا آغاز نئی دہلی میں ایرانی سفیر کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے کیا۔ یہاں بہت مختصر عرصہ کام کرنے کے بعد پہلے وہ مشرقی پاکستان گئے اور کومیلا میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وہ مغربی پاکستان آئے اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہو گئے اور ساتھ ہی علی گڑھ پبلک اسکول لاہور میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ بعدازاں وہ لاہور سے مستقل طور پر کراچی آگئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ریڈیو پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ ریڈیو پاکستان کی بیرونی نشریات کے شعبۂ فارسی سے وابستہ تھے۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں ٹیلی ویژن کا آغاز ہوا تو شاہ صاحب نے ٹیلی ویژن پر قرآن کریم کی تفسیر اور خبریں سنانے کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔ شاہ عطا حسن کو فارسی، عربی، ترکی، انگریزی اور اُردو زبانوں پر مکمل

عبور حاصل تھا- ان کی علمی قابلیت اور صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہیں اسلامی چیمبر آف کامرس کا ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن مقرر کیا گیا- زندگی کے آخری ایام میں وہ متحدہ عرب امارات کے قونصل خانے کے ایڈمنسٹریٹیو آفیسر تھے-

ریڈیو پاکستان کے زمانے میں ملازمت چھوڑ کر کچھ عرصہ وہ سیالکوٹ کی کسی تحصیل میں قائم ایک نجی ڈگری کالج کے پرنسپل ہو کر چلے گئے تھے- لیکن کالج کی انتظامیہ سے کچھ اختلافات ہو گئے- اُن کا ایک اختلاف تو یہ تھا کہ اساتذہ کی حقیقی اور قبض الوصول پر درج شدہ تنخواہوں میں بڑا فرق ہے- دھیرے دھیرے ان کے اختلافات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا- بالآخر استعفیٰ دے کر کراچی چلے آئے-

کراچی واپس آ کر انہوں نے دوبارہ ریڈیو میں اپنے اسی عہدے کو حاصل کرنے کی کوشش کی جسے وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے- ریڈیو حکام بھی انہیں دوبارہ رکھنے کو تیار تھے لیکن اب پبلک سروس کمیشن کی شرط آڑے آ گئی- شاہ صاحب کی عمر مقررہ معیاد سے تجاوز کر چکی تھی لہذا باضابطہ ملازم کی حیثیت سے تقرر ممکن نہ تھا- بہرحال وہاں کی انتظامیہ نے کچھ کام ان کے سپرد کر دیا تھا- شاہ صاحب تراجم کا کام بھی کرتے تھے- اور تراجم بھی اعلیٰ پائے کی کتابوں کا- شاہ حسن عطا ان کتابوں کے مصنف، مولف اور مترجم تھے: افصح العرب والعجم ورسالت مآب صلعم کا تعارف بحیثیت انسانی تاریخ کے سب سے بڑے خطیب، ہماری یونین، وخطبۂ صدارت، مبادیات مدنیت، ابوبکر صدیقؓ وفاروق اعظمؓ، گلستان کی حکایات اردو میں، نامہ دیدہ گوش، مقامات مہدوی، فاروق اعظمؓ کا ترجمہ مع تعلیقات ہے-

سنہ ۱۹۸۷ء میں حکومتِ سندھ نے تحریکِ پاکستان کی گرانقدر خدمات کے اعتراف کے طور پر ایوارڈ سے نوازا جسے ان کی اہلیہ نے وصول کیا- ۷ر جولائی ۱۹۸۱ء کو مذہبی اسکالر، ماہر لسانیات، معلم، مترجم، مفسر شاہ عطا حسن دارفانی سے رخصت ہو گئے-

---••☆••---

شاہ محی الحق فاروقی

شاہ محی الحق فاروقی ۱۵ر جون سنہ ۱۹۳۲ء کو قصبہ وڈا کخانہ بحری آباد، ضلع غازی پور یوپی کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے- ان کا کہنا ہے کہ ان کی پیدائش کی یہ تاریخ تعلیمی اسناد کے مطابق ہے جو اصل تاریخ سے دو تین سال کم ہے- ان کے والد شاہ منیر الحق فاروقی، جن کا انتقال محی الحق کی کم سنی میں ہو گیا تھا، یوپی میں پولیس سب انسپکٹر تھے- والد کے انتقال کے بعد ان کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ صاحبہ اور ان چچاؤں کی سرپرستی میں ہوئی- شاہ صاحب کی آبائی حیثیت اور مشاغل میں زمینداری اور سلسلۂ رُشد و ہدایت تھا- زمینداری تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں ختم ہو گئی- پیری مریدی کا جو سلسلہ ان کے آباؤ اجداد کے زمانے سے چلا آ رہا تھا، ان کے دادا کے انتقال کے بعد خاندان کی دوسری شاخ میں منتقل ہو گیا- اس طرح نہ زمینداری سے کوئی تعلق رہا نہ پیری سے-

محی الحق کی اُردو کی ابتدائی تعلیم بحری آباد کے پرائمری اسکول میں اور انگریزی کی تیسری اور چوتھی کلاس کی تعلیم مسلم اینگلو ورنا کیولر اسکول، قصبہ مئو ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی- قصبہ مئو اب خود ضلع بن چکا ہے- اس کے بعد پانچویں کلاس سے میٹرک تک انہوں نے شبلی انٹر کالج اعظم گڑھ میں پڑھا اور یہیں سے ۱۹۴۷ء میں میٹرک پاس کیا- شبلی کالج سے میٹرک کرنے کے فوراً بعد چند مہینے انہوں نے حلیم مسلم کالج کانپور یوپی میں بحیثیت کلرک ملازمت کی اور اسی سال ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں مقیم ہوئے-

یہاں آ کر ذریعہ معاش اور حصولِ علم کے لیے وہ مختلف جگہوں پر ملازمت کرتے رہے- ابتدا میں انہوں نے الہ آباد بنک لمیٹڈ لاہور میں جونیئر کلرک کی حیثیت سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا پھر کراچی آ کر کراچی پورٹ ٹرسٹ میں آوٹ ڈور کلرک ہوئے- مئی ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک شاہ محی الحق فاروقی نے آرڈننس ڈپو، کراچی میں لوئر ڈیویژن اور اَپر ڈیویژن کلرک کی حیثیت سے خدمات انجام دیں- اپنی مختلف ملازمتوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا- سنہ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے سندھ مسلم

شبینہ کالج سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں سندھ مسلم آرٹس کالج سے بی اے اور ۱۹۸۶ء میں ایل ایل بی کیا۔کُل پاکستان بنیاد پر فیڈرل پبلک کمیشن کی جانب سے مرکزی سکریٹریٹ میں بطور کلرک ملازمت کے لیے منعقدہ امتحان میں کامیابی کے نتیجے میں فاروقی صاحب اگست ۱۹۵۱ء سے ستمبر ۱۹۵۹ء تک وزارتِ قانون میں لوئر ڈیویژن کلرک گریڈ ۵' اپر ڈیویژن کلرک گریڈ ۷ اور اسسٹنٹ گریڈ ۱۱ مقرر ہوئے۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں مرکزی سکریٹریٹ میں سیکشن آفیسر (گریڈ ۱۷) کی اسکیم نافذ ہوئی تو وزارت قانون کے تقریباً تیس اسسٹنٹوں میں صرف محی الحق فاروقی صاحب کو سلیکشن بورڈ نے سیکشن آفیسر منتخب کیا۔سیکشن آفیسر مقرر ہونے کے بعد انہوں نے بحیثیت سیکشن آفیسر وزارتِ قانون (کراچی / راولپنڈی)' سکریٹری اسلامی نظریاتی کونسل' حکومتِ پاکستان (لاہور)' سیکشن آفیسر وزارتِ داخلہ وزارتِ قانون (راولپنڈی' اسلام آباد) خدمات انجام دیں۔ سنہ ۱۹۷۷ء میں وزارت خزانہ میں ڈپٹی سیکریٹری (گریڈ ۱۹) اور پھر حکومت پاکستان کی کیبنٹ ڈیویژن کے جوائنٹ سیکریٹری (گریڈ ۲۰) کے عہدے پر مامور ہوئے۔اس طرح مختلف اہم محکموں میں ترقی کرتے ہوئے ٹریڈنگ کارپوریشن اور کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن' حکومت پاکستان کے فنانس ڈائریکٹر (گریڈ ۲۰) مقرر ہوئے اور یہیں سے وہ ریٹائر ہوئے۔

سرکاری ملازمت اور اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ محی الحق فاروقی کا علمی و ادبی سرگرمیوں سے خاص شغف رہا ہے۔ وہ مختلف جرائد میں متفرق مضامین لکھتے رہے۔ان کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ ''کھٹے میٹھے انار'' شائع ہو چکا ہے۔محی الحق صاحب نے انگریزی سے اُردو تراجم بھی کیے ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

English Title	اُردو نام
A Judge may laugh and even cry (Retd Justice M.R. Kayani)	ایک جج ہنس بھی سکتا ہے' شاید
Training Guide for Islamic workers (Hisham Abu Talib) USA	رہنمائے تربیت (کارکنانِ دعوت و تبلیغ کے لیے لائحۂ عمل
Nawab and Nightingales	بلبلیں نواب کی

(Musa Raza, a senior Indian Oficer

فرہنگ بنکاری ومالیات — Glossary of Banking & Finance (English - Urdu)

جہات غالب — Aspects of Ghalib Ed.Mumtaz Hasan)

تفہیم کراچی — Understanding Karachi (Arif Raza)

کراچی واٹر اینڈ سینی ٹیشن بورڈ کی نجکاری — Privatisation Of K.W.S.B (Noman Ahmed & M.Suhail

سانحۂ مشرقی پاکستان تصویر کا دوسرا رُخ — Betrayal of East Pakistan (Gen.Rtd. A.A.K. Niazi)

شمالی امریکہ کے مسلمان — Muslim Communities in Noth Amerca(Ed:Y.Y.Haddad&J.I.Smith)

محی الحق فاروقی کی شائع ہونے والی کتابوں میں آخری کتاب ''بیدار دل لوگ'' ہے جو ان کے لکھے ہوئے چند خاکوں پر مشتمل ہے۔ جن افراد کے خاکے اس کتاب میں شامل ہیں ان میں پرنسپل بشیر احمد صدیقی مرحوم، صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم، سابق دارالمصنفین اعظم گڑھ اور فاروقی صاحب کے بڑے بھائی مشیر الحق (شہید) سابق وائس چانسلر سری نگر یونیورسٹی کے نام نمایاں ہیں۔

مندجہ بالا کتابوں کے علاوہ روزنامہ ''امت'' کراچی میں ''کھٹے میٹھے انار'' کے عنوان سے ستمبر ۱۹۹۷ء سے مستقل کالم نگاری کر رہے ہیں۔

--••☆••--

شاہدالوری

اصل نام نذیر محمد، تخلص شاہد اور قلمی نام شاہد الوری ہے۔
۲۶ ردسمبر سنہ ۱۹۲۳ء کو راجپوتانہ کی مشہور ریاست الور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد وزیر محمد انصاری بسلسلۂ ملازمت بمبئی، احمد آباد، کلکتہ، لکھنؤ اور دہلی میں رہے۔ والد کے شہر بہ شہر پھرنے کی وجہ سے شاہد الوری کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا تھا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں ان کے نانا جناب بخت آور نے انہیں دہلی بلالیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں دوسری بار میٹرک کے امتحان میں فیل ہوجانے سے ان کی طبیعت پڑھائی سے اچاٹ ہوگئی اور پھر دہلی میں بے مقصد گھومتے پھرتے تھے۔ نانا صاحب کو جب ان کی آوارہ گردی کا علم ہوا تو انہیں ہنر سیکھنے کا مشورہ دیا اور پھر اپنے ویلڈر دوست کے پاس چھوڑ آئے جہاں انہوں نے ویلڈنگ کا کام سیکھا۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں شاہد الوری نے اپنی ذاتی ویلڈنگ اینڈ انجینئرنگ ورکشاپ قائم کی ، جو اگست تک قائم رہی۔

شاہد الوری ۱۳ ردسمبر سنہ ۱۹۴۷ء کو پاکستان آئے۔ ابتدا میں وہ راولپنڈی میں رہے اس کے بعد ۱۳ رجنوری سنہ ۱۹۴۸ء کو لاہور اور پھر قائد اعظم کی وفات کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں پر غنی اجمیری سے دوستانہ مراسم ہوئے۔ غنی اجمیری عبدالرحیم شاہ صاحب ارمان اجمیری کے شاگرد تھے۔ غنی صاحب کی صحبت میسر آئی تو شعروسخن سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور شاہد الوری بھی ارمان اجمیری کے شاگرد ہوگئے اور ان کا تخلص شاہد رکھا گیا۔ ارمان اجمیری کے بعد انہوں نے راغب مراد آبادی کی شاگردی اختیار کی اور تادمِ واپسی اصلاح لیتے رہے۔ شاہد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

''غالب کی زمینوں میں شاہد نے اپنی غزلوں کی کاشت کا ہنر خوب دکھایا ہے۔ عجب صاحب کمال ہیں کہ غالب کا مصرعہ اُٹھایا اور اس پر بے مطلع قطعات کہتے چلے گئے اور تضمین کر ڈالی۔ اس پر یہ کہ بیان میں شروع سے آخر تک ایک ہی سطح، ایک ہی معیار ہے جس پر وہ قائم رہے ہیں۔
اُن کی بے نفسی قابلِ داد ہے کہ غالب سے اپنی عقیدت کو انہوں نے محض ایک جذباتی مسئلہ

نہیں بنایا بلکہ اپنے فن کو اِس بے پناہ عقیدت کا عکس بنا دیا۔''

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

''غالبؔ، شاہدؔ الوری کے لیے محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک استعارہ اور ایک سَمت ہے۔فکر اور زندگی کی سَمت' اور شاہدؔ نے اس استعارہ کے معانی کے مختلف گوشے ہی اُجاگر نہیں کیے بلکہ خود اپنی ذات کا اظہار بھی کیا ہے، کہ یہی زندگی کا جواز ہے۔غالبؔ نے اپنے اشعار میں آنے والے ہر لفظ کو گنجینہ معنی کا طلسم کہا تھا، اور شاہدؔ الوری کے الفاظ اس طلسم کی کلید ہیں۔ شاہدؔ کی رفاقت میں غالبؔ سے ملاقات ہی کا دوسرا نام ''سخن در سخن'' ہے۔''

شاہدؔ الوری کا ایک دیوان ''سخن در سخن'' ۱۹۸۲ء میں مکتبہ الانصار، ایف/۶۶۹، کورنگی ٹاؤن سے شائع ہو چکا ہے۔انہوں نے اپنی غزلیں غالبؔ کی زمین میں کہیں۔غالب کا ایک مصرعہ لے کر پوری غزل کہہ ڈالی۔طویل علالت کے بعد ۱۵ر ستمبر ۲۰۰۴ء کو شاہدؔ الوری کا انتقال ہو گیا۔کورنگی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ان کے کلام سے منتخب اشعار ذیل میں درج ہیں' ملاحظہ کیجیے۔

شمس و قمر' زمان و مکاں' برق و ابر و باد
ہر شے اُسی کے فیض کی حلقہ بگوش ہے

ہر ایک حرف حمد کا ہے شرحِ ''لاالہٰ''
''غالب صریرِ خامہ نوائے سُروش ہے''

اے رَاہیِ اَفلاک، زَمیں کو ہے شِکایت
تو خِدمتِ اَحبَاب اَبھی کرتا کوئی دن اور

اے سَاکنِ فردوسِ بَریں، فخرِ زمانہ
''کیا تیرا بگڑتا جو نہ مَرتا کوئی دِن اَور''

بُجھ گئے مایوسیوں سے شَادکامی کے چراغ
دَرد کی انگڑائیاں تسکینِ سَاماں ہو گئیں

اور اِسی ہَنگام' شاہدؔ! دِل نے یہ آواز دی
''مشکلیں مُجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں''

ہم یونہی خاک بسر ہو کے گزاریں گے حیات
حسنِ رعنا کو سزاوارِ نظر ہونے تک

شُعلے کو چاہیے لپکا، تو نفس کو گرمی
''آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک''

کارگاہِ زندگی میں آج تنہا رہ گئے
بے خودی کی آنچ سے کیا کہیے کیا کیا جل گیا

ایسی ناکامی میں شاہدؔ ازرہِ دیوانگی
''کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا''

سوچا کہ راستے کا تعیّن ہے لازمی
مدّت ہوئی ہے سَر بہ گریباں کیے ہوئے

یہ کیا کہ زندگی سے ہیں بیزار اس قدر
''بیٹھے ہیں خود کو بے سر و ساماں کیے ہوئے''

یہ سازِ محبت کہیں بے رُوح نہ ہو جائے
اب دل کے تڑپنے پہ گزرتا ہے گماں اور

ملتی ہے ہمیں طنز کے ہر زخم سے منزل
''ہے بسکہ ہر اک اُن کے اِشارے میں نشاں اور''

موت تجدید ہے اک صورت وہیئت کے لیے
''عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا''

جُرأتِ عرضِ حال کر نہ سکے
اور وہ درد آشنا نہ ہوا

ڈھل گئی رات، چھپ گئے تارے
''درد مِنّت کشِ دوا نہ ہوا''

صبح کی پہلی کِرن تھی کہ کوئی نشتر تھا
ظلمتِ شب کا جنازہ سرِ زنداں نکلا

کٹ گئی رات' تو یہ راز کھلا شاہدؔ پر
''قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا''

کس نے اس راز کو پایا ہے بجز ذوقِ جنوں
کیا گزرتی ہے کلی پر گُلِ تر ہونے تک

زندگی کچھ بھی نہیں، پھر بھی ہے سب کچھ شاہدؔ!
''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک''

ذکر کیا کلی کا ہے، ہم گلوں کو رو بیٹھے
اب نہ بوئے گل اپنی اور نہ گلستاں اپنا

دامنِ محبت میں ہے متاعِ رُسوائی
''بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا''

اب شفق رنگ اُجالے ہیں نہ آنسو نہ بہار
کیا ہوا جانِ غزل، جانِ وفا میرے بعد

دل بہا جاتا ہے افکار کی طغیانی میں
''کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد''

منزل مجھے پُکار رہی ہے کہ جلد آ
ہر چند طول دیتا ہوں راہِ سفر کو میں

بڑھ جائے گی کچھ اور بھی ویرانیٔ حیات
''یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں''

ہائے وہ لب کہ جو تھے مَطلعِ انوارِ غزل
اُن میں بھی کیفِ تغزل نہ رہا میرے بعد

اب مرے خونِ جگر کی ہوئی قیمت معلوم
''ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد''

--••☆••--

شاہد عشقی

شاہد حسین ان کا اصل نام، تخلص عشقی اور قلمی نام شاہد عشقی ہے۔ ۴؍جولائی سنہ ۱۹۲۶ء کورامپور یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ کالج اجمیر سے میٹرک پاس کیا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں انٹر سائنس کیا۔ تقسیم ہند سے پہلے جے پور یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۴۶ء میں بی اے پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء میں شاہد صاحب پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ یہاں آنے کے بعد سنہ ۱۹۵۹ء میں ایم اے اردو کراچی یونیورسٹی سے کیا۔ پھر پاکستان پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ابتدا میں ان کا تقرر بھاول نگر میں ہوا اس کے بعد گورنمنٹ کالج ناظم آباد اور پھر مختلف کالجوں میں لیکچرر اور پروفیسر رہے۔ آخر میں ڈی جے سائنس کالج میں بحیثیت پروفیسر صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے اور یہیں سے سنہ ۱۹۸۴ء میں ریٹائر ہوئے۔

شاہد عشقی صاحب کو ذوق سخن سے لگاؤ اسکول کے زمانے سے ہوا۔ مختلف رسالوں میں ان کا کلام چھپتا رہا۔ انہوں نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہیں لیکن ان کی محبوب صنف سخن غزل ہے۔ اپنے شعری سفر کے متعلق شاہد عشقی صاحب لکھتے ہیں:

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میری پہلی نظم ''قحطِ بنگال'' کے عنوان سے سنہ ۱۹۴۳ء میں ''مدینہ'' بجنور میں شائع ہوئی تھی۔ مدینہ ایک باوقار سہ روزہ تھا' اور ایک کالج کے طالب علم کے لیے یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی۔ اس زمانے میں غالبؔ میرے پسندیدہ شاعر تھے اور اس قدر پسندیدہ کہ حضرت جوشؔ ملسیانی کے ایک مضمون کے جواب میں جو غالبؔ کی تنقیص میں ''آج کل'' دہلی میں شائع ہوا تھا میں نے ''آج کل'' ہی میں غالبؔ کے سخن فہم سے زیادہ غالبؔ کا طرفدار بن کر ایک سخت جوابی مضمون شائع کروایا تھا جو میرا پہلا تنقیدی مضمون بھی تھا۔ غالبؔ کے بعد اگر کسی شاعر کو میں نے دل لگا کر پڑھا تو وہ اصغرؔ تھے لیکن ان کلاسیکی شاعروں کے مطالعے کے ساتھ ساتھ میں نے راشدؔ اور میراجیؔ جیسے جدید شاعروں

کا مطالعہ بھی جاری رکھا - یہ دونوں شاعر اس زمانے میں ادب کے ہیروشیما پر ایٹم بم کے دھماکے کر رہے تھے اور ان کی صرفِ نظر کرنا ممکن نہ تھا-''

اُن کے کلام کے بارے میں جناب فراقؔ گورکھپوری لکھتے ہیں:

''شاہد عشقیؔ کے کلام میں لوچ ہے' نغمہ ہے' سلاست ہے' روانی ہے' جذبات کا خلوص ہے؛ شاعرانہ غور وفکر ہے- اُن کی شاعری ایک جیتی جاگتی آواز ہے جسے پڑھتے وقت ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے ہم اُنھیں سُن رہے ہوں-''

عشقیؔ صاحب کا مجموعۂ کلام ''قامت'' (سنہ ۱۹۸۵ء) میں شائع ہوا- ان کی تصانیف میں'' تنقیدی جائزے'' اور'' حرفِ نقد'' بھی شامل ہیں- ان کی ایک غزل اور چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کس کس کے آنسو پوچھوگے؟ کس کس کو بہلاؤ گے؟
اک دن آئے گا تم بھی شامل ان میں ہو جاؤ گے

رنگ ہوا میں تیر رہے ہیں تتلی کا بہروپ لیے
ارے رنگ اتر جائیں گے تم گر ہاتھ لگاؤ گے

عمرِ عزیز گنوائی اپنی سایوں کا پیچھا کرتے
سائے کس کے ہاتھ آئے ہیں اور تم بھی کیا پاؤ گے

سیل حوادث میں ہم سب اب پتھر بن کر زندہ ہیں
کیسے شعر کہو گے عشقیؔ، کس کو شعر سناؤ گے

عشقیؔ تم نے عمر گزاری ہے امیدِ بہاراں میں
اور ایّامِ بہاراں بھی گر تم کو راس نہ آئے؟ پھر؟

رات ہے، شہرِ بتاں ہے اور ہم آرزوے بیکراں، ہے اور ہم
بجھ چلے ہیں سارے یادوں کے چراغ اب چراغوں کا دھواں ہے اور ہم

شمع کی صورت میں بھی اپنی آگ میں جلتا رہتا ہوں
شمع کے ساتھ جلے پروانے میرے ساتھ جلے گا کون

---••☆••---

شاہد نقوی

اصل نام سید شاہد علی شاہ اور قلمی نام شاہد نقوی ہے۔ ۱۵؍جون سنہ ۱۹۳۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید احمد حسین شاہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ انہوں نے مذہب پر ایک کتاب انگریزی اور دو کتابیں اُردو میں تحریر کی ہیں۔ شاہد نقوی کے دادا سید صفدر حسین نے بھی دو جلدوں میں ایک ضخیم کتاب "The Early History of Islam" لکھی تھی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اس بات سے اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اس کے کم وبیش سات ایڈیشن کراچی سے شائع ہو چکے ہیں۔ صفدر حسین مختلف جگہوں پر بحیثیت تحصیلدار رہے ہیں۔ شاہد نقوی بڑے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلامی رواج کے مطابق ان کی دینی تعلیم گھر پر ہوئی۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے سینٹیل ہائی اسکول لکھنؤ سے میٹرک اور امین آباد انٹر کالج لکھنؤ سے ایف ایس سی پاس کیا۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی اے (پارٹ ا) میں داخلہ لیا لیکن اسی سال وہ پاکستان آ گئے۔

یہاں آ کر انہوں نے سنہ ۱۹۵۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور سنہ ۱۹۵۶ء میں ایم اے (سیاسیات) کیا۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں یونیورسٹی لاء کالج لاہور سے ایل ایل بی کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو پیکیجز لمیٹیڈ لاہور کے شعبۂ قانون میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے بعد پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز کارپوریشن (PIAC) سے منسلک ہو گئے۔ سنہ ۱۹۵۵ء بطور جنرل منیجر لیگل اینڈ ایڈمنسٹریشن پی آئی اے ہولڈنگز لمیٹیڈ کراچی سے ریٹائر ہونے کے بعد وکالت کرتے رہے۔ کراچی میں انتقال ہوا۔ شاہد نقوی کو شعر وسخن کا ذوق زمانہ طالب علمی سے تھا۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں:

(۱) آفتاب عصر (شہید کربلا پر مسدس) مطبوعہ مکتبۂ تعمیر ادب لاہور (۲) سوغات (شعری مجموعہ) دو ایڈیشن (۳) پیشکش (شعری مجموعہ) مطبوعہ ارتقاء مطبوعات (۴) تذکرہ تاریخ امامباڑہ سیدہ

مبارک بیگم لاہور (۵) عزاداری (تہذیبی ٗ ادبی اور ثقافتی منظر نامے) (۶) عظمتِ بشر (مجموعہ مراثی) (۷) بیدار شعائیں ترقی پسند تحریک کے بانیوں کو خراج محبت وغیرہ۔

شاہد صاحب کا کلام ملاحظہ کیجئے ؎

ہم نے نگار زیست کے گیسو سنوار کے ۔ قائم کیے ہیں رشتے کئی اعتبار سے
خوابوں کو جلوہ گاہِ لہو سے نکھار کے ۔ دن گن رہے ہیں آمدِ فصلِ بہار کے
بیدار ہو اے روحِ شرر بار ہو بیدار ۔ پیکار ہو اس موسمِ بیمار سے پیکار
اے حریتِ فکر و عمل، عزمِ ثمربار ہو ۔ اے جرأت و ہمت کے نقیبانِ خوش آثار
اے عالمِ امکان کے روشن در و دیوار ۔ اے قافلۂ عقل و فراست کے طرف دار
اے حوصلۂ زیست کے لشکر کے علمدار ۔ ظلمت کدۂ وہم وگماں پر ہو کڑا وار
منزل ہی پہ جا کر رکے عزم کا رہوار ۔ اے میرے رفیقان وجلیسانِ خوش اطوار
پھر فیصلہ کن قلعۂ شاہی پہ ہو یلغار ۔ ڈھاتے ہوئے راہوں کا ہر اک آہنی کہسار
چاندنی اترتی ہے جب بھی اپنے آنگن میں ۔ اک خیال رہ رہ کر دل میں مُسکراتا ہے
اُڑ گئے پرندے سب اپنی اپنی منزل کو ۔ دل کہ شام ہوتے ہی ڈوب ڈوب جاتا ہے
بولتے ہیں سناٹے، چیختی ہے تنہائی ۔ بانسری کی لے میں جب ہیر کوئی گاتا ہے
کیا عجب مسافت ہے ختم ہی نہیں ہوتی ۔ جو قدم بھی اُٹھتا ہے فاصلے بڑھاتا ہے
رشتۂ تمنا کو جس نے خود ہی توڑا تھا ۔ زیرِ لب وہی میرے شعر گنگناتا ہے
ہر طرف نوحہ کناں ویرانیاں ۔ اہلِ دل وحشت کا پیکر ہوگئے
رینگتی ہیں ہَول کی پرچھائیاں ۔ راستے آسیب منظر ہوگئے
ہم کہ صورت گر تھے، بے چہرہ ہوئے ۔ سانحے ایسے بھی ہم پر ہوگئے

---••☆••---

شبیر علی کاظمی، سید

شبیر علی کاظمی کے مورثِ اعلیٰ عہدِ عالمگیر میں ایران سے دہلی آئے تھے۔ شاہی دربار سے جاگیریں عطا ہوئیں تو یہ لوگ اپنی جاگیروں اور زرعی زمینوں کے قریب قصبہ سرسی ضلع مرادآباد میں آباد ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء سے چند دن قبل کاظمی صاحب کے دادا سید مددعلی اپنے بھائیوں کو ساتھ لے کر سرسی سے اپنے گاؤں نرولی میں مقیم ہوگئے تھے جہاں ان کی زیرکاشت زمینیں تھیں۔ اس گاؤں کے قریب ایک جید عالم اور بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سرسی سے منتقل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ زیر اثر نوابوں کی حکومت سے متفق نہیں تھے۔ اس خاندان کے بزرگوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف مجاہدین کا بھی ساتھ دیا جس کے جرم میں ان کی جاگیریں اور جائیدادیں ضبط کر لی گئیں اور وہ مالی بدحالی سے دوچار ہوگئے۔ شبیر علی کاظمی کے والد نوشے علی کی عمر ابھی چھ ماہ تھی کہ ان کے والد سید مددعلی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد نوشے علی اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ماموں کے پاس سنبھل آگئے۔ نوشے علی نے اپنے ماموں کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی۔ اس کے بعد ان کے ماموں نے اپنے ایک قرابت دار کی بیٹی سے نوشے علی کی شادی کرادی۔

کاظمی ۱۱؍جولائی ۱۹۱۵ء کو سنبھل ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم سنبھل میں حاصل کی اور وہیں سے میٹرک کیا پھر انٹرمیڈیٹ ایس ایم کالج چندوسی سے پاس کیا۔ اس کے بعد کاظمی نے ایم اے (فارسی) ایم اے (اُردو) اور بی اے بی ٹی کی ڈگریاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ وہیں پر انہوں نے ہندی کی بھی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہوکر سنبھل میں نائب تحصیلدار ہوگئے۔ اس کے بعد آفیسر ٹریننگ اسکول مہو (سینٹرل انڈیا) میں اُردو کے استاد مقرر ہوگئے جہاں وہ انگلستان سے آئے ہوئے فوجی افسروں کو اُردو پڑھاتے رہے۔ یہاں سے کاظمی صاحب کا تبادلہ شیواجی ملٹری اکیڈمی پونا اور پھر سینٹ تھامس بوائز اسکول کلکتہ، دارجلنگ ہوگیا جہاں وہ اُردو کے استاد رہے۔

۱۹۴۹ء میں کاظمی صاحب مشرقی پاکستان ایجوکیشن سروس سے منسلک ہوکر گورنمنٹ کالج راجشاہی

کچھ برباد ہوا، اپنا مال و متاع لٹا کر پہلی ہجرت ہندوستان سے کی، اپنے بچوں کو قربان کر کے دوسری ہجرت مشرقی پاکستان سے کی۔ لیکن انہوں نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی پر قانع رہے۔ غموں نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ مغربی پاکستان کے مشہور ادیبوں، شاعروں اور اعلیٰ حکام سے شناسائی تو اُس وقت ہی سے تھی جب وہ مشرقی پاکستان میں مقیم تھے۔ جب وہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو ان احباب نے ان کی ہر طرح اخلاقی مدد اور ہمت افزائی کی اور ان کے غموں کا بوجھ ہلکا کرنے کی جستجو کرتے رہے۔ ان احباب میں جمیل الدین عالی اور مشفق خواجہ پیش پیش تھے۔ یہاں پر وہ غم غلط کرنے کے لیے انجمن ترقی اُردو جاتے رہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے تو ان کی باقاعدہ خط و کتابت رہتی تھی۔ انجمن ترقی اُردو سے مشفق خواجہ کی سبکدوشی کے بعد جمیل الدین عالی اور اختر حسین صاحب کے ایما پر انہیں انجمن میں بحیثیت معتمد مقرر کر دیا گیا۔

اس مضمون میں کاظمی صاحب کی زندگی کے حالات، غموں، دکھوں کا ذکر اور ان کی علمی ادبی خدمات کا ذکر کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کے سبب انتہائی اختصار سے کیا گیا ہے جو باعثِ تشنگی ہے۔ کاظمی صاحب برِصغیر کے ممتاز دانشور، ماہرِ لسانیات اور ماہرِ تعلیم تھے۔ متعدد زبانوں کی تاریخ و قواعد اور مختلف ادوار میں زبانوں کی تبدیلیوں اور الفاظ و محاورات میں تغیر و تبدل کے بارے میں بیش بہا معلومات رکھتے تھے۔ ان کی اہم تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) 'اُردو اور بنگلہ کے مشترک الفاظ' (اس کتاب پر انہیں ۱۹۷۰ء میں داؤد ادبی انعام سے نوازا گیا۔ اس کتاب کی تالیف انہوں نے اپنے لسانی ذوق و شوق اور متعدد زبانوں سے واقفیت کی بنا پر تنہا کی تھی۔ تاہم اس کام میں بابائے اردو کی مدد بھی شامل رہی۔ علمی اعتبار سے یہ کتاب غیر معمولی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔ (۲) ''اساس اُردو'' (۳) ''اُردو کا عوامی ادب'' (۴) ''والیانِ اُردو'' (۵) ''ایشیا کے لوگ'' (۶) ''پراچین اُردو'' (۷) ''چند تعلیمی تصورات''۔ کاظمی صاحب مختلف موضوعات پر مقالے، طنزیہ مضامین بھی لکھتے رہے جو ملک کے اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے۔ مختلف انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ آخر وہ گھڑی بھی آ پہنچی جب کاظمی صاحب کی زندگی کا المناک سفر اختتام کو پہنچا۔ ۳ رجنوری ۸۵ء کو کاظمی صاحب ملکِ عدم رخصت ہو گئے۔ سخی حسن کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔

---••☆••---

شریف الحسن

شریف الحسن ۲۵ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے سنہ ۱۹۳۸ء میں ایم اے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ شریف الحسن صاحب سنٹرل انفارمیشن سروس کے رکن رہے، ۹ سال تک ترکی میں پاکستانی سفارتخانے کے پریس اتاشی رہے اور اسی حیثیت میں مختلف اوقات میں لندن، جینوا، قاہرہ اور نئی دہلی میں تعینات رہے۔ وزارتِ اطلاعات پاکستان میں ڈائیریکٹر فارن پبلیسٹی اور پھر سینٹو میں ڈپٹی سیکریٹری جنرل کے عہدے پر انقرہ میں مامور ہوئے۔ آخر میں صدرِ پاکستان کے سیکریٹریٹ میں جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہو کر سعودی عرب کے سفارت خانے میں ایڈوائزر مقرر ہوئے۔ شریف الحسن صاحب کو ادب سے گہرا تعلق اور بڑا لگاؤ تھا۔ انہوں نے کئی زبانوں میں شعر کہے، تاریخ گوئی میں اور لغت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ کچھ عرصے ترقی اردو بورڈ کی مجلسِ ادارت میں بھی شامل رہے۔

ڈاکٹر شان الحق حقی ''سب رس'' یادرفتگاں نمبر (حصہ دوم) میں لکھتے ہیں:

''ہر دور اور ہر معاشرے میں کچھ ایسی ہستیاں بھی ہوتی ہیں جن کی علمی لگن شہرت سے بے نیاز اور بقائے دوام سے بے پروا ہو کر انہیں محض علم کی خاطر طلبِ علم میں محو رکھتی ہے، آپ ان کی ذات سے تاحیات فیض اور فرحت حاصل کر سکتے ہیں اور پھر نگاہیں ان کو ڈھونڈتی رہ جاتی ہیں۔

ایسی ہی ایک شخصیت شریف الحسن مرحوم کی تھی۔ کردار ہر جہت سے روشن اور بے داغ، زندگی میں ناخوشگوار حادثات اور نہایت حساس دل رکھنے کے باوجود طبیعت شگفتگی سے عاری نہ تھی۔ صحبت دلچسپ تھی، علم وسیع بھی اور حاضر بھی۔ ادب سے گہرا لگاؤ، نظم و نثر پر قادر، بیک وقت کئی زبانوں کے ماہر اور اس حد تک کہ اردو، فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی میں شاعری کرتے تھے۔ چلتی پھرتی لغت اور انسائیکلوپیڈیا تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔''

۱۳ دسمبر سنہ ۱۹۸۰ء کو شریف الحسن صاحب نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔

---••☆••---

شفقت رضوی

پورا نام سید شفقت حسین رضوی اور ادبی نام شفقت رضوی ہے- ۱۵ر مارچ ۱۹۲۷ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے- ان کے والدین لکھنؤ یوپی کے رہنے والے تھے- ان کے والد سید اکبر حسین رضوی معروف وکیل تھے- چند برس وہ منصف کے منصب پر بھی فائز رہے تھے- جنوری سنہ ۱۹۶۳ء میں ان کا انتقال کراچی میں ہوا- وہ یہاں عارضی طور پر آئے ہوئے تھے- ان کے والدین حیدر آباد دکن کے محلہ ''اُردو شریف'' میں رہتے تھے- شفقت رضوی نے ابتدائی تعلیم وہیں کے سرکاری اسکول میں حاصل کی- چھٹی جماعت تک ''سٹی کالج'' کے ہائی اسکول سیکشن اور ساتویں' آٹھویں کلاس ''ورنگل ہائی اسکول'' میں پڑھا- اس کے بعد نویں اور دسویں کلاسیں سٹی کالج کے ہائی اسکول سیکشن میں پڑھیں- سنہ ۱۹۴۳ء میں حیدر آباد دکن ثانوی بورڈ سے میٹرک پاس کیا- انٹرمیڈیٹ کے لیے ناگپور میں داخلہ لیا لیکن وہاں فساد پھوٹ پڑنے تعلیم منقطع ہوگئی- اس سال بیکار رہنے کے بجائے شفقت رضوی نے علی گڑھ سے دوبارہ میٹرک پاس کیا اور پھر وہیں انٹر میں داخلہ لے لیا- لیکن یہاں بھی فسادات کی وجہ سے تعلیم منقطع کرنی پڑی اور حیدر آباد واپس جا کر محکمہ تعلیم میں بحیثیت استاد ملازمت اختیار کر لی-

حیدر آباد دکن میں محکمہ تعلیم کے ملازمین کے علاوہ پرائیویٹ امتحان دینے کا کوئی تصور نہیں تھا- یہی وجہ تھی کہ شفقت رضوی کو محکمہ تعلیم میں ملازمت کرنا پڑی- چنانچہ انہوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھا- اس طرح انہوں نے ۱۹۵۲ء میں انٹرمیڈیٹ' ۱۹۵۴ء میں بی اے' ۱۹۵۶ء میں ایم اے اور ۱۹۶۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو) کیا- شفقت رضوی نے میٹرک کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی تھی- لیکن ایم اے کرنے کے بعد بھی ان کی کوئی ترقی نہیں ہوئی تو دل برداشتہ ہو کر ترک وطن کیا اور پاکستان آ گئے-

یہاں آ کر انہوں نے مختلف جگہ کام کیا- کچھ دن وہ ماما پارسی اسکول میں ٹیچر' اسلامیہ کالج کراچی

میں اکاؤنٹنٹ اور اسلامیہ کالج کے پرنسپل جسٹس (ر) محمد بخش میمن کے پی اے بھی رہے۔ بالآخر یکم ستمبر ۱۹۶۳ء کو نیشنل کالج کراچی میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۷۰ء کو اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں جبراً سرکاری ملازمت کے زمرے میں شامل کیے گئے۔ ۱۴ر مارچ ۱۹۸۷ء کو اسی کالج سے ساڑھے چوبیس برس کی خدمات کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

شفقت رضوی کو لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ابھی وہ طالب علم ہی تھے کہ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کی درخواست پر اسکول فنکشن کے لیے ایک ڈرامہ ''غیرت جاگ اُٹھی'' کے عنوان سے لکھا جو بہت مقبول ہوا اور ان کے اساتذہ نے بھی پسند کیا۔ ڈرامے کی مقبولیت کے اعتراف میں شفقت رضوی کو کچھ کتابیں بطور عطیہ دی گئیں۔ جن دنوں وہ علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے تو وہاں جناب ظہیرالدین علوی اُردو پڑھاتے تھے۔ علوی صاحب نے جب غالب پڑھانا شروع کیا تو شفقت رضوی لائبریری جاکر غالب کی تمام شرحیں دیکھ کا مطالب ازبر کرلیتے اور اگلے دن شرحوں کی بناء پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ علوی صاحب بھی ان کی جسارت دیکھ کر اس کی داد دیتے تھے۔ اسی زمانے میں شفقت رضوی نے پہلا تنقیدی مضمون لکھا جسے علوی صاحب نے دیکھ کر شفقت کو یہ اجازت دی کہ وہ سیمینار کی لائبریری سے جو کتاب چاہیں لے سکتے ہیں۔ مذکورہ مضمون حیدرآباد کے مشہور رسالہ ''شہاب'' میں شائع ہوا۔

۱۹۴۶ء سے افسانے اور ادبی مضامین لکھنا شروع کیے جو ہندوستان کے مقتدر رسائل ''شاعر''، ''افکار''، ہفت روزہ ''نظام'' (بمبئی) ہفت روزہ ''شاہد'' اور دوسرے متعدد رسالوں میں چھپتے تھے۔ شفقت رضوی کا افسانہ ''نئی عورت'' بے حد مقبول ہوا۔ شفقت رضوی کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے رضیہ کوثر نے رسالہ ''شاعر'' (بمبئی) کے ایک شمارہ میں ایک مضمون لکھا جس کا انہوں نے عنوان ''نئی عورت کا خالق'' رکھا تھا۔ جہاں رضیہ کوثر نے مجموعی طور پر افسانہ کی تعریف کی وہیں سہیل بخاری نے سخت تنقید بھی کی۔ سہیل بخاری کی تنقید کا ایک اقتباس یہ تھا:

> ''یہ لوگ جنس کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئے انہیں آگے پڑھنے کے لیے راستہ نہ مل سکا۔ عصمت کا ''لحاف'' آزمائش شرط ہے کا مصداق ہے۔ منٹو کا ''ٹھنڈا گوشت'' ماءاللحم ہے اور شفقت رضوی کا ''جذبہ بے اختیار ہوس انگیز!'' قدامت پسندوں کی جانب اُن پر عریانی کا الزام ہے۔''

شفقت رضوی کم گو اور گوشہ گیر شخصیت کے مالک ہیں- ان کے دوست احباب بھی نہ ہونے کے برابر ہیں- وہ خود بھی کہیں جانا آنا پسند نہیں کرتے- ریٹائرمنٹ کے بعد سارا وقت کتابوں کے مطالعہ میں گزرتا ہے- عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب اس کی ضرورت اور افادیت ختم یا نہ ہونے کے برابر ہو چکی ہے- لیکن شفقت رضوی نے ایسا نہیں سوچا- وہ آج بھی ذہنی' جسمانی طور پر فعال ہیں اور پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے ہیں- پڑھے لکھے لوگوں میں ان کی ایک شناخت ہے اور ان کے کام کو اہل علم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں-

شفقت رضوی نے علمی تحقیقی کام بھی کیے ہیں- مولانا حسرت موحانی' بیگم حسرت موحانی' سراج اورنگ آبادی' جوش ملیح آبادی' ابوالکلام آزاد' برکت اللہ بھوپالی' محی الدین قادری پر ان کے بلند پایہ تحقیقی تصنیفات و تالیفات ہیں- انہوں نے اقبال' سلیمان' مولانا سندھی پر بھی مقالات تحریر کیے ہیں- شفقت رضوی کے افسانے اور مضامین جو شائع ہو کر مقبول ہوئے ان کی بڑی تعداد ہے جسے اس مختصر مضمون میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے- آج کل وہ اپنے بچوں کے پاس امریکہ گئے ہوئے ہیں- ان افسانوں اور مضامین میں چند کے نام یہ ہیں-

(۱) ''سازِ شکستہ'' ہفت روزہ ''انجام'' (دہلی) (۲) ''سازِ ہستی'' رسالہ ''سب رس'' حیدرآباد ''صحرانورد'' رسالہ ''پریم'' (جموں) (۳) ''محبت و نفرت'' ماہنامہ ''فسانہ'' (الہ آباد) ''کنول جو کھل نہ سکا'' روزنامہ ''میزبان'' (ادبی ایڈیشن) (۴) ''نئی عورت'' رسالہ ''چندن'' کانپور (۵) ''بدلیاں'' رسالہ ''جادہ'' بھوپال (۶) ''رات بھر دیدۂ نمناک میں'' رسالہ ''جادہ'' بھوپال ''عورت جو آفاقی ہے'' رسالہ ''شاعر'' آگرہ (۷) ''مٹی کا مادھو'' ہفت روزہ ''منشور'' کراچی ''علی اختر کی شاعری'' رسالہ ''شہاب'' حیدرآباد دکن (۲) ''مارکسی تصور ادب'' رسالہ ''افکار'' بھوپال (۳) ''جدید اُردو شاعری'' ہفت روزہ ''نقش و نگار'' حیدرآباد دکن (۴) ''غیر افادی ادب'' رسالہ ''منزل'' کراچی (۵) ''نئے ادبی رجحانات'' رسالہ ''افکار'' بھوپال

---••☆••---

شفیق احمد شفیق

شفیق احمد نام، شفیقؔ تخلص اور قلمی نام شفیق احمد شفیق ہے۔ ۶ر جولائی ۱۹۴۹ء کو کلکتہ، مغربی بنگال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالرشید سروے آف انڈیا میں ملازم تھے۔ تقسیم ہند کے بعد شفیق احمد کے والدین ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے اور ڈھاکہ میں مقیم ہوئے اور اپنا کاروبار شروع کیا۔ شفیق احمد نے دینی تعلیم کے بعد ۱۹۶۵ء میں انجمن مفیدالاسلام ڈھاکہ سے میٹرک پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے شفیقؔ نے قائداعظم کالج ڈھاکہ میں داخلہ لیا۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں انہوں نے انٹر اور پھر ۱۹۷۰ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور پھر شعبہ صحافت سے منسلک ہو گئے۔ ابتدا میں انہوں نے روزنامہ ''پاسبان''، ''ہماری زبان'' اور ''وطن'' میں کام کیا۔ یہ تینوں اخبار ڈھاکہ سے مختلف اوقات میں نکلتے تھے۔ اسی دوران شفیقؔ احمد نے ہفتہ وار رسالہ ''نکہت'' کراچی اور ادبی رسالہ ''مجلس'' لاہور کے لیے نامہ نگار کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیے۔

۱۹۶۹ء میں شفیقؔ مغربی پاکستان آ گئے اور بزنس ریکارڈر سے منسلک ہو گئے۔ ابتدا میں انہوں نے پروف ریڈر پھر پروف ریڈنگ سیکشن کے انچارج کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد وہ سب ایڈیٹر اور پھر تا حال سینیر ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ صحافت کے ساتھ شفیقؔ کو شعر و سخن افسانہ نگاری اور تنقید نگاری سے بھی ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ ڈھاکہ کے دورانِ قیام وہ روزنامہ ''ہماری آواز'' میں ''عکس و آہنگ'' کے عنوان سے ادبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی موضوعات پر ہر ہفتے کالم لکھتے تھے۔ اسی زمانے میں وہ ''جام نو'' میں ''اجڑے ہوئے میکدے کے رندان'' کے زیرِ عنوان مشرقی پاکستان میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور تخلیقی سرگرمیوں پر مشتمل قسط وار مضامین مسلسل دو سال تک لکھتے رہے۔ شفیق احمد ''جام نو'' اور ''پاکستانی ادب'' کراچی کے ادارہ تحریر میں بھی شامل رہے ہیں۔

تصنیفات میں شفیق احمد شفیق کا ایک تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ادراک'' کے عنوان سے سنہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب پر ساہتیہ کار سنسد سمستی پور (بہار)، بھارت نے فراق گورکھپوری اعلیٰ ادبی

ایوارڈ(Summit Award) سے نوازا ہے-ان کا ایک شعری مجموعہ ''پس لفظ آئینہ'' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا-اس کے علاوہ دو شعری مجموعے، چار تنقیدی و تحقیقی مضامین کے مجموعے اور دو انگریزی کی کتابیں My Views on Revviews (کتابوں پر تبصرے) اور Litteratures (مختلف ادباء و شعراء کے فکر و فن کے تجزیے) کتابت وطباعت کے مراحل میں ہیں-انہوں نے سہ ماہی ''پیش رفت'' (انٹرنیشنل) کا اجرا کیا جو تاہنوز شائع ہو رہا ہے-حال ہی میں ان کی ایک کتاب ''جدیت مابعد جدیت تک'' شائع ہوئی ہے-اس سہ ماہی کے وہ مدیر اعلیٰ بھی ہیں-شفیق احمد شفیق کی ایک غزل ملاحظہ کیجیے۔

شہر میں تیرے نوازش کبھی ایسی تو نہ تھی — سنگ الزام کی بارش کبھی ایسی تو نہ تھی

دیکھتے جس کو وہی صاحب ادراک ہے آج — ہائے ناقدریٔ دانش کبھی ایسی تو نہ تھی

جو بھی ملتا ہے چبھو دیتا ہے نشتر دل پر — رسم دلداری و پرسش کبھی ایسی تو نہ تھی

کس نے شفاف فضاؤں کو کیا ہے مسموم — میرے انفاس میں سوزش کبھی ایسی تو نہ تھی

ہوش اڑنے لگے رندانِ بلا نوش کے بھی — ساغر وقت کی گردش کبھی ایسی تو نہ تھی

تیر کی طرح ہے ہر لفظ ترا زو دل پر — آپ کی طرز نگارش کبھی ایسی تو نہ تھی

عزم کا چاند نہ ہوجائے کہیں ماند شفیق — رُخ حالات کی تابش کبھی ایسی تو نہ تھی

--••☆••--

شفیق بریلوی:

شفیق بریلوی ۲۰/اپریل ۱۹۲۲ء کو بریلی میں پیدا ہوئے- وہ ایک مشہور ادیب' شاعر' مورخ' اور بے باک صحافی تھے- انہوں نے جو علمی' ادبی' صحافتی اور دینی خدمات انجام دیں وہ قابل تحسین اور قابل تعریف ہیں- انھوں نے تحریک پاکستان میں بھی بڑی دلجوئی اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا- تقسیم سے قبل ان کی ایک تالیف ''ہمارے رہنما'' بہت مشہور ہوئی- ۱۹۴۲ء میں وہ قائداعظم محمد علی جناح سے بریلی میں متعارف ہو چکے تھے لیکن ان کی تالیف ''ہمارے رہنما'' نے شفیق بریلوی کو قائداعظم اور دوسرے مشاہیر رہنماؤں سے قریب تر کر دیا تھا- قائداعظم کے ارشاد پر وہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے اور کراچی میں مقیم ہوئے-

پاکستان آنے کے بعد بھی صحافتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا- ۱۹۴۹ء میں ان کی ایک تصنیف ''دختران حرم'' کے عنوان سے شائع ہوئی- اس کتاب میں تحریک پاکستان اور مسلم خواتین کی سیاسی اور معاشرتی اصلاح میں حصہ لینے والی مشاہیر خواتین کے تذکرے ہیں- ۱۹۶۱ء میں انھوں نے ''تذکرہ شاعرات پاکستان'' اور اسی سال ''زن زر زمین'' کے عنوان سے ایک ناول شائع کیا- اس ناول میں پاکستانی معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے- ان کی دیگر کتابوں میں ازواج مطہرات، پاک بیبیاں، تحریک پاکستان کی تاریخ محمد بن قاسم سے محمد علی جناح تک، قانون الٰہی پر مقالات ومضامین کا مجموعہ، نظام اسلام شامل ہیں- ان کے علاوہ انہوں نے حضرت نیاز احمد بریلویؒ کا دیوان مرتب کیا ہے-

روزنامہ ''ریاست'' کراچی ۸/نومبر ۲۰۰۴ء میں شفیق بریلوی کی اعلیٰ خدمات کے بارے میں جلیل قدوائی کی ایک تحریر کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''انہوں نے غیر منقسم ہندوستان میں تحریک پاکستان اور ادب وصحافت کی خدمت کے سلسلے میں جو کام سرانجام دیے اور قیام پاکستان کے بعد مشہور زمانہ ماہنامہ ''خاتون پاکستان'' جاری

کر کے اور خاص طور پر اس کے جو دینی نمبر شائع کیے ان سے متاثر ہو کر مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے مفسر قرآن کو لکھنا پڑا کہ ''شفیق بریلوی نے صحافت کو عبادت بنادیا ہے'' اس کے بعد انہوں نے اپنی زندگی عشق رسول ﷺ کی راہ میں کچھ اس طرح وقف کردی کہ یادگار زمانہ اور تاریخی ''ارمغان نعت'' شائع کی- اس ضخیم مجموعہ کے اب تک تین بہترین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ پچھلے چودہ سو برسوں کی عربی، فارسی اور اُردو کی بہترین نعتوں کا سب سے پہلا نادر روزگار مجموعہ ہے اس بابرکت مجموعہ میں ابتدائی عشاق رسول ﷺ اور صحابیان کرامؓ سے لے کر موجودہ دور کے بہترین نعت گو شعراء تک کو شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے- ''ارمغان نعت'' کے بارے میں شفیق بریلوی پر ہر طرف سے بہت سے تحسین و توصیف کے ڈونگر برستے رہے مگر میرے خیال میں حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مرحوم کی تعریف اس سلسلے میں بڑی قابل تعریف ہے- مولانا نے فرمایا کہ ''ارمغان نعت'' نے یہ ترغیب پیدا کی کہ جو لوگ کل تک لینن اور مارکس کے قصیدے لکھتے تھے وہ بھی نعت رسول ﷺ لکھنے لگے.........

قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی محترمہ فاطمہ جناح کی سرپرستی میں کراچی سے اُردو کا پہلا ماہنامہ ''خاتون پاکستان'' شائع ہوا اس کے چیف ایڈیٹر شفیق بریلوی بنائے گئے ''خاتون پاکستان'' کی رہنمائی کے علاوہ اس ماہنامہ نے پوری ملّت پاکستان کی قابل قدر خدمات انجام دیں- شفیق بریلوی نے علمی، ادبی، معاشرتی اور سماجی موضوعات پر جو خصوصی شمارے شائع کیے ہیں وہ درحقیقت تاریخی حیثیت کے حامل ہیں- خاص طور پر قرآن مجید، سیرت پاک اور تصوف پر جو عظیم و ضخیم خصوصی نمبر پیش کیے وہ اسلامی ادب میں یقیناً ایک اضافہ ہیں-
برعظیم کے بیشتر علماء، ادبا، شعراء اور سیاسی رہنماؤں سے شفیق کا گہرا ربط و تعلق رہا ہے، جن پر انہوں نے چند مشاہیر عالم سے مل کر ان کے انٹرویو بھی شائع کیے ہیں نیز عالم اسلام کے بہت سے مشاہیر کے حالات سے نئی نسل کو متعارف کرانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے- مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی ۱۹۵۱ء میں پہلی بار موتمر عالم اسلامی کے اجلاس کی صدارت کے لیے پاکستان تشریف لائے تو ان سے شہید ملت لیاقت علی خاں نے شفیق بریلوی کا تعارف

کرایا-اس تعارف کے نتیجے میں مفتی اعظم ''خاتون پاکستان'' کے لیے مضامین بھی لکھتے رہے-''

کراچی کا مشہور ادبی اور ثقافتی ماہنامہ ''الشجاع'' شفیق بریلوی ہی کی تجویز پر شجاع الدین مرحوم مالک ٹائمز پریس کراچی نے جاری کیا تھا-شفیق بریلوی صاحب ہی اس کے پہلے ایڈیٹر تھے-شفیق بریلوی کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کا ذکر اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں-ایسی اعلیٰ خدمات انجام دینے کی بناء پر وہ ایک تحریک اور ایک انجمن تھے-۲۲ر جولائی ۱۹۸۱ء کو اپنی نئی نسل کو علم و ادب کا بہت بڑا سرمایہ دے کر یہ عظیم شخصیت دار فانی سے رخصت ہوگئی-گلشن اقبال کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں-

---••☆••---

شکیل احمد ضیاؔء

شکیل احمد نام اور ضیاؔء تخلص کرتے ہیں۔ان کے والد ناصر علی (مولا بخش) شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا کے بھتیجے تھے اور ان کے نانا مولانا عبدالقادر مرحوم عالم دین اور ماہر لسانیات تھے۔ضیاؔء صاحب ۲۵رد سمبر سنہ۱۹۲۱ء کو یوپی کے شہر جھانسی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کا آغاز تین سال کی عمر سے ہوا، سات سال کی عمر میں حفظ قرآن کے علاوہ فارسی کی چند درسی کتب اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی تمام اردو ریڈرز پڑھ لیں۔گورنمنٹ ہائی اسکول باندہ (یوپی) میں چوتھی کلاس میں داخل ہوئے اور ۱۴سال کی عمر میں میٹرک پاس کیا۔انیس برس کی عمر میں انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے آنرز کیا اور اسی دوران الہ آباد بورڈ سے علوم شرقیہ کے تمام امتحانات ،منشی، کامل، مولوی، عالم اور فاضل پاس کیے۔اس کے بعد ہندی اور سنسکرت کی تعلیم بھی حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سنہ۱۹۳۴ء سے جھانسی کے اخبارات ہفت روزہ ''عزیز ہند'' اور ہفت روزہ ''ساکت'' میں صحافتی مضمون لکھنا شروع کیے۔سنہ۱۹۳۶ء میں ان کی ادارت میں ہفت روزہ 'روشن ضمیر' کا اجرا ہوا۔یہ ہفت روزہ سنہ۱۹۴۳ء تک جاری رہا۔ضیاؔء صاحب کو شعر و سخن کا ذوق بہت کم عمری سے ہو چکا تھا۔سنہ۱۹۲۹ء میں حضرت صادق جھانسوی سے شرف تلمذ حاصل کیا اور ان کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ ''صبح صادق'' میں ان کی پہلی غزل شائع ہوئی۔اس غزل کا ایک شعر بہت مشہور ہوا۔

یا ترا تذکرہ کرے ہر شخص
یا کوئی ہم سے گفتگو نہ کرے

سنہ۱۹۴۲ء میں انہوں نے ہندی کے عظیم شاعر اور مہذب سیاست کار شرن گپت کی شاگردی اختیار کی اور سنہ۱۹۴۳ء میں رئیس المتغزلین سید الاحرار مولانا حسرتؔ موہانی سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔سنہ۱۹۳۹ء میں ان کے ہندی گیتوں کا مجموعہ ''گیت مالا'' کے عنوان سے شائع ہوا جسے ان کے دو دوستوں

کماری کرشنا چترویدی اور شیل چترویدی نے مرتب کیا تھا' جو نا گفتہ بے حالات کی وجہ سے منصۂ شہود پر نہیں آ سکا- سنہ ۱۹۴۰ء میں ان کا پہلا مجموعہ '' لمعۂ طور'' شائع ہوا جس پر حضرت جگر مراد آبادی اور احسان الحق قریشی نے پیش لفظ اور مقدمہ تحریر کیا تھا- سنہ ۱۹۴۴ء میں ان کا دوسرا مجموعہ ''توریت نجم'' شائع ہوا اس پر مولانا حسرت موہانی اور مسز سروجنی نائیڈو نے دیباچے تحریر کیے-

اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء میں ضیاء صاحب پاکستان آئے اور کراچی میں آباد ہوئے- یہاں آنے کے بعد ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''موج گل'' (۱۹۷۴ء) اور سنہ ۱۹۸۰ء میں ''شعلۂ رنگ'' شائع ہوئے- اس کے بعد سنہ ۱۹۹۳ء میں چھٹا شعری مجموعہ ''دوسرا قدم'' شائع ہوا- اس کے علاوہ انہوں نے کچھ کتابیں انگریزی میں بھی تصنیف کی ہیں جن میں The quest and Pre-discovery of India (1946) دوسری کتاب The life and Times of Josh Malihabadi ہے جو طبع نہیں ہو سکی ہے- ان کی تیسری کتاب A History of Jewish Crimes ہے جو سنہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی- ۷/مارچ سنہ ۱۹۹۹ء کو شکیل احمد ضیاء کا انتقال ہوا- ان کا کلام ملاحظہ کیجیے

یہ غم' یہ خستگی غم تمہیں ہوا کیا ہے تمہارا اور یہ عالم تمہیں ہوا کیا ہے

غرورِ حسن کی طنازیوں پہ کیا گزری حضورِ عشق میں سرخم تمہیں ہوا کیا ہے

نہ اجتناب نہ بیگانگی نہ رم نہ گریز سپردگی کا یہ عالم تمہیں ہوا کیا ہے

کہاں وہ لذت خوابِ سحر کے افسانے کہاں یہ ذکرِ شب غم تمہیں ہوا کیا ہے

کہاں لبوں پہ وہ ہر دم شگفت گل کا سماں کہاں یہ دیدۂ پرنم تمہیں ہوا کیا ہے

اس قدر تو جو ہے خفا مجھ سے
ایسی کیا ہوگئی خطا مجھ سے
جس نے سب کچھ بھلادیا وہ بھی
پوچھتا ہے مرا پتا مجھ سے
کیا گلہ اس کی بے رُخی کا ضیاؔ
اس نے سیکھی ہے یہ ادا مجھ سے

--••☆••--

شکیل عادل زادہ

ممتاز صحافی ادیب مدیر شکیل عادل زادہ ۱۰ مارچ ۱۹۴۰ء کو مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ عمر کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ گھریلو کاغذات کے مطابق ان کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ ان کے والد عادل ادیب معروف شاعر تھے۔ وہ مراد آباد سے ایک ماہنامہ "مسافر" کے نام سے نکالتے تھے۔ شکیل عادل زادہ جب چھ سات برس کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت ان کے نانا نے کی۔ شکیل نے ان ہی نامساعد حالات میں میٹرک پاس کیا۔ تقسیم کے بعد جو فرقہ وارانہ حالات پیدا ہوئے اور تعصب نے مسائل کو جنم دیا تو مسلمانوں کے لیے زندگی دشوار ہوگئی اور شکیل کے نانا کا کاروبار بھی ختم ہوگیا تو انہوں نے ان سے کہا کہ اب میرے ایسے وسائل نہیں کہ میں تمہیں مزید تعلیم دلا سکوں۔ شکیل صاحب نے ٹیوشن پڑھانا شروع کیا۔ اپنے مستقبل سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ وہ اپنی والدہ کی بغیر اجازت پاکستان آگئے اور کراچی میں رئیس امروہوی کے گھر قیام کیا۔

رئیس امروہوی ان کے والد کے گہرے دوست تھے۔ رئیس امروہوی صحافی تھی ان کی صحبت میں شکیل بھی صحافت کی طرف مائل ہوگئے اور اپنی تعلیم جو منقطع ہوگئی تھی اُسے بھی جاری رکھا۔ یہاں آکر انہوں نے اُردو کالج میں داخلہ لیا اور بی کام کیا۔ اس کے بعد شکیل نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (عمرانیات) ایم اے (سیاسیات) کیا۔ انہوں نے ایم اے (فلسفہ) اور ایل ایل بی میں داخلہ لیا تھا لیکن ان مضامین میں ایک سال مکمل کر کے تعلیم کو خیر آباد کر دیا۔ شکیل اپنی تعلیم کے دوران رئیس امروہوی کے پرچے کے لیے اشتہار جمع کرتے اور پیسٹنگ اور ایڈیٹنگ کیا کرتے تھے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ جب رئیس امروہوی کا پرچہ جو میرا اور جونؔ ایلیا کا پرچہ بھی تھا چل نکلا تو یوں محسوس ہوا کہ یہاں میری وہ حیثیت نہیں ہے جو میں تصور کر رہا تھا۔

۱۹۷۰ء میں ان کی زندگی کا اہم موڑ آیا۔ انہوں نے اپنا ایک ڈائجسٹ "سب رنگ" کے نام سے

نکلا-''سب رنگ'' نے بہت جلد اپنی نفاست' پیشکش اور معیاری مضامین کے باعث نہ صرف ملک گیر بلکہ عالمی شہرت حاصل کرلی-اس کی اشاعت ایک لاکھ سے بھی تجاوز کرگئی-اُردو رسائل کی تاریخ میں ایک رکارڈ قائم کیا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی-وہ روزنامہ ''شیراز'' ''ماہنامہ ''انشاء'' اور ماہنامہ ''عالمی ڈائجسٹ'' کے عملۂ ادارت میں شامل ہوکر بھی لکھتے لکھاتے رہے ہیں-

شکیل عادل زادہ ادبی دنیامیں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں-کتابوں پر تبصرہ نگاری' کراچی کے سیاسی سماجی موضوعات اور مختلف عمرانی مسائل پر رائے زنی ان کا میدان ہے-دوسرے ادیبوں کی تخلیقات کا تمہیدی نوٹ لکھنے میں انہیں کمال حاصل ہے جو بجائے خود مختصر تخلیقی تحریر ہوتی ہے-ان کی تصانیف میں ''اقابلہ''، ''امربیل''، ''بازی گر'' موخرالذکر کے چار حصے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں-آج کل ''جیو'' ٹی وی چینل پر چیف اسکرپٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہے ہیں-

---••☆••---

شکیلہ رفیق

شکیلہ رفیق یکم جنوری کو سیتاپور میں پیدا ہوئیں۔ آباواجداد صدیوں پہلے یوپی کے خطہ اودھ میں آباد ہوئے۔ نسبی لحاظ سے راجپوت خاندان سے تعلق تھا جو مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ ان کے والد عبدالرحیم خان پیشہ کے لحاظ سے وکیل تھے۔ ان کا تعلق موضع سرودہ چاندخان تحصیل سدھولی ضلع سیتاپور کے ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ شکیلہ رفیق کے والد عبدالرحیم خان اپنی تعلیم کے سلسلے میں دیہات سے سیتاپور شہر آئے اور وہاں پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کرسچین کالج لکھنؤ سے بی اے اور پھر وہیں سے ایل ایل بی کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر انہوں نے سیتاپور ہی میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ ان کا شمار شہر کے معزز اور مقبول لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ اٹھائیس برس تک کارپوریشن کے ممبر رہے اور تاحیات ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد تمام اعزازات مراعات اور آسائشوں کو خیرآباد کہہ کر پاکستان آئے اور پیرالٰہی بخش کالونی کراچی میں آباد ہوئے۔

شکیلہ رفیق نے پی آئی بی کالونی کے سیکنڈری اسکول سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ میٹرک کے بعد سرسید کالج میں سال اول میں داخلہ لیا ہی تھا کہ ان کی شادی سید محمد رفیق حسین سے ہوگئی جو نواب آف بھوپال کے پڑپوتے تھے۔ جن کا تعلق لکھنؤ کے ایک علمی گھرانے سے تھا۔ شادی کے بعد شکیلہ رفیق کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ وہ گھریلو زندگی اور اپنے بچوں کو تعلیم دلانے اور ان کی تربیت کرنے میں مشغول ہوگئیں۔ وہ اپنے شوہر کی بھی خدمت گذاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھیں۔ ابھی ان کے بچے بہت چھوٹے ہی تھے کہ ایک الم ناک حادثہ پیش آیا جس سے شکیلہ رفیق دوچار ہو کر رہ گئیں۔ یہ سانحہ ان کی نوعمری میں ان کے اپنے رفیق شوہر رفیق حسین کا اچانک انتقال تھا جس کے بعد زندگی کا سفر طے کرنا ان کے لیے انتہائی مشکل ہوگیا۔ غم ودکھ اور نامساعد حالات میں اس عظیم خاتون نے بڑی بلند ہمت اور ثابت قدمی سے کام لیا۔ انہوں نے سوچا اپنے بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کے لیے مجھے کچھ کام کے ساتھ

اپنی تعلیم کو بھی دوبارہ جاری کرنا چاہیے جو شادی کے بعد منقطع ہو چکی تھی- چنانچہ انہوں نے اوّل درجے میں انٹر اور سیکنڈ ڈیویژن میں بی-اے کے امتحانات خوردسال بچوں کی کفالت کے ساتھ پرائیویٹ طور پر پاس کیے- اس کے بعد انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے اُردو ادب میں ایم اے کیا-

ذریعہ معاش اور بچوں کی تعلیم کے لیے انہوں نے پی آئی اے میں پبلک ریلیشنز بطور اُردو فیچر رائٹر کا کام کیا- اس کے علاوہ جنرل فلک پرواز کا الف سے ی تک سارا کام کرتی رہیں- علاوہ ازیں کسٹمر ریلیشنز کا کام بھی کرتی رہیں- وہاں وہ بحیثیت پبلک ریلیشنز آفیسر کام کرتی تھیں- انہوں نے جنگ' نوائے وقت' حریت' اخبار جہاں' اُردو ڈائجسٹ' سب رنگ اور خواتین کے بہت سے پرچوں میں خوب لکھا- ان کی قلمی کاوشیں صرف افسانہ نگاری تک محدود نہیں رہیں بلکہ انشائیہ نگاری' تنقیدی مضمون نویسی اور شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے- لیکن ان کا اصل میدان افسانہ نگاری ہے-

ان کی تصانیف میں ''خوشبو کے جزیرے''، ''قطار میں کھڑا آدمی''، ''کچھ دیر پہلے نیند سے''، ''فن اور شخصیت'' شامل ہیں-

شمس الحسن، سید

سید شمس الحسن ۱۸۸۵ء میں بریلی کے ایک مہذب علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈاکٹر امید حسن یو پی میڈیکل سروس میں تھے۔ شمس الحسن بچپن ہی سے نہایت ذہین طالب علموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ بریلی اور آگرہ میں تعلیم پائی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ ابتداً وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکریٹری سید وزیر حسن کے پرسنل اسٹاف میں بحیثیت اسٹینوگرافر رہے۔ پھر ۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ آفس سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں لیگ کے مرکزی دفتر میں اسٹنٹ مقرر ہوئے اور ۱۹۴۷ء تک ۳۳ سال وہ اسی عہدے پر خدمات انجام دیتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان لیگ کے بھی اسٹنٹ سیکریٹری رہے۔

سید شمس الحسن نے آل انڈیا مسلم لیگ کو متحرک رکھنے کے لیے بہت اہم خدمات انجام دیں۔ آفس سیکریٹری ہونے کے ساتھ وہ مسلم لیگ کے سرکاری ترجمان بھی تھے۔ مسلم لیگ کے دفتری انتظامات میں نواب زادہ لیاقت علی خان کے بعد دوسرے نمبر پر سید صاحب ہی کا نمبر تھا۔ انہیں روزنامہ ''ڈان'' اور ''منشور'' کے ناشر ہونے کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ قائداعظم شمس الحسن کی ذہانت اور ان کے کام سے بے حد خوش اور ان پر بہت اعتبار کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار ان کے بارے میں فرمایا تھا ''مسلم لیگ کیا ہے؟ میں، شمس الحسن اور ان کا ٹائپ رائٹر۔''

شمس الحسن صاحب قائداعظم کے اس قدر قریب تھے کہ قیام پاکستان سے چند روز قبل قائد نے انہیں دہلی میں اپنی رہائش گاہ پر بلوایا اور اپنے ذاتی خطوط جو مسلمانان ہند نے ان کو وقتاً فوقتاً تحریر کیے تھے، مسلم لیگ کا تمام ریکارڈ اور دوسری اہم دستاویزات ان کے حوالے کیں جن کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی۔ سید صاحب نے اس تمام ریکارڈ کو محفوظ رکھنے میں تاریخی کردار ادا کیا۔ وہ ہجرت کے وقت اپنا ذاتی سامان تو نہیں لا سکے لیکن یہ تمام ریکارڈ جو قائداعظم نے ان کے حوالے کیا تھا، بوریوں میں بھر کر کسی نہ کسی طرح کراچی لے آئے۔

یہاں آنے کے بعد جب کچھ سکون ہوا تو شمس الحسن صاحب نے ان تمام دستاویزات، خطوط اور ریکارڈ کو نہایت ذمہ داری، احتیاط اور بڑے سلیقے سے ۵۸ جلدوں میں مرتب کیا- اس ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے اس کے متعدد سیٹ تیار کرائے جن میں ایک سیٹ قائداعظم اکیڈمی کراچی کو، دوسرا سیٹ کراچی یونیورسٹی کو دیا اور تیسرا سیٹ قائداعظم انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد میں رکھوا دیا- اس کے علاوہ دو سیٹ انہوں نے ہندوستان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی کو بھیج دیے- ان کا مرتب کیا ہوا یہ ریکارڈ "Shamsul Hasan's Collection" (ذخیرۂ شمس الحسن) کہلاتا ہے- سید شمس الحسن صاحب نے ایک کتاب ''پلین مسٹر جناح'' (صرف مسٹر جناح) بھی لکھی- وہ ۱۹۵۸ء تک مسلم لیگ سے وابستہ رہے حتیٰ کہ جنرل ایوب خان کا مارشل لاء نافذ ہو گیا اور یہ تمام ریکارڈ بھی سربہ مہر ہو گیا-

شمس الحسن صاحب کے فرزند سید خالد شمس الحسن نیشنل بنک آف پاکستان میں سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے- خالد صاحب نہایت مخلص، بے ریا، نام و نمود سے دور اور متواضع شخصیت کے مالک تھے- اہل علم و ادب کی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد رہا اور سرگرم رہتے تھے- بے نظیر کے دور میں انہیں نشانہ ستم بنایا گیا لیکن ان کی زبان پر کسی کے سامنے شکوے کا ایک حرف نہ آیا اور انہوں نے اس سلسلے میں کوئی چارہ جوئی کی- دو سال تک نیشنل بنک میں اپنے اعلیٰ عہدے سے معطل رہنے کے بعد انہیں بحال کیا گیا- جب کہ اس وقت ملک ایک انقلاب سے گزر چکا تھا- شمس الحسن کے دوسرے بیٹے سید واجد شمس الحسن نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا- وہ بے نظیر کے دورِ حکومت میں برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر بھی رہ چکے ہیں- ۷ر نومبر ۱۹۸۱ء کو تحریکِ پاکستان کے مخلص کارکن سید شمس الحسن دارِ فانی سے رخصت ہو گئے- ان کی وفات پر سندھ کے مشہور سیاسی رہنما دانشور، بیباک صحافی اور ادب نواز پیر علی محمد راشدی نے روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں معرکتہ الآرا مضمون لکھا تھا-

--••☆••--

شمیم احمد

شمیم احمد کا تعلق ساداتِ علویہ کے خانوادے سے تھا-ان کے جدامجد سالار مسعود غازی کے ساتھ ہندوستان آئے ضلع بارہ بنکی کے قصبے دیوہ شریف کے قصباتی موضعات اور قصبات میں بس گئے تھے- ان کا اپنا خاندان موضع کھیولی، ضلع بارہ بنکی میں آباد تھا-شمیم احمد کے دادا سید عباس علی شاعر تھے اور جوہر تخلص کرتے تھے-انہوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی- لیکن شمیم احمد کے والد سید شرافت علی اپنے آبائی وطن کھیولی واپس آگئے تھے-وہ کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے-۱۹۳۶ء میں جب شمیم صرف تین سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا-

شمیم احمد مارچ سنہ ۱۹۳۳ء کو ضلع باندہ یوپی میں پیدا ہوئے-ہندوستان میں ان کی تعلیم باقاعدگی سے کسی اسکول میں نہیں ہوسکی- قیام پاکستان کے بعد وہ اپنی والدہ کے ساتھ بمبئی کے راستے پاکستان آگئے-ان کے بڑے بھائی سلیم احمد پاکستان پہلے ہی آچکے تھے-اس خاندان نے کچھ عرصہ حیدرآباد اور میرپورخاص میں بھی گزارا-ذریعہ معاش کے لیے سلیم احمد نے دکان بھی چلائی اور ٹیوشن بھی کیے-اس کے بعد یہ خاندان کراچی آگیا اور بہار کالونی میں آباد ہوا-

یہاں آ کر شمیم احمد نے ادیب، ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے-پھر جامعہ کراچی سے ایم اے (اردو ادب) فرسٹ ڈویژن اور سیکنڈ پوزیشن میں پاس کیا-اس زمانے میں وہ انجمن ترقی اردو کے شعبۂ قاموس الکتب سے وابستہ تھے-یہ شعبہ کچھ عرصے کے بعد ختم کردیا گیا تو شمیم احمد بھی سبکدوش ہوگئے-یہ سبکدوشی ان کے لیے بڑی پریشان کن تھی-وہ اب تنہا نہیں تھے بلکہ اب ان کا گھر بس چکا تھا-انجمن ترقی اُردو کے بعد اُردو ڈائجسٹ کے مدیر اور ممتاز صحافی الطاف حسن قریشی نے اُردو ڈائجسٹ کے لیے کراچی کے ادیبوں سے ان کی نگارشات حاصل کرنے کا کام شمیم احمد کے سپرد کردیا-لیکن اس کام کی اجرت اتنی نہ تھی کہ جس میں ان کی ضروریات پوری ہوسکیں-

اسی زمانے میں بلوچستان یونیورسٹی قائم ہوئی تو کرار حسین صاحب کا بحیثیت وائس

چانسلر تقرر رہوا- انہوں نے شمیم احمد کو یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں لیکچرار مقرر کر لیا- دس سال تک وہ بلوچستان یونیورسٹی میں لیکچرار رہے- اس کے بعد ان کا تبادلہ معاون پروفیسر شعبۂ اُردو، کراچی یونیورسٹی ہو گیا تو وہ کراچی آ گئے- مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد سنہ ۱۹۹۳ء کو شمیم احمد ریٹائر ہو گئے-

شمیم احمد نے ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی- شعر و ادب کے علاوہ ان کا گھر سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا- اس بات کا اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور کے دو اہم اخبار ''الہلال'' اور ''زمیندار'' کے پورے فائل ان کے گھر میں موجود تھے- شمیم صاحب نے بچپن ہی سے لکھنا لکھانا شروع کر دیا تھا- ان کی پہلی کاوش ایک رومانی ناولٹ تھا جو انہوں نے بارہ سال کی عمر میں تحریر کیا تھا- شمیم صاحب نے ''کارواں''، ''سیارہ''، ''ادبی گزٹ''، ''نیا دور'' کی ادارت بھی کی ہے- ان کی تصانیف میں (۱) ۲+۲=۵ ادبی مضامین کا پہلا مجموعہ (۲) ''زاویۂ نظر'' ادبی مضامین کا مجموعہ (۳) ''سوال یہ ہے؟'' ادبی مضامین کا مجموعہ (۴) ''تحریک پاکستان'' پاکستان کے ثقافتی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر کا جائزہ (۵) ''بھائی صاحب'' کتابیں شامل ہیں- ۲۰؍جون ۱۹۹۳ء کو شمیم احمد دار فانی سے رخصت ہو گئے- پاپوش نگر کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں-

شمیم احمد کی تصنیف ''زاویۂ نظر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ فرماتے ہیں:

''لیکن 'زاویۂ نظر' میں صرف اسی قسم کی مزیدار باتیں نہیں ہیں اور بھی بہت کچھ ہے- ادب، ادبی مسائل اور ادیبوں کے بارے میں دو درجن سے زیادہ مضامین کا یہ مجموعہ ادب کے سنجیدہ قارئین کی نظر سے ضرور گزرنا چاہیے- یہ روایتی تنقید نہیں ہے کہ پڑھنے والا اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتے - یہ روایتی تنقید کے خلاف اعلان جنگ ہے، جس سے قاری کے خون میں حدّت پیدا ہوتی ہے- آپ شمیم احمد سے لاکھ اختلاف کریں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تحریریں ادب اور اس کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی راہ دکھاتی ہیں- (سخن در سخن سے)

ڈاکٹر احسن فاروقی فرماتے ہیں:

''......خاص طور سے شمیم احمد کے مضامین تو اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ انہیں پڑھنے بیٹھتا ہوں تو بغیر ختم کیے نہیں رہ سکتا جب کہ دوسرے نقادوں کے مضامین دو چار جملوں یا زیادہ سے

زیادہ ایک آدھ پیراگراف سے زیادہ چل ہی نہیں پاتے، مجھے جھنجلا کر الگ رکھ دینا پڑتا ہے۔ ان سے اس دلچسپی کا جائزہ لیتا ہوں تو ان کی دو خاص صفتیں میرے سامنے آتی ہیں۔ اول ان کا تسلسل جو پہلے جملے سے توجہ کو پکڑتا ہے تو آخری جملے تک نہیں چھوڑتا بات میں بات نکلتی آتی ہے اور افسانہ کا تسلسل قائم رکھتا ہے۔ دوسرے ان کی شگفتگی جس کی بنا پر بڑے چونکا دینے والے فقرے اور جملے سامنے آتے رہتے ہیں اور مضمون کو ایک خاص اور انفرادی زندگی دیتے رہتے ہیں' اور میرے ذہن کو پھڑکاتے رہتے ہیں۔ لوگ ان کی فقرے بازی سے جل کر اسے تنقید کہنے کو تیار نہیں ہیں۔ مگر میں اس بات کو مانتے ہوئے کہ کہیں کہیں یہ فقرے سطحی اثر قائم کرنے سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہ بھی خوب سمجھتا ہوں کہ یہ فقرے کمال کے ساتھ فکر انگیز ہیں اور ان میں تنقید کی وہ جان ہے جس سے ہمارے منشیانِ تنقید آشنا نہیں ہیں' ان کی فقرے بازی محض طبیعت کو نہیں چونکاتی بلکہ فکر میں بھی جان ڈالتی ہے اور حقیقت کو نہایت بلاغت کے ساتھ واضع کرتی ہے۔ اس میں مضامین کی وہ جان ہے جو انہیں تخلیقی تنقید کے دائرے میں لاتی ہے۔ دورِ رواں کے نقادوں میں وہ ان چند میں ہیں جو اردو تنقید کو محض منشی گیری کے دائرے سے نکال کر جیتی جاگتی' زندہ اور زندہ رہنے والی چیز بنا دیتے ہیں۔'' (ایک مطبوعہ مضمون سے اقتباس)

--••☆••--

شمیم سوری، پروفیسر

اصل نام شمیم احمد خاں سوری اور قلمی نام شمیم سوری ہے۔ ۶ رمارچ ۱۹۳۳ء کو امروہہ کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حلیم احمد خاں متوسط درجے کے زمیندار تھے۔ اسلامیہ کالج کے سابق پرنسپل شجاع احمد زیبا مرحوم، شمیم سوری کے بہنوئی تھے۔ زیبا صاحب کی بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ تا مرگ رفاقت رہی ہے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے تنظیمی امور میں ان کا بڑا ساتھ دیتے تھے۔ اُردو کالج میں اردو فارسی کے نامور استاد پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر ان کے خالو تھے۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی داغ بیل ڈالنے والوں میں حبیب اللہ غضنفر بھی شامل تھے۔ پروفیسر نواب عالم فاروقی سابق چیئرمین سندھ پبلک سروس کمیشن بھی ان کے قریبی عزیزوں میں ہیں۔ ان کے آباواجداد زمانہ قدیم میں صوبہ سرحد سے امروہہ آ کر بس گئے تھے۔

شمیم سوری نے ابتدائی تعلیم گھر اور مدرسہ تحصیل سے حاصل کی۔ اس کے بعد انہیں ٹی جی سی ہندو اسکول میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں شمیم سوری نے اسی اسکول سے اول درجے میں میٹرک پاس کیا۔ تقسیم کے بعد زمینداری کا خاتمہ ہو گیا جس کے سبب ہر وہ شخص جس کا تعلق زمینداری سے تھا اپنی جگہ پریشان تھا۔ اسی دوران ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں شمیم سوری اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آ گئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ یہاں آئے تو بے سروسامانی کا سامنا تھا اور مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد شمیم سوری منسٹری آف انڈسٹریز حکومت پاکستان میں بحیثیت کلرک ملازم ہو گئے۔ ملازمت کے ساتھ انہوں نے اپنی تعلیم کو بھی دوبارہ جاری کیا جو ہجرت کے سبب منقطع ہو چکی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے اردو کالج سے انٹر اور ۱۹۵۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی کام کیا۔ بعد ازاں ۱۹۶۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اکنامکس) کا امتحان پاس کیا۔

شمیم سوری نے ہمیشہ علمی وادبی ماحول میں بیٹھنے اُٹھنے کو ترجیح دی ہے- چنانچہ گیارہ سال کی سرکاری ملازمت چھوڑ کر درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے-۱۹۶۱ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج میں بحیثیت لیکچرر ملازمت اختیار کرلی اور ترقی کرتے ہوئے پروفیسر کے منصب تک پہنچے- برصغیر کے نامور نقاد اور افسانہ نگار پروفیسر محمد حسن عسکری ان کے قریبی دوستوں میں تھے-۱۹۹۳ء میں مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد شمیم سوری ریٹائر ہوئے- شمیم سوری کا شمار بہترین اکنامکس پڑھانے والے پروفیسرز میں تھا- انہوں نے پاکستان کی معاشیات پر ایک کتاب ''معاشیات پاکستان'' بھی تصنیف کی جو بی کام کے کورس میں پڑھائی جاتی ہے- اس کے علاوہ شمیم سوری نے زبیری صاحب سابق پرنسپل قائدملت کالج اور ڈاکٹر انصار زاہد خاں پروفیسر نیشنل کالج کے ساتھ مل کر انٹرمیڈیٹ بورڈ کے لیے دو کتابیں ''کلچر اینڈ ہسٹری آف پاکستان (حصہ اول ودوم)'' بھی لکھیں ہیں- یہ دونوں کتابیں فارن اسٹوڈنٹ کے لیے لکھوائی گئی تھیں- ستمبر۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۷ء تک وہ سندھ پبلک سروس کمیشن کے ممبر بھی رہے- آج کل وہ کالج آف مینیج منٹ اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی (کومٹ) میں بحیثیت پرنسپل خدمات انجام دے رہے ہیں-

---••☆••---

شمیم صبائی متھراوی ۱۹۹۹ء

انتظار احمد نام شمیم تخلص اور قلمی نام شمیم صبائی متھراوی تھا- ۱۵ اردسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کو متھرا، یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے- شمیم صاحب مولوی انتظام الدین مرحوم کے فرزند تھے-ان کا تعلق متھرا کے ممتاز و معزز خاندان سے تھا-اس خاندان میں قضاۃ اور خطابت کے مناصب جلیلہ سلطنتِ مغلیہ کے دور سے نسل در نسل جاری ہے-ان کے تایازاد بھائی مولوی حبیب احمد (نسیم متھراوی) خطیب شاہی عیدگاہ متھرا تھے- ہجرت سے قبل شمیم نے ایم اے (اردو)، ادیب فاضل (اردو) اور منشی (فارسی) کے امتحانات پاس کیے-

وہ حکومتِ پاکستان کے ڈپٹی سیکریٹری تھے-مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد سنہ ۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہوئے-سنہ ۱۹۵۵ء سے سنہ ۱۹۶۵ء تک وہ (انجمن) اردوادب کے اعزازی معتمد رہے- اسلام آباد میں بزمِ شعروادب اسلام آباد کے مشاعروں میں بھرپور حصہ لیتے رہے ہیں-ان کی تصانیف وتالیفات میں (۱) اردو واسوخت (۲) نعت کا دریا (نعتوں کا مجموعہ) (۳) غزلوں کا مجموعہ (۴) نعت گو شعراء کا تذکرہ وغیرہ شامل ہیں-سنہ ۱۹۶۰ء میں حضرت شاہ جے پوری کی وفات پر ''ذکرِ غم'' کے تاریخی نام سے ممتاز شعراء اور ادیبوں کے مختلف مقالات، مضامین اور قطعات تاریخِ وفات کو کتابچہ کی شکل دی ہے-

شمیم متھراوی کی تصنیف بہ عنوان ''اردو واسوخت'' ایک تحقیقی کتاب ہے-جس کے مطالعے سے اردو شاعری کی پوری تاریخ اپنی جملہ اصنافِ سخن اور تاریخی ادوار کے ساتھ ذہن میں اُبھر آتی ہے- ڈاکٹر فرمان فتح پوری شمیم صاحب کی کتاب ''واسوخت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...... ''واسوخت'' کا لفظ، فارسی قواعد اور لسانی ساخت کے اعتبار سے ماضی ہے واسوختن کا-فارسی میں حاصلِ مصدر چونکہ ماضی کی صورت میں بھی آتا ہے-اس لیے ''واسوخت'' کو کلمۂ اسم یعنی ''واسوختن'' کا حاصلِ مصدر سمجھنا چاہیے-مصدر ''واسوختن'' مرکب ہے ''وا''

اور ''سوختن'' سے-اس لیے اس کا مفہوم ''سوختن'' سے یکسر الگ نہیں ہو سکتا- ''سوختن'' کے معنی ''جلنا'' بھی ہے اور ''جلانا'' بھی-............اردو شاعری کی اصطلاح میں ''واسوخت'' سے مراد ایسی نظم یا اشعار سے ہے جس میں محبوب کی وفاداری و توجہ سے مایوس اور اس کی بے اعتنائی و بے رخی سے مجبور ہو کر شاعر اسے طعن و تعریض کا نشانہ بناتا ہے- شکوے شکایت کرتا ہے- آداب عاشقی کے برعکس، اسے جلی کٹی سناتا ہے-غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے- تلملاتا ہے، کڑھتا ہے، بھڑتا ہے، مضطربانہ، برا بھلا کہتا ہے-ان باتوں کا مقصود، حقیقتاً محبوب کو اپنی طرف متوجہ کرنا اور دل داری والتفات پر دوبارہ آمادہ کرنا ہوتا ہے- اگر ان باتوں کا بھی اثر نہ ہوا تو وہ محبوب کو جلانے اور اس سے انتقام لینے کی غرض سے کسی دوسرے محبوب سے دل لگانے کی دھمکی دیتا ہے-''

یہاں ایک واسوخت ملاحظہ ہو

تسکیں مجھی کو دیتے ہو جب تب اے دوستو
سمجھاؤ جا کے اس کو تو تم سب اے دوستو
کچھ اور اس سوا نہیں مطلب اے دوستو
تب مجھ کو چین ہو وہ ملے جب اے دوستو
دیکھی ہے تن میں عشق کی کیا تپ اے دوستو
ہے روزِ حشر ہجر کی ہر شب اے دوستو
دوری میں اس کی ہائے جیوں کب اے دوستو
اس کو نہیں ہے قدر مری اب اے دوستو
پھر آ کے لاش پر مری پچھتائے گا بہت
آ کر مرے مزار پہ رو جائے گا بہت

---••☆••---

شمیم نویدؔ

خاندانی نام شمیم الدین، تخلص نویدؔ اور شمیم نویدؔ قلمی نام تھا- ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ، محلّہ غوریہ باغ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے- شہر علی گڑھ کو مسلم یونیورسٹی کے علاوہ قفل سازی کی صنعت کے سبب بھی نمایاں شہرت حاصل ہے- نویدؔ کے والد علیم الدین ایک کارخانہ چلاتے تھے- قفل سازی کی صنعت ان کا آبائی پیشہ تھا- شمیم نویدؔ کے دادا اور پردادا بھی صنعت کار تھے- شمیم نویدؔ کی تعلیم کے لیے گھر پر ایک ماسٹر رکھا گیا، اور پھر دینی تعلیم کے لیے ایک مدرسے میں داخل کیا جہاں انہیں قرآن کی تعلیم اور تختی لکھنا سکھایا گیا- ابتدائی تعلیم کے بعد شمیم صاحب نے مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا- اس کے بعد انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو) تک تعلیم مکمل کی- مزید تعلیم کے لیے ان کا ارادہ اُردو میں جدید غزل پر ڈاکٹریٹ کرنے کا تھا- مسلم یونیورسٹی میں جن صاحبانِ علم سے انہوں نے کسبِ فیض کیا اُن میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر معین احسن جذبی، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ تھے-

شمیم کو شعر و سخن کا ذوق بہت کم عمری میں اپنے ایک دوست رویندر جین کے ساتھ ہوا- یہ وہی رویندر جین ہے جس کا شمار آج بھی دنیائے موسیقی خاص طور پر فلمی دنیا میں، بلند ترین موسیقاروں میں ہوتا ہے- بقول شمیم نویدؔ کے وہ ایک بہت کالا اور بدشکل تھا- اس کا دہانہ آگے کو نکلا ہوا تھا اور دونوں آنکھوں کے ڈھیلے نہ ہونے کے برابر تھے- اسے بہت کم نظر آتا تھا، بس تھوڑی بہت جھائیں مارتی تھی- شمیم نویدؔ نے ترس کھا کر اُسے اپنا دوست بنالیا تھا- رویندر کا مستقبل سنوارنے کے لیے اس کے والد اندرمل جین نے بیٹے کو موسیقی کی تعلیم دلانے کے لیے ایک پنڈت کو رکھ لیا جو اسے موسیقی کی تعلیم دینے باقاعدہ آتا تھا- اس وقت شمیم نویدؔ بھی اس کے گھر پہنچ جایا کرتے تھے- اس طرح انہیں بھی راگ راگنیوں اور موسیقی سے لگاؤ ہو گیا- اس کے بعد وہ اور رویندر نئے گلوکاروں کی حیثیت سے فنکشنز میں بھی گانے لگے- یہیں سے نویدؔ کو غزلیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا تو میر تقی میرؔ سے لے کر فراق گورکھپوری تک

سیکڑوں غزلیں جمع کرلیں اور پھر رویندر جین کے ساتھ مل کر غزلوں کی دھنیں ترتیب دیتے اور فنکشنز میں سناتے تھے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نوید کسی شعر کا کوئی مصرع گاتے گاتے بھول جاتے تو اسی وقت اپنی طرف سے مصرع موزوں کر کے گا دیتے تھے۔اسی دوران شمیم کی ملاقات ایک کہنہ مشق شاعر مختار ہاشمی سے ہوئی۔انہوں نے ان کے شعر سنے اور تخلص پوچھا۔خاصے سوچ بچار کے بعد انہوں نے اپنا تخلص نوؔید رکھ لیا اور مختار ہاشمی کی شاگردی بھی اختیار کرلی۔اس طرح نوؔید تو بڑے شاعر ہو گئے اور رویندر جین ایک بڑا موسیقار بن گیا۔

شمیم نوؔید اپنے والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔اس سلسلے میں وہ دوسرے شہروں میں جاتے اور آرڈر بک کرا کر مال سپلائی کرتے تھے۔۱۹۶۳ء میں وہ کلکتہ کے ایک سرحدی قصبے بن گاؤں میں آرڈر بک کرانے گئے۔وہاں سے واپسی پر انہیں ملٹری والوں نے پکڑ لیا اور حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے دن ایک ایک قیدی کو بلایا اور نام پوچھ کر ہندوؤں کو چھوڑ دیا اور مسلمانوں کو ٹرک میں بٹھا کر ایک گھنے جنگل میں اتارا اور جنگل میں بھاگ جانے کے لیے کہا۔فوجیوں نے رائفلیں تانتے ہوئے یہ بھی کہا کہ پیچھے مڑ کر مت دیکھنا ورنہ گولی ماردی جائے گی۔

مجبوراً یہ لوگ وہاں سے جنگل کی طرف بھاگے۔آگے جا کر آپس میں مشورہ کیا کہ کلکتہ کس طرف سے جانا چاہیے۔اختلاف رائے کی وجہ سے یہ لوگ دو حصوں میں بٹ گئے اور دوبارہ سفر جاری کیا۔ بہرحال اسی پریشانی کے عالم شمیم نوؔید مشرقی پاکستان آنکلے اور پھر کسی طرح کراچی آ گئے۔کراچی آ کر ان کی ذہنی حالت کچھ دن بہت خراب رہی۔اپنے والدین، بہنوں، بھائیوں اور تمام قریبی عزیزوں کے چھوٹ جانے کا بڑا صدمہ تھا۔کوشش کے باوجود وہ پھر ہندوستان واپس نہ جا سکے۔مجبور ہو کر یہیں پر .GEC.Co میں سیل منیجر کی ملازمت اختیار کرلی۔نبی باغ کالج میں بحیثیت استاد کی پیش کش بھی ہوئی تھی لیکن انہوں نے منظور نہیں کی۔اس کے بعد بینک آف بھاولپور، ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے۔ریڈیو پاکستان میں کام کرنے کے دوران انہوں نے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو بھی کراچی بلا لیا۔اس سلسلے میں زیڈ اے بخاری مرحوم نے ان کی بہت مدد فرمائی۔

شاعری کے علاوہ شمیم نوؔید نے دوران تعلیم ہی سے نثر نگاری کا بھی آغاز کر دیا تھا۔ان کے افسانے، کہانیاں ہندوستان کے نمائندہ رسالوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔کراچی میں انہیں جوؔن ایلیا، شکیل

عادل زادہ اور متعدد لوگوں نے اپنے ڈائجسٹوں اور رسالوں میں لکھنے اور شریک ہونے کے لیے کہا۔اس طرح انہوں اپنا نثر نگاری کا شغف بھی جاری رکھا۔شیمم نویدؔ نے خود بھی پرچہ نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔کچھ عرصہ وہ ہمدرد فاؤنڈیشن کے شعبۂ ادارت میں مشیر بھی رہے۔اسی زمانے میں روزنامہ ''ایکسپریس'' کراچی کے چیف ایڈیٹر نیر علوی مرحوم نے، جن سے راقم الحروف کے بھی قریبی مراسم تھے، شیمم نویدؔ کو ''ایکسپریس'' میں ملازمت کے لیے نہ صرف پیش کش کی بلکہ اصرار کر کے بلالیا۔اس طرح شیمم صاحب ''ایکسپریس'' سے منسلک ہو گئے۔عجیب وغریب رومانٹک زندگی گزارنے والے شیمم نویدؔ ۲۲ رجنوری ۲۰۰۵ء کو اچانک ہارٹ فیل ہو جانے کے سبب دارفانی سے رخصت ہو گئے۔ان کا ایک مجموعہ کلام ''اک سائے کا قتل ہوا'' کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ان کا کلام ملاحظہ کیجیے ؎

کوئی خوشبو نہیں اب اس گلی میں
سنا ہے شہر میں ایسا بھی ہم نے

جو تنہا تھا مگر اک انجمن تھا
اسے دیکھا ہے اب تنہا بھی ہم نے

خود سے بھی اب تو رہتی ہے بیگانگی ہمیں
یہ موج درد جانے کہاں لے چلی ہمیں

ہم اپنے شہر ہی میں تماشا تو بن گئے
اب اور کیا بنائے گی یہ زندگی ہمیں

کیا کیا حسین شہر تھے جو خواب ہو گئے
لیکن وہ اک گلی کہ نہیں بھولتی ہمیں

احساس کے ویرانے سے اک گلشن جاں تک
صدیوں کی سلگتی ہوئی یادوں کا دھواں ہے

وہ گلی چھوٹ گئی اس کا بہت غم ہے مگر
ہم سلامت ہیں تو یارو در و دیوار بہت

وقت کا تیشہ چلتے چلتے بھول گیا رفتار اپنی
پتھر سے مضبوط ہو جیسے شیشے کی دیوار اپنی

ہم ایسے لوگ کہاں بار بار آتے ہیں
تری گلی سے گزرنے کو اک جہاں گزرا

آج پامال نظر ہیں ورنہ
یہ کبھی چاند سے چہرے ہوں گے

وہ گلی اتنی تو ویران نہ تھی
ہم بھی کچھ دیر تو ٹھہرے ہوں گے

نرم جھونکوں سے بھی دکھتا ہے بدن
روح کے زخم تو گہرے ہوں گے

کوئی تو شہر میں ہو دشمن جاں
یاں تو جو ہے سو بے ضرر سا ہے

پیرہن تشنگی کا ترسا ہے
کوئی بادل ضرور برسا ہے

---••☆••---

شہاب الدین رحمت اللہ

شہاب الدین رحمت اللہ ۹ رجون سنہ ۱۹۱۳ء کو ضلع شاہ آباد صوبہ بہار (بھارت) میں پیدا ہوئے- گورنمنٹ لا کالج پٹنہ سے سنہ ۱۹۳۳ء میں بی اے (آنرز) معاشیات کے بعد ۱۹۳۵ء میں انڈین سول سروس کے امتحانات میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے- اسی سال شہاب الدین رحمت اللہ کو انگلستان بھیج دیا گیا- وہاں آکسفورڈ کے جیمز کالج میں انہوں نے مزید تعلیم و تربیت حاصل کی- اس کے بعد سنہ ۱۹۳۷ء میں وطن واپس آ گئے- لندن کے دورانِ قیام ''آنریبل سوسائٹی آف دی مڈل ٹمپل'' سے بیرسٹرایٹ لا کیا اور آکسفورڈ کے ''زیسکن اسکول آف ڈرائنگ'' سے فن مصوری کی سند حاصل کی- شہاب الدین انگریزی، اردو کے معروف شاعر، ادیب اور مترجم تھے- فوٹوگرافی میں شہرت کی وجہ سے برٹش رائل سوسائٹی لندن اور علامہ اقبال سے عقیدت کی بناء پر اقبال اکادمی پاکستان کے لائف ممبر رہے-

شہاب الدین رحمت اللہ سنہ ۱۹۳۷ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک حکومت برطانیہ کی سول سروس کے مختلف عہدوں پر فائز رہے- ۱۴راگست سنہ ۱۹۴۷ء میں وہ ضلع ڈھاکہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے اور مسلسل پانچ سال تک اس عہدے پر فائز رہے- اس کے بعد سنہ ۱۹۵۹ء میں پاکستان منصوبہ بندی کمیشن کے سکریٹری مقرر ہوئے- تقسیمِ ہند کے بعد جب مہاجرین کے قافلے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان پہنچے تو شہاب الدین نے مرکزی و صوبائی حکومتوں کی امداد، ذاتی کوششوں اور دن ورات کی محنت سے مہاجرین کی آبادکاری کا انتظام کیا- انہوں نے نئی نئی بستیوں کی منصوبہ بندی کر کے مہاجرین کو آباد کیا اور اردو تعلیم کے لیے انہوں نے چھوٹے بڑے اسکول اور کالج قائم کیے- مشرقی پاکستان کا سب سے پہلا اردو کالج قائداعظم میموریل کالج ڈھاکہ، رحمت اللہ انسٹیٹیوٹ، رحمت اللہ اکیڈمی نرائن گنج، رحمت اللہ ماڈل ہائی اسکول ڈھاکہ قابلِ ذکر ہیں- شہاب الدین رحمت اللہ نے جو علمی، رہائشی اور دیگر ہر طرح کی خدمات انجام دیں، وہ ناقابلِ فراموش ہیں- شہاب الدین رحمت اللہ صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انہوں نے

قیامِ پاکستان کے پہلے دن ہی ڈھاکہ میں پاکستان کا پہلا پرچم بلند کیا۔

شہاب صاحب نے اردو زبان وادب کو ملکی و غیر ملکی انگریزی داں طبقوں سے روشناس کرانے اور اردو کی اہمیت کو تسلیم کرانے میں جو غیر معمولی خدمات انجام دیں ان کو بھلا دینا آسان نہیں ہے۔اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت خود ان کے انگریزی تراجم اور تصانیف ہیں۔چند مثالیں درج ذیل ہیں؛

۱۔آرٹ ان اردو پوئٹری:

شہاب الدین رحمت اللہ کی یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوئی۔یہ اردو کی ابتدا سے اقبال تک کے اردو شعرا کا انگریزی میں پہلا تذکرہ ہے۔اس کتاب میں انہوں نے اردو اشعار کے انگریزی اشعار میں ترجمے کیے ہیں۔اشعار سے متعلق تصاویر بھی انہوں نے خود ہی بنائی ہیں۔ان کے فن کی مصوری کو پاکستان کے عظیم مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے بہت پسند کیا۔آرٹ ان اردو پوئٹری'' کا پیش لفظ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تحریر فرمایا۔اس کتاب کی افادیت کے بارے میں بابائے اردو فرماتے ہیں:

''نظم کا نظم میں ایسا ترجمہ کرنا کہ مفہوم میں فرق نہ آنے پائے اور اصل کی خوبی اور زورِ بیان قائم رہے، نہایت دشوار ہے۔یہ فاضل مؤلف کی قدرتِ زبان کا کمال ہے کہ انگریزی ترجمہ نہایت صفائی اور خوش اسلوبی سے ایسی اچھی زبان میں کیا ہے کہ جسے پڑھ کر ان لوگوں کو جو اردو سے ناآشنا ہیں اصل شعر کا لطف آجائے گا۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ قابل مؤلف شعر کا ذوق ہی نہیں رکھتے شاعر بھی ہیں۔

مؤلف نے اشعار کے مفہوم کو تصاویر کے روپ میں ظاہر کیا ہے۔یہ کام انہوں نے اپنے کیمرے اور موئے قلم سے لیا ہے۔اس سے کتاب کی رونق اور دلکشی میں اضافہ ہو گیا ہے۔''

۲۔ہنڈریڈ جیمس فرام غالب: (غالب کے سو اشعار) ناشر نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی۔

اس کتاب کا پیش لفظ میجر جنرل سید شاہد حامد نے لکھا۔اس میں شہاب صاحب کی پینٹنگ کے علاوہ چغتائی اور صادقین کی بنائی ہوئی تصاویر بھی زینتِ کتاب ہیں۔

۳۔ٹن جمس فرام غالب (مصور): مطبوعہ کلکتہ۔۱۹۳۳ء

غالب کے دس منتخب اشعار منظوم ترجمہ، سر تیج بہادر سپرو، سر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر مبارک عظیم

آبادی جیسے مشاہیر نے اس ترجمے کو بے حد سراہا- ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی (تلمیذ داغ دہلوی) نے ایک نظم کی صورت میں اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا:

یہ ٹن جیمس غالب کے ہیں وہ جواہر
ہر اک کو جواہر کی اک کان کہیے
یہ دس شعر غالب کے وہ منتخب ہیں
کہ ہر شعر کو ایک دیوان کہیے
نئی چیز اردو کو یہ ہاتھ آئی
مبارک اسے تازہ عنوان کہیے

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی باتصویر ہے- جو ۱۹۴۵ء میں کلکتے سے طبع ہوا تھا- اس ایڈیشن کا پیش لفظ اس وقت کے گورنر بنگال کی اہلیہ لیڈی مالیپ کیسی نے لکھا تھا-

شہاب الدین رحمت اللہ کی تصانیف میں ان کے کلام کے تین مجموعے "مرقع شہاب"، "سحر حلال" اور "فردیات" شائع ہوئے- پہلے دو مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہو گئے تھے- تیسرا مجموعہ "فردیات" ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا- انہوں نے ایک خودنوشت "شہاب بیتی" بھی لکھی جس میں انہوں نے اپنے فرائض منصبی کے زمانے کے بہت سے حیرت انگیز واقعات کو قلمبند کیا ہے- شہاب بیتی پر تبصرہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"زیر نظر کتاب میں مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور "محرم درون ے خانہ" کی حیثیت سے بہت سے سنسنی خیز رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے- شہاب نے جو کچھ دیکھا- اسے کسی مصلحت کے بغیر بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے- یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں بہت سے چہرے بے نقاب ہو کر اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ نظر آتے ہیں-"

شہاب الدین رحمت اللہ ۳۰؍اکتوبر سنہ ۱۹۹۱ء کو دارِ فانی سے رخصت ہو گئے-

--••☆••--

شہناز پروین

شہناز پروین ۱۷رنومبر سنہ۱۹۴۷ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئیں۔ان کے والدانوارالحق کا علمی وادبی اور معزز گھرانے سے تعلق تھا۔تقسیم کے بعدان کا خاندان مشرقی پاکستان آ گیا اور چاٹ گام میں مقیم ہوا۔ابتدائی مذہبی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لیے قمرالنساء گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیااور پھراسی اسکول سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کاامتحان پاس کیا۔اس امتحان میں ان کی پوزیشن پورے مشرقی پاکستان میں آٹھویں تھی۔ایڈن گرلز کالج سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرسائنس کیا۔ اس کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں بی اے آنرز (اُردو) اور پھر فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے (اُردو) کے امتحانات پاس کیے۔

تعلیم سے فارغ ہوکر شہناز پروین نے درس وتدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا۔انہوں نے سنہ۱۹۷۰ء میں اپنی پہلی ملازمت کا آغاز گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین چانگام مشرقی پاکستان سے کیا۔اس کے بعد اِسی سال اِن کا تبادلہ ایڈن گرلز گورنمنٹ ڈگری کالج میں ہوگیا جہاں سنہ۱۹۷۲ء تک انہوں نے پڑھایا۔سقوطِ ڈھاکہ کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ کراچی آ گئیں۔یہاں آ کر وہ سیفیہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین کراچی میں پروفیسر مقرر ہوئیں۔سنہ۱۹۸۰ء سے سینٹ جوزف گورنمنٹ کالج برائے خواتین میں پروفیسر کی حیثیت سے پڑھارہی ہیں۔

شہناز پروین کوادب سے بڑالگاؤ ہے۔وہ ایک خوبصورت افسانہ نگار ہیں۔ابتدامیں وہ بچوں کی کہانیاں لکھتی رہیں اور انگریزی اور بنگلہ زبان کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ترجمے بھی کیے۔جو''کھلونا'' ''پھلواری''،''ہمدردنونہال'' میں چھپتے رہے۔آج بھی اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ تخلیق کرتی رہتی ہیں۔اُن کے افسانے افکار،سیپ،صریر،اقدار،تشکیل،تجدیداور دوسرے رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔جولائی سنہ۲۰۰۰ء کوان کے افسانوں کے مجموعہ''سناٹابولتا ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اپنے مجموعے کے بارے میں وہ کہتی ہیں:

''یہ افسانے کیسے ہیں یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی' میں نے آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ اچھے افسانے ہیں' اتنا ضرور کہوں گی کہ جس طرح ہر تخلیق کار کو اپنی تخلیق سے پیار ہوتا ہے مجھے بھی ان سے پیار ہے' ان کہانیوں میں اگر کوئی خوشبو ہوگی تو اپنے آپ تعارف بن جائے گی ورنہ وقت کے صحرا میں ریت کے ذروں کی طرح بکھر جائے گی۔

......میرا بچپن چاٹگام کی سرسبز وادیوں اور سمندر کے اطراف گزرا ہے' پہاڑ' سمندر اور جھیلیں آج بھی میری کمزوری ہیں ساحل سمندر سے سیپیاں چننا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ایک بار بڑی سی سیپی میرے ہاتھ آئی تھی جسے میں نے' اپنے کمرے میں پڑھنے کی میز پر رکھ دیا تھا' اکثر رات کے سناٹے میں مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس میں سارے سمندر کا شور ہے۔اسی طرح جب میں اپنے گھر والوں کے ساتھ جھیل کی سیر کو جایا کرتی تو سرکنڈے اور بانس کے جنگلوں میں یوں تو خاموشی ہوتی' مگر سانپوں کی سرسراہٹ اور ہواؤں کی گونج ساری فضا میں ایک پراسراریت' اضطراب اور بے کلی سی پیدا کر دیتی۔میں اس سناٹے کی آواز سے گھبرا کر بھاگتی جاتی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا میرے پیچھے آوازوں کا شور ہے پھر جیسے جیسے وقت گزرتا رہا یہ سناٹا میرے ساتھ سفر کرتا رہا جس نے مشرقی پاکستان کو اپنی آنکھوں سے ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔''

مجموعہ ''سناٹا بولتا ہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

''اگر شہناز پروین کے بعض افسانے ہماری ادبی تاریخ کے ادب لطیف کے دور میں لکھے جاتے تو انہیں آسانی سے تاثر پاروں کا نام دیا جاسکتا تھا۔مگر آج جب بیان' پلاٹ اور کردار' غرض یہ کہ افسانے کے سارے اجزائے ترکیبی معرض زوال میں ہیں شہناز پروین کی افسانوی شباہتیں ایک ایسی حسرت تعمیر کا اظہار کرتی ہیں' جو بہتر دنیا اور بہتر انسانوں کی جستجو سے عبارت ہے۔اگر حقیقت بیانی کی جگہ من مانے واہموں نے لے لی ہے تو مقام مسرت ہے کہ شہناز پروین کی خیالی صورتیں بھی حقیقت کے نقش سے خالی نہیں اور ان کا دل مریضانہ' اذیت پسندانہ اور انتشار آفریں تصورات کی بجائے' ایسی تصویروں کو پیش کرنے کی جانب مائل ہے' جن میں انسانوں سے محبت کا رنگ غالب ہے۔''

شہناز شورو

شہناز شورو ۱۷ر نومبر ۱۹۶۹ء کو سائیں داد شورو سندھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد عبدالکریم شورو اوسط درجے کے زمیندار تھے۔ شہناز شورو کی والدہ کا تعلق سکھ گھرانے سے تھا جنہوں نے مذہب اسلام قبول کیا اور اس کے بعد سختی سے صوم صلاۃ کی پابند ہوگئیں۔ انہیں اپنے بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت کی بڑی خواہش تھی جسے دیہات میں رہ کر پوری کرنا بہت مشکل تھا۔ لہذا انہوں اپنے شوہر کو دیہات سے نکل کر شہری زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اپنی بیوی کی خواہش پر ان کے والد اپنی زمینیں چھوڑ کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ میر پور خاص منتقل ہو گئے۔ یہاں پر شہناز شورو اور ان کے چھ بہن بھائیوں نے سرکاری اسکول میں تعلیم شروع کی۔ شہناز شورو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھتی رہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد شہناز نے گورنمنٹ گرلز اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ انٹر اور بی اے ابن رشد کالج میر پور خاص سے کیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے ادب (انگریزی) کیا۔ ۱۹۹۹ء میں شہناز شورو نے اُردو ادب میں بھی ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۹۹۶ء میں پبلک سروس کمیشن سے لیکچرارشپ کا انٹرویو پاس کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شہناز شورو نے تدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا۔ آج کل وہ ایس ایم کالج میں بحیثیت لیکچرار فرائض انجام دے رہی ہیں اور اپنے طالب علموں میں بہت مقبول ہیں۔ سنہ ۱۹۹۵ء میں ان کی شادی پروفیسر اکبر سے ہوئی جو بعد میں اسسٹنٹ کمشنر اور اب محکمہ ٹورزم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

شہناز شورو کو لکھنے لکھانے کا شوق تو زمانہ طالب علمی سے تھا لیکن فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ سنجیدگی سے افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئیں اور چند ہی برس میں انہوں نے ادبی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل کر لیا۔ ابتدا میں ان کے ادبی مضامین اخبار ''امن'' میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد بچوں کے لیے ''ہونہار پاکستان''، ''ٹوٹ بٹوٹ'' اور ''ساتھی'' میں کہانیاں لکھیں۔ یہاں انہیں محمود شام اور انیس

الرحمٰن کی شفقت حاصل رہی۔ روزنامہ ''امن'' میں نوجوانوں کے صفحہ کے لیے پندرہ روزہ کالم ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' لکھنا شروع کیا۔ اس طرح ان کا ادبی سفر آگے بڑھتا رہا۔

ان کی ایک مشفق استاد نکہت رضوی جنہوں نے ''ٹوٹ بٹوٹ'' میں شہناز کی کہانیوں میں روانی دیکھ کر ان کی بڑی تعریف کی اور ان سے کہا کہ وہ ماہنامہ ''صریر'' میں افسانے لکھا کریں۔ یہ رسالہ نکہت رضوی کے والد فہیم اعظمی نکالتے تھے۔ اس طرح انہوں نے افسانہ نگاری شروع کی اور دن بدن ان کے افسانوں میں نکھار آتا چلا گیا۔ شہناز شورو کے افسانوی مجموعہ ''لوگ لفظ اور انا'' شائع ہو چکا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف افسانہ نگار فردوس حیدر نے اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے ہیں:

> ''شہناز شورو اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ہے جو اپنے عہد کے معاشرے کی نبض شناس ہے اور انسان کی ذات کی شکست و ریخت بالخصوص عورت کے حوالے سے اچھی طرح سمجھتی ہے اور اسے دوسروں کو محسوس کرانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔''

--••☆••--

شہناز نور

شہناز نور ضلع سکھر میں پیدا ہوئیں-اُن کی پیدائش اس وقت ہوئی جب ان کا خاندان ہجرت کی سختیوں کا بوجھ اُٹھائے مہاجر کیمپ میں اقامت پذیر تھا-ان کا اصل نام شہناز اختر رکھا گیا-اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد ہونے کے ناتے بڑی لاڈلی تھیں-خاص طور پر ان کے والدان سے بہت پیار کرتے تھے-ان کے والد پیشے کے لحاظ سے ایک معروف حکیم تھے-شہناز کا گھرانا مشرقی تہذیب پسند تھا جہاں بیشتر گھرانوں میں لڑکیوں کو تعلیم گھروں میں ہی دی جاتی تھی-لیکن ان کے والد سیر و سیاحت کے بے حد شوقین تھے-انہوں نے برما سے لے کر روس کی مسلم ریاستوں تک سیاحت کی-وہ کمیونسٹ پارٹی کے مشہور لیڈر باروا سوہن سنگھ کے قریبی دوست تھے-جس کی وجہ سے ان میں خاصی فکری تبدیلی آچکی تھی-انہوں نے شہناز کو تعلیم دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی-

شہناز نے گورنمنٹ گرلز پرائمری اسکول سکھر سے پرائمری اور پھر کراچی ملیر کے ارمان سیکنڈری اسکول ماڈل کالونی سے مڈل پاس اور ریلوے گرلز ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا-۱۹۶۸ء میں اسلامیہ کالج سکھر سے بی اے کیا-سنہ ۱۹۷۰ء میں ایم اے اُردو کا امتحان دینے والی تھیں کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ امتحان میں شریک نہ ہوسکیں-والد کے انتقال کے بعد شہناز کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا-

سنہ ۱۹۷۴ء میں سکھر میونسپل کمیٹی 'جو اُس وقت کارپوریشن نہیں بنی تھی' کے تحت ایک مقامی براڈکاسٹنگ اسٹیشن میں بحیثیت پروڈیوسر ملازم ہوگئیں-یہاں پر شہناز کے فرائض میں پروگرام پروڈکشن کے ساتھ مقامی خبریں پڑھنا اور اناؤنسمنٹ بھی شامل تھا-اس براڈکاسٹنگ اسٹیشن کے اعزازی ڈائریکٹر روزنامہ ''حکیم'' کے مدیر اعلیٰ مہر الٰہی شمسی تھے-سنہ ۱۹۷۴ء میں سندھ کے محکمۂ اطلاعات نے اپنے یہاں کچھ خالی جگہوں کے لیے اشتہار دیا-چنانچہ مہر شمسی صاحب کی ہدایت پر شہناز نور نے بھی درخواست دے دی-انٹرویو کے بعد ان کو اس محکمہ میں بحیثیت اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر' ملازمت مل گئی-اسی محکمہ میں ترقی کرتے ہوئے آجکل وہ کراچی میں بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہی ہیں-حالات کچھ

سازگار ہوئے تو انہیں اپنی تعلیم کا خیال آیا جو دس گیارہ سال پہلے منقطع ہو چکی تھی-لہذا سنہ۱۹۷۸ء میں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو) کیا-

شہناز نور کو اپنے والد سے بے حد لگاؤ تھا-ان کے انتقال کے صدمے نے اُن کے ذہن و دل پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں-آخر ان ذہنی الجھنوں اور مایوسیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو سماجی بہبود کے کاموں میں مصروف کرلیا-۱۹۶۷ء کے اواخر میں انہوں نے پیپلز پارٹی کی سماجی بہبود کے لیے کام شروع کر دیا تھا-ابتدا میں وہ ''ممبران انجمن خواتین''سکھر کی سکریٹری اور پاکستان یوتھ کونسل کی رکن رہیں-اس کے بعد پیپلز پارٹی میں خواتین کے شعبہ کی علیحدہ بنیاد رکھی جسے بعد میں ملکی سطح پر اپنا لیا گیا-

شہناز نور کو شعر و سخن کا ذوق والد سے ورثے میں ملا تھا-ان کے والد سندھی اور پنجابی کے مستند شاعر تھے-شہناز طالب علمی کے زمانے میں شعر کہنے لگی تھیں لیکن ان کے والد نے ہدایت کی پہلے اپنی تعلیم مکمل کرلو بعد میں اس شوق کو بھی پورا کر لینا-وہ کراچی میں ادبی تنظیم ''ارباب قلم'' سے بھی منسلک ہیں-اس تنظیم کے صدر جناب شبنم رومانی ہیں-شہناز نور کا اُردو مجموعہ ''نشاطِ ہجر'' کے عنوان سے زیرِ طباعت ہے-ان کی ایک نظم بطور نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

گردش نصیب زیست کو اک جام لکھ گیا — سارے جہاں کو بادۂ آلام لکھ گیا
کی سازباز وقت نے ایسی مرے خلاف — موسم جُدائیوں کا میرے نام لکھ گیا
بالاتفاق ذکرِ وفا ناشناس پر — وہ اپنے دوستوں کے کئی نام لکھ گیا
کم وقت اور طویل سفر تھا، وہ تیزرو — دیوار پر ہی آخری پیغام لکھ گیا
رکھا دیا جلا کے سرِ رہگذار نورؔ — ایسے گزارنا سحر و شام لکھ گیا

---••☆••---

صبا متھراوی

اصل نام رفیع احمد، صبا تخلص اور قلمی نام صبا متھراوی تھا۔ ۱۹۱۶ء کو متھرا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی رضی الدین شاہی عیدگاہ متھرا کے خطیب تھے۔ صبا متھراوی معزز اور ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے خاندان میں قضاۃ اور خطابت کے مناصب جلیلہ سلطنتِ مغلیہ کے دور سے نسل در نسل جاری رہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے مولوی، فاضل، منشی کامل، ادیب فاضل، اعلیٰ قابل اور ہائی اسکول کے امتحانات پاس کیے۔ انگریزی ادب کا پرائیویٹ مطالعہ کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس وتدریس کو مقصدِ زندگی قرار دیا۔ متھرا میں وہ جمعیۃ القریش اسکول میں صدر مدرس اور ضلع مسلم لیگ متھرا کے صدر رہے۔

شعروسخن کا ذوق ہوا تو سنہ ۱۹۳۵ء میں علامہ سیماب اکبرآبادی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور سنہ ۱۹۴۰ء میں فارغ الاصلاح ہوئے۔ ادب سے لگاؤ طالب علمی کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ اسکول کی بزمِ ادب کے سرپرست اور اسکول کے مجلّہ ''بہارِنو'' کے مستقل نگراں مقرر ہونے کے علاوہ مختلف ادبی انجمنوں کے صدر و سرپرست رہے۔ متھرا میں بزمِ روحِ ادب کے ناظم عمومی اور آل انڈیا سیماب لٹریری سوسائٹی متھرا کی شاخ کے بانی اور نگراں اور کراچی میں علامہ سیماب کی انجمن ترویجِ اردو کے صدر رہے۔ مجلسِ مکتبۂ اردو ادب کے صدر و سرپرست اور پاکستان رائٹرگلڈ کے ممبر ہوئے۔ متھرا میں اتفاق اور الصادق کے اداروں میں اور کراچی میں ماہنامہ ''پرچم'' کے حلقۂ ادارت میں بھی شریک رہے۔

ان کی تصنیفات میں (۱) ''آئینے'' (ہندوستان سے ہجرت کے منظوم تاثرات) (۲) ''محاذِ قلم'' (رزمیہ نظموں کا مجموعہ۔ اس سے نوجوانوں میں نظم وضبط اور حبّ الوطنی کے جذبات پیدا ہوں گے) (۳) ''خطباتِ غوثِ اعظم منظوم'' (۴) ''دربارِ رسالت میں'' نعتوں کا مجموعہ (۵) ''ترویجِ فنِ تاریخ'' تاریخ گوئی پر مبسوط مقالہ (۶) ''دس ستارے'' عشرۂ مبشرہ خراج منظوم (۷) ''مصدرِ الہام'' غیر منقوط

کلام کا مجموعہ (۸) ''گل افشاں نغمات'' (۹) ''نصابی'' کتاب فارسی برائے درجہ ہفتم

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صباؔ متھراوی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمارے شعراء کی توجہ عام طور پر مدح ومنقبت کے باب میں صرف چندا کابرو آئمہ تک ہی محدود رہی۔ اردو کے ممتاز تاریخ گو اور نعت نگار شاعر حضرت صباؔ متھراوی نے ہمارے شعراء کی اس کوتاہی اور شعری سرمایہ کی کمی کو محسوس فرمایا اور دس ستارے کے عنوان سے مدح اور منقبت میں ان صحابۂ کرام کو بھی شامل کر لیا، جنہیں عشرۂ مبشرہ کا لقب دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مختصر کتاب نہ صرف فکر وفن کے محاسن کے اعتبار سے بلکہ موضوع کے اعتبار سے بھی اردو کی مذہبی شاعری میں بالکل نئی چیز ہے۔''

ڈاکٹر اسلم فرخی شعبۂ تصنیف وتالیف کراچی یونیورسٹی لکھتے ہیں:

''حضرت صباؔ متھراوی کا شمار پاکستان کے قادرالکلام شعراء میں ہوتا ہے۔ حضرت صباؔ کو تمام شاعرانہ اوصاف پر ماہرانہ دسترس حاصل ہے۔ غزل ہو، قصیدہ ہو، نظم ہو، رباعی ہو، قطعہ ہو صباؔ صاحب نے ہر صنف میں اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے، فن تاریخ سے انہیں طبعی مناسبت ہے۔ ان کی تاریخیں بے مثل، برجستہ اور فنی مہارت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ صباؔ صاحب نے اپنی علالت کے باوجود شعر وشاعری سے قطع تعلق نہیں کیا اور اس عالم میں جبکہ اکثر فنکار ذہنی اضمحلال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دس ستارے کے عنوان سے عشرہ مبشرہ کے بارے میں منظوم ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس مجموعے میں حمد ونعت کے علاوہ حضرات عشرہ مبشرہ کے بارے میں بڑے خوبصورت دلآویز اور شایانِ شان انداز میں اظہارِ عقیدت کیا گیا ہے۔ اس اظہارِ عقیدت میں صباؔ صاحب کی شاعرانہ مہارت، قادرالکلامی، ذوق وشوق اور بلند نگاہی سبھی کچھ شامل ہے یہ اظہارِ عقیدت رسمی نہیں، اس میں روح سے نکلی ہوئی آواز کا کیف واثر ہے اور تاریخی اشارے ہیں۔ سیرت کی صحیح تصویر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاعرانہ فضا اور پاکیزہ زبان کا التزام ہے۔ دس ستارے ایک ادبی ارمغان بھی اور اس کا مطالعہ ولولۂ وشوق میں اضافہ کا سبب بھی ہوگا۔''

صباؔ متھراوی سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ۴؍اکتوبر سنہ ۱۹۸۸ء کو صباؔ متھراوی نے داعیٔ اجل

کو لبیک کہا، نئی حسن کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان کے کلام کے چند اشعار پیش ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

سمتِ متھرا سے چلا سوئے مدینہ بادل
برق کے کاندھے پہ رکھے ہوئے میزانِ عمل

مری شاعری میں مری زندگی میں فراواں فراواں پیامِ محمدؐ
وہ احمدؐ مُرسل وہ عمل کا محور وہ طورِ عطا رحم و کرم کا مصدر

میں نے جب سوچا کہ لکھوں سالِ نو پر نظم نو بول اٹھا وقت کا سرگرم قاطع گورکن
زندگی کی قبر پر چادر چڑھی ہے اک نئی سالِ نو ہے عالمِ کہنہ کا اک تازہ کفن
زندگی جب زندہ ہوگی سالِ نو ہوگا وہی مٹ مٹا کر آدمی بھی آدمی بن جائے گا
صبح میں بھی حسن ہوگا شام میں بھی اک نکھار گردشِ دوراں سلامت دَور وہ بھی آئے گا
یہ تصنع یہ تکلف یہ تنوع کچھ نہیں! زندگی کے واسطے سامانِ نو پیدا کرو
زندگی بھی مرگئی انسان جب سے مرگیا سالِ نو کے واسطے انسانِ نو پیدا کرو

یہ تری تہذیب حاضر نام کی تہذیب ہے
موم کی گائے بھی ناداں دودھ دیتی ہے کہیں
یہ دہکتے سرخ چہرے یہ چمکتے پیرہن
پھول ہیں کاغذ کے جن میں نام کو خوشبو نہیں

---••☆••---

صبیح رحمانی

سید صبیح الدین رحمانی، صبیح تخلص ہے، جنہیں ادبی دنیا ان کے قلمی نام صبیح رحمانی کے نام سے جانتی ہے، ۲۷ر جون ۱۹۶۵ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید اسحٰق الدین ہے۔ صبیح الدین نے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات سے بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ذریعۂ معاش کے لیے پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن کارپوریشن میں ملازمت اختیار کر لی۔ اپنے گھر کے دینی ماحول سے متاثر ہو کر صبیح الدین کو نعت گوئی شوق ہوا اور ذاتی ذوق کی وجہ سے نعت خوانی کرنے لگے اور چند ہی دنوں میں نعت گوئی میں انہوں ایک منفرد مقام حاصل کر لیا۔ صبیح رحمانی نے نعت کے ادبی فروغ کے لیے مختلف نعتیہ جرائد کا اجرا بھی کیا جس میں نعت رنگ کو (جس کے وہ مدیر بھی ہیں) بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی اور دوسرا ''سفیر نعت'' ہے جو ان کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ ان کے نعتیہ کلام کے بارے میں ادیبؔ رائے پوری لکھتے ہیں:

''مجھے نہیں معلوم کہ تمہاری شاعری میں ''سنجیدہ سرگرمی'' ہے کہ نہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا غلط یا درست، تمہارے اشعار میں جذبہ عشق ﷺ کی فراوانی ہے۔ جس کے سبب اکثر تمہاری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور یہی سیل اشک تمہیں بہا کر مدینہ لے جاتا ہے۔ اب تمہارا یہ جذبہ عقیدت کے سمندر میں بہہ جانا ''کاغذ کی ناؤ'' ہے یا وہ بیڑہ جو بحر ظلمات اور طوفان رنج والم سے نکال کر سکون دل اور قرار جاں تک لے جاتا ہے جسے مدینہ کہتے ہیں۔''

ان کی مطبوعہ کتب کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

(۱) جادۂ رحمت (۱۹۹۳ء) (۲) ماہِ طیبہ (۱۹۸۹ء) (۳) خوابوں میں سنہری جالی (مجموعۂ نعت) (۴) سرکار کے قدموں میں (مجموعہ نعت) (۵) سلام کے لیے حاضر ہو جائے غلام (مجموعہ نعت) وغیرہ۔

اس کے علاوہ ان کی نعتوں کے متعدد آڈیو ویڈیو سی ڈی ریلیز ہو چکے ہیں۔ وہ کئی ممالک میں نعتیہ مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ان کی تالیفات: ایوانِ نعت (دبستانِ کراچی کے زندہ شعرا کے کلام

اوردبستانِ کراچی کی نعتیہ خدمات کا جائزہ) مطبوعہ ۱۹۹۳ء جمالِ مصطفیٰ ﷺ (انتخاب نعت) مطبوعہ ۱۹۹۷ء ہیں۔

صبیح رحمانی کو ان کی شاعرانہ خدمات کے اعتراف میں متعدد ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ حکومت پاکستان نے نعت رنگ پر صبیح رحمانی کو ۲۰۰۴ء میں صدارتی ایوارڈ عطا کیا۔ ان کی شاعرانہ خدمات پر حکومت کینیڈا نے بھی (۲۰۰۲ء) میں ایوارڈ دیا۔ علاوہ ازیں متعدد انجمنوں اور شخصیات نے انہیں مختلف ایوارڈ اور اعزازات سے نوازا ہے۔ ان کے کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

صبیح رحمانی کی نعتوں کے اشعار درج ہیں ملاحظہ کیجیے۔

کوئی مثل مصطفیٰؐ کا کبھی تھا، نہ ہے، نہ ہوگا
کسی اور کا یہ رتبہ کبھی تھا، نہ ہے، نہ ہوگا

ایک اک گام پہ روشن کرو مدحت کے چراغ — نعت کی روشنی پھیلاؤ جہاں تک پہنچے
جب بھی آیا ہے صبیحؔ اسم محمدؐ لب پر — قافلے حرف کے معراج بیاں تک پہنچے
قلم خوشبو کا ہو اور اس سے دل پر روشنی لکھوں — مجھے توفیق دے یارب کہ میں نعت نبی لکھوں
قلم کی پیاس بجھتی ہی نہیں مدح محمدؐ میں — میں کن لفظوں میں اپنا اعتراف تشنگی لکھوں
نظر کے ریگزاروں کو متاع نقش پا دے دو — میں ہوں تاریک راہوں میں اجالوں کا پتہ دے دو
جہالت کے اندھیروں کی فصیلیں جس سے گر جائیں — مرے ہاتھوں کو ایسا علم کا روشن دیا دے دو
لکھے سب پھول جیسے لفظ سوچے چاند سے مضموں — صبیحؔ نعت گو کو نعت کا لہجہ نیا دے دو
تیرگی سے خوف کھا کر جب پکارا آپؐ کو — جسم وجاں میں روشنی کا اک سمندر جاگ اُٹھا
فرش پر عرش کے حالات سنائے ہم کو — اُنؐ کے آنے سے گیا بے خبری کا موسم
آپؐ نے آ کے بتائے ہیں بصیرت کے رموز — آپؐ سے سب کو ملا ہوش نگہی کا موسم
اُنؐ کی نسبت سے دعاؤں کا شجر سبز ہوا — ورنہ ٹلتا ہی نہ تھا بے ثمری کا موسم

--••☆••--

صدرالحق، ڈاکٹر محمد

ڈاکٹر محمد صدرالحق ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ء کو عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) اور ایم اے (فارسی) کیا- تقسیم کے بعد وہ مشرقی پاکستان چلے گئے جہاں انہوں نے ڈھاکہ میں رہائش اختیار کی اور درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے- ہندوستان اور پھر مشرقی پاکستان میں وہ مختلف درسگاہوں میں تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتے رہے- آخر میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت پروفیسر خدمات انجام دیں- انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تدریس، تحقیق اور جستجو میں صرف کیا- ڈھاکہ یونیورسٹی سے انہوں نے ایم اے (اسلامی تاریخ وثقافت) اور پھر عبدالغفور خاں نساخ پر مقالہ لکھ کر ڈھاکہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی- یہ مقالہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی سے شائع ہوا جسے اُردو ادب میں ایک اضافہ کے طور پر سراہا گیا- ملک کے محققوں اور نقادوں نے ڈاکٹر صاحب کو اس تحقیقی کام کی بڑی داد وتحسین دی اور تبصرے لکھ کر اپنی گراں قدر آراء کا اظہار کیا- انہیں اردو زبان اور ادب سے بے انتہا لگاؤ تھا- اس سلسلے میں وہ ہمیشہ بڑی جاں فشانی سے کام کرتے رہے اور تحقیق وجستجو میں مصروف رہ کر نئے نئے انکشافات کرتے رہے-

ڈاکٹر محمد صدرالحق نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ تعلیم وتدریس اور تحقیق وجستجو میں صرف کیا- نساخ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے دوسری تحقیقی کتاب ''انکشافات'' لکھ کر ادبی دنیا کے سامنے پیش کی اور خراجِ تحسین حاصل کیا- ''انکشافات'' میں ان کے پانچ مقالے لکھے ہیں، جن میں چار کا تعلق بنگال کی ادبی تاریخ سے ہے- پہلا مقالہ ''شمالی ہند میں باضابطہ اُردو شاعری کی ابتدا'' ہے جو خاصا طویل ہے- دوسرا مقالہ ''بنگال میں اُردو کا طلوع'' ہے- کتاب کا تیسرا مقالہ ''سید محمود آزاد اور غالب کا رشتۂ شاگردی'' ہے اور آخری مقالے کا عنوان ''مشرقی بنگال میں اُردو نثر'' ہے-

''انکشافات'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور دانشور اور نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ستارۂ امتیاز) لکھتے ہیں:

’’شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز ورواج کے سلسلے میں ہماری ادبیات میں تین خاص نقطۂ نظر ملتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اُردو شاعری کا رواج دہلی میں ولی دکھنی کے ورود ۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۰ء کے بعد ہوا۔ اس کے برعکس یہ بھی کہا گیا ہے کہ ولی کی آمد کے وقت سے نہیں بلکہ اس وقت ہوا جبکہ ۱۱۳۲ھ مطابق ۱۷۲۰ء میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا۔ ان دونوں راویوں کے برخلاف ایک زاویہ نظریہ بھی ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ورواج ولی یا ان کے دیوان کی آمد کا مرہون منت نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے دوسرے علاقوں کے ساتھ یہاں بھی اردو شاعری مقبول ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے تینوں راویوں پر بحث ومحاکمہ کیا ہے اور مختلف دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پہلا اور تیسرا نظریہ باطل اور دوسرا درست ہے۔.............

اس کتاب کا دوسرا مضمون ’’بنگال میں اردو کا طلوع‘‘ قدیم اردو کے نمونوں اور ماخذوں سے بحث کرتا ہوا دوسرے علاقوں کی طرح بنگال کو بھی اردو کے قدیم ترین گہواروں میں شمار کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق عربی فارسی کے ساتھ بنگالی الفاظ کی آمیزش کا سلسلہ سندھ، گجرات اور نواح دہلی کی طرح تیرھویں صدی عیسوی میں شروع ہو گیا تھا۔......

تیسرے مقالے کا موضوع ’’سید محمود آزاد اور غالب کا رشتۂ شاگردی‘‘ ہے۔ سید محمود آزاد دراصل حافظ اکرام احمد ضیغم اور آغا احمد علی کے شاگرد تھے لیکن بعض محققوں نے ضعیف روایتوں کے ذریعہ انہیں غالب کا شاگرد بتایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پختہ دلائل وشواہد سے اس رائے کی تردید کی ہے اور ایک بڑے مغالطے کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔.........

آخری مضمون کا عنوان ہے ’’مشرقی بنگال میں اردو نثر‘‘ اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے مشرقی بنگال میں اردو نثر کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مشرقی بنگال میں اردو کا نثری سرمایہ اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن جو کچھ ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لسانی ارتقاء اور اُس ارتقاء کی مختلف کڑیوں کے سمجھنے کے لیے مشرقی بنگال کی اردو نثر کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔..............

اس تفصیل کی روشنی میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ ’’انکشافات‘‘ اگرچہ سو صفحے کی مختصر سی کتاب ہے

لیکن ''ہر کہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' کے مصداق آئے دن چھپنے والی موٹی موٹی ادبی کتابوں پر بھاری ہے۔''

اس کتاب کی افادیت اور اس کے پڑھنے میں دلچسپی اُس دن کچھ بھی نہ رہی جس دن مشرقی پاکستان، مشرقی پاکستان نہ رہا۔ ڈاکٹر محمد صدرالحق کا سارا تجربہ اور ساری تحقیق و جستجو لاحاصل ہو کر رہ گئی جس کا انہیں بے حد ملال رہا۔ بہر حال جو لوگ تحقیق و تنقید کے رشتے کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر محض اپنے ذوق اور ادبی خدمت کے جذبے کی تسکین کے لیے اس طرف آتے ہیں وہ ادب کی تاریخ میں ضرور اپنا نقش یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔ بقول چکبست:

چمن زار محبت میں اُسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

یہ بڑا افسوس کا مقام ہے کہ اس کے بعد ڈاکٹر محمد صدرالحق کی کوئی قدر نہیں کی گئی اور نہ انہیں کوئی بہتر مقام دیا گیا۔ باقی ماندہ زندگی گزارنے کے لیے وہ بحیثیت مترجم ٹیلی وژن سے منسلک ہو گئے اور پھر ۷ر مارچ ۱۹۸۴ء کو وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ ان کی تدفین بخشی حسن کے قبرستان میں ہوئی۔

---••☆••---

ضمیرالدین احمد

نامور صحافی' ادیب' افسانہ نگار ضمیرالدین احمد ۹ رجولائی ۱۹۲۶ء کو فتح گڑھ بھارت میں پیدا ہوئے- فتح گڑھ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو آگرے سے اسی میل مشرق میں دریائے گنگا کے کنارے پر واقع ہے- ضمیرالدین احمد نے گورنمنٹ اسکول فتح گڑھ سے میٹرک کیا- میٹرک کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے- وہاں سے گورکھپور چلے گئے جہاں انہوں نے سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور میں تعلیم حاصل کی بعدازاں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا اور پھر وہیں سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا-

تقسیم کے بعد ضمیرالدین پاکستان آگئے اور کراچی میں مقیم ہوئے- کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کو بلالیا اور پی آئی بی کالونی میں رہائش اختیار کی- یہاں آکر ضمیرالدین نے کسی ایک جگہ ٹِک کر کام نہیں کیا- سنہ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز انگریزی صحافت سے کیا اور اے پی پی کے نمائندۂ خصوصی کی حیثیت سے دلّی چلے گئے جہاں انہوں نے چار سال گزارے- اس کے بعد اے پی پی سے استعفادے کر روزنامہ ''ڈان'' کراچی سے منسلک ہوگئے- پھر صحافت چھوڑ کر صنعت کی طرف توجہ کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی تو پھر واپس صحافت میں آگئے اور ساری عمر اسی پیشہ سے وابستہ رہے- کچھ عرصہ انہوں نے بزنس رکارڈر کراچی میں کام کیا- پھر یہاں سے بھی چھوڑ کر وہ لندن چلے گئے جہاں انہوں نے بی بی سی لندن میں کام کیا- بی بی سی لندن سے فارغ ہوکر وہ فلیٹ اسٹریٹ لندن کے مختلف اخباروں کے لیے لکھتے رہے- کچھ عرصہ ''گلف ڈیلی نیوز'' بحرین میں بھی کام کیا اس کے بعد لندن واپس جاکر انٹرنیشنل اسلامک نیوز ایجنسی کے لیے کام کیا- اسی زمانے انہوں نے ''پاکستان ٹائمز'' لاہور میں بھی کام کیا لیکن وائس آف امریکہ میں ملازمت مل جانے پر وہ واشنگٹن ڈی سی چلے گئے- وہاں کئی سال کام کرنے کے بعد مستعفی ہوکر وہ واپس لندن آئے- پاکستان میں جمیل جالبی صاحب سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی- ''سوکھے ساون'' میں ضمیرالدین احمد سے اپنی

ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کرجمیل جالبی صاحب لکھتے ہیں:

''ضمیرالدین احمد نے بہت کم لکھا- میں نے پوچھا تو بتایا کہ وہ پاکستان میں اُردو کے مستقبل سے مایوس ہوگئے ہیں' اس لیے اُردو میں لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی-۱۹۸۴ء میں جب وہ لندن آئے تو ان کی تخلیقی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا- برسوں کی خاموشی کے بعد ۱۹۸۶ء میں ان کا افسانہ ''پُروائی'' نیادور میں شائع ہوا- اس افسانے میں ایک ایسی تازگی اور تہ داری ہے اور ماضی اتنی شدت کے ساتھ ان کے تخلیقی وجود میں مہکا ہے کہ یہ افسانہ' جو ان کے مجموعے ''سوکھے ساون'' میں ''پچھم سے چلے پُروا'' کے نام سے شامل ہے' ضمیرالدین کے بہت اچھے افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے- ان کے کُل افسانوں کی تعداد تقریباً چالیس ہے- ان کا پہلا مجموعہ دیوناگری رسم الخط میں دتی سے پانچ برس پہلے شائع ہوا تھا جس کا نام ''پہلی موت'' تھا- اس مجموعے کے سارے افسانے اُردو میں لکھے گئے تھے- ایک سال پہلے انہوں نے دوسرا مجموعہ بھی مرتب کرلیا تھا جس میں بارہ افسانے ''رگ سنگ''، ''چور کے پاؤ''، ''پہلا گاہک''، ''پہلی موت''، ''شیشے میں بال''، ''رانگ نمبر''، ''پاتال''، ''کچھ عجیب سا''، ''ٹھہرا دریا''، ''گاؤرا اقصاب برد''، ''اے محبت زندہ باد'' اور ''تین خط'' شامل ہیں-''

ضمیرالدین احمد آخری عمر بیمار رہنے لگے- ڈاکٹروں کی تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں پھیپڑوں کا کینسر ہو چکا ہے جو لاعلاج ہے- اسی مرض میں وہ ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو لندن میں انتقال کر گئے-

--••☆••--

ضمیر نیازی

شعبہ صحافت کے معروف صحافی ضمیر نیازی ۸/مارچ ۱۹۲۷ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے-ان کا اصل نام ابراہیم جان محمد درویش تھا-ضمیر نیازی کا تعلق ہالائی میمن خاندان سے تھا جو بمبئی کے ایک محلّہ ''ماہم'' میں سکونت پذیر تھا-پڑھے لکھے تعلیم یافتہ لوگ' معروف شاعر وادیب' تاجر اور فلمی دنیا کے نمائندہ آرٹسٹ اسی محلے سے ملحقہ علاقے باندرہ سے تعلق رکھتے تھے-ضمیر نیازی صاحب کی تعلیم وتربیت بمبئی میں ہوئی-ان کے والد جان محمد ہاشم ایک متوسط گھرانے کے فرد تھے جن کا پیشہ تجارت تھا-بقول ضمیر نیازی کے (غالب سے معذرت کے ساتھ)

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سوداگری

ضمیر نیازی کے والد کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا بھی تجارت کا پیشہ اختیار کرے لیکن ضمیر نیازی صحافت کے پیشے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے-اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن ہی سے ایک سماجی اور سیاسی شعور رکھنے والے طالب علم تھے اور دورانِ تعلیم سے ہی وہ طالب علموں اور مزدور تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تھے-چنانچہ انہوں نے بمبئی کے روزنامہ ''اجمل'' جو حکیم اجمل خاں کے نام سے منسوب تھا' اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا-اس کے بعد بمبئی کے دو روزناموں ''انقلاب'' اور ''خلافت'' میں بھی کام کیا-اُردو کے یہ تینوں اخبار بمبئی کے سربرآوردہ اخبار تھے جن میں کام کرنے کے بعد انہیں شعبۂ صحافت میں بڑی مہارت ہوئی-ضمیر نیازی کو صحافت کے پیشے میں کتنی دلچسپی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز دانشور جناب خلیق ابراہیم خلیق (بچپن کے دوست) لکھتے ہیں:

''آزاد ہندوستان کی کانگریسی حکومت بائیں بازو کی سوچ رکھنے والوں اور ترقی پسندوں کے پیچھے بری طرح پڑی ہوئی تھی اور ان پر ہر طرح کے ظلم وتشدد کی ارزانی تھی' جن لوگوں نے ''ترقی پسند تحریکوں کی ترجمانی'' کے لیے پندرہ روزہ ''نیا پرچم'' کا اجراء کیا' ان میں ضمیر نیازی کو خاص اہمیت حاصل تھی-اس پرچے کے حلقہ ادارت میں راجیندر سنگھ بیدی'

وشوامتر عادل اور محمد حیدر اسد کے ساتھ وہ بھی شامل تھے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی ادارت سے لے کر انتظامی امور تک کام کا زیادہ بوجھ انہیں کے کاندھوں پر تھا۔ حکومت نے ''نیا پرچم'' کی اشاعت پر پابندی لگادی تو ضمیر نیازی نے ''نیا پرچم'' کا مشن جاری رکھنے لیے تصدیق سیوہاروی کے ساتھ مل کر ہفت روزہ ''منزل'' نکالا۔ اس اثنا میں حکومت کی سخت گیر پالیسیوں نے حالات اتنے خراب کر دیے کہ کسی ترقی پسند ادبی پرچے کا پنپنا بہت دشوار ہو گیا۔ چنانچہ چند شماروں کے بعد ''منزل'' بھی بند ہو گیا۔ مگر ضمیر نیازی بھلا کب ہمت ہارنے والے تھے انہیں یہ ترکیب سوجھی کہ فلمی پرچہ نکالا جائے اور اس کے پردے میں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے چلائی جانے والی تحریکوں اور ترقی پسند ادب کو فروغ دیا جائے۔''

۱۹۵۳ء میں ضمیر نیازی ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ ابتدا میں ان کی رہائش پی آئی بی کالونی میں تھی۔ خوش قسمتی سے یہاں بھی انہیں پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میسر آئی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد بیشتر ممتاز ادیبوں شاعروں اور صحافیوں نے پی آئی بی کالونی ہی میں قیام کیا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد انہوں نے کراچی سے نکلنے والے اخبار ''نئی روشنی'' سے صحافتی کیریئر دوبارہ شروع کیا۔ کچھ عرصہ وہ پریس انٹرنیشنل سے بھی منسلک رہے۔ بعد ازاں کراچی کے نمائندہ اخبار ''ڈان'' سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں پر ابتدا میں انہوں نے بحیثیت مبتدی کے کام کیا پھر باقاعدہ ایک امتحان پاس کرنے کے چھ ماہ بعد وہ سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۲ء تک ڈان میں خدمات انجام دینے کے بعد نیازی صاحب روزنامہ ''ڈیلی نیوز'' سے منسلک ہو گئے۔ یہاں پر انہوں نے نیوز ایڈیٹر اور قائم مقام ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ آخر میں وہ ۱۹۵۶ء میں ''بزنس رکارڈر'' میں چلے گئے جہاں وہ میگزین کے انچارج اور نیوز ایڈیٹر کی جگہ کام کرتے رہے۔ اس اخبار میں انہوں نے اڑتیس سال کام کیا۔ ۱۹۹۴ء میں خرابی صحت کی وجہ سے انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی۔

وہ انتہائی قناعت پسند اور فرض شناس صحافی تھے۔ شعبۂ صحافت میں وہ ہمیشہ غیر جانبدارانہ پالیسی پر عمل پیرا رہے اور اعلیٰ صحافتی روایات کی پاسداری کے لیے کام کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی کسی سیاسی یا حکومتی پارٹی سے تعلق نہیں رکھا اور ہمیشہ ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ یہاں یہ بات

بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ضمیر نیازی نے صحافت کے مہذب پیشے کو بے جا مخالفت یا اپنے ذاتی مفاد کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا۔ صحافت کا گلا گھوٹنے اور اس کے ساتھ ہونے والی بدسلوکیوں کے خلاف وہ ہمیشہ جنگ کرتے رہے۔ ان کو متعدد بار مالی اور اعزازی مراعات دینے کی بھی کوشش کی گئی لیکن مرحوم نے لینے سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے شدید مخالفت بھی کی۔ جس نے ابتدا ہی سے شفاف صحافت کا بیڑا اٹھایا تھا ہو وہ ایسے اعزازات یا انعامات کیسے قبول کرسکتا تھا۔

صحت کی خرابی کے باوجود وہ آخری دم تک شعبہ صحافت کی نگہبانی میں مصروف رہے۔ صحافت کا گلا گھوٹنے اور سچ لکھنے والے صحافیوں کو نازیبا اور سخت سزاؤں کو برسر عام لانے کے لیے ضمیر نیازی صاحب نے شدید خطرات کے باوجود ایک کتاب "PRESS IN CHAINS" کے نام سے شائع کی۔ اس کتاب کو چھاپنے کے لیے کوئی پبلشر یا اشاعتی ادارہ تیار نہیں تھا۔ بہر حال اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں کراچی پریس کلب سے شائع ہوا جو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس میں برصغیر پاک و ہند کی دوسو سالہ صحافتی تاریخ کا مختصر جائزہ لینے کے بعد پاکستان میں اخبارات کی آزادی کو سلب کرنے کی طویل داستان ہے۔ یہ کتاب اور اس کا ترجمہ پڑوسی ملک نے بھی شائع کیا تھا۔ ان کی دوسری کتاب ''THE PRESS UNDER SIEGE'' ہے۔ اس کتاب میں جنوری ۱۹۶۵ء سے نومبر ۱۹۹۱ء تک مختلف اخبارات کے دفاتر اور اخباری کارکنوں پر دھمکیوں سمیت ۲۳۶ حملوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے ایک اور کتاب ''THE WEB OF CENSORSHIP'' کے عنوان سے لکھی جسے دوسال بعد مارچ ۱۹۹۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا۔ یہ کتاب سنسر شپ کے موضوع پر ایک اعلیٰ کتاب ہے۔

آزادیٔ صحافت کے حوالے سے ضمیر نیازی نے بے شمار مضامین اور متعدد کتابیں لکھیں جن میں ''انگلیاں فگار''، ''زمین کا نوحہ''، ''صحافت پابند سلاسل''، ''باغبان صحرا'' جیسی شہرۂ آفاق کتابیں شامل ہیں۔ ضمیر نیازی بلاشبہ پاکستان اور خصوصاً کراچی کی صحافت کا ایک معتبر نام تھا۔ ۱۱ رجون ۲۰۰۴ء کو بے باک صحافت کو روشناس کرانے والا یہ چراغ گل ہو گیا۔ ان کی موت سے دنیائے صحافت میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جسے پُر کرنے کے لیے طویل عرصہ چاہیے۔

---••☆••---

ضیاء القادری بدایونی مولوی محمد یعقوب

اصل نام محمد یعقوب 'ضیاء القادری بدایونی قلمی نام اور محمد فضل الرحمٰن تاریخی نام تھا۔ ۳ر جون سنہ ۱۸۸۳ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ یاد حسین بدایوں کے مشہور ملاّ خاندان کے فرد تھے۔ ضیاء القادری ابھی کوئی چار سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی پرورش ان کے خالو مولانا اسیرؔ کے زیرِ سایہ ہوئی۔ عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر دارالعلوم شمسیہ بدایوں میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۷ء میں اُردو مڈل پاس کیا اور پھر انگریزی کی تعلیم لوئر مڈل اسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد انہیں ذریعہ معاش کی جستجو ہوئی تو اپنے چچا کے ساتھ برما چلے گئے جہاں وہ محکمہ سروے میں ملازم ہوگئے۔ چار سال تک محکمۂ سروے میں ملازمت کرنے کے بعد واپس آئے تو محکمۂ تعلیم سے منسلک ہوگئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۳ء میں بدایوں تحصیل میں بطور رجسٹرار گرد اور قانون گو تعینات ہوگئے اور یہیں سے وہ سنہ ۱۹۴۰ء میں ریٹائر ہوئے۔
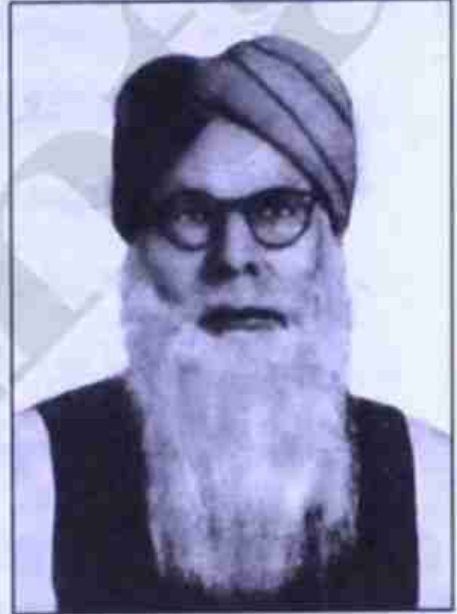
جناب مالک رام اپنی تصنیف ''تذکرۂ معاصرین'' جلد اول میں تحریر ماتے ہیں:

''ان کے بزرگوں میں اکبری دور کے مشہور ولی اللہ شیخ عبداللہ بدایونی کی ہستی قابلِ ذکر ہے۔ جن کے شاگردوں میں ملاّ عبدالقادر بدایونی کی سی نادرۂ روزگار ہستی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جیسا کہ خواجہ نظام الدین نے طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے کہ شیخ عبداللہ دراصل ہندو تھے۔ ایک دن گلستان کا سبق پڑھ رہے تھے کہ اس میں رسولِ اسلام کا ذکر آ گیا۔ استاد سے ان سے متعلق تفصیل پوچھی اور انہوں نے جو مناقب بیان کیے' ان کے سننے کے بعد اسلام قبول کرلیا۔ پھر اپنی ریاضت سے علم و فضل اور ورع و تقویٰ سے وہ مقام حاصل کیا کہ خلقِ خدا نے ان کی برگزیدگی کا اعتراف کیا۔''

ضیاء القادری صاحب کو رجبی شریف منانے کا بہت شوق تھا۔ ہندوستان میں جہاں جہاں بھی اولیائے کرام کے مزارات ہیں وہ وہاں جا کر وہاں کے عرس میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ تقسیمِ ہند کے

بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں ضیا صاحب نے پاکستان آ کر کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی- یہاں آ کر انہوں نے ایک انجمن ''مجلسِ شیدائیانِ نبیؐ'' کے نام سے قائم کی- اس انجمن کا مقصد میلادالنبیؐ، معراج النبیؐ، یوم خلفائے راشدین، یومِ شہیدِ کربلا اور بزرگانِ دین کے عرس کے موقعے پر جلسے کرنا تھا- اس کے علاوہ نعتیہ اور منقبتی مشاعرے بھی منعقد کرتے رہتے تھے جن سے لوگوں میں دینی شغف اور شعور بھی پیدا ہوا- کراچی میں ضیا صاحب کے شاگردوں کی خاصی بڑی تعداد ہے- سنہ ۱۹۵۸ء میں ان کے شاگردوں نے ایک ''بزمِ ضیا'' بھی قائم کی تھی-

ضیا صاحب کے نعتیہ کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں- اس کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی نظم ونثر کی تصنیف کی ہیں جن میں 'دیارِ نبی منظوم' (سفرنامۂ حج)، مرقعِ شہادت (منظوم واقعات کربلا)، جوارِ غوث الوریٰ (منظوم سفرنامۂ عراق)، نغمۂ ربانی (منظوم میلادشریف)، تاج مضامین (منظوم مناقب اولیائے قادریہ بدایوں) اور ستارۂ چشت وغیرہ شامل ہیں- ان کی اہم تالیف اکمل التواریخ ہے- اس کے دو حصے ہیں- پہلے میں بدایوں کے عثمانی خاندان کے علما اور بزرگوں کے حالات ہیں- ان کی ایک اہم کتاب مجموعہ ہفت احمد (بدایوں ۱۹۶۴ء) بھی قابل قدر ہے جس میں بدایوں کے سات اولیاء اللہ کا ذکر ہے- ضیا القادری بدایونی کا ۱۵ راگست ۱۹۷۰ء کو کراچی میں انتقال ہوا- ان کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

در پہ آئے ہیں دادِ غم پانے	منزلِ معرفت کے فرزانے
آپؐ کے روئے پاک کے شیدا	گیسوے عنبریں کے دیوانے
تلخ ہے جن کی داستانِ حیات	عبرت آگیں ہیں جن کے افسانے
زخم خوردہ ہے پیکرِ ہستی	داغ اتنے دیے ہیں دنیا نے
گوشہ گوشہ میں بن گئے دل کے	کفر و باطل کے لاکھ بت خانے

المدد، المدد، رسولؐ انام
مٹ نہ جائیں حضورؐ کے یہ غلام

---••☆••---

ماخذ (۱) ''تبصرۂ معاصرین'' جلد اول مالک رام (۲) ماہنامہ بدایوں کراچی اکتوبر ۱۹۹۱ء

ضیائیؔ، ضیائے عباس ہاشمی

ان کا اصل نام سید ضیاے عباس ہاشمی اور تخلص ضیائیؔ تھا۔ ۱۸۸۶ء کو ریاست گوالیار کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کا ہر فرد تعلیم یافتہ اور شاعر نہیں تو سخن پرور اور سخن سنج ضرور تھا۔ ان کے والد نورالدین ریاست گوالیار میں کسٹم سپرنٹنڈنٹ کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ ضیائیؔ کے بڑے بھائی مولوی محد الدین احمد ریاست کے پوسٹ ماسٹر جنرل اور ان کے چھوٹے بھائی ابنِ عباس ریاست گوالیار کے ایک ضلع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ضیائیؔ نے اپنے والد بزرگوار کا ادبی ذوق ورثہ میں پایا۔ جب یہ کچھ بڑے ہوئے تو ان کے پھوپھا مولوی غلام غوث نے جو داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے، اپنے پاس رکھ لیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی۔ غلام غوث کی تربیت میں اور خاندانی ورثہ کے تحت ضیائیؔ صاحب کا ذوق سخن فطری بن گیا۔

ضیائیؔ نے گوالیار سے میٹرک کرنے کے بعد وہیں پر وکٹوریہ کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ وہ اپنے کالج کے ذہین لڑکوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جب وہ انٹر میں تعلیم پا رہے تھے تو ایک دن ان کے کالج میں مہاراجا مادھو راؤ سندھیا آنجہانی کسی سلسلے میں کالج آئے۔ اسی دوران ان کو ضیائی کی ذہانت کا علم ہوا تو انہوں نے ضیائیؔ ہاشمی کو وظیفہ دے کر وے ٹی ری نری (Veterinary) تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں وہ وے ٹی ری نری (Veterinary) کی تعلیم حاصل کرنے لاہور چلے گئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد واپس گوالیار آئے تو ویٹرینری ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ ویٹرینری سے تبدیل ہو کر محکمۂ مال و بندوبست میں باؤنڈری آفیسر مقرر ہوئے۔ اس محکمہ کا تعلق وازارتِ امورِ خارجہ اور وزارتِ مال دونوں سے تھا۔ ضیائیؔ صاحب گوالیار کی ایگزیکٹیو کونسل میں وزیر امورِ سیاسی اور خارجہ بھی رہے۔ ضیائیؔ کے خاندان میں بہت سے افراد اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ان کے ماموں زاد بھائی خان بہادر سید آل علی انسپکٹرز آف اسکولز یو پی،

سید آلِ نبی ڈپٹی کلکٹر کانپور اور سبطِ نبی نقوی سائنٹسٹ ڈائریکٹر موسمیات پاکستان رہے ہیں۔

ملازمت کے ساتھ ساتھ ضیائی کا ادبی ذوق بھی جاری رہا۔ ان کے خاندان میں ہر فرد کو شعر و سخن سے خاص لگاؤ تھا۔ مشہور و معروف ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے بھی روابط قائم تھے۔۔ نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی، شکیل بدایونی، سیماب اکبرآبادی، ل اکبرآبادی اور دوسرے بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ضیائی صاحب کی ہمیشہ ملاقات رہتی تھی۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں لشکر گوالیار میں ان ہی کی کاوشوں سے ''بزمِ اُردو'' قائم کی گئی تھی جس کے وہ سنہ ۱۹۴۷ء تک سکریٹری رہے۔

ضیائی صاحب کا مطالعۂ زبان انتہائی وسیع تھا۔ انہیں ہم معنیٰ، قریب المعنیٰ اور متضاد الفاظ کی نہایت دقیق فہم حاصل تھی۔ اس سلسلے میں ان کے ہم عصروں نے انہیں توجہ دلائی کہ ہم معنیٰ، قریب المعنی اور متضاد معنیٰ کی ایک کتاب لغات مرتب کریں جس کے لیے وہ تیار بھی ہوگئے تھے۔ لیکن اسی دوران ہندوستان تقسیم ہوگیا۔ جس کے بعد فسادات اُٹھ کھڑے ہوئے اور قتل و غارت گری کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ ان کے کتب خانے کو آگ لگادی گئی اور سارا ذخیرہ نذرِ آتش ہوگیا۔ ایسے حالات دیکھے تو ضیائی نے اپنے بچوں کو پاکستان اپنے خسر کے پاس بھیج دیا۔ پھر حالات اتنے ناگفتہ بہ ہوئے کہ وہ خود بھی اپنے آباواجداد کی بسائی ہوئی برسوں پرانی بستی چھوڑ کر پاکستان آگئے۔ سید امروہوی ضیائی کے دیوان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''افسوس کہ ان کا مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا اور وہ اس دارِ فانی سے عالمِ بقا کی جانب کوچ کر گئے۔ مرحوم کے فرزند میرے کرم فرما، دوست اور محسن جناب اظہر عباس ہاشمی نے اپنے والدِ مرحوم کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی ذمہ داری مجھے سونپی اور جسے میں نے اپنے لیے سعادت جانا اور اس ذمہ داری کو قبول کرلیا۔ لیکن اس کی تدوین و ترتیب میرے بس میں نہ تھی چنانچہ میں نے شاعرِ آلِ محمد حضرتِ نسیم امروہوی مدظلہٗ العالی سے درخواست کی اور انہوں نے میری درخواست کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا، جس کے لیے میں مولانا مدظلہٗ العالی کا احسان منداور شکر گزار ہوں۔ مولانا نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود زیرِ نظر مجموعۂ کلام کی نہ صرف تدوین و ترتیب فرمائی بلکہ تصحیح بھی کی؛''

ضیائی صاحب ۳۱ر دسمبر سنہ ۱۹۶۴ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ ان کا مجموعۂ کلام

''ضیائے سخن'' ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند جناب اظہر عباس ہاشمی نے کراچی سے شائع کیا۔
ضیائی ہاشمی کے مجموعۂ کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

نورِ دیدہ صَرفِ گریہ ہوگیا دِل رَہ گیا
مِٹ گیا طوفاں زدہ برباد ساحل رہ گیا

مِٹ گئے جذباتِ دل سارے فقط دل رہ گیا
شورِ طوفاں دب گیا خاموش ساحل رہ گیا

میں ہوں وہ گم کردہ مقصد جیسے مقصد ہی نہ تھا
منزلوں پیچھے کہیں احساسِ منزل رہ گیا

حیات و مرگ کا الفت میں خواب دیکھ لیا
سکوں دیکھ لیا، اضطراب دیکھ لیا

بہار جا کے خزاں، آشیاں کے بعد قفس
جو دیکھنا نہ تھا، وہ انقلاب دیکھ لیا

یہی دستور ہے دنیا کا، کیا روئیں زمانے کو
ہوا دی شاخِ گُل نے میرے جلتے آشیانے کو

ابھی عہدِ محبت کے بہت ناسُور رِستے ہیں
میں رو دیتا ہوں اکثر یاد کر کے اُس زمانے کو

گرے بجلی مری اِس قوتِ یاد و تصور پر
میں اپنے ساتھ لے آیا قفس میں آشیانے کو

ضیاؔ اس امتیازِ اعتباری کی کوئی حد بھی
قفس میں تا بکئے روتے رہو گے آشیانے کو

الزام بجا لیکن کیا کیجیے اِس دل کو
دو تنکوں کی خاطر ہے سب یاد گلستاں کی

بہت حسین تمنّا ہے تجھ سے ملنے کی
میں تجھ سے مل کے اُسے کیوں تباہ کر ڈالوں

گناہ گاروں سے مخصوص دیکھ کر رحمت
ہے شیخ کو بھی یہ حسرت گناہ کر ڈالوں

وہ خاک چلے گا پروانہ جو دل کی لگن بھی کھو بیٹھے
حق بات کہیں گے کیا جو ذوقِ دار و رسن بھی کھو بیٹھے

غربت کی کشش اللہ غنیٰ احسانِ غربت کیا کہیے
ہم ترکِ وطن کو کیا روئیں احسانِ وطن بھی کھو بیٹھے

اب پھول کھلیں، بجلی ٹوٹے، بے بال و پری ہے اور قفس
کیا شوقِ بہار و خوفِ خزاں امیدِ چمن بھی کھو بیٹھے

تقلیدِ مغرب میں ہمدم کیا تجھ کو بتاؤں کیا پایا
باہر سے تو کچھ حاصل نہ ہوا ہم گھر کا چلن بھی کھو بیٹھے

---••☆••---

طالب جوہری، علامہ

اصل نام ابوطالب، طالب تخلص اور طالب جوہری قلمی نام ہے۔ سن ۱۹۳۹ء میں گورکھ پور میں پیدا ہوئے جہاں ان کے نانا بسلسلۂ معاش مقیم تھے۔ ان کا آبائی وطن حسین گنج سارن (بہار) ہندوستان تھا۔ علامہ طالب جوہری ایک ایسے علمی خانوادے کی معروف آٹھویں پشت میں ہیں جو صدیوں سے تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدریس میں اپنے علاقے میں معروف رہا ہے۔ ان کے والد محمد مصطفیٰ جوہر کا شمار برِصغیر کے نامور علماء میں ہوتا تھا۔ وہ فلسفے اور علم کلام میں برِصغیر کے جید علماء کی صفِ اوّل میں شامل تھے۔ سنہ ۱۹۸۵ء میں ان کا انتقال ہوا اور یحیٰ حسن کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کی تصنیفات عربی، فارسی اور اردو میں ہیں۔ مطبوعہ کتابوں میں ''توحید اور عدل'' اور دیوان ''محراب'' شامل ہیں۔

علامہ طالب جوہری نے اسلامی علوم کی بنیادی تعلیم اپنے والد مولانا محمد مصطفیٰ جوہر اور اپنے چچا مولانا محمد مرتضیٰ اختر سے حاصل کی۔ سنہ ۱۹۵۷ء کے اوائل میں اسلامی علوم کی بین الاقوامی درسگاہ نجف اشرف گئے اور تقریباً دس سال وہاں رہ کر سارے علوم کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں بین الاقوامی ساکھ کے صفِ اوّل کے بزرگ ترین علماء آیۃ اللہ سید ابوالقاسم خوئی، آیۃ اللہ سید روح اللہ خمینی، آیۃ اللہ سید علی فانی، آیۃ اللہ سید باقر الصدر (شہید) شامل ہیں۔

نجفِ اشرف سے واپس کراچی آنے کے بعد علامہ صاحب نے ایک دینی درسگاہ جامعہ امامیہ ناظم آباد میں پانچ سال تک بحیثیت پرنسپل کام کیا اور اعلیٰ درجے کی کتابوں کی تدریس کی۔ گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں بھی سالہا سال تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی دوران کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ معارف اسلامیہ میں کچھ عرصے کے لیے غیر ملکی طلبہ کی تدریس کی۔ وہ حکومت پاکستان کے معروف علمی اور فقہی ادارے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے دوبار رکن منتخب ہوئے اور ایک بار مجلسِ شوریٰ (حکومت پاکستان) کے رکن بھی رہے۔

علامہ طالب جوہری بین الاقوامی شہرت کے خطیب ہیں-وہ برسوں سے پاکستان ٹیلی وژن کی مجلس ''شام غریباں'' سے خطاب کرتے ہیں-''فہم القرآن'' کے عنوان سے ان کی تقاریر کا سلسلہ پاکستان ٹیلی وژن سے نشر ہوتا تھا-جو برسوں تک لوگوں کی توجہات کا مرکز رہا اور آج بھی لوگ اسے یاد کرتے ہیں-تقریباً تیس سال سے زیادہ عرصے سے وہ محرم کے ایام میں نشتر پارک (کراچی) کی مجالس سے خطاب کرتے ہیں جن میں اسلامی مسالک کے علاوہ عیسائی، ہندو اور پارسی وغیرہ بھی شریک ہوتے ہیں-وہ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف شہروں کے علاوہ یورپ، افریقہ، امریکہ اور عرب اور خلیجی ریاستوں میں تقریروں کے سلسلے میں سفر کرتے رہتے ہیں-ان کی تقریریں کتابی صورت میں کراچی، لاہور اور لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری وساری ہے-ان کی تقریروں کی شائع شدہ کتابوں میں ''انسانِ معاصر اور قرآن''، ''تہذیب نفس اور تہذیبِ حاضر''،''عالمی معاشرہ اور قرآنِ حکیم''، ''حیات وکائنات کا الوہی تصور''،''انسانیت کا الوہی منشور''،''اساس آدمیت اور قرآن''،''میراث عقل اور وحی الٰہی''،''نظام حیات انسانی''،''دین وشریعت کی عقلی تعبیر'' اور ''ذکر معصوم'' شامل ہیں- علامہ صاحب کی تصانیف میں (۱) تفسیر احسن الحدیث (۲ جلدیں) (۲) علامت ظہور مہدی (۳) خلفائے اثناعشر (۴) حرف نمو (شعری مجموعہ) (۵) پس آفاق (شعری مجموعہ) (۶) ہدایت (مرثیہ) شائع ہو چکی ہیں-

علامہ صاحب شعر وسخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں-ان کے شعری مجموعے ''حرفِ نمو'' میں غزلیں، نظمیں، مرثیے اور قصیدے سب ہی کچھ شامل ہیں-لیکن ان کا مجموعی مزاج غزل کا ہے اس لیے ان کی غزلیں دوسرے اصناف سخن کی نسبت زیادہ جاندار ہیں-بطور مثال ان کی صرف ایک غزل اس جگہ درج کی جاتی ہے، ملاحظہ کیجیے۔

آج بھی آپ گئے تھے ملنے اس کے گھر، پھر کل جائیں گے
طالبؔ صاحب آگ سے مت کھیلیں، بالآخر جل جائیں گے

وہ اپنے گھر کی رونق بن جائے تو ہم وعدہ کرتے ہیں
اپنے گھر واپس جا کر گھر کے ماحول میں ڈھل جائیں گے

رسی جل گئی لیکن اس کے بل شعلوں پر خندہ زن ہیں

جب خاکستر بن کے اُڑے گی تب رسّی کے بل جائیں گے

حد نظارہ تک خشخاش کے نیلے پودے تھے اور میں تھا
دل نے کہا تھا آنکھ جُھکا لے ورنہ پودے جل جائیں گے

دولت پر اترانے والے اپنا آپ بچا کر رکھیں
یہ تیزاب ہے اس میں گر کر پیکر و یکر گل جائیں گے

اپنی مہار کو خود ہی تھامے ایک چھلاوے کے پیچھے ہم
جنگل جنگل گھوم چکے ہیں اب بادل بادل جائیں گے

ذہن کے سب کھڑکی دروازے کھول کے اندر جھاڑو دے دو
کب سے حُجرہ بند پڑا ہے اُس میں پھپھوندل جائیں گے

اُس سندر دیوی کو شاید مجھ سے کوئی کام نہیں اب
اب پھر سارے عہد و پیماں اگلے جنم پر ٹل جائیں گے

اس نے مجھ سے عذر تراشے یعنی وہ یہ جان رہا تھا
ایک یہی دوکان ہے جس پر کھوٹے سِکّے چل جائیں گے

--••☆••--

عالم تاب تشنہ

اصل نام سید عالم تاب علی، تشنہ تخلص اور قلمی نام عالم تاب تشنہ تخلص ہے۔ ۲۰ر اپریل سنہ ۱۹۳۵ء کو میرٹھ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی وثانوی تعلیم کے بعد میرٹھ سے ایم کام کیا۔ اپریل سنہ ۱۹۵۹ء میں پاکستان آ گئے اور لاہور میں مقیم ہوئے۔ لاہور امپرو ومنٹ ٹرسٹ میں چیف اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں وہ محکمہ روڈ ٹرانسپورٹ میں مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی محکموں میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں ٹریننگ کے لیے انہیں امریکہ بھیج دیا گیا جہاں سے عالم تاب علی نے اوا ینڈ ایم میں ڈپلوما کیا۔ کنیکٹ یونیورسٹی اور مشی گن یونیورسٹی سے ابلاغ میں سند حاصل کی۔ چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسپورٹ نے فیلوشپ کے اعزاز سے نوازا۔ پاکستان واپس آئے تو انٹرنیشنل ٹرانسپورٹ کمپنی سے منسلک ہو گئے۔

عالم تاب تشنہ کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ سنہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۸ء تک انہوں نے خوب شعر کہے۔ اس کے بعد اچانک انہوں نے شاعری اور اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیا اور طویل مدّت تک دنیائے شعر وسخن سے دور رہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء سے انہوں نے دوبارہ شاعری پر توجہ دینا شروع کیا۔ ان کے مجموعۂ کلام ''موج موج تشنگی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

> ''بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی شاعر نے چند سال کی مدّت میں دنیائے شاعری میں اپنے لیے اعتبار پیدا کر لیا ہو ایک ایسا اعتبار جو شہرت پانے کے مروّجہ طریقوں کے بغیر حاصل نہیں کیا گیا ہو۔ عالم تاب تشنہ کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ تازگی ہے، انفرادیت ہے اور سب سے بڑھ کر اس کے یہاں تجریدیت کے خلاف ایک جچے تلے مؤقف کی کارفرمائی نظر آ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ جدید دور کے تجریدیت پسندوں پر یہ انداز شاق گزرے لیکن اس کا یہی اسلوب اس کی شاعری میں نئے رنگ بھرتا نظر آتا ہے۔''

عالم تاب تشنہ کا مجموعہ کلام ''موج موج تشنگی'' کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے

شیکسپیئر کے ڈرامے ''مڈ نائٹ ڈریم'' کا ترجمہ ''خوابِ نیم شب'' کے نام سے کیا-۱۲رمئی سنہ۱۹۹۱ء میں عالم تاب تشنہ کا کراچی میں انتقال ہوا-ان کی ایک غزل کے کچھ اشعار پیش ہیں' ملاحظہ ہوں:

وہ کیا ہوئیں محبتوں کی بستیاں — مکیں وہ کیا ہوئے مکان کیا ہوئے
وہ جن کے دم سے تھیں لہو میں گردشیں — وہ شاعرانِ خوش بیان کیا ہوئے
وہ زندگی کی آن بان کیا ہوئی — وہ نام کیا ہوئے نشان کیا ہوئے
جلا کے آئے تھے جو اپنے بادباں — وہ شیر دل جہازران کیا ہوئے
تراشتے تھے منزلیں جو دشت میں — وہ قافلے وہ ساربان کیا ہوئے
سوادِ جاں میں نہ یوں در بدر پھرا مجھ کو — مسافرت مرے گھر کا پتہ بتا مجھ کو
مجھے تو اپنے خدوخال تک بھی یاد نہیں — دیارِ خو نگری آئینہ دکھا مجھ کو
نہ جانے کتنے اجالوں کا ہے بھرم مجھ سے — چراغِ خانۂ مفلس ہوں مت بجھا مجھ کو
میں اپنے ظرف کی حد سے نکل نہ جاؤں کہیں — مری انا مرے قامت سے مت بڑھا مجھ کو
چراغ میں بھی تھا اور روشنی بھی رکھتا تھا — بجھا گئی ہے ترے شہر کی ہوا مجھ کو
لبوں پہ حرفِ تمنا کا عکس آنے لگا — دکھا رہا تھا کوئی دل کا آئینہ مجھ کو
چراغِ خلوتِ جاں ہوں اور اس خیال میں ہوں — بجھا نہ دے مرے سانسوں کی بھی ہوا مجھ کو
عجیب شخص تھا تشنہ حریفِ جاں ہو کر — محبتوں کے سلیقے سکھا گیا مجھ کو
نظر لگائے رہے دوسرے کے قامت پر — کسی کو اپنے برابر کوئی نہ دیکھ سکا
ہر ایک شخص تھا اپنی ہوس کا زندانی — حصارِ ذات سے باہر کوئی نہ دیکھ سکا

---••☆••---

عبدالرشید، کرنل خواجہ

غیر ادبی شعبۂ حیات سے وابستہ لوگوں میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو اپنے پیشے کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ علم و ادب میں بھی غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہوں- یہاں ایک ایسی ہی علمی ادبی شخصیت کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا نام خواجہ عبدالرشید تھا اور پیشہ کے لحاظ سے فوج میں ڈاکٹر اور کرنل کے عہدے پر فائز تھے- زمانۂ قدیم میں ان کے آباواجداد کشمیر سے آ کر لاہور میں آباد ہوئے تھے- اِس خاندان میں بڑی بڑی نابغۂ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھیں علمی ادبی، سیاسی سماجی خدمات کی بنا پر شہرت عام اور دوام کا مقام حاصل ہوا- خواجہ عبدالرشید کے والد خواجہ عبدالحمید کے دو برادر بزرگ (۱) عبدالمجید (مشہور لغت ''جامع اللغات'' کے مولف)، (۲) خواجہ عبدالوحید (مشرق و مغربی علوم کے جید عالم، ماہر اسلامیات و اقبالیات) اِسی خاندان کے چشم و چراغ تھے- خواجہ عبدالرشید کے والد خواجہ عبدالحمید کا اگرچہ علمی ادبی سرگرمیوں سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا، لیکن وہ اعلیٰ درجے کے الیکٹریکل انجنیر اور انگلستان کے فارغ التحصیل تھے- موجودہ دور کے نامور محقق، نقاد، ادیب اور خوبصورت شاعر جناب مشفق خواجہ صاحب (خواجہ عبدالوحید کے فرزند) بھی اسی خانوادہ علم و تہذیب کے لعل و شب ہیں-

خواجہ عبدالحمید نے دو شادیاں کیں جن میں پہلی چچا کی بیٹی اور دوسری انگلستان میں ایک انگریز عورت سے ہوئی- ان کی پہلی بیوی سے خواجہ عبدالرشید ۲۱ مئی ۱۹۱۲ء کو (اندرون بھاٹی گیٹ) لاہور میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم کے بعد خواجہ عبدالرشید نے سینٹرل ماڈل اسکول سے میٹرک اور اسلامیہ کالج سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا- اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں انہوں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا- ایم بی بی ایس کی تعلیم کے دوران ان کی شادی شیخ فیروزالدین کی بیٹی سے ہوئی- تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ وہ پرائیویٹ کلینک میں کام کرتے رہے- اس کے بعد سنہ ۱۹۴۱ء میں پہلے وہ انڈین میڈیکل سروس میں لیفٹیننٹ بھرتی ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے

سنہ۱۹۴۴ء میں میجر اور پھر لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے- سنہ ۱۹۴۷ء میں برما کی آزادی کے بعد وہاں کے فوجی ہسپتالوں کی تنظیم نو کے لیے بھیج دیے گئے - دوسال اپنے فرائض انجام دینے کے بعد سنہ ۱۹۴۹ء میں وطن واپس آ گئے- ۱۹۷۳ء میں گورنمنٹ کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد دیال سنگھ لائبریری سے منسلک ہو گئے اور لائبریری کو خوبصورت انداز میں منظم کیا- سنہ ۱۹۸۳ء تک وہ اس لائبریری کے چیئر مین رہے- ساٹھ کی دھائی میں وہ جناح ہسپتال کراچی میں بحثیت ایڈمنسٹریٹر بھی رہے- خواجہ عبدالرشید نے فرائض منصبی کے علاوہ سماجی' ثقافتی' صحت عامہ' علمی وادبی اداروں اور لاہور کی مختلف انجمنوں میں بھی بڑی خدمات انجام دی ہیں جن کی تفصیل اس مختصر مضمون میں لکھنا ممکن نہیں ہے-

علم وادب کی ترویج میں انہوں نے مختلف موضوعات پر کام کیا اور اپنی تصانیف بھی چھوڑی ہیں- جن کی تفصیل اس طرح ہے-(۱) تذکرہ طالب آملی- مطبوعہ ۱۹۶۵ء فیروزسنز لاہور (۲) تذکرہ شعرائے پنجاب- مطبوعہ ۱۹۶۷ء اقبال اکادمی- کراچی (۳) Historical Dissertation مطبوعہ ۱۹۶۶ء لاہور (۴) معارف الآ ثار- مطبوعہ ۱۹۶۳ء ندوۃ المصنفین - دہلی (۵) معارف النفس- مطبوعہ ۱۹۶۲ء مجلس اخوان الصفا- کراچی (۶) Essays on Islam، مطبوعہ ۱۹۶۰ء، دین محمد پریس- کراچی (۷) Re-evolution of Islamic thought ناشر یونیورسل بکس ۱۹۷۵ء (۸)Iqbal, Quran and Western world، مطبوعہ ۱۹۷۸ء (۹) سیر فرنگ- مطبوعہ کتاب خانہ رشیدیہ لاہور-

آخری ایام میں خواجہ صاحب مستقل بیمار رہنے لگے اور شوگر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ایک تو ان کی صحت دن بدن گرتی چلی گئی اور دوسرے آنکھوں کی بینائی بھی آہستہ آہستہ جاتی رہی- ۱۳ر مارچ ۱۹۸۳ء کو انہیں دل کا دورہ پڑا اور زبان بند ہو گئی- چار گھنٹے بعد اسی عالم میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی- اگلے دن ۱۴ر جون ۱۹۸۳ء کو میانی شریف قبرستان میں سپرد خاک ہوئے-

--••☆••--

عبدالواحد سندھی، مولانا

ادیب، محقق، مورخ مولانا عبدالواحد سندھی ۱۹۰۵ء کو تحصیل پنو عاقل ضلع سکھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھوٹکی اور سلیمان پور کے دینی مدرسوں میں حاصل کی۔ ابتدا ہی سے علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ دینی مدرسوں کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ علی گڑھ چلے گئے اور جامعہ ملّیہ میں داخلہ لیا۔ اُس وقت جامعہ ملّیہ علی گڑھ میں تھا۔ ۱۹۲۵ء میں جب جامعہ ملّیہ علی گڑھ سے دلّی منتقل ہوا تو عبدالواحد صاحب بھی دلّی چلے گئے اور وہاں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے چہیتے شاگرد تھے۔ جامعہ ملّیہ سے فارغ ہوئے تو سنہ ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ہدایت پر مولانا صاحب اعلیٰ تربیت کے لیے موگا ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ضلع فیروز پور چلے گئے۔ وہاں سے جدید طرز تعلیم کی تربیت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں واپس دلّی آ گئے۔ اس کے بعد جامعہ ملّیہ میں انہیں بحیثیت استاد مقرر کیا گیا جہاں وہ تقسیم سے قبل تک پڑھاتے رہے۔ علی گڑھ قیام کے دوران ان کی شادی بھی بدایوں کے ایک گھرانے میں ہوئی۔

تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ اسی زمانے میں عمر داؤد پوتہ کی تحریک پر مطبوعات پاکستان کی جانب سے سندھی کا معیاری ماہنامہ "نئی زندگی" جاری ہوا تو عبدالواحد سندھی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بیس سال تک وہ اس ماہنامہ میں بحیثیت ایڈیٹر خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد واحد صاحب نے "نئی زندگی" میں شائع شدہ مقالات کا بہترین انتخاب کئی جلدوں میں شائع کیا۔ "نئی زندگی" سے سبکدوش ہونے کے بعد انہیں ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے اپنے پاس بلا لیا اور مولانا کو جامعہ ملیہ ملیر کے شعبۂ تصنیف و تالیف کا نگراں مقرر کر دیا۔ یہاں ان کی ادارت میں بچوں کا رسالہ ماہنامہ "ستارہ" پانچ سال تک شائع ہوتا رہا۔ یہ رسالہ ڈاکٹر محمود حسین کی وفات کے بعد بند ہو گیا تو مولانا صاحب بیگم عمر داؤد پوتہ کے خواتین جریدے "ادیو" کے مدیر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۷۲ء میں عبدالواحد سندھی کے جواں سال بیٹے کا انتقال ہوا تو ان کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی۔ ضعیفی میں جوان بیٹے کے غم

نے انہیں اور بھی کمزور و نڈھال کر دیا-۳ رجنوری ۱۹۸۸ء کو مولانا صاحب نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا-

مولانا عبدالواحد عظیم انسان تھے انہوں نے اپنی ساری زندگی علم حاصل کرنے اور علم پھیلانے میں گزاری-ان کی تصانیف وتالیفات میں ''اسلام کیسے پھیلا''،''اسلام کیسے شروع ہوا''،''اسلام کے مشہور سپہ سالار''،''قرآن پاک کیا ہے'' اور ''اسلام کے مشہور امیر البحر'' بہت اہم ہیں- بچوں کے ادب کے لیے بھی مولانا عبدالواحد سندھی نے بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں-انہوں نے بچوں کے لیے بے شمار سبق آموز کہانیاں لکھیں جن میں ''بندر اور نائی''،''بی مینڈکی اور کوا''،''پانچ بونے''،''پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا''،''پکڑ دُم کٹے کو''،''تاک دھنا دھن تاک''،''جادو کا گھر''،''جگنو کی بتی''،''چل میرے مٹکے ٹمک ٹم''،''لال بندر''،''مادو رانا پردیس چلے''،''روٹی کس نے پکائی''،''لومڑی کا گھر''،''بھوچپو''،''پانچ بونے'' اور ''دال تو خوب پکی'' وغیرہ شامل ہیں-

---••☆••---

عبدالواحد معینی، سید

ماہر اقبالیات اور مشہور مصنف سید عبدالواحد ۲۱ رجنوری ۱۸۸۸ء کو اجمیر شریف (بھارت) میں پیدا ہوئے- ان کا خاندانی شجرہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ملتا تھا- اس لیے وہ اپنے نام کے ساتھ معینی لکھتے تھے- ان کے والد کا نام سید عبدالمجید معینی تھا- سید عبدالواحد نے ابتدائی تعلیم درگاہ کے مدرسہ میں حاصل کی- اسی شہر میں پڑھتے رہے اور اجمیر گورنمنٹ کالج سے بی ایس سی کیا- سنہ ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ میں داخلہ لیا اور سنہ ۱۹۲۰ء تک یہاں رہے- بعدازاں حکومت ہند کے وظیفے پر آکسفورڈ یونیورسٹی بھیج دیے گئے اور سنہ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے نباتیات میں ایم اے کیا- علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں سید صاحب نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم کے ہم جماعت تھے- آکسفورڈ میں پھر وہ نوابزادہ لیاقت علی خان کے ساتھ شعیب قریشی اور سر انتھونی ایڈن کے ہم جماعت بھی رہے تھے- آکسفورڈ میں عبدالرحمٰن صدیقی اور عبدالکریم چھاگلہ بھی ان کے ساتھ تھے- سید صاحب اس بات پر بہت فخر کیا کرتے تھے کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں وزیراعظم پاکستان ہوئے، مسٹر چھاگلہ ہندوستان میں مرکزی وزیر ہوئے، شعیب قریشی جو مولانا محمد علی کے داماد تھے' وزیر و سفیر رہے- عبدالرحمٰن صدیقی گورنر مشرقی پاکستان ہوئے- سید صاحب اپنے ان ہم جماعتوں کے قصے سناتے ہوئے بڑا فخر محسوس کرتے تھے-

سنہ ۱۹۳۲ء میں یورپ سے واپسی پر انڈین فارسٹ سروس سے منسلک ہوگئے- سی پی اور حیدرآباد دکن میں محکمۂ جنگلات کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے- سنہ ۱۹۴۸ء میں واحد معینی صاحب پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی- سنہ ۱۹۵۲ء میں وہ اقوام متحدہ کے مشیر جنگلات مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۵۵ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے-

سید صاحب علامہ اقبالؔ اور اُن کے کلام کے بڑے شیدائی تھے- وہ علامہ اقبال سے والہانہ عشق کرتے تھے- وہ جس ملک جاتے تھے وہاں کے اسکالرز کو کلامِ اقبال کے مطالعے پر اُکساتے تھے- ان

کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ ہائیڈل برگ اور میونخ میں جہاں علامہ اقبال رہے تھے' با قاعدہ تحریک چلا کر انہوں نے اقبال کی یادگار بنوانے کے لیے ماحول تیار کیا- جرمنی میں جہاں جہاں علامہ اقبال جاتے رہے' اُن مقامات پر یادگاری تختیاں لگوائیں اور جرمنی میں "اقبال ایوینو" بنوایا جواب تک مشہور جگہ ہے- سید صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے- علمی تجسّس ان کے خاندان کی دیرینہ روایت تھی- اس روایت کو نبھانے کے لیے انہوں نے اقبالیات کا موضوع اپنایا اور اپنی زندگی میں ہی فکرفنِ اقبال پر آٹھ کتابیں لکھیں- جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) اقبال اور اس کا فن (۲) باقیاتِ اقبال (۳) انٹروڈکشن ٹو اقبال (انگریزی)
(۴) اسٹڈیز ان اقبال (۵) تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال اس کے علاوہ انہوں نے علامہ اقبال کے مختلف مقالات بھی پرانے جرائد و رسائل سے جمع کر کے شائع کیے ہیں-

آغا شورش کاشمیری (مرحوم) "سب رس" یادرفتگان نمبر (حصہ دوم) میں لکھتے ہیں:

"سید صاحب کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اقبال سے ان کا والہانہ عشق ہے' وہ دل و دماغ سے اقبال کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا رہبرِ اعظم سمجھتے اور ان کی فکر کو عام کرنے کے مبلغ ہیں- انہوں نے اپنے بڑھاپے کو بھی اس کے لیے وقف کر رکھا ہے وہ دن رات اس کے لیے سفر کرتے اور ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں- ان کا خیال ہے کہ بعض لوگوں نے اقبال کو اپنی معاش یا اپنی شہرت کا ذریعہ بنا رکھا ہے' حالانکہ اقبال کے افکار و نظریات ملک و قوم کی برتری و بلندی اور اسلامی معاشرے کی نئی تشکیل میں مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں-

غرض اس ایک شخص (سید صاحب محترم) کی تنہا جدوجہد اور شب و روز کے سفر سے احساس ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اقبال کے نام پر اکادمیاں بنا کر کراچی اور لاہور میں سرکاری خزانے کے روپے کو خویش پروری پر صرف کر رہے ہیں اور انہیں اس سارے عرصے میں ایک آدھ قابلِ مطالعہ کتاب کے سوا کسی قابلِ ذکر کتاب کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوئی ہے-"

سید عبدالواحد کی قابلِ قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جناب ہاشم رضا صاحب "سب رس" یادرفتگان میں لکھتے ہیں:

"اقبال کی اردو فارسی خدمات پر اُن کو نوبل پرائز آف لٹریچر ملنا چاہیے تھا- وہ اس ایوارڈ

کے اہل تھے اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ہم عصر بھی جن کو ادب کا نوبل پرائز ملا۔ اقبالؔ نے اگر نوبل پرائز حاصل نہ کیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ٹیگور کی بنگالی شاعری اقبال کے اردو و فارسی کے کلام سے زیادہ بہتر تھی۔ ایسا اس حقیقت کی بدولت ہوا کہ اقبال کے کلام کا انگریزی ترجمہ نہیں ہوا تھا جبکہ ٹیگور کی تحریروں کا ہو چکا تھا۔ ٹیگور کے وسیلے اور ذرائع بہت فعال اور مضبوط تھے کہ وہ اپنے مقاصد میں آگے بڑھ سکے جب کہ اقبال کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ اسی طرح سے سید عبدالواحد کی بھی کوئی لابی اور ذرائع نہ تھے۔ نیوز ٹی وی ریڈیو اخبارات غرض ہمارے ذرائع ابلاغ میں سے کسی نے اقبالؔ کے اس زبردست حامی اور بہی خواہ کی موت کا نوٹس نہیں لیا جو ۳ مارچ سنہ ۸۰ء کی صبح کو خاموشی سے وفات پا گئے تھے۔''

سید صاحب بڑے ڈیل ڈول اور ہاٹھی کاٹھی کے انسان تھے لیکن آخری عمر میں بیماری اور لاغری کی وجہ سے پریشان رہتے تھے۔ ۳ مارچ سنہ ۱۹۸۰ء کو سید عبدالواحد معینی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ کلفٹن کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔

---••☆••---

عبیداللہ علیم

عبیداللہ علیم ۱۲ جون سنہ ۱۹۳۹ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ان کے آباواجداد کا تعلق کشمیر کے بٹ خاندان سے تھا۔ان کے والد رحمت اللہ بٹ کا قیام سیالکوٹ میں تھا۔وہ انجنیئر تھے اور سیالکوٹ سے بھوپال چلے گئے تھے۔وہ پینتیس سال تک وہاں رہے۔ان کا ذریعہ معاش ٹھیکے داری اور زمینداری تھا۔بھوپال سے پچاس میل دور چن پور میں ان کا ایک فارم بھی تھا۔ان کی والدہ بھوپال کی تھیں جن کا تعلق یوسف زئی خاندان سے تھا۔عبیداللہ علیم کی ابتدائی تعلیم بھوپال میں ہوئی ۔سنہ ۱۹۵۲ء کو وہ پاکستان آئے اور لالوکھیت میں آباد ہوئے۔یہاں آ کر سنہ ۱۹۵۵ء تک پڑھائی کا سلسلہ منقطع رہا۔۱۹۵۵ء میں رنچھوڑ لائن میں واقع ایک نائٹ اسکول میں ساتویں کلاس میں ان کا داخلہ ہوا۔نویں کلاس میں لالوکھیت نمبر ۴ میں گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا اور وہیں سے میٹرک پاس کیا۔۱۹۵۹ء میں اردو کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۱ء میں انٹر کیا۔ناساعد حالات کے تحت تعلیمی سلسلہ پھر منقطع ہوگیا اور وہ دو سال تک ملازمت کرتے رہے۔۱۹۶۳ء میں اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور اول درجے میں بی اے پاس کیا۔اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں اردو میں ایم اے کیا۔
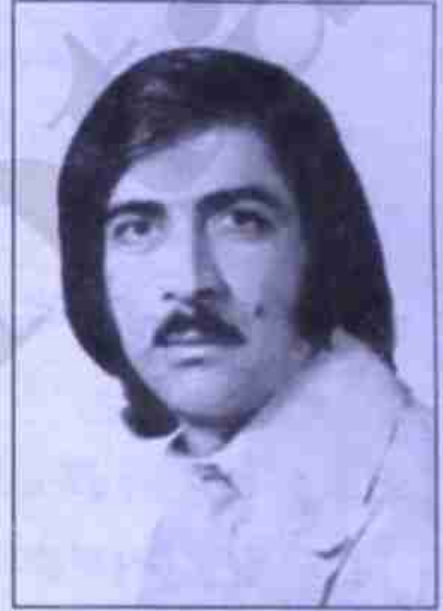
عبیداللہ علیم ہمہ وقت معاشی مسائل میں مبتلا رہے۔پاکستان آنے کے بعد ان کے والد حسن ابدال چلے گئے اور ایک فیکٹری میں ملازم ہوگئے۔یہ فیکٹری رضیہ غلام علی کی تھی۔رضیہ غلام علی کے والد سے عبیداللہ علیم کے والد کے تعلقات بھوپال سے تھے جہاں وہ ان کے ساتھ انجینئر رہے تھے۔کچھ عرصے کے بعد عبیداللہ اپنے والد کے ساتھ واپس کراچی آ گئے۔ذریعہ معاش کے لیے عبیداللہ نے مختلف جگہوں کیا۔انہوں نے فیکٹری میں مشینیں بھی صاف کیں،اسٹیشن پر انڈے بھی بیچے،رسالوں کے معمے بھی بھرے اور بیڑیاں بھی بنائیں لیکن عبیداللہ نے چھوٹے سے چھوٹے کام یا چھوٹی سے چھوٹی ملازمت کرنے میں کبھی کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی۔

میٹرک کے بعد پوسٹ آفس کے سیونگ بینک میں ڈیڑھ سال تک ملازم رہے۔پھر تقریباً دو سال

تک پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹس میں کام کیا-بارہ سال تک انہوں نے ٹیلی ویژن پر بھی نوکری کی- آٹھ دس سال تک وہ بی سی سی آئی سے منسلک رہے-اس کے بعد علیم نے ایک ڈیکلیریشن کے لیے درخواست دی جو منظور نہیں کی گئی-ڈیکلیریشن کے لیے ان کے دوست احمد مقصود حمیدی اور آغا حسن عابدی نے بھی کوشش کی لیکن انہیں ڈیکلیریشن کی اجازت نہیں ملی اور وہ ڈیکلیریشن لینے میں کامیاب نہ ہو سکے-

عبیداللہ علیم کو شعر سخن کا ذوق زمانہ طالب علمی سے ہوا- میٹرک سے پہلے انہوں نے غزلیں، نظمیں لکھیں-وہ اپنی شاعری کے آغاز کے متعلق کہتے ہیں:

''ویسے تو میں نے میٹرک سے پہلے شعر کہنا شروع کر دیا تھا-لیکن آپ یقین جانیے کہ میں نے میٹرک تک جتنی بھی شاعری کی وہ غزلیں، نظمیں، اشعار سب کو ضائع کر دیا-اپنی بیاض کو باقاعدہ مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی-......لیکن جب ہم ۱۹۵۹ء میں اپنی باطنی شکل میں نمودار ہوئے تو ہم نے غزلیں لکھیں اور جب سے آج تک ہم نے کوئی چیز ضائع نہیں کی-''

عبیداللہ علیم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے سلیم احمد ''سیپ'' شمارہ ۲۸ میں لکھتے ہیں:

''علیم کی شاعری کو میں نے آشوبِ رات کی شاعری کہا ہے-نئی نسل میں بھی احساسِ ذات کی فراوانی ہے-اس کے معنی کیا ہیں-؟ فرد جب اپنی فطری، خاندانی اور معاشرتی رشتوں سے کٹ جاتا ہے-تو سارے رشتے اس پر ایک بوجھ بن جاتے ہیں-تب فرد کو سانس لینے میں بھی ایک دقت سی محسوس ہوتی ہے اور دباؤ سا محسوس ہوتا ہے-یہ دباؤ جتنا شدید ہوتا ہے-فرد کو اپنے وجود کا احساس ہونے لگتا ہے-بالکل اسی طرح جیسے آپ ہاتھ میں کوئی وزنی چیز اٹھائیں، وزن کی وجہ سے آپ میں اپنے ہاتھ کا احساس زیادہ بڑھ جائے گا-انسانی نفسیات کی یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ داخلیت پسندی جو خارج سے اتنی آزاد معلوم ہوتی ہے تمام تر خارجی دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے-خارجی دباؤ اسے پیدا بھی کرتا ہے-اور متعین بھی کرتا ہے-اس لیے ہمارے یہاں داخلیت پسندی کا جو زور ہے وہ سرتاسر ایک منفی معاشرے کی پیداوار ہے-''

عبیداللہ کی شعری کتابوں کے اب تک کئی ایڈیشن چھپے ہیں-''چاند چہرہ ستارہ آنکھیں'' کے آٹھ

ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ''ویران سرائے کا دیا'' سنہ ۱۹۸۶ء میں اس کے دو ایڈیشن ایک کے بعد دیگرے چھپے اور مقبول ہوئے۔ عبید اللہ کا کلام ملاحظہ کیجیے۔

ہم دیوانوں کی قسمت میں لکھے ہیں یاں قہر بہت
کوچہ کوچہ سنگ بہت اور زنداں زنداں زہر بہت

رات آئی تو گھر گھر وحشی سایوں کی تقسیم ہوئی
دن نکلا تو جبر کی دھوپ میں جلتا ہے یہ شہر بہت

اب تو ہو کسی رنگ میں ظاہر تو مجھے کیا
ٹھہرے ترے گھر کوئی مسافر تو مجھے کیا

سوائے اپنے کسی کے بھی ہو نہیں سکتے
ہم اور لوگ ہیں لوگو ہمیں ستاؤ مت

آنکھیں اپنی خواب بھی اپنے
اپنے خواب کے دکھلائیں

خیال و خواب ہوئی ہیں محبتیں کیسی
لہو میں ناچ رہی ہیں یہ وحشتیں کیسی

نہ شب کو چاند ہی اچھا نہ دن کو مہر اچھا
یہ ہم پہ بیت رہی ہیں قیامتیں کیسی

نہ صاحبانِ جنوں ہیں نہ اہلِ کشف و کمال
ہمارے عہد میں آئیں کثافتیں کیسی

عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

کمال آدمی کی انتہا ہے
وہ آئندہ میں بھی سب سے بڑا ہے

کوئی رفتار ہوگی روشنی کی
مگر وہ اس سے بھی آگے گیا ہے

جہاں بیٹھے صدائے غیب آئی
یہ سایہ بھی اسی دیوار کا ہے

مجسم ہوگئے سب خواب میرے
مجھے میرا خزانہ مل گیا ہے

حقیقت ایک ہے لذّت میں لیکن
حکایت سلسلہ در سلسلہ ہے

یونہی حیراں نہیں ہیں آنکھ والے
کہیں اک آئینہ رکھا ہوا ہے

سلامت آئینے میں ایک چہرہ
شکستہ ہو تو کتنے دیکھتا ہے

---••☆••---

عتیق احمد، پروفیسر

پروفیسر عتیق احمد یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں ان کو چوتھے درجے کے امتحان میں شریک کرایا گیا جس میں وہ کامیاب ہوئے اور پانچویں کلاس میں داخل ہوئے۔ یہیں سے انہوں نے آٹھویں کلاس پاس کی۔ اس کے بعد دہلی سے تقریباً ۳۰ میل کے فاصلے پر واقع پلول کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ کرایا گیا۔ یہ اسکول پنجاب یونیورسٹی کے تحت آتا تھا۔ یہاں پر ان کے نانا محکمۂ پولیس میں ملازم تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں انٹر کا امتحان دینے سے پہلے عتیق صاحب کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ والد صاحب کی اچانک وفات اور نامساعد حالات کی وجہ سے پڑھائی کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔

سنہ ۱۹۴۸ء میں پرفیسر عتیق صاحب پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ والد صاحب کی وفات کے بعد عتیق صاحب پر بہت سی گھریلو ذمہ داریاں آپڑی تھیں۔ سب سے اہم ذمہ داری والدہ اور بہنوں کی کفالت اور پھر اپنی تعلیم تھی۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت اختیار کرلی لیکن کچھ دن کے بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں حکومت پاکستان منسٹری آف فائنانس میں بحیثیت کلرک ملازم ہوگئے۔ اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی اے اور سنہ ۱۹۵۷ء میں ایم اے (فارسی) کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد پارٹ ٹائم فارسی کے لیکچرار ہوگئے اور سرکاری نوکری کو خیرباد کہا۔ دو سال پڑھانے کے بعد اندازہ ہوا کہ فارسی پڑھنے والوں کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۶۰ء میں عتیق صاحب نے سیکنڈ ڈویژن میں ایم اے (انگلش) کیا۔ اس کے بعد وہ مکمل طور پر درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں ان کی

شادی ہوئی۔ان کی اہلیہ فہمیدہ عتیق بھی ایک ناموراديب ہیں۔اُن کی تصنیف میں ''اِبنِ خلدون اور جدید تعلیمی نظریات'' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی ہے۔آجکل وہ ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہی ہیں۔عتیق صاحب نے ابتدا میں رضا علی کالج میں پڑھایا اس کے بعد انہوں نے نیشنل کالج پھر سراج الدولہ کالج اور آخر میں جناح کالج میں تدریسی خدمات انجام دیں۔سنہ ۱۹۹۰ء میں وہ جناح کالج سے ریٹائر ہوئے۔

پروفیسر عتیق احمد صاحب اپنی ادبی زندگی کے بارے میں کہتے ہیں:

''سنہ ۱۹۵۰ء تک صرف ادب پڑھنے میں دلچسپی رہی۔بالخصوص افسانے اور ناول بہت پڑھتا رہا۔شاعری بھی پڑھی لیکن عجیب بات یہ ہے کہ نہ کبھی شاعری کرنے کی طرف دھیان کیا اور نہ افسانہ نویسی کی طرف۔ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک دوست نے اپنے ہفت روزہ ''ماحول'' میں علامہ اقبال پر مضمون لکھنے کو کہا۔ یہ ہفت روزہ کچھ نیم فلمی ،نیم سیاسی اور بہت ہی غیر معروف قسم کا تھا۔سوچا کہ ادب پڑھنے والے اس پرچے کو پڑھتے ہی نہیں لہذا دوست کا دل رکھنے اور خود بھی کچھ مصنف بن جانے کے لالچ نے ورغلایا اور یوں پہلا مضمون ''علامہ اقبال کا تصورِ زندگی'' لکھا جو دوست نے چھاپ بھی دیا۔اور تعریف بھی کی (یہ بھی ان کی مروّت ہی تھی) کچھ ہمت بندھی ،اُسی سال ''حالی'' اور ''ذوق'' پر دو مضامین ہفت روزہ ''ماحول'' اور ''غالب کی شاعری میں مزاح'' ماہنامہ ''تنویر'' کراچی میں شائع ہوا، اور حالی اور عشق' ماہنامہ ''ادب'' کراچی میں۔پس گاڑی چل پڑی۔سنجیدگی سے تنقید نگاری کے متعلق نہ سوچا تھا اور نہ کوئی پروگرام تھا۔افسانے بہت کثرت سے پڑھتا تھا اس خیال سے کبھی نہ کبھی افسانے لکھنے شروع کر دوں گا۔مگر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی۔''

پروفیسر عتیق احمد صاحب کا ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام ہے۔اُنھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں (۱) مثلث (ناولٹ از عزیز احمد مع طویل مقدمہ) (۲) استفادہ (۳) اردو ادب میں احتجاج (۴) فیض۔عہد اور شاعری (۵) ادبی مضامین پریم چند (۶) تنقیدی راستے۔(۷) بنّے بھائی (سجاد ظہیر کے بارے میں ذاتی تاثراتی مضامین) (۸) خواجہ احمد عباس کے افسانے (مع مقدمہ) (۹) سجاد ظہیر ایک ادبی جائزہ

--••☆••--

عروجؔ، عبدالرؤف

عبدالرؤف نام اور تخلص عروجؔ ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء کو اورنگ آباد (مہاراشٹر) بھارت میں پیدا ہوئے۔ عروجؔ کا تعلق قدیم مذہبی گھرانے سے تھا۔ ان کے جدِّ اعلیٰ ایک صاحب حال وقال بزرگ تھے جن کا مزار آج بھی سُرور نگر میں مرجع خاص وعام ہے۔ عروجؔ کی تعلیم وتربیت اورنگ آباد میں ہوئی۔ انہوں نے میٹرک انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد سے کیا۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں پڑھ رہے تھے کہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا جہاں شعر گوئی گناہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن خاندانی روایت کی پروانہ کرتے ہوئے وہ شعر سخن میں دلچسپی لیتے رہے۔ اُردو ادب پر انہیں نے خاصی دسترس حاصل تھی۔ فارسی انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد میں پڑھی تھی۔ اپنے استاد شکیل اورنگ آبادی کی صحبت میں رہ کر انہوں نے فارسی شاعری کا بھی خوب مطالعہ کیا تھا۔ ان کی پہلی ادبی تخلیق آٹھ نو برس کی عمر میں منظر عام پر آئی اور خوب سراہی گئی۔ یہ ایک گیت تھا جو دیوالی کے تہوار پر لکھا تھا جس کے بول ''پھر آج دیوالی آئی'' تھے۔ یہ گیت دیوالی کے موقعے پر اورنگ آباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا۔

حیدر آباد میں پولیس ایکشن کے کچھ عرصہ بعد عروجؔ اورنگ آباد سے کراچی چلے آئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس بائیس برس تھی۔ یہاں آنے کے بعد حیدر آباد ٹرسٹ میچ فیکٹری میں مزدوری کی، پھر کوئلے بیچے، اخبار بیچے اور فٹ پاتھ پر سو کر راتیں بسر کیں۔ پھر بہت سے ادبی رسالوں اور اخبار اور کچھ عرصہ اردو لغت بورڈ میں کام کیا۔ ماہنامہ ''نیا راہی'' میں ان کا طویل مضمون چھپتا رہا۔ یہ موڑ پیر حسام الدین اور قمر جمیل کی وجہ سے آیا۔ اسی زمانے میں ان کی کتاب تذکرہ فارسی گویان ہند منظر عام پر آئی۔ بیس بائیس برس تک وہ ''حریت'' سے منسلک رہے اور روز ایک قطعہ لکھتے تھے۔ حریت کے ادبی گزٹ ان ہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ اس کے لیے انہوں نے سرزمین سندھ پر قسط وار مضامین لکھے جن کی پیر حسام الدین، کریم بخش خالد جیسے دانشوروں نے بڑی تعریف کی۔ امیر خسروؔ کے سات سو سالہ جشن کے موقع پر عروج نے ایک کتاب لکھی جس کا مسودہ اسلام آباد میں گم ہوگیا لیکن انہوں نے اپنی یادداشت

سے دوسرا مسودہ لکھ دیا۔

عبدالرؤف عروج کا شمار اُردو کے پختہ فکر اور ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی نظمیں اور غزلیں ملک کے تمام اہم رسالوں میں چھپتی رہیں۔ان کے کلام کو مختلف حلقوں میں اس لیے پسند کیا جاتا تھا کہ اس میں اس عہد کا مشاہدہ، تجربہ اور تجزیہ شامل ہوتا تھا۔ان کے پڑھنے والے آج بھی عروج کی بعض پرانی نظموں کے حوالے دیتے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں ہر صنف پر طبع آزمائی کی۔ان کا کلام برصغیر کے مشہور و معروف جرائد میں چھپتا رہا۔نثر نگاری، تذکرہ نگاری اور تنقید نگاری میں بھی وہ بڑے مشاق تھے۔

عروج نے ریڈیو ٹی وی کے لیے بھی بہت کچھ لکھا۔شاہد احمد دہلوی نے عروج سے نغمے لکھوائے اور نشر کروائے۔انہوں نے بہت سے پروگراموں کے لیے اسکرپٹ بھی لکھے جن میں یادش بخیر (یہ پروگرام مشاہیر کے بارے میں تھا) (۲)سات دن (۳)چہرے (۴)ٹی وی انسائیکلوپیڈیا (۵)نیلام گھر کے لیے سوالات (۵)شاعر مشرق کی زندگی پر دو دستاویزی فلموں کے مسودے۔

عروج ایک ذہین اور پُرگو شاعر تھے۔وہ شاعری کی کسی صنف میں بند نہیں تھے، خاص طور پر غزل اور نظم پر وہ یکساں قدرت رکھتے تھے۔۱۷ مئی ۱۹۹۰ء کو عروج دارفانی سے رخصت ہوگئے۔ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

فارسی گو شعرائے اُردو (تذکرہ)، بزمِ غالب (معاصرین و مکتوب الیہم غالب)، ''رجال اقبال'' (حصہ اول اقبال کی تحریروں کے حوالے سے ان کے معاصرین، احباب اور ملاقاتیوں کے حالات)، اقبال اور حیدرآباد

زیرِ طبع: شاعری اور سماجی ترکہ، خاندانِ انیس کے مرثیہ نگار، اقبال کے غیر مدّون خطوط، رجال اقبال (حصہ دوم)، لہولہو اجالا (مراثی) ان کی اکھٹی چار پانچ تالیفات ''میر اور عہد میر''، ''غالب کا دوسرا دیوان''، ''مصحفی کی مثنوی نگاری'' اور ''اردو مثنوی کے پانچ سو سال'' تدوین: ''اُردو مرثیہ کے پانچ سو سال''، ''دیوان محمد علی جوہر''

عروج کا کلام:

نظر میں لوچ نہ ہیجان منظروں میں ہے عروسِ صبح ابھی شب کی چادروں میں ہے
نہ سوچ تاج وروں کا مآل کیا ہوگا یہ دیکھ تیشہ بکف کون پتھروں میں ہے

سلگ رہی ہیں کناروں کی بستیاں اب تک
بلا کی آگ ہمارے سمندروں میں ہے
میں کس سے اپنی تباہی کی داد چاہوں گا
فقیہہ شہر تو ہنگامہ گستروں میں ہے
نگل نہ جائیں اسے بھی یہ کج کلاہ عروج
ذرا سی آن جو باقی سخن وروں میں ہے

کچھ نہ کیا ارباب جنوں نے پھر بھی اتنا کام کیا
دار بہ دار افتاد سے کھیلے زلف بہ زلف آرام کیا
تنہائی بھی سنناٹے بھی دل کو ڈستے جاتے ہیں
رہ گیرو کس دیس میں آ کر ہم نے آج قیام کیا
رات کے ہاتھوں کب تک رہتا شہر نگاراں تیرہ تار
اپنے لہو سے ہم نے چراغاں آخر گام بہ گام کیا
میر کے گیانی لاکھوں دیکھے میر سی کس میں بات عروج
میری بتیں آپ نے کہہ لیں خود کو عبث بدنام کیا

پلکوں پہ دیے سجا رہا ہوں
راتوں میں لہو جلا رہا ہوں
رونے کو نہیں ہیں اشک باقی
ہر چیز پہ مسکرا رہا ہوں
اب یاد بھی راکھ ہوگئی ہے
کس آگ سے کھیلتا رہا ہوں
ہے سنگ زنوں کا اس پہ قبضہ
کس شہر کی سمت جا رہا ہوں
میرا تو قصور ہے بس اتنا
میں آپ کا آشنا رہا ہوں
راتوں کے بکھر گئے ہیولے
صبحوں کا فریب کھا رہا ہوں

--••☆••--

عطیہ خلیل عرب، ڈاکٹر

پاکستان میں ایسی بہت سی شخصیات موجود ہیں جو اپنے علم و دانش اپنی ذہانت سے نہ صرف پاکستان میں بلکہ ممالک غیر میں بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان ہی شخصیات میں ایک نام ممتاز اسکالر و شاعرہ ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب کا بھی ہے۔ غیر عرب کی حیثیت سے ان کا شمار عرب دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور علم و فن کے حلقوں میں بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے عربی کے حوالے سے بے مثال اور لاجواب کام کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں عربوں میں "مجاہدہ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب کے والد علامہ خلیل عرب عربی زبان کے ایک جید عالم تھے۔ اُن کا برِصغیر بلکہ عرب دنیا میں بھی بڑا مقام تھا۔ وہ بھوپال کی شہزادی عابدہ سلطانہ کے قرآن کے معلّم اور استاد تھے۔

عطیہ کے دادا شیخ محمد عربی کے قادر الکلام شاعر تھے اور فن عروض کے تو وہ امام تھے۔ عربی نثر بھی بے تکلف لکھتے تھے۔ ان کی نشو ونما اور ان کی جوانی سب بلاد یمن میں گزری تھی۔ وہ اہل زبان تھے اور صاحب دیوان شاعر بھی۔ نواب زادہ شہریار خاں نے ان کے دادا کو باغ فرحت افزا عطا کیا تھا۔ ڈاکٹر عطیہ کے پردادا علامہ شیخ حسین بن محسن الانصاری، جو عربی کے عظیم اسکالر تھے، یمن سے برِصغیر آئے تھے۔ اپنی علمی شہرت اور فضیلت کی بدولت نواب شاہجہان بیگم کے دَورِ حکومت میں ریاست بھوپال کی مجلسِ علماء کے اہم رُکن تھے۔ نواب شاہ جہاں بیگم خلد آشیاں ان کی اتنی قدر کرتی تھیں کہ ان کے مشورہ کے بغیر کسی مذہبی معاملہ میں قدم نہیں اُٹھاتی تھیں۔

اسی علمی خاندان میں ۲۷ دسمبر ۱۹۴۳ء کو ریاست بھوپال میں ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر برِصغیر اور عرب دنیا میں بڑا مقام حاصل کیا ہے۔ وہ پہلی غیر عرب پروفیسر ہیں جنھوں نے عرب طلبہ کو تعلیم دی۔ ڈاکٹر عطیہ اپنے والد کی سب سے چھوٹی بیٹی ہیں۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئیں اور کراچی میں مقیم ہوئیں۔ عربی کی تعلیم انہوں نے

گھر پر حاصل کی-۱۹۶۷ء میں میٹرک پاس کیا-سنہ ۱۹۶۸ء میں ان کی شادی سید محمد اویس سے ہوگئی -ان کے شوہر جنہوں نے ڈاکٹر عطیہ خلیل کے ذوق وشوق کو بڑی جلا بخشی اور ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتے رہے، حکومتِ پاکستان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں- ڈاکٹر صاحبہ نے انٹر، بی اے کے امتحانات شادی کے بعد پرائیویٹ طور پر پاس کیے-اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا-بعدازاں انہوں نے مصر کی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا-ان کے مقالے کا عنوان ''زمانہ جاہلیت کی شاعری میں عورتوں کا تذکرہ'' تھا-

تعلیم سے فارغ ہوئیں تو درس وتدریس سے منسلک ہوگئیں-پی ایچ ڈی کے بعد وہ سعودی عرب یونیورسٹی میں ادب کی پروفیسر رہیں-کئی سال سعودی عرب میں رہنے کے بعد ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب سنہ ۱۹۷۳ء میں کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں پروفیسر مقرر ہوئیں-مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد سنہ ۲۰۰۳ء میں ریٹائر ہوئیں-

ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب کو لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا-نوعمری کے زمانے میں انہوں ایک چھوٹی سی کتاب ''محمدؐ رسول اللہ'' لکھی-انہوں نے علامہ اقبالؔ کے فارسی اور اُردو کلام کا عربی میں ترجمہ کرنے کا بھی بڑا کام کیا ہے-وہ ایک کہنہ مشق شاعرہ بھی ہیں-شعروسخن کا ذوق انہیں سنہ ۱۹۷۸ء سے ہوا-عربی، فارسی اور اُردو میں شاعری کرتی ہیں-ان مجموعۂ کلام ''سایہ ہے کہ تم ہو'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے-ان کا کلام ملاحظہ کیجیے۔

گُم گشتہ مسیحا کا پتہ پوچھ رہے ہیں ‏ ‏ درد دلِ مضطر کی دوا پوچھ رہے ہیں
ہم آج بھی منزل سے پرے قافلے والو! ‏ ‏ اک ایک سے منزل کا پتہ پوچھ رہے ہیں
اب اور کہاں جائیں کسے حال سنائیں ‏ ‏ وہ پوچھ رہے ہیں کہ یہ کیا پوچھ رہے ہیں
وہ لوگ جو واقف نہیں آداب جنوں سے ‏ ‏ آج آپ سے آئینِ وفا پوچھ رہے ہیں

مجھے ایک سجدہ نصیب ہو، کبھی کوئی ایسا نماز میں ‏ ‏ میں سر جھکاؤں سر کو یہیں کہیں، تو اُٹھاؤں ارضِ حجاز میں
ترا شوق دید کشاں کشاں، مجھے لے گیا ہے کہاں کہاں ‏ ‏ تری جلوہ گاہ یہاں، وہاں میں ہوں، سجدہ ہائے نیاز میں
ترا حرف کُن ہمہ لامکاں وہ لما خلقت کا راز داں ‏ ‏ جہاں ایک فرق لطیف سا تھا حقیقت اور مجاز میں
مجھے آج اپنا بنا بھی لے، مجھے اپنے در پہ بلا بھی لے ‏ ‏ جو نفخت فیہ میں روح تھی نہیں اب وہ پردۂ راز میں

مرا اشک اشک' لہو لہو' مری ہر کسک میں ہے تو ہی تو
لبِ زخم کھل کے بتا نہ دے، جو لکھا ہے لوحِ بیاض میں

مری چشم تر بھی منفعل مرے اعتراف گناہ پر
مری بندگی کو اماں ملے' ترے عفو بندہ نواز میں

مجھے اب تو اذنِ رسائی دے کبھی تو مجھے بھی دکھائی دے
کروں عرض حال میں روبرو' کبھی سوز میں کبھی ساز میں

زندگی کو زندگی سے بدگماں دیکھے گا کون
ہم نہ دیکھیں گر تمہیں پھر جان جاں دیکھے گا کون

ہر فسانہ اک حقیقت' ہر حقیقت داستاں
داستانوں میں حقیقت کو نہاں دیکھے گا کون

زخم اِس مرہو طلب ہے' درد پیہم کی قسم
سر میں سودائے جنوں' زخم نہاں دیکھے گا کون

یہ جہان آب و گل' اول فنا' آخر فنا
رشتہ ہائے جسم و جاں' ہوں گے کہاں؟ دیکھے گا کون

ای! کہ از سوز فراق تو پریشاں سوختم
پا بجولا سوختم رقصاں و گریاں سوختم

او بت کافر نہ داند رسم دلداری و من
رُتختم طرح حرم در کافرستاں سوختم

تو کہ اندر تربیئ جاں ناز فرمائی و من
آتشے در سینہ دارم در بیاباں سوختم

من زبلبل نغمہ و آہ و فغاں آموختم
در چمن زار و بہار کوئے جاناں سوختم

از فغاں بر دل قیامت رفت و کس آگاہ نیست
فاش می گویم کہ من محشر بد اماں سوختم

ای کہ وصلت نیست ممکن در جہان بے اماں
وی کہ اندر التہاب نار ہجراں سوختم

--••☆••--

عظمیٰ فرمان، ڈاکٹر

ڈاکٹر عظمیٰ فرمان ۲۱ ستمبر ۱۹۶۸ء کو ایسے علمی ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں جس میں برسوں سے علم وادب اور شعروسخن کا چرچا رہا ہے۔ عظمیٰ کے والد ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک روشن خیال استاذ وسیع النظر نقاد ادیب، محقق اور بہترین مقرر ہیں۔ دنیائے ادب میں ان کا منفرد اور اعلیٰ مقام ہے۔ وہ ملک کے متعدد علمی ادبی اداروں کے رکن ہیں۔ ان کی گراں قدر علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے ان کو ۱۹۸۵ء میں سول اعزاز ''ستارۂ امتیاز'' سے سرفراز کیا۔ قدیم ماہنامہ ''نگار'' جسے علاّمہ نیاز فتح پوری نے سنہ ۱۹۲۲ء میں جاری کیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اس کی اشاعت کو آج تک برقرار رکھا ہے۔ برِصغیر میں یہ اُردو کا قدیم ترین ادبی ماہنامہ ہے۔

عظمیٰ فرمان نے ابتدائی تعلیم نیوٹاؤن ہائی اسکول میں حاصل کی اور یہیں سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد پی ای سی ایچ ایس کالج سے ۸۶ء میں انٹر کیا۔ ۱۹۸۹ء میں بی ایس سی کرنے کے بعد ۱۹۹۳ء میں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈوژن، فرسٹ پوزیشن میں ایم اے (اردو) کیا۔ بعدازاں ۱۹۹۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان ''اُردو کی ادبی تحقیق وتنقید میں خواتین کا حصّہ'' تھا۔ عظمیٰ فرمان کے اس مقالے کو کراچی یونیورسٹی نے طباعت کے لیے منتخب کیا اور ۲۰۰۲ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل یہ اپنے موضوع کی بنا پر پہلی مستند کتاب ہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر عظمیٰ فرمان نے میلان طبع کے سبب درس وتدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا اور جناح یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہوگئیں۔ ۱۹۹۷ء میں کراچی یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرار پڑھانے لگیں اور ۱۹۹۹ء میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد وہ اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئیں۔ اگرچہ وہ بی ایس سی تک بنیادی طور پر سائنس کی تعلیم حاصل کرتی رہیں جہاں فزکس اور ریاضی ان کے خاص مضامین تھے لیکن فطری میلان اور گھر کے ماحول کے زیرِ اثر انہوں اپنا ٹریک بدل دیا تھا۔

پی ایچ ڈی کے بعد بھی وہ لکھتی پڑھتی رہیں اور اُردو کے معیاری رسالوں ''صریر''، ''افکار''، ''نگار'' اور قومی زبان کے لیے مضامین لکھتی ہیں۔ ڈاکٹر عظمیٰ کی کتاب ''اُردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ'' کے فلیپ پر لندن یونیورسٹی کے ڈاکٹر خالد حسن قادری، انجمن ترقی اُردو (ہند) کے معتمد عمومی ڈاکٹر خلیق انجم نیز ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اسلم فرخی اور پروفیسر جمیل اختر کی رائیں درج ہیں جن میں عظمیٰ کے کام کی داد دی گئی ہے۔

ڈاکٹر خالد حسن قادری نے کتاب پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''اس کتاب کی بڑی خوبی بیان کی شگفتگی اور ادبی زبان کے استعمال کی مہارت ہے۔ نہ طول لاطائل نہ اہمال اجمال، جہاں اختلاف کیا ہے وہاں مضبوط لب و لہجے میں ٹھوس دلائل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ زبان و بیان اور الفاظ کے انتخاب و استعمال میں، اختلاف و اتفاق دونوں حالتوں میں لہجے اور اسلوب کی شائستگی قایم رہتی ہے۔''

ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں:

''ڈاکٹر عظمیٰ فرمان نے ''اردو کی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ'' کے زیر عنوان نہایت قابلِ تحسین کام کیا ہے۔ انہوں نے بہت سی ایسی قابل قدر خواتین سے ہمیں متعارف کرایا ہے جن کی بلند پایہ علمی و ادبی خدمات سے اب تک ہم بے خبر تھے۔ یہ کام، انہوں نے سرسری نہیں بلکہ بنیادی ماخذوں اور شائع شدہ حوالوں کی مدد سے ایسے قرینے سے کیا ہے کہ ان کا تحقیقی مقالہ اردو ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر عظمیٰ کی یہ تحقیقی و تنقیدی کاوش علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی موضوع کے سلسلے میں ان کے حسن انتخاب کی داد دی جائے گی اور آئندہ کام کرنے والے اس سے حسب توفیق روشنی حاصل کریں گے۔''

ان دنوں عظمیٰ کنیڈا میں ہیں اور لسانیات کے حوالے سے تحقیق و تصنیف میں مصروف ہیں۔

---••☆••---

عقیل احمد جعفری

عقیل احمد جعفری مشہور مصنف اور صحافی مولانا سید رئیس احمد جعفری کے بڑے بھائی تھے۔ ان کا سال ولادت غالباً ۱۹۰۶ء تھا۔ ان کا وطن سیتاپور ہے۔ عقیل صاحب کا خاندان یہاں کے بڑے خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ جعفری صاحب کے نانا نیاز احمد جو مدتوں ریاست بھوپال کے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس رہے، مشہور شاعر ریاض خیرآبادی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ خیرآباد اسی ضلع کا ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ عقیل احمد جعفری کے والد کا نام سید ناظر حسین تھا۔ عقیل صاحب ابھی نوعمر تھے کہ ان کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ اس طرح ان دونو بھائیوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش ننھیال میں ریاض خیرآبادی کی سرپرستی میں ہوئی۔ سید ناظر حسین جعفری کی اچانک موت کے سبب خاندانی جائداد کی دیکھ بھال صحیح طریقے پر نہ ہوسکی اور کارندوں کی خردبرد کے باعث تباہ ہوگئی جس کا اثر رئیس احمد اوران کے بڑے بھائی عقیل احمد صاحب کی تعلیم پر پڑا۔ چنانچہ عقیل احمد نے توآٹھویں کلاس کے بعد ہی تعلیم چھوڑ دی شروع میں عقیل احمد صاحب کو سیاست سے دلچسپی رہی اور میونسپل بورڈ کے چیئرمین بھی ہوگئے لیکن اپنی خاندانی روایات اور ماحول کے زیراثر جلد ہی شعروادب کی طرف آ گئے۔

تقسیم ہند کے بعد عقیل جعفری پاکستان آگئے اور کراچی میں آباد ہوئے۔ یہاں آکر سینٹرل انجینئرنگ اتھارٹی میں ملازمت اختیار کی۔ اپنے حالات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں:

"پاکستان آکر ادبی وسیاسی مشاغل غمِ روزگار کے ہاتھوں بالکل ترک ہوگئے۔ تاہم جناب جوش ملیح آبادی کی شاعرانہ بڑائی کا اعتراف کرتے ہوئے بھی ان کے ملحدانہ خیالات کی کبھی کبھی، کہیں کہیں تصحیح اور تردید کرتے ہوئے یہاں بھی ایک منظوم مجموعہ "جوش وہوش" شائع کیا۔

پاکستان آکر عمر میں پہلی مرتبہ ملازمت کی اور دس برس تک سینٹرل انجینئرنگ اتھارٹی میں خدمات سرکاری انجام دے کر اب آخری انجام کا منتظر ہوں۔"

عقیل احمد صاحب کے مجموعۂ کلام ''جوش وہوش'' میں تذکرہ خیر آباد از حاجی مولوی محمد صدیق صاحب کا ہے جنہوں نے عقیل صاحب کی سیاسی زندگی کا حال اس طرح لکھا ہے:

''منشی سید عقیل احمد جعفری خیر آبادی اب کراچی سکرٹریٹ (سنٹرل گورنمنٹ پاکستان) کے ایک گوشہ (دفتر) میں پناہ گیر ہیں۔

کہاں صحن عالم کہاں کنج مرقد بسر کر رہے ہیں بسر کرنے والے

خیر آبا میں تو یہ ایسے نہ تھے۔

ع کہ جیسے میری ضرورت نہیں زمانہ کو

میونسپل بورڈ کے چیر مین تھے (تیل۔شکر اور کپڑے کے انتہائی ابتدائی آزمائشی دور میں پبلک کی بڑی بے لوث اور انتھک خدمت کر کے

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

کے مجسم مصداق ہیں۔

سنہ ۴۷ء کا زمانہ دیکھئے اور آپ کا منتخب ہونا دیکھیئے .... آپ کے کردار کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں لوگ عموماً چھپ کے پاکستان آتے تھے آپ اس شان کے ساتھ خیر آباد سے رخصت ہوئے کہ ''حق'' میں ایڈیٹوریل شائع ہوا۔الوداعی پارٹی دی گئی۔ سپاسنامہ پیش کیا گیا اور میونسپل نے اعتراف خدمات کا ریزولیشن پاس کیا اور پھر اسٹیشن پر

دور تک یار وطن آئے تھے پہنچانے کو''

کراچی آ کر انہوں نے محمد علی اکیڈمی قائم کی تھی۔ان کا خیال تھا کہ اسے نشری ادارہ بنائیں گے لیکن بعد میں اپنے بھائی رئیس احمد کے سپرد کر کے خود ایک بکڈ پو بنا لیا۔۲۶ر جنوری کو عقیل احمد جعفری نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف غالباً نثر ریاض خیر آبادی تھی جو حیدر آباد کے کسی ناشر نے شائع کی تھی۔کراچی کے زمانہ قیام میں تین کتابیں شائع ہوئیں۔ (۱) ''مکالماتِ ابوالکلام'' (۲) ''جوش وہوش'' اور مجموعۂ کلام ''جوش وہوش'' قطعوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے جو جوشؔ کے کلام کے جواب میں ہے۔نمونہ کے طور پر ملاحظہ کیجیے۔

ہاں مشغلہ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی رسم ہا و ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان سے ٹکر ایسی
ہر ''دین'' کے ماتھے سے لہو جاری ہے
جوش ملیح آبادی

انساں پہ یہی وقت بہت بھاری ہے
سانس اکھڑی ہے دم اٹکا ہے ناچاری ہے
مرتے ہوئے مومن کے لبوں پر ہے ہنسی
''بے دین'' کی آنکھوں سے لہو جاری ہے
عقیل احمد خیرآبادی

معبود حیات تھی سو مرتے گذری
ہر آن کے دغدغوں سے ڈرتے گذری
اس عمر کا حساب بھی ہوگا سرِ حشر
جو عمر ہائے ہائے کرتے گذری
جوش ملیح آبادی

جب حشر کی تردید ہی کرتے گذری
تو کس لئے عمر آپ کی ڈرتے گذری
کرلیجیے اس کا بھی جہنم میں شمار
جو عمر کہ ہائے ہائے کرتے گذری
عقیل احمد خیرآبادی

---••☆••---

عقیل دانش

اصل نام سید عقیل احمد، تخلص دانش اور قلمی نام عقیل دانش ہے۔ ۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۴۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید محمد جمیل ہے۔ ابتدائی تعلیم قرآن شریف اور درسِ نظامیہ کی شکل میں دارالعلوم امروہہ میں حاصل کی۔ اُن کے بڑے بھائی ڈاکٹر شریف احمد سابق صدر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی نے گھر میں اردو تعلیم و تدریس کا ماحول پیدا کیا تھا۔ گھر کے ماحول اور امروہے کی روایات نے عقیل دانش میں سخن فہمی اور سخن سنجی کا شوق پیدا کیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ سنہ ۱۹۵۲ء میں کراچی آ گئے۔ یہاں سنہ ۱۹۵۷ء میں نبی باغ ہائی اسکول کراچی سے میٹرک کیا۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے اعزاز کے ساتھ بی اے پاس کیا اور سنہ ۱۹۶۳ء میں اوّل درجہ اوّل اردو میں ایم اے کیا۔ اس اعزاز پر یونیورسٹی نے انہیں تمغۂ بابائے اردو سے نوازا۔

عقیل دانش کی پہلی نظم ''شاہکار'' نبی باغ اسکول کے مجلّے میں شائع ہوئی۔ اردو کے معروف شاعر جون ایلیا نے سید عقیل احمد کو عقیل دانش بنا دیا اور وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ سنہ ۱۹۶۳ء سے سنہ ۱۹۶۴ء تک عقیل دانش نیشنل ڈگری کالج کراچی می شعبہ اردو سے وابستہ رہے۔ سنہ ۱۹۶۴ء سے سنہ ۱۹۶۸ء تک گورنمنٹ ڈگری کالج ناظم آباد میں اردو پڑھاتے رہے۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں وہ لندن چلے گئے وہاں کچھ دن بی بی سی لندن سے وابستہ رہے بعد ازاں لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جز وقتی اردو پڑھانے لگے۔ سنہ ۱۹۷۸ء میں اقبال صدی کی تقریبات کے موقع پر ان کی ادبی کاوشوں کے ذیل میں حکومت پاکستان نے انہیں تمغۂ اقبال عطا کیا۔

عقیل دانش کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے روزنامہ جنگ لندن میں سو (۱۰۰) اسباق پر مشتمل اردو تدریس کا سلسلہ ''اردو لکھیے، اردو پڑھیے، اردو بولیے'' شروع کیا جو مغرب میں بہت مقبول ہوا۔ آج کل وہ ہفت روزہ ''نیشن لندن'' میں ہفت روزہ کالم اور قطعہ لکھتے ہیں اور اردو ٹائمز نیویارک میں بھی شائع ہوتا ہے۔ روزنامہ جنگ لندن میں بھی ہر ہفتے ایک ادبی کالم لکھتے ہیں جو ''اردو لنک'' لاس

اینجلس میں بھی نقل ہوتا ہے-روزنامہ جنگ لندن، جنگ کراچی، سن رائز ریڈیو، ٹی وی ایشیاء اور زی ٹی وی اُن کے متعدد انٹرویو شائع اور نشر کر چکے ہیں-یورپ میں مشاعروں کی نظامت کے لیے عقیل دانش کا نام ایک معیار بن چکا ہے-وہ کیمبرج یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی کے متعدد اردو امتحانات ترتیب دیتے ہیں-عقیل دانش صاحب لندن میں حلقۂ فکرِ اقبال کے بانی ہیں اور سال میں دو تین محفلیں ضرور منعقد کرتے ہیں-ادیبوں اور شاعروں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں-وہ قرآن کریم کی تلاوت قراءت سے کرتے ہیں یعنی وہ ایک خوش آواز قاری بھی ہیں-عقیل دانش یوں تو ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن ان کا زیادہ رجحان غزل کی طرف ہے-نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

وہ سر زمیں جو ہمیں پہچانتی نہیں
لب پر اُسی زمیں کا ترانہ ہے دوستو

بچّے بد بھی ہوں تو سینے سے لگا لیتی ہے
ماں کے انداز میں اندازِ خدا ملتا ہے

کس چیز پر جہاں میں میری نظر نہیں
میں چپ ہوں اس لیے کہ کوئی معتبر نہیں

فسونِ شب سے ہراساں نہ ہو خدا کی قسم
اسی زمیں پہ کہیں صبح بھی ہوئی ہوگی

ظلمت کدے میں نور کا مینار ہم رہے
تپتی فضا میں سایۂ دیوار ہم رہے

راہِ الفت کا سفر جاں کا زیاں ہے دانش
آپ بتلائیے کہ آپ کہاں تک پہنچے

غزل کو حاصل صدا اعتبار کرتے رہو
جو ہو سکے تو زمانے سے پیار کرتے رہو

ہمیں یقیں ہے کہ ہم پر ستم تمام ہوئے
ہمارے بعد کسی پر ستم نہیں ہوں گے

ہر لمحہ بکھر بکھر کے دانش
تنظیمِ حیات کر رہا ہوں

دیس سے ہم کو ملا جب بھی خط اُن کا دانش
یاد پردیس میں آنے لگے گھر کے سائے

---••☆••---

علی اختر حیدر آبادی

سید علی اختر نام، تخلص اختر اور ادبی دنیا میں بطور علی اختر حیدر آبادی مشہور ہوئے۔ ۱۰ ر شوال سنہ ۱۳۱۱ھ کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن علی گڑھ ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق سبزوار ایران سے تھا۔ ان کے دادا سید قاسم علی مشہدی فارسی زبان کے بہترین شاعر تھے، وہ چند وجوہات کی بناء پر ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے اور علی گڑھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ علی اختر صاحب نے ابتدائی فارسی، عربی کی تعلیم شاہ نصیر الدین سے حاصل کی۔ اس کے بعد مسلم ہائی اسکول اٹاوہ میں پڑھے اور میٹرک کا امتحان سینٹ جانس کالج آگرہ سے پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ چلے گئے جہاں انٹرمیڈیٹ کے بعد خرابیٔ صحت کی بناء پر تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ ان کے والد کاظم علی باغ بسلسلۂ روزگار دکن حیدر آباد منتقل ہو گئے تھے۔ ابتدا میں وہ محکمۂ مالگذاری میں ملازم ہوئے بعد ازاں محکمۂ آبکاری میں ایک عرصے تک سر رشتہ دار اور پھر انسپکٹر کی حیثیت سے رہے۔ چنانچہ انٹر کرنے کے بعد علی اختر بھی اپنے والد کے ساتھ دکن حیدر آباد چلے گئے اور محکمۂ تعمیرات سے منسلک ہو گئے۔

کاظم علی باغ کا زمانۂ حیدر آباد علم و ادب کا ایک بہترین دور تھا۔ سنہ ۱۹۲۲ء سے سنہ ۱۹۲۸ء تک ان کے مکان پر باقر باغ اندروں چادر گھاٹ میں طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے جس میں حیدر آباد کے نامور شاعر شریک ہوا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے علی اختر کو ذوقِ سخن وراثت میں ملا اور اس ذوق کو اپنے ہی گھر کے ماحول نے جلا بخشی۔ حضرت علی اختر مرحوم موجودہ دور کے ایک ممتاز اور بلند پایہ نظم نگار تھے۔ ان کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی لیکن سنہ ۱۹۱۳ء سے وہ زیادہ تر نظمیں ہی لکھتے رہے۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب خواجہ حمید الدین شاہد لکھتے ہیں:

''ماضی کے شعری سرمایہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ نئے ادبی رجحانات اور تقاضوں کو سمجھنے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی اور اس میں ان کو جو کامیابی ہوئی وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ حضرت اختر علی مرحوم کی نظم نگاری کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا فلسفیانہ اندازِ

بیان ہے۔ان کی غزلوں اور رومانی نظموں میں بھی اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔
علامہ نیاز فتح پوری جیسے بالغ نظر نقاد نے اپنے رسالہ ''نگار'' میں ان کی شاعری کی اہمیت اور عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔''

''نوائے مشرق'' علی اختر حیدر آبادی کے پیش لفظ میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

''اختر حیدر آبادی ان شعراء میں سے ہیں جن کی شہرت ایک نظم نگار کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ ایک زمانے میں ان کا نام جوشؔ ملیح آبادی کے ساتھ لیا جاتا تھا۔اگر نیاز فتح پوری کی رائے پر بھروسا کیا جائے تو اخترؔ اپنی فنی بصیرت کے اعتبار سے جوشؔ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کے حق دار تھے، لیکن شہرت اور ناموری کے لیے کچھ اور ہی درکار ہے جو اخترؔ کو حاصل نہیں۔''

سقوط حیدر آباد کے بعد سنہ ۱۹۴۹ء میں حضرت علی اخترؔ حیدر آبادی کا خاندان پاکستان آیا اور کراچی شہر میں مستقل سکونت اختیار کی۔اُن کے ایک فرزند نظرؔ حیدر آبادی بھی شاعر تھے جنھوں نے کراچی میں شعر و سخن میں بڑا نام پیدا کیا۔اُن کا تذکرہ ''دبستانوں کا دبستان کراچی'' جلد اوّل میں ہو چکا ہے۔علی اختر ایک ممتاز شاعر تھے۔علی اخترؔ کو تمام اصنافِ سخن پر عبور حاصل تھا۔اُن کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی لیکن ۱۹۱۳ء کے بعد وہ زیادہ تر نظمیں ہی لکھتے رہے۔مرحوم کے دو شعری مجموعے ''انوار'' اور ''اسرار'' شائع ہو چکے ہیں۔ان کا مجموعۂ کلام ''انوار'' سنہ ۱۹۴۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا۔اخترؔ کا دوسرا مجموعہ ''اسرار'' ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن نے شائع کیا۔سنہ ۱۹۴۸ء میں بارہ سو (۱۲۰۰) اشعار کی ایک طویل نظم ''قولِ فیصل'' نگار بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کی۔۱۱؍جنوری سنہ ۱۹۵۸ء کو علی اخترؔ حیدر آبادی نے کراچی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہر قدم دیتی ہے دُنیا دعوتِ عرفانِ راز — ذرّہ ذرّہ اک جہاں ہے فکرِ انساں کے لیے
اک صبر شکن احساس ملا اک درد بھری تقدیر ملی — جو خواب ازل میں دیکھا تھا اُس خواب کی تعبیر ملی
ہنستی ہوئی کلیوں کے رُخ سے اُٹھے جو تبسم کے پردے — حسرت ہی کا ایک عالم دیکھا عبرت ہی کی اک تصویر ملی

مری دانست میں خوابِ گراں ہے رازِ بیداری — کہ بیداری مجھے خوابِ گراں معلوم ہوتی ہے
قفس میں کیوں چلی آتی ہے یادِ گلستاں ہمدم — کوئی بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
دل کی آبادی ہے اخترؔ دل کی بربادی کا نام — اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

دل بجھا سوزِ محبت نہ گیا وہ تصور کسی صورت نہ گیا

دل کی ویرانی کو مدت گزری اک مگر عالمِ عبرت نہ گیا

کروٹیں وقت نے بدلیں کیا کیا اثرِ گردشِ قسمت نہ گیا

تھا تو دنیا کا فسانہ دلچسپ تا بہ رُو دادِ حقیقت نہ گیا

جا چکے تاب و تواں صبر و سکوں اک غمِ دل کی بدولت نہ گیا

رہ گئے کانپ کے کھلتے ہوئے لب نالہ تا حدِّ شکایت نہ گیا

بجھ گئیں گرچہ اُمنگیں اخترؔ دل سے احساسِ محبت نہ گیا

---••☆••---

علی اظہر برلاس، مرزا

مرزا علی اظہر برلاس سنہ ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے مشہور علمی و دینی خاندان سے تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ کلکتہ چلے گئے، جہاں انہوں نے ۱۹۲۰ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے امتیازی نمبروں کے ساتھ بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۲۴ء میں یونیورسٹی لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۲۵ء میں انہوں نے بہرائچ اودھ میں وکالت کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ بار ایسوی ایشن کے نائب صدر اور مسلم لیگ کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ بعد ازاں بہرائچ میونسپل بورڈ کے بلا مقابلہ چیئرمین منتخب ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں علی اظہر برلاس ریاست جے پور میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے اعلیٰ منصب فائز رہے۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں انہیں نواب زادہ لیاقت علی خان نے روزنامہ ڈان دہلی کا جنرل منیجر مقرر کیا۔

تقسیم کے بعد مرزا علی اظہر برلاس ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ یہاں پر وہ روزنامہ ''ٹائمز'' لاہور میں بحیثیت جنرل منیجر منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد وہ کراچی آ گئے اور کراچی سے اپنا ذاتی ہفت روزہ ''نیشن'' انگریزی جاری کیا۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں مرزا صاحب نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ مرکزی حکومت میں انہوں نے مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۲ء میں وہ مرکزی وزارتِ اطلاعات سے بحیثیت افسرِ اطلاعات ریٹائر ہوئے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ پانچ سال تک کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں بحیثیت چیف پبلک ریلیشنز آفیسر رہے۔

برلاس صاحب ملازمتوں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں۔ وہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے بانی رکن اور نائب صدر رہے ہیں۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی رکن ہیں اور اس کی ریسرچ اکیڈمی کے چیئرمین رہے ہیں۔ سرسید گرلز کالج کراچی کے

بانی رکن ہیں۔کراچی کے دو اہم اور وقیع تعلیمی اداروں کی بنیاد بھی انہوں نے رکھی ہے جن میں ایک ایرانیان ٹیکنیکل اسکول کھارادر اور عبداللہ ڈگری کالج ہے۔

انہوں نے اُردو اور انگریزی میں متعدد تحقیقی مقالے لکھے ہیں جو علمی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ملازمت کے بعد مرزا صاحب ایک تحقیقی کتاب ''واجد علی شاہ'' لکھی اس کتاب کا بیشتر مواد انہوں نے انگلستان جا کر لندن کیمبرج اور اوکسفورڈ سے حاصل کیا اور ثابت کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سلطان واجد علی شاہ کو پراگندہ اور قابل نفرت کردار بنا کر پیش کیا تھا۔۵/فروری ۱۹۸۹ء کو علی اظہر برلاس دارِفانی سے رخصت ہو گئے۔سخی حسن کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

ان کی تصانیف میں (۱) تاریخی شہ پارے (اردو مقالات) کراچی ۱۹۷۱ء، (۲) ''کنگ واجد علی شاہ آف اودھ'' یہ ضخیم کتاب دو جلدوں میں ہے۔کراچی ۱۹۸۲ء۔ (۳) ''اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ''

علی حیدر ملک

معروف افسانہ نگار علی حیدر ملک ۷ راگست ۱۹۴۴ء کو موضع ملاٹھی، ضلع گیا (بھارت) کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے ننھیال اور ددیہال دونوں خاندانوں کا ذریعہ معاش چھوٹی موٹی زمینداری کے ساتھ سرکاری ملازمت رہا ہے۔ ان کے والد مظہر العلیم جو سول کورٹ سے منسلک تھے، موضع ملاٹھی کے معزز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ علی حیدر ملک کی ابتدائی تعلیم مختلف علماء واساتذہ سے گھر پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ہری داس سیمنری اسکول اور پھر گیٹ ہائی اسکول میں تعلیم پائی اور یہیں سے میٹرک پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ تک سچدانند سہنا کالج اورنگ آباد میں پڑھا۔ بی اے ([illegible]) اور ایم اے (اردو) کے امتحانات پٹنہ یونیورسٹی سے پاس کیے۔ اس زمانے کے مایۂ ناز اساتذہ میں علامہ جمیل مظہری، پروفیسر ممتاز احمد اور ڈاکٹر اختر اورینوی شامل تھے۔

تقسیم کے بعد ملک کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ زمینداری کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ہر وہ شخص جس کی چھوٹی موٹی زمینداری تھی وہ اپنی جگہ پریشان تھا۔ مفلسی اور غربت نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا اور ان پر روزی کے دروازے بھی بند ہو چکے تھے۔ مجبور ہو کر علی حیدر اور گھر کے افراد سنہ ۱۹۶۵ء میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے اور کھلنا میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے گورنمنٹ بی ایل کالج (کھلنا) میں بحیثیت لیکچرار ملازمت اختیار کر لی۔ چند سالوں کے بعد مشرقی پاکستان کے حالات بھی بگڑنا شروع ہو گئے۔ سات آٹھ سال تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد انہیں دوبارہ ہجرت کرنا پڑی۔ اس طرح ۱۹۷۳ء میں وہ سکھر آ کر مقیم ہوئے۔ سکھر میں بھی انہوں نے اپنا درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابتدا میں علی حیدر ملک گورنمنٹ ڈگری کالج سکھر اور اس کے بعد سپیریر کالج خیرپور (سندھ) میں لیکچرار رہے۔ بعد ازاں وہ وفاقی اُردو کالج، کراچی میں بحیثیت لیکچرار اور پھر اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اور اب وہ وفاقی اُردو یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دے

رہے ہیں۔

علی حیدر ملک کو افسانہ نگاری اور مضمون نویسی کا ذوق طالب علمی سے ہوا۔ اسی زمانے میں ''ادارہ فنکار'' کے نام سے نئے لکھنے والے نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم تھی جہاں ہفتہ وار تنقیدی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ جس میں وہ بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ مشرقی پاکستان آنے کے بعد علی حیدر ملک نے افسانہ نگاری کا بھی مشغلہ جاری رکھا۔ کھلنا کے قیام کے دوران انہوں نے اُردو کا پہلا اخبار ''ساحل'' نکالا۔ اس کے بعد ہفت روزہ ''قوم'' کا اجرا کیا جو بنگلہ دیش بننے سے پہلے تک پابندی سے نکلتا رہا۔ اس کی ایک شاخ ڈھاکہ میں بھی قائم کی تھی جس کے نمائندہ خصوصی جناب شاہد کامرانی مرحوم تھے۔ یہ بڑا مقبول اور کامیاب ہفت روزہ تھا جس میں اُس دور کی اہم شخصیات کے انٹرویو شائع ہوتے تھے۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کی ووٹر لسٹ جو صرف انگریزی اور بنگلہ زبان میں تھی ''ینگ مینز فیڈریشن'' کے مطالبہ کے بعد اردو میں شائع ہوئی۔ اس مطالبے کی منظوری اُردو داں طبقے کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

علی حیدر ملک نے تدریسی خدمات کے ساتھ ادبی تخلیقات کو بھی ہمیشہ جاری رکھا۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے اور تصانیف شائع ہو چکی ہیں جن میں (۱) بے زمیں بے آسماں (افسانے)، (۲) افسانہ اور علامتی افسانہ (مضامین)، (۳) عمر خیام اور دوسری غیر ملکی کہانیاں (تراجم)، (۴) دبستان مشرق (ترتیب)، (۵) اُردو ٹائپ اور ٹائپ کاری (ترتیب) (۶) شہزاد منظر شخصیت اور فن (ترتیب) اور (۷) شاہ لطیف بھٹائی نمبر ''برگ گل'' (ترتیب)

علی حیدر ملک کی تصنیف ''افسانہ اور علامتی افسانہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف نقاد، افسانہ نگار اور صحافی شہزاد منظر لکھا ہے:

''علی حیدر ملک کی بحیثیت ادیب ایک بنیادی خوبی یہ ہے کہ عام افسانہ نگاروں کی طرح محض افسانہ نگار نہیں، وہ افسانے کا بہت اچھا پارکھ اور ناقد بھی ہے۔ میں جب یہ کہتا ہوں تو کسی مبالغے سے کام نہیں لیتا۔ جو لوگ افسانے کے بارے میں اس کے مضامین پڑھ چکے ہیں۔ وہ میری باتوں سے اتفاق کریں گے۔ علی حیدر ملک کو نہ صرف کلاسیکی افسانے کے فن سے گہری واقفیت ہے، بلکہ وہ علامتی افسانے کے فن اور اس کے اسرار و رموز سے بھی اچھی طرح

واقف ہے- یہی وجہ ہے کہ وہ عام جدید علامت نگاروں کی طرح گم گشتہ راہ نہیں- وہ اپنی منزل سے اچھی طرح واقف ہے-اس نے علامت نگاری کے نام پر کبھی اُوٹ پٹانگ افسانے نہیں لکھے-اس کے علامتی افسانے کی تفہیم وابلاغ میں کبھی دشواری پیش نہیں آتی- اس کی وجہ اس کا گہرا تنقیدی شعور ہے-جو ہر مرحلے میں اس کی رہنمائی کرتا ہے-''

علی حیدر ملک ہمہ صفت انسان ہیں-وہ بیک وقت ایک اچھے استاد، صحافی، براڈ کاسٹر اور کمپیئر بھی ہیں- ماہنامہ ''قومی زبان'' کراچی اور ماہنامہ ''علامت'' میں بحیثیت مدیر کے خدمات انجام دے چکے ہیں- وہ روزنامہ ''جسارت'' کراچی اور ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی میں کالم بھی لکھتے رہے ہیں- علی حیدر نے ٹیلی وژن اور ریڈیو پاکستان سے ادبی پروگرام بھی کیے اور ادبی و تعلیمی تقریبات میں کمپیئر کی خدمات بھی انجام دیتے ہیں-

---••☆••---

علی محسن صدیقی، پروفیسر

پروفیسر علی محسن صدیقی ۶ رجنوری ۱۹۲۹ء کو غازی پور (یوپی) ایک کے تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مولوی محمد فاروق صدیقی علوم دینی کی معتبر شخصیت تھے۔ علی محسن صدیقی بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔متحدہ ہندوستان کے دوران قیام انہوں نے مشرقی علوم میں فاضل درسِ نظامی (مدرسہ چشمۂ رحمت، غازی پور) اور مولوی، عالم، فاضل ادیب، فاضل دینیات اسلامی، منشی (فارسی) کامل درس نظامی اور امتحانات عربی، فارسی و اُردو کی تکمیل گورنمنٹ عربی و فارسی امتحانات بورڈ الہ آباد سے کی۔اس کے بعد علی محسن صدیقی نے یوپی بورڈ سے اول درجے میں میٹرک اور انٹر کے امتحانات پاس کیے۔تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کی اور ڈھاکہ میں آباد ہوئے۔بڑی کاوش سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔۱۹۵۲ء انہوں نے بی اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔حصولِ تعلیم کے دوران علی محسن نے محسوس کیا کہ مشرقی پاکستان میں ان کا قیام مشکل ہے لہذا سنہ ۱۹۵۳ء میں وہ کراچی چلے آئے۔یہاں پر معاشی تگ و دو کے ساتھ انہوں نے تحصیل علم کا سلسلہ جاری رکھا۔انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اسلامی تاریخ) اور ایم اے (عربی) کے امتحانات پاس کیے اور دونوں امتحانات میں پوری یونیورسٹی میں اول رہے۔

ذریعہ معاش کے لیے پروفیسر علی محسن صاحب کچھ عرصہ سکریٹریٹ کراچی جوائنٹ واٹر بورڈ میں بحیثیت اسسٹنٹ اور سپرنٹنڈنٹ ملازم رہے۔لیکن اس ملازمت سے وہ خوش نہیں تھے۔ان کی خواہش تھی وہ کسی تعلیم کے شعبہ سے منسلک ہو جائیں تو پڑھنے لکھنے کا اچھا موقع مل جائے گا۔چنانچہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تدریس کا شغل اختیار کیا۔وہ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۹ء تک اُردو کالج (اب اُردو یونیورسٹی) اور کراچی یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ، تاریخ برِاعظم ہند و پاکستان، عربی اور اسلامیات پڑھاتے رہے۔ ۱۶ رجنوری ۱۹۸۹ء میں پروفیسر صاحب ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ملازمت کے بعد مختلف اداروں میں تدریس و تسوید کے مواقع ملے، مگر انہوں نے ان تمام مشاغل سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اپنے آپ

کو نامکمل مسودات کی تکمیل اور تصنیف وتالیف کے کاموں کے لیے وقف کر دیا - اب وہ سیرت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تذکرۂ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی تکمیل میں منہمک ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس نیک مقصد میں کامیابی عطا فرمائے - ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لکھتے ہیں:

''درس وتدریس ان کا پیشہ نہیں شوق تھا اور تصنیف وتالیف ان کی ضرورت نہیں' ان کے ذوقِ علمی کی تسکین کا ذریعہ ہے - انہوں نے کالج اور یونیورسٹی کی ملازمت معاشی مجبوری سے اختیار نہیں کی تھی' یہ ان کی فطرت کی پکار اور قوم وملت کی خدمت کا جذبہ تھا - آج کل تو عام طور پر معاشی ضرورت سے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہ پاکر تعلیم وتدریس کو بھی بطور پیشہ اختیار کرتے ہیں اور پھر زندگی بھر ملازمت کرنے کے بعد پنشن اور گریجوٹی حاصل کر کے مرجاتے ہیں - لیکن علی محسن صدیقی جیسے لوگ اس میدان میں خدمت کے جذبہ سے آتے ہیں اور احیائے علم وتہذیب' تشکیلِ سیرۃ اور تعمیرِ انسانیت کا مقدس فرض انجام دیتے ہیں - اپنے تجربہ اور مطالعہ وتحقیق سے قوم وملت کو ایک نئی زندگی عطا کرتے ہیں - وہ ریٹائر ہوکر اور معطل بن کر بیٹھ نہیں جاتے - وہ مرجانے کے بعد بھی مرتے نہیں، زندہ رہتے ہیں - وہ کائنات کی روح اور جامہ الفاظ کے بجائے الفاظ کے معنی اور فکر بن جاتے ہیں - چونکہ موت کائنات کے قالب کے لیے ہوتی ہے، روح کے لیے نہیں اور فنا الفاظ کے لیے ہوتی ہے، ان کے فکر ومعنی کے لیے نہیں ہوتی - موت ان کے ظاہر اور قالب کو بگاڑتی ہے - ان کی روح اور فکر ومعنی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی - ایک سچے استاد کے لیے موت اور فنا کے الفاظ بے معنی ہوتے ہیں - ایسے اساتذہ دنیا میں رہ کر انسانیت کے لیے نفع رساں ہوتے ہیں اور جب دنیا سے جاتے ہیں تو اپنے علمی کام انسانیت کی زندگی کے لیے اور اپنی سیرت دنیا کی رہنمائی کے لیے یادگار چھوڑ جاتے ہیں -

علی محسن صدیقی نے تعلیم وتدریس کی زندگی میں انسانیت کی تعمیر کے لیے کتابیں ہی نہیں لکھیں انسان پیدا کیے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ انسانیت کی زندگی کے لیے سروساماں مہیا کرنے میں مصروف ہیں - کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں شور اور ہنگاموں اور سیاست سے کبھی دلچسپی نہیں رہی - وہ ہمیشہ علم وادب کے مطالعہ اور تصنیف وتالیف کے

مشاغل میں مصروف رہے اور اب گوشہ نشینی کی زندگی میں بھی مطالعہ وتصنیف اور تدوینِ افکار کے اعمالِ خیر اُن کے شب وروز کے معمول ہیں۔ ان کا بڑھاپا ان کی جوانی سے زیادہ قابلِ رشک ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے وجودِ گرامی کو تادیر ہمارے معاشرے میں قائم رکھے اور ان کے ذوق اور اسوہ علمی کو ہمیں اپنا رہنما بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔"

پروفیسر علی محسن صدیقی مشرقی ومغربی علوم پر خصوصاً اسلامی تاریخ اور دینیات میں گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ آج بھی تاریخ وتمدنِ اسلام کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔ دورانِ ملازمت اور وظیفہ یابی کے بعد اب تک کم وبیش ساٹھ (۶۰) علمی، مذہبی، ادبی اور تاریخی مقالات لکھ چکے ہیں۔ ان کے مقالات کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی مطبوعہ کتب میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

(۱) "کعب بن زہیر اور قصیدۂ بانت سعاد" یہ کتاب کراچی یونیورسٹی کے ایم اے (فائنل) اسلامیات میں داخلِ نصاب ہے۔ (۲) "برزۃ المدیح" (۳) "عقائد مسلمین ومشرکین" امام رازیؒ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ (۴) "فضیلتِ شیخین پر دلائل عقلی" امام شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب کا گم گشتہ حصہ بازیاب کر کے فارسی متن اور اس کے اُردو ترجمہ کے ساتھ۔ (۵) 'عربی قواعد دو حصے۔ (۶) "جدید عربی گرامر" (۷) "المعارف" (۸) "تاریخ اسماعیلیہ" (۹) "عہدِ اموی میں سیاسی ومذہبی احزاب" (۱۰) "الصدیق" (۱۱) "الملل والنحل" (۱۲) "مقالات تاریخی" (۱۳) "مضامین تاریخی"

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ پروفیسر علی محسن صدیقی نے کراچی یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران ریڈیو پاکستان سے کئی سو تقاریر نشر کیں۔ اُن کی تقاریر کے عنوان درسِ حدیث، مذہبی تقاریر، تاریخ وقیامِ پاکستان، بزرگانِ دین، سیرۃ الرسولؐ وغیرہ۔ وہ طلبہ اور بچوں کے پروگراموں میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔

--••☆••--

عمر محمد داؤد پوتا، ڈاکٹر

عمر محمد داؤد پوتہ برصغیر کی عظیم اور انتہائی معتبر شخصیت کا نام ہے- وہ ہر لحاظ سے سیلف میڈ آدمی تھے- ان کی ابتدائی زندگی عسرت میں گزری، لیکن محنت اور اعلیٰ کارکردگی کے بیشمار ہفتخواں طے کرنے کے بعد وہ اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے-

عمر محمد داؤد پوتہ ۲۵ر مارچ ۱۸۹۶ء کو ٹلٹی، ضلع دادو میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم انہوں نے سندھی اسکول ٹلٹی، لاڑکانہ مدرسہ اور بعد میں نوشہرہ فیروز (ضلع نواب شاہ) سے حاصل کی- اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں سندھ مدرستہ الاسلام میں پڑھا اور یہیں سے ۱۹۱۷ء میں میٹرک پاس کیا- وہ میٹرک تک ہر کلاس میں اوّل آئے- اس کے بعد انہوں نے ڈی جے سندھ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۱ء میں بی اے (آنرز) اور ۱۹۲۳ء میں ایم اے امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور اوّل پوزیشن حاصل کی اور "چانسلرز میڈل" کے حقدار قرار پائے جو بجائے خود بہت بڑا اعزاز ہے- وہ پہلے سندھی مسلمان تھے جنہیں یہ اعزاز ملا- اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران انہوں نے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری وظائف حاصل کیے- سندھ مدرستہ الاسلام کراچی کے قیام کے دوران انہوں نے اپنے آپ کو محنت اور مشقت کا عادی بنالیا اور ہر قسم کی محنت کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے- ایم اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ کے لیے وہ ڈی جے سندھ کالج میں عربی سندھی کے اسسٹنٹ پروفیسر بھی رہے- ۱۹۲۴ء میں عمر محمد داؤد پوتہ کو اسٹیٹ اسکالرشپ پر کیمبرج یونیورسٹی گئے اور ۱۹۲۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی-

پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد واپس آئے تو انہیں سندھ مدرستہ الاسلام کا پرنسپل مقرر کیا گیا- وہ یہاں ۳ برس تک پرنسپل رہے اور اس دوران انہوں نے تدریسی اور انتظامی ماحول کی اصلاح کی- یہاں کے بعد اندھیری (ممبئی) میں نئے قائم شدہ سر اسماعیل کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۹ برس تک انتہائی جانفشانی اور خلوص سے عربی تعلیم کے فروغ میں کام کرتے رہے- ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر صاحب کو صوبہ سندھ کا ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن (D.P.I) مقرر کیا گیا اور یہیں سے ۱۱ برس

کے بعد اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ ریٹائر ہوئے- انہیں شمس العلماء کا خطاب سے بھی نوازا گیا تھا-

ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتا بڑے علمی ادبی اور بڑے فراخ دل انسان تھے- اُن میں نام کو بھی غرور نہ تھا، جس سے بھی ملتے انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے تھے- دوسروں کی خدمت کرنا ان کی زندگی کا عظیم مقصد تھا- ان کی ذاتی لائبریری ہزاروں قیمتی کتابوں پر مشتمل تھی- چونکہ انہوں نے خود اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ عسرت میں کاٹا تھا اس لیے وہ ساری زندگی ایسے ہونہار نوجوانوں کی امداد کرتے تھے جو اپنے محدود ذرائع کی وجہ سے آگے بڑھنے سے معذور ہو- جناب ضیاء الدین برنی صاحب' جنہیں ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ کا قرب حاصل تھا' اپنی کتاب ''عظمتِ رفتہ'' میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے اپنی مادری زبان سندھی کے فروغ کے لئے بہت کچھ کیا- انہوں نے اس کام کے لئے سابقہ سندھ گورنمنٹ سے لڑ جھگڑ کر ایک لاکھ روپے کی گرانٹ حاصل کی- انہوں نے سندھ ادبی بورڈ اور سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی کی بھی بنیاد ڈالی تا کہ یہ دونوں ادارے اس صوبہ کے کلچر، زبان، تاریخ اور ادب کی بقا کے لئے کام کریں- وفات سے قبل وہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اشتراک سے سندھی زبان کی مبسوط ڈکشنری تیار کر رہے تھے- ۱۹۴۱ء میں انہیں شمس العلما کا خطاب ملا- وہ فواد انسٹی ٹیوٹ (مصر) کے بھی ممبر تھے- غالباً وہ پہلے پاکستانی ہیں جو اس اعزاز سے نوازے گئے-
>
> .... پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے مہاجرین کو محکمۂ تعلیم میں کھپانے کی پوری پوری سعی کی- انہوں نے حکومت کی اجازت کے بغیر سندھ میں ہر سندھی طالب علم کے لئے اردو پڑھنا لازمی قرار دے دیا تھا- یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا-

انہیں ساری عمر عربی، فارسی اور اردو سے غیر معمولی شغف رہا- ان کی خواہش تھی کہ پاکستان میں عربی کو بہت اونچا مقام حاصل ہونا چاہیے تا کہ دوسرے اسلامی ممالک سے قریبی رابطہ قائم ہو سکے- پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے شاہ لطیف کے بارے میں اردو میں ریڈیو پاکستان سے متعدد تقریریں کیں-

انہیں سندھ کے مشہور صوفی اور شاعر شاہ لطیف سے جو محبت تھی اُسی کا نتیجہ تھا کہ وفات کے

بعد انہیں ان کے مزار کے پاک ماحول میں جگہ ملی- یہ خدا کی دین ہے- ان کی دلی تمنا تھی کہ انہیں ان کے مزار کا قرب نصیب ہو-''

ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ صرف علم کے گوہر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے فنکار بھی تھے- انہوں ۳۱ کتابیں شائع کیں جن میں ''سرہا گل'' (مہکتے پھول) منہاج العاشقین (فارسی) کا سندھی ترجمہ وغیرہ شامل ہیں- ۲۲ نومبر ۱۹۵۸ء کو ڈاکٹر صاحب دارِ فانی سے رخصت ہو گئے-

---••☆••---

عمر مہاجر

محمد عمر مہاجر ۲/اگست ۱۹۱۷ء کو لنگسگور، ضلع رائچور، حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ مہاجر صاحب کا خاندان ایک عرصہ سے مملکتِ حیدر آباد میں آباد تھا۔ ان کے والد محمد غوث رائچور میں ٹھیکہ دار اور دادا ڈاکٹر قاضی احمد رائچور میں تعینات تھے۔ جب مہاجر صاحب سوا سال کے ہوئے تو ان کے والد کا انفلوئنزا کے مرض میں انتقال ہوا اور وہ اپنے والد کے سائے سے محروم ہو گئے۔ اس حادثے کے بعد ان کی پرورش ان کے دادا نے کی۔ جب محمد عمر مہاجر ڈیڑھ سال کے ہوئے تو ان کو چھوٹی چھوٹی قرآنی آیات یاد کرائی گئیں اور بعد میں تقریباً آدھا قرآن حفظ کرا دیا گیا تھا۔

مہاجر صاحب جامعہ عثمانیہ کے گلِ سرسبد تھے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے میٹرک اور سنہ ۱۹۳۹ء میں بی۔اے کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۴۱ء میں اردو ادب میں ایم اے کیا۔ یہ دور جامعہ عثمانیہ کی تاریخ کا سنہری دور تھا۔ اس وقت جامعہ میں برصغیر کے مختلف خطوں کے بہترین دماغ اساتذہ طلبہ کی تعلیم وتربیت پر مامور تھے۔ جامعہ کے اس علمی ماحول نے مہاجر صاحب کی صلاحیتوں کو بڑی جلا بخشی اور اُن میں وسیع النظری اور روشن خیالی پیدا ہو گئی۔ مہاجر صاحب بڑے ذہین تھے۔ اُنہیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ انہیں قدرت نے بے پناہ صلاحیت عطا کی تھی۔ تحریر وتقریر دونوں پر ان کو بڑا عبور حاصل تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کی خطابت کے چرچے ہونے لگے تھے۔ نواب بہادر یار جنگ جیسا فقید المثال خطیب بھی مہاجر صاحب کے حسنِ خطابت کا گھائل تھا۔

سقوطِ حیدر آباد کے وقت وہ محکمۂ مال سے وابستہ تھے۔ سقوطِ حیدر آباد کے بعد وہ وہاں کے بدلے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا نہ کر سکے اور ایک اعلیٰ عہدہ چھوڑ کر پاکستان چلے آئے۔ یہاں مہاجر صاحب ابتدا میں کچھ دن صوبہ سندھ کے محکمۂ آبادکاری سے منسلک رہے لیکن یہ ملازمت ان کو پسند نہیں آئی۔ چنانچہ اسے خیرباد کہہ کر ریڈیو پاکستان میں پروگرام آرگنائزر کی حیثیت سے اپنی شاندار خدمات کا آغاز کیا۔ ان کی پہلی تعیناتی سنہ ۱۹۵۰ء میں ریڈیو پاکستان ڈھاکہ میں ہوئی۔ یہاں اپنے افسروں کی

ناراضگی کے باوجود مہاجر صاحب نے اردو کی ترویج کے مقصد کو عزیز رکھا- سنہ ۱۹۵۲ء میں ان کا تبادلہ ریڈیو پاکستان راولپنڈی ہو گیا- یہاں پر انہوں نے صحیح معنٰی میں اپنی نشریاتی زندگی کا آغاز کیا- وہ ریڈیو پاکستان حیدر آباد اور کراچی میں بھی رہے- ریڈیو پاکستان کراچی کے دوران وہ اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر نامزد ہوئے- عمر مہاجر صاحب کچھ عرصہ کے لیے الیکشن کمیشن میں بھی ڈیپوٹیشن پر رہے-

ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں مہاجر صاحب کی زباندانی پر بخاری صاحب سے بحث ہوگئی تھی-۔ جس کے بعد بخاری صاحب اِن سے اتنے ناراض ہوئے کہ اُنہوں نے اسٹیشن ڈائریکٹر نظامی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں ان کے خلاف بخاری صاحب نے شکایت تحریر کی تھی اور انہیں سخت تنبیہہ کرنے بلکہ برخواست کر دینے کو کہا- نظامی صاحب نے مہاجر صاحب کو بلا کر خط دکھایا اور شکایت کی وجہ معلوم کی- مہاجر صاحب نے زباندانی پر بحث کا واقعہ بتایا- اس کے بعد نظامی نے مہاجر صاحب سے کہا کہ میں باصلاحیت افراد کی قدر کرتا ہوں، میں ان کو موقع دیتا ہوں کہ وہ اپنی صلاحیت کو ثابت کر دکھائیں-

زیب عمر مہاجر اپنے مضمون ''سلسلہ یادوں کا'' میں بخاری صاحب کے خط کے بعد کا واقعہ اور مہاجر صاحب کی ریڈیو پاکستان پنڈی کی کارکردگی کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''چنانچہ مہاجر صاحب کو پہلے تقاریر کا شعبہ دیا گیا، پھر ڈرامہ کا اور پھر موسیقی کا- ایک روایت ہے کہ نظامی صاحب کا خیال تھا کہ اس شعبہ میں یہ اچھی صلاحیت ظاہر نہ کر سکیں گے- مگر موسیقی میں مہاجر صاحب نے کئی تجربے کیے جنہیں نظامی صاحب نے بہت پسند کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی- اسی دوران ایک مرتبہ بخاری صاحب دورے پر پنڈی آئے- نظامی صاحب نے انہیں اپنے ریکارڈ کیے ہوئے کئی نغمے سنائے- بخاری صاحب نے کہا ''ان میں تو کوئی خوبی نہیں!'' پھر انہوں نے مہاجر صاحب کے ریکارڈ کیے ہوئے نغمے سنائے جنہیں بخاری صاحب نے بہت پسند کیا اور کہا کہ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی باریکیوں میں بھی جا سکتے ہو-'' جب وہ تعریف کر چکے تو نظامی صاحب نے کہا، پہلے جو گانے آپ نے سنے، وہ میں نے ریکارڈ کیے تھے اور اب جو آپ نے سنے وہ مہاجر صاحب کے ریکارڈ کیے ہوئے ہیں- بخاری صاحب کو یقین نہیں آ رہا تھا، کئی بار اس کی تصدیق چاہی، نظامی صاحب

نے کہا کہ آپ خود اپنے سامنے ریکارڈ کروا کر دیکھ لیں - اس واقعہ کے بعد بخاری صاحب کی
مخالفت کم ہوگئی۔"

آخر میں مہاجر صاحب نے "ذوقِ آگاہی" اور "جہانِ تازہ" کے عنوان سے معلوماتی پروگرام پیش
کیے جو بہت مقبول ہوئے - غالب کی مشہور کتاب "پنج آہنگ" کا اردو ترجمہ ان کی یادگار ہے - ۲۸ ستمبر
سنہ ۱۹۷۷ء کو ان کی وفات ہوئی -

---••☆••---

فانی بلگرامی، وصی احمد، سید

اصل نام سید وصی احمد، فانیؔ تخلص اور فانی بلگرامی قلمی نام ہے۔ ۱۶؍دسمبر ۱۸۸۹ء کو آرہ (بہار) بھارت میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد سید نور احمد کے چھوٹے فرزند تھے۔ سید نور احمد کے دو بیٹے ہوئے جن میں بڑے سید عنایت احمد اور چھوٹے بیٹے سید وصی احمد بلگرامی تھے۔ دونوں بھائی شاعر تھے۔ سید عنایت احمد دلگیرؔ تخلص کرتے تھے اور سید وصی احمد کا تخلص فانیؔ تھا۔ وصی احمد نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو صدیوں سے علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ رہا ہے۔ ان کے دادا سید فرزند علی صفیرؔ غالبؔ کے شاگرد تھے جنہیں غالبؔ کے شاگردوں میں بہت شہرت حاصل تھی۔ فرزند علی صفیرؔ کو نظم و نثر دونوں پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ بہار میں اردو زبان کو جو فروغ حاصل ہوا وہ فرزند علی صفیرؔ ہی کی بدولت ہوا۔ ۱۱؍مئی ۱۸۹۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اپنے وطن آرہ میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ وصی احمد کے والد سید نور احمد کو بھی شعر و سخن کا بڑا ذوق تھا اور گرامیؔ تخلص کرتے تھے۔

فانیؔ اپنے والد کے چھوٹے بیٹے تھے۔ انہوں ابتدائی تعلیم کے بعد آرہ ٹاؤن اسکول سے دسویں کلاس تک تعلیم حاصل کی اور ۱۹۰۷ء کو کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں جی بی پی کالج مظفر پور (بہار) سے انٹر اور ۱۹۱۱ء میں پٹنہ کالج سے بی اے پاس کیا۔ فانی انتہائی ذہین طالب علم رہے ہیں۔ انہوں نے ہر امتحان میں امتیازی نمبر لا کر وظیفہ حاصل کیا۔ بی اے کرنے کے بعد ایم اے (تاریخ) میں کرنے کے لیے انہوں نے پٹنہ کالج میں داخلہ لیا لیکن بیماری کے باعث وہ امتحان نہیں دے سکے۔ اس کے بعد ان کی تعلیم کا سلسلہ بالکل ہی منقطع ہو گیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے ملازمت اختیار کی۔ انہوں نے بکسر، پورنیہ، مونگیر، دربھنگہ، چھپرہ، پٹنہ وغیرہ شہروں میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو انڈر سکریٹری حکومت بہار خدمات انجام دیں۔ اٹھائیس ۲۸ سال تک سرکاری ملازمت

میں رہنے کے بعد ۱۹۴۷ء کو فانیؔ ریٹائر ہو گئے- انہوں نے تقسیم سے پہلے ہی نقل مکانی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا- چنانچہ ۱۰ راگست سنہ ۱۹۴۷ء کو وہ پاکستان آئے اور کراچی میں مقیم ہوئے- یہاں آ کر وہ حج کے لیے گئے اور حج کے فرائض ادا کر کے واپس کراچی آ گئے- فانیؔ کو شاعری میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن ان کی نثر نگاری سے ان کے شاعرانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے- ''دیر و حرم'' جو ادارہ یادگار غالب نے شائع کیا ہے اس کے دیباچہ میں مشفق خواجہ صاحب نے ان کے حُسن اخلاق اور ان کی علمی ادبی زندگی پر بڑی روشنی ڈالی ہے- دیباچہ میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''بلگرامی صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو میں اُن کے نام اور کام سے اچھی طرح واقف تھا- اُن کے متعدد مضامین میری نظر سے گزر چکے تھے اور ان کا مشہور زمانہ مضمون ''س-ش-ص'' تو میں کئی مرتبہ پڑھ چکا تھا جس کی اشاعت سے صوبۂ بہار کی دنیائے ادب میں ایک ہنگامہ برپا ہوا تھا-..........

غالبؔ صدی کے موقع پر انجمن ترقی اُردو کی طرف سے رسالہ ''اردو'' کا غالب نمبر دو جلدوں میں مرتب کرنے کے ساتھ نصف درجن سے زاید کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بھی بنایا گیا- ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے کہ اُسے ''خانہ پُری'' کے ذیل میں رکھا جا سکے- اس موقع پر بھی بلگرامی صاحب نے میری دست گیری کی- انہوں نے ''گلِ رعنا'' کا ایک ایسا نسخہ عنایت فرمایا جس پر خود غالب کے قلم سے حواشی تھے- میں نے اپنے کرم فرما اور ممتاز غالب شناس سیّد قدرت نقوی مرحوم سے اِسے مرتب کرایا اور نہایت اہتمام سے شائع کیا-

''س-ش-ص'' میں بلگرامی صاحب نے ایک مرثیۂ شادؔ کا ذکر کرتے ہوئے اُس کے اصل مسوّدے کے بارے میں لکھا ہے ''یہ مسوّدہ آج انمول ہے- اُس کو گل بکاؤلی بھی نہیں پا سکتا- کیوں کہ وہ شنیدہ ہے اور یہ دیدہ ہے- شاد عظیم آبادی کی تحریر، صفیر بلگرامی کی تحریر، مرزا دبیر لکھنوی کی تحریر، ان تینوں کی زیارت ہو سکتی ہے تو اِسی مسوّدے میں''

مالک رام نے اپنی کتاب ''تذکرۂ معاصرین جلد ۴'' میں فانیؔ اور اکبرالہ آبادی سے منسوب ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر اس طرح کیا ہے-

''فانیؔ کے دورانِ ملازمت کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے جس سے اکبرالہ آبادی مرحوم کے ایک نئے شعر کا بھی سراغ ملتا ہے- یہ ہمیں فانی کے بھانجے سید مرتضٰی حسین بلگرامی (علی گڑھ)

نے عطا کیا ہے۔

فانی کا سرکاری دورے پر الہ آباد جانا ہوا۔ ایک دن اکبر الہ آبادی سے ملنے ان کے مکان پر گئے۔ اکبر نے دورانِ گفتگو میں شکایتی انداز میں فانی سے کہا:

دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے تالی اکبر!
ہم اکیلے ہیں، ہم اکیلے ہیں محبت کو نبھائیں کیونکر!

مدعا یہ کہ آپ رہ و رسم رکھا کیجیے۔ جناب فانی اس وقت ادباً خاموش رہے، مگر جب رخصت ہو کر باہر آئے تو اکبر الہ آبادی کے ملازمِ خاص کو ایک کاغذ کے پُرزے پر یہ شعر لکھ کر دیا کہ اکبر کی خدمت میں پیش کر دے:

چٹکی تو بجا کرتی ہے اک ہاتھ سے فانی!
تالی نہ سہی، وہ کبھی چٹکی تو بجاتے

اکبر الہ آبادی یہ شعر پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے اور کہا "بات سے بات پیدا کرنا اس کو کہتے ہیں"

فانی کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ وہ نثر نگار بھی تھے ان کے مضامین میں الف، گلِ داؤدی، ملک خطا کے شہزادے نثری شاہکار ہیں۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد وہ تقریباً تیس برس لکھنے پڑھنے اور ادب کی خدمت میں صرف کیے۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۷۶ء کو فانی دارِ فانی سے رخصت ہو کر مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی ایک غزل جو مالک رام نے "تذکرۂ معاصرین جلد ۴" میں شائع کی ہے، ملاحظہ کیجیے۔ مالک رام نے یہ غزل مشفق خواجہ صاحب سے حاصل کی تھی:

برہمن کی چوکھٹ پر گر کر آنکھیں ملتے ہیں
آنکھیں بند ہوتے اقربا کے ہاتھوں جلتے ہیں

جوان و پیر کے زیبِ گلو ہے طوقِ نادانی
کھلونے موت نے چھینے، تو طفل آسا مچلتے ہیں

وہی ہیں بھیس میں خورشید کے دن کو کرم فرما
لباس ماہ و انجم میں جو راتوں کو نکلتے ہیں

جو دکھلائیں تو غش ہوں سب، نہ دکھلائیں تو منکر ہوں
وہ یکتائی پہ اپنے حُسن کی خود ہاتھ ملتے ہیں

چلنا اور نہ چلنا پاؤں ہونے پر نہیں موقوف
شجر بھی کیوں نہیں چلتے، ستارے جیسے چلتے ہیں

یقین و شک پہ ٹھہرا ہے وہاں کا فیصلہ، فانی!
کہ شک والے پھسلتے ہیں، یقیں والے سنبھلتے ہیں

--••☆••--

فداؔ خالدی دہلوی

اصل نام عبدالحمید، فداؔ تخلص اور فداؔ خالدی قلمی نام ہے۔ ۱۹۲۳ء میں دہلی کے علمی ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت امداد علی تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت خالد بن ولیدؓ سے جاملتا ہے۔ اسی نسبت سے وہ اپنے تخلص کے ساتھ خالدی لگاتے تھے۔ ان کی والدہ مرحومہ بستی بیگم کے دادا عبداللہ بیگ، بہادر شاہ ظفر کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ دہلی میں گڑھی عبداللہ بیگ انہی کے نام سے منسوب ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد فداؔ خالدی نے فارسی اُردو میں منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ دہلی کے سخن پرور ماحول سے متاثر ہو کر ۱۴ سال کی عمر میں شاعری کی طرف راغب ہوئے اور بیخوؔد دہلوی، جانشینِ حضرتِ داغؔ دہلوی کی شاگردی اختیار کر لی۔

تقسیم کے بعد فداؔ خالدی ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ یہاں آنے کے بعد وہ اورنٹیل کالج کراچی میں بحیثیت لیکچرار وابستہ ہو گئے اور مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

فداؔ خالدی نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور غزل میں ان کا فن کمال عروج پر ہے لیکن مشکل ترین صنف رباعی میں وہ بے مثل شاعر ہیں۔ پاکستان آ کر فداؔ خالدی نے اپنے استاد بیخوؔد دہلوی کے فن کو بلند رکھا اور بدلتے ہوئے رجحانات کے پیشِ نظر اس فن کا تحفظ بھی کیا۔ ان کی مطبوعہ تصانیف ''آتشِ جذبات''، ''آتشِ احساس''، ''م ص'' اور آتشِ افکار (رباعیات کا مجموعہ) ہیں۔ فداؔ خالدی کو رباعیات میں یدطولیٰ حاصل تھی۔ ان کی رباعیات کے مجموعہ ''آتشِ خوابیدہ'' میں سید سعید اختر صاحب زیدی، پروفیسر آفتاب صاحب زبیری، ڈاکٹر خورشید خاور نے تبصرے لکھ کر فداؔ خالدی کی شاعری پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سعید اختر زیدی لکھتے ہیں:

''فداؔ ایک کامیاب فن کار شاعر ہے، حالات نے اسے رباعی کی طرف مائل کر دیا ہے، وہ سنجیدہ مضامین کو بیان کرتا ہے جس کی متحمل رباعی ہو سکتی ہے اور وہی اس کے خیالات کی ترجمانی

کرسکتی ہے مگر اس نے بہت مرصع غزلیں بھی کہی ہیں۔''

پروفیسر زبیری صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت فدؔا خالدی دہلوی کا زیرِ نظر مجموعۂ کلام بنام ''آتشِ خوابیدہ'' ان کی رباعیات پر مشتمل ہے جس میں لب و رُخسار سے لے کر دار و رسن تک کے جملہ مراحل و منازل بڑے تزک و احتشام کے ساتھ موجود ہیں۔ فدؔا صاحب ایک کہنہ مشق اُستاد ہیں اور ہر صنفِ سخن میں طاق ہیں۔ حضرت بیخؔود دہلوی جیسے معروف اُستاد کے شاگردِ رشید ہیں، حضرت بیخؔود دہلوی نواب مرزا داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ رکھتے تھے''

پیرزادہ احسان الحق فاروقی ایم-اے، ایچ-پی-اے-یو-تعارف میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک شاعری کا تعلق ہے فدؔا صاحب اس کی کسی بھی صنف میں قاصر نہیں۔ آپ کی غزلیں معیاری اور معنویت سے بھرپور ہیں مگر رباعی میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ 'قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد است'

''رباعی ایک مشکل صنفِ سخن ہے اور بالعموم معمر شعرا کا حصہ ہے، مگر آپ نے یہ مقام جو کہیں بڑھاپے میں جا کر حاصل ہو پاتا ہے جوانی میں ہی طے کر لیا اور اس کی گہرائیوں اور پہنائیوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوئے ہیں، جہاں تک آپ کے زیرِ نظر مجموعے کا تعلق ہے تو رباعیات کا یہ گلدستہ اپنے دامن میں گلہائے رنگارنگ اور خوشبوہائے گوناگوں کی ایسی مہک رکھتا ہے جس سے ہر شخص اپنی اپنی صلاحیتِ احساس اور استعدادِ علم کے مطابق اپنے دل و دماغ معطر و محفوظ کر سکتا ہے۔''

۲ر مارچ ۲۰۰۱ء کو فدؔا خالدی دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ بلاشبہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ذیل میں نمونۂ کلام درج ہے، ملاحظہ کیجیے۔

اِک حُسن کی تنویر سمجھتے ہیں مجھے
صَد لائقِ توقیر سمجھتے ہیں مجھے
دیکھیں تو کبھی آپ بھی میری جانب
سب آپ کی تصویر سمجھتے ہیں مجھے

دنیا ہے یہاں رنج ملا کرتے ہیں
جو مرد ہیں کب ان کا گلہ کرتے ہیں
کیوں دل کی تباہی کا قلق ہے تجھ کو
مُرجھانے ہی کو پھول کھلا کرتے ہیں

رہنے کے لیے چمن میں آیا تھا میں
اسباب بہار ساتھ لایا تھا میں
جب گل سے کہا کیا ہے تباہی کا سبب
بولا کہ چمن میں مُسکرایا تھا میں

ہر طرح سے آمادۂ پے کار رہے
خود اپنی ہی ہستی پہ گرانبار رہے
کانٹوں کی کسی طور نہ بدلی فطرت
سایہ میں رہے گُل کے مگر خار رہے

کب تک ان مظلوموں پر تم تیرِستم برساؤ گے
جان پہ یہ تو کھیل ہی لیں گے ظالم تم کہلاؤ گے
یوں اہل محبت کو کب تک تڑپاؤ گے کلپاؤ گے
ظلم کا بدلہ ظلم ہی ہوگا آج نہیں کل پاؤ گے
جلتے چہرے سامنے ہیں سب اپنی غرض کے بندے ہیں
یاد کروگے ہم کو اُس دن تنہا جب رہ جاؤ گے
چھوڑ دو مجھ کو میرے خدا پر عہد محبت کھیل نہیں
یہ راہ بڑی پتھریلی ہے تم ساتھ کہاں تک آؤ گے
اُس کی گلی میں کون سنے گا حال قدآ بس لوٹ چلو
کب تک خود پر جبر کروگے کب تک پتھر کھاؤ گے

تقدیر کیا ہے اس کو سمجھنے سے فائدہ
آخر قفس میں آ ہی گئے آشیاں سے ہم
نہ جانے کتنے پتنگوں کو کردیا بے نُور
چراغ کس نے جلایا ہے روشنی کے لیے

---•• ☆ ••---

فضل احمد صدیقی

فضل احمد صدیقی ۸ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ان کے آباواجداد کا تعلق میرٹھ کی تحصیل باغپت کے ایک گاؤں کاٹھ سے تھا۔ان کے والد مولوی نور احمد ایک متوسط درجے کے زمینداری تھے۔فضل احمد صدیقی ابھی بہت چھوٹے تھے کہ ان کے سر سے ان کے والد مولوی نور احمد کا سایہ اُٹھ گیا اور ان کی تعلیم وتربیت کا بار ان کی والدہ کے کاندھوں پر آ گیا۔فضل صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں ہوئی۔اس کے بعد وہ تعلیم حاصل کرنے میرٹھ آئے جہاں انہوں نے فیض عام ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور یہیں سے اول درجہ میں میٹرک پاس کیا۔بعدازاں فیض عام ہائی اسکول کو کالج کا درجہ مل گیا تو انہوں نے یہیں سے اول درجے میں انٹر اور پھر بی اے پاس کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ذریعہ معاش کی تلاش میں وہ ممبئی چلے گئے۔یہاں انہیں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔فضل صدیقی بڑے ذہین اور پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے۔آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے مزید تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے ممبئی یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو فارسی) اور قانون کی اسناد حاصل کیں۔یہیں پر فضل صاحب کی ملاقات مخشب جار چوی اور پاکستان کے نامور قانون داں جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب سے ہوئی جو آخری دم تک قائم رہی۔

تقسیم کے بعد فضل صدیقی ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی میں مستقل رہائش اختیار کی۔یہاں آنے کے بعد وہ اُردو ''ڈان'' کراچی میں بحیثیت ایڈیٹر مقرر ہوئے۔بعدازاں اُردو ''ڈان'' بند ہو گیا تو فضل صاحب نیوز ایڈیٹر ہو کر ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔

اس زمانے میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے میونسپل کمشنر ہاؤرائڈ (Howroid) تھے جنہوں نے انہیں کارپوریشن میں بحیثیت افسر اطلاعات مقرر کر لیا۔فضل صدیقی کو بلدیہ عظمیٰ کے افسروں میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔میونسپل کارپوریشن کے اجلاس میں جتنی بھی قراردادیں پیش کی جاتی تھیں، وہ فضل صاحب ہی تیار کر کے پیش کیا کرتے تھے۔وہ انتہائی محنتی اور ایماندار افسر تھے۔اس وقت راقم

الحروف بھی میونسپل کارپوریشن میں بحیثیت بلڈنگ سرویئر کام کررہا تھا۔

اس زمانے میں بلدیہ عظمیٰ کا یہ رواج رہا ہے کہ جب بھی کوئی ممالک غیر کا سربراہ یا کسی ملک کے بڑے شہر کا میئر یا کوئی اور نامور شخصیت یا وفد کراچی آتا تھا تو اُس کو زبردست استقبالیہ دیا جاتا تھا اور اس موقع پر مہمان کو شہر کی کُنجی پیش کی جاتی تھی۔ ان تمام کاموں میں جناب فضل احمد صدیقی پیش پیش رہتے تھے اور تمام کاموں کی نگرانی بڑی ہی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔ مدّت ملازمت ختم ہونے پر سنہ ۱۹۶۹ء میں فضل صاحب ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ ان کی اعلیٰ خدمات کے پیش نظر انہیں ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی بلالیا جاتا تھا۔

سنہ ۱۹۷۱ء میں عباسی شہید ہسپتال جسے بلدیہ عظمیٰ نے تعمیر کرایا تھا' کا افتتاح پاکستان کے وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھوں سے کرایا گیا تھا۔ جس شام کو وزیراعظم کو افتتاح کرنے آنا تھا بلدیہ عظمیٰ کے تمام سینئر افسران عباسی شہید ہسپتال میں ایک صف بنا کر کھڑے ہوئے تھے۔ اس صف کے پیچھے جونیئر افسران تھے جس میں راقم الحروف بھی موجود تھا۔ سینئر افسران کی صف میں جناب فضل احمد صدیقی بھی کھڑے ہوئے تھے۔ جب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی سواری ہسپتال میں آ کر رکی تو اس وقت بھٹو صاحب کی نگاہ فضل احمد پر پڑی تو بھٹو صاحب ان کے پاس پہنچے اور بڑے احترام سے پوچھا میرے استاد آپ کیسے ہیں اور کیا کررہے ہیں؟ فضل صاحب نے بتایا کہ میں بلدیہ عظمیٰ کراچی میں ڈائریکٹر انفارمیشن ہوں' دو چار دن کے بعد ریٹائر ہو جاؤں گا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے فوراً اپنے سکریٹری کو بلایا اور کہا کہ فضل احمد صاحب میرے استاد ہیں' انہیں اسلام آباد بلا کر کسی جگہ لگایا جائے۔ ممبئی کے دورِ قیام میں فضل صاحب ذوالفقار علی بھٹو کو پڑھایا کرتے تھے۔ چنانچہ وزیراعظم کی دعوت پر وہ اسلام آباد چلے گئے جہاں انہیں پاکستان کی تحریک پر ریسرچ افسر مقرر کردیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں خرابیِ صحت کی بنا پر وہ واپس کراچی آ گئے۔

فضل احمد صدیقی ایک ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں لکھنے لکھانے اور شعروادب کا ذوق زمانہ طالب علمی سے تھا۔ ان کے مضامین ''ڈان'' اُردو اور پھر ''ڈان'' انگریزی میں شائع ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک کتاب ''خوں نابہ کشمیر'' لکھی جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ''ہمارا پاکستان'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ ان دونوں کتابوں کی بڑی پذیرائی بھی ہوئی۔ انہوں نے خطبہ حجۃ الوداع

کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ کبھی کبھی ٹی وی اور ریڈیو کے مذاکروں میں شرکت بھی کیا کرتے تھے۔

راقم الحروف کا فضل صاحب براہ راست ملاقات تو نہیں تھی البتہ دفتر آتے جاتے علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ وہ انتہائی منکسر المزاج' خوش اخلاق اور ملنسار شخص تھے اور ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں ٹھہراؤ اور ہر لفظ کی جچی تلی ادائیگی تھی۔ اب ایسے افسر کہاں' چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو نہیں ملتے۔ ۱۹راگست ۱۹۷۸ء کو دارِ فانی کا سفر طے کر کے فضل احمد صدیقی دار فانی سے کوچ کر گئے۔ پاپوش نگر کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔

---••☆••---

قاضی قیصرالاسلام

شعبہ فلسفہ کی مشہور و معروف شخصیت قاضی قیصرالاسلام ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو خیرآباد، یو پی (بھارت) کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد قاضی بشیراحمد مرحوم بی ایل جے کالج مرزاپور میں لیکچرر تھے۔قیصرالاسلام نے ابتدائی تعلیم مرزاپور میں اپنے والد کے زیرِ سرپرستی حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کے والد نے انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیج دیا جہاں سے انہوں نے انٹر اور پھر بی اے کے امتحانات پاس کیے۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۸ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل رہائش اختیار کی۔

یہاں آنے کے بعد ذریعہ معاش کی تلاش ہوئی تو انہوں نے ریلوے میں ملازمت اختیار کر لی جہاں وہ ٹکٹ چیکر کی آسامی پر تعینات رہے۔پڑھنے لکھنے کا شوق بہت غالب تھا۔فرصت کے اوقات میں مختلف نوعیت کے مضامین خاص طور پر فلسفے سے متعلق مضامین لکھتے رہتے تھے۔اسی اثنا میں ان کی ملاقات معروف دانشور اور نیشنل بنک کے سابق مینجنگ ڈائریکٹر ممتاز حسن مرحوم سے ہوگئی۔ممتاز حسن ایک عظیم دانشور، عالم و فاضل اور علم دوست شخصیت کے مالک تھے۔وہ ہمیشہ لکھنے پڑھنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ممتاز حسن نے قیصر کی علمی استعداد دیکھی تو ان سے کہا کہ ریلوے کی نوکری چھوڑ کر میرے پاس نیشنل بنک میں آجاؤ، وہاں تمہیں لکھنے پڑھنے کا اچھا موقع ملے گا۔اس طرح قیصرالاسلام نے ریلوے کی نوکری چھوڑ کر نیشنل بنک کی ملازمت اختیار کر لی اور پھر ترقی کرتے ہوئے اسسٹنٹ وائس پریسیڈنٹ کے عہدے تک پہنچے۔

نیشنل بنک میں قیصرالاسلام کو لکھنے پڑھنے کا اچھا موقع ملا اور ان کی علمی استعداد اور صلاحیتوں میں مزید اضافہ اور شہرت بھی ہوئی۔اسی زمانے میں انہوں نے ہومیو پیتھ کی تعلیم حاصل کر کے پریکٹس بھی شروع کی۔وہ خاص طور پر مزمن بیماریوں (Chronical disease) کا علاج کرتے تھے۔

قاضی قیصرالاسلام ایک محققانہ مزاج کے آدمی تھے۔وہ محقق بھی تھے، مترجم بھی تھے اور ایک فلسفی

بھی تھے۔ تحقیق کی وادی بہت سنگلاخ ہوتی ہے جہاں بڑے بڑے لوگ قدم رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ یہ ایک بڑا دیرپا اور صبر آزما کام ہے۔ لیکن قیصرالاسلام ایسی راہوں سے پوری کامیابی کے ساتھ گزرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور دشوارترین کاموں ہی سے ان کے ذوق کی تسکین ہوتی تھی۔ افسوس! ۱۸/اکتوبر ۱۹۹۸ء کو قیصرالاسلام نے علمی دنیا کو سوگوار چھوڑ کر ملک عدم کی بھی راہ اختیار کرلی۔

قیصرالاسلام نے اپنی بہت سی مطبوعہ اور غیر مطبوع تصانیف چھوڑی ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

(۱) ''فلسفے کے بنیادی مسائل'' ۶۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے پانچ ایڈیشن نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کیے۔ یہ کتاب بی اے آنرز کے نصاب میں شامل ہے۔

(۲) ''تاریخ فلسفہ مغرب'' (DC624 - AD1994) تک تمام فلاسفر شامل ہیں۔

(۳) ''فلسفے کے کے جدید نظریات'' مطبوعہ اقبال اکیڈمی لاہور سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی۔

(۴) Chinese Synthesis By Kamal Azfer) "ترجمہ۔

(۵) A key to Theosophy by H.P. Blavatsky.
Theosophical Society of Pakistan.

(۶) طبع زاد مضامین کتابی شکل میں (جدید نظریات پر مبنی) زیر طبع

(۷) مضامین کے مجموعے کتابی شکل میں۔ زیر طبع

(۸) کرونولاجی (ایک صدی ایک صفحہ پر) یعنی جب حضورؐ پیدا ہوئے تو اس وقت پوری دنیا میں کیا ہو رہا تھا۔ آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔

(۹) کشاف اصطلاحات (فرہنگ اصطلاحات فلسفہ بمعہ اردو مترادفات اور تشریحات و وضاحتوں کے ساتھ تقریباً ۲۳۰۰ اصطلاحات قدیم فلسفہ سے لے کر عصر حاضر کے لسانی فلسفہ تک ہیں۔ یہ کتاب بھی زیر طبع ہے

(۱۰) الفاظ - (Words) خودنوشت ژاں پال سارتر۔ ۱۱۴ اسقاط کا ترجمہ ماہنامہ ''دائرے'' کراچی میں شائع ہوا۔ بیماری اور پھر انتقال کے سبب ترجمہ مکمل نہ ہوسکا۔

--••☆••--

قدرت نقوی

اصل نام سید شجاعت علی نقوی البخاری اور قلمی نام سید قدرت نقوی ہے۔ ۱۰رنومبر ۱۹۲۵ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد الہ آباد بورڈ سے میٹرک پاس کیا۔ میرٹھ سے ہی فارسی کا اعلیٰ امتحان پاس کیا۔ معلم علوم شرقیہ کی ٹریننگ پنجاب بورڈ سے حاصل کی۔ اس کے بعد پی ایل سی کا امتحان ممبئی سے پاس کی۔

تقسیم کے بعد قدرت نقوی لاہور آئے اس کے بعد وہ ملتان چلے گئے جہاں انہوں نے مختلف تعلیمی اداروں میں بحیثیت معلم السنۂ شرقیہ خدمات انجام دیں۔ ملتان میں اپنے قیام کے دوران وہ متعدد تنظیموں کے بانی رہے اور فروغ ادب کے لیے علمی ادبی اور تحقیقاتی کام کرتے رہے۔

قدرت نقوی کی علمی ادبی تحقیقات کو دیکھتے ہوئے اُردو ڈکشنری بورڈ (سابقہ انجمن ترقی اردو بورڈ) کے سابق سکریٹری جناب شان الحق حقی نے انہیں ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ اپنی علمی ادبی خدمات سے ادارہ کو فیض یاب کریں۔ اس طرح قدرت نقوی اردو ڈکشنری بورڈ سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۶۹ء سے ترقی اُردو بورڈ میں بحیثیت مدیر خدمات انجام دیں۔ ان کے زمانے میں اُردو ڈکشنری کی کئی جلدیں مکمل ہوئیں۔ ان کی کئی زبانوں سے واقفیت نے اس کام میں بڑی معاونت کی۔

قدرت نقوی ایک ماہر لسانیات تھے۔ انہیں ہندی فارسی عربی انگریزی اور سنسکرت پر عبور حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ سرائیکی پنجابی اور دیگر علاقائی زبانوں پر بھی دسترس حاصل تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سنسکرت زبان میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ان تمام علمی وادبی کمالات سے انہوں نے ادارہ کو مستفید کیا۔ قدرت نقوی ۹رنومبر ۱۹۸۵ء کو اردو ڈکشنری بورڈ سے بحیثیت مدیر ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔

قدرنقوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے شروع کیا تھا۔ ان کے افسانے

مشہور رسالہ ''آئینہ'' میں شائع ہوتے تھے۔انہوں نے شاعری بھی کی اور ہائیکو نگاری بھی کی اور سیکڑوں دوہے بھی لکھے لیکن بعد میں شاعری اور افسانہ نگاری ترک کر کے تحقیقی کاموں کی طرف راغب ہو گئے تھے۔

۱۹۵۹ء میں انہوں نے ''غالب کون ہے؟'' کے عنوان سے کتاب لکھ کر شائع کی؛ جس میں غالب کی ہمہ رنگ اور متنازعہ شخصیت کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ غالبیات ان کا پسندیدہ موضوع رہا اور غالب کے بارے میں ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ساری زندگی غالب کے مذہبی معتقدات سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔غالبیات پر ان کی گہری نظر تھی۔وہ ساری زندگی غالب کے مذہبی معتقدات پر تحقیق کرتے رہے۔اس سلسلے میں ان کی مولانا غلام رسول مہر اور مولانا امتیاز علی عرشی سے طویل عرصہ تک خط و کتابت بھی رہی۔غالب کے معتقدات پر قدرت نقوی کی ایک تحقیقی کتاب ''غالب آ گہی'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔۲۰۰۲ء میں قدرت نقوی کے مقالوں پر مشتمل ایک گراں قدر کتاب ''مقالاتِ قدرت نقوی'' کے عنوان سے سید علی اکبر رضوی نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔

۱۶ر دسمبر ۲۰۰۰ء کو قدرت نقوی کا کراچی میں انتقال ہوا۔ادبی دنیا میں وہ ایک بڑے نقاد، محقق اور تخلیق کار کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

--••☆••--

قطب الدین، پروفیسر خواجہ

معروف استاد، مقرر اور کالم نگار پروفیسر خواجہ قطب الدین اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غلام زین العابدین کا شمار حیدر آباد دکن کے مشہور ماہرِ تعمیرات (آرکی ٹیکٹس) میں ہوتا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ قطب الدین نے ابتدائی تعلیم کے بعد مقبول عام ہائی اسکول سوسائٹی کراچی میں تعلیم حاصل کی اور یہیں سے ۱۹۵۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اردو کالج کراچی میں انٹر آرٹس میں داخلہ لیا اور بی اے ایل ایل بی تک یہیں تعلیم حاصل کی۔ دوران طالب علمی وہ انجمن طلبہ اردو کالج کے صدر رہے۔ خواجہ قطب الدین ادبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور بہترین مقرر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ بی اے ایل ایل بی کرنے کے بعد انہوں نے جامعہ کراچی سے ایم اے سیاسیات کی ڈگری حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے درس و تدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۷۴ء میں پروفیسر خواجہ قطب الدین اُردو کالج میں بحیثیت لکچرار شعبۂ سیاسیات مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ان کا تقرر بحیثیت چیئرمین شعبۂ سیاسیات اور پھر ترقی دے کر وائس پرنسپل کیا گیا۔ آجکل اُردو یونیورسٹی میں ڈائریکٹر ایوننگ پروگرام کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اردو کالج میں اساتذہ کے نمائندہ کی حیثیت سے پروفیسر خواجہ قطب الدین بورڈ آف گورنرز کے رکن اور شعبۂ سیاسیات جامعہ کراچی کی نصابی کمیٹی اور اُردو یونیورسٹی کی نصابی کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔ کراچی کے کئی علمی ادبی اور سماجی اداروں سے وابستہ ہیں اور فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ تا حال وہ بہادر یار جنگ اکادمی کے معتمد اعزازی، احباب انڈسٹریل ہوم کے چیرمین، میر عثمان علی خاں اکادمی کے سکریٹری اور آرٹس کونسل آف پاکستان کے رکن ہیں۔ خواجہ صاحب پاکستان ٹیلی وژن اور ریڈیو پاکستان کے پروگراموں بھی حصہ لیتے ہیں۔ کراچی کے اخبارات میں مختلف عنوانات کے تحت ان کے مضامین

شائع ہوتے رہتے ہیں-وہ کراچی میں کئی ادبی رسائل وجرائد کے نگرانِ اعلیٰ کی حیثیت سے بھی کام انجام دے رہے ہیں-

اُردو کی خدمت کے اعتراف میں سنہ ۱۹۷۵ء میں انجمن ترقیٔ اردو کے صدر جناب اختر حسین رائے پوری نے پروفیسر خواجہ قطب الدین کو ''ستارۂ اُردو'' کا اعزاز عطا کیا-سنہ ۱۹۹۶ء میں انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ شکاگو (امریکہ) کی جانب سے ''ثروتِ اُردو'' کا اعزاز عطا کیا گیا-

خواجہ قطب الدین عصر حاضر کے معروف محقق، دانشور اسکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے بڑے متاثر تھے-ان کے انتقال کے بعد ان کی زندگی اور کارناموں پر ایک کتاب بعنوان ''عالم اسلام کے نامور سپوت ڈاکٹر محمد حمید اللہ'' مرتب کی ہے-اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ عالم اسلام کے نامور سپوت تھے-ان کی شخصیت کو متعارف کرانے میں جو کردار پروفیسر خواجہ قطب الدین نے ادا کیا ہے وہ قابل رشک، قابل تحسین اور عالم اسلام کی بہترین خدمت ہے-۲۷/اگست ۲۰۰۴ء کو اس معرکتہ الآرا کتاب کی تقریب اجرا کراچی کے معروف ہوٹل آواری ٹاور میں منعقد ہوئی تھی-جس کی صدارت کے فرائض محترم جناب معین الدین حیدر سابق گورنر سندھ نے انجام دیے-مقررین میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، آفتاب احمد خاں انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر اور ڈاکٹر عفان سلجوق تھے-

اس کتاب کا پیش لفظ پروفیسر ڈاکٹر عفان سلجوق اور تعارف پروفیسر ڈاکٹر احمد عبدالقدیر نے لکھا ہے -ڈاکٹر محمد عبداللہ کی شخصیت اور پروفیسر خواجہ قطب الدین کے اس کارہائے نمایاں پر جو انہوں نے لکھا ہے اس کے اقتباسات ذیل میں درج ہیں-پروفیسر ڈاکٹر عفان سلجوق لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر خواجہ قطب الدین نے اپنی اس گرانمایہ علمی کوشش میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ پر جو مضامین جمع کیے ہیں وہ اپنے تنوع کے اعتبار سے ان کی زندگی کے گوشوں کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں-.......... ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی وفات کو ایک سال بیت چکا ہے-اس دوران ان پر کافی کچھ لکھا جاچکا ہے مگر ان کی ہمہ جہت شخصیت پر جتنا لکھا جائے کم ہے-وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ، انجمن اور درسگاہ تھے-ان کے قارئین اور مداح بالخصوص یورپ اور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے-ترکی، فرانسیسی، جرمنی، اُردو، عربی، روسی اطالوی نہ معلوم کن کن زبانوں میں انہوں نے بقول خود ان کے ایک ہزار سے زائد مقالے اور تین سو کے لگ بھگ کتابیں

اور رسالے تصنیف کیے۔ جس کا احاطہ کرنا کسی فرد واحد یا ادارے کے لئے انتہائی مشکل ہے۔ پروفیسر خواجہ قطب الدین کی یہ علمی کوشش حال ہی میں قائم ہونے والے ڈاکٹر حمید اللہ ریسرچ فاؤنڈیشن کے کام کو آگے بڑھانے میں یقیناً ممد و مددگار ثابت ہوگی۔''

تعارف میں پروفیسر ڈاکٹر احمد عبدالقدیر لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب نے جامعہ عثمانیہ کے نامور سپوت، عالم اسلام کے عظیم محقق و اسکالر اور اس صدی کی عظیم شخصیت محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (مرحوم) کی ذات، صفات اور علمی خدمات کو متعارف کروانے کی جو سعی کی ہے اس کے لئے ہر پڑھنے والا ان کا ممنون و مشکور رہے گا۔ کوئی بڑا عالم، محقق اور اسکالر کسی تعریف کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ ہی دنیاوی نام و نمود کا خواہشمند، وہ شہرت اور دنیاوی مقام سے بالاتر اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ ایسی ہی بے مثال شخصیت کے حامل رہے ہیں۔..............

ڈاکٹر صاحب کا اسٹیٹس ایک پولیٹیکل رفیوجی کا تھا۔ (ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آباد دکن کے اس مشن کے رکن تھے جو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں حیدر آباد کے مقدمے کی نمائندگی کے لئے بھیجا گیا تھا۔ لیکن ہندوستان کی فوج کشی اور سقوط حیدر آباد کے بعد یہ کیس آگے نہ بڑھ سکا اور عرصہ دراز تک سلامتی کونسل کے ایجنڈے میں رہا) بے وطن ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب پیرس میں ٹھہر گئے اور تقریباً ساری زندگی وہیں گزار دی۔

ایک دفعہ جب ڈاکٹر صاحب خوشگوار موڈ میں تھے تو سوال کیا کہ ''ڈاکٹر صاحب! آپ کو بھی پیرس بہت پسند آیا۔'' مسکرا کر فرمایا۔'' شاید وہ وجہ نہیں جو آپ کے ذہن میں ہے۔ دراصل پیرس کی قومی لائبریری میں اسلامیات پر اتنا کثیر ذخیرہ ہے کہ شاید دنیا میں کسی اور جگہ موجود ہو۔''

پاکستان انہیں یوں پسند نہ آیا کہ یہاں کے حکمرانوں کی اس مملکت خداداد کو قرآن اور سنت رسول ﷺ کے مطابق چلانے کی ساری باتیں زبانی جمع خرچ رہیں اور کوئی مخلصانہ کوشش نہیں کی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کی بے حد خلش رہی۔''

---••☆••---

قمر جمیل

قمر جمیل کا خاندانی نام قمر احمد فاروقی اور قلمی نام قمر جمیل ہے- وہ ۱۰ مئی ۱۹۳۱ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے- ان کا آبائی وطن قصبہ سکندر پور ضلع بلیا (یوپی) ہے- قمر جمیل کے دادا مولانا وکیل احمد سکندر پوری حیدر آباد آگئے تھے اور یہاں جج تھے- ان کے والد جمیل احمد صاحب دکن حیدر آباد میں وکالت کرتے تھے- قمر جمیل کی ابتدائی تعلیم مدرسۂ صنعت وحرفت نام پلی حیدر آباد میں ہوئی- دادا کے انتقال کے بعد وہ اپنی والدہ کے ساتھ سکندر پور آگئے- دو سال تعلیم کا سلسلہ منقطع رہنے کے بعد ان کے ماموں انہیں الہ آباد لے گئے جہاں ان کی تعلیم کا آغاز اسلامیہ کالج سے شروع ہوا- یہیں سے انہوں میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے- اس کے بعد قمر جمیل پھر حیدر آباد چلے گئے- حیدر آباد میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی اے کیا- ان کے اختیاری مضامین میں فلسفہ اور ادب تھا- والد صاحب کے انتقال کے بعد قمر جمیل اپنے ماموں کے ساتھ آغا پورہ آگئے- یہیں پر انہوں نے ماہر القادری اور فانی بدایونی کو دیکھا- مولانا ماہر القادری صاحب قمر جمیل صاحب کے دوستوں میں تھے- قمر جمیل کے محلے میں فانی بدایونی کی موجودگی نے ان کے ذہن میں شاعری کے وقار کو اور بڑھا دیا تھا- شاعری کے سلسلے میں قمر جمیل کے ایک عزیز جناب اکرام الحق صاحب ان کی اصلاح کرتے اور حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے-

جب قمر جمیل حیدر آباد سے یوپی میں اپنے آبائی وطن پہنچے تو ان کی شاعری کو ایک تازیانہ لگا اور شاعری کا شوق بڑھ گیا- چنانچہ انہوں نے اپنا کلام اپنے ایک عزیز واثق سکندر پوری کو دکھایا- قمر جمیل کا کلام دیکھ کر ان کے عزیز نے انہیں ایک رسالہ دیتے ہوئے کہا کہ تم اسے دیکھ ڈالو- تمہیں کسی استاد کی ضرورت نہیں اپنی فطرت کی رہنمائی میں شعر کہو- چنانچہ انہوں نے اپنی فطرت کی رہنمائی میں شعر کہنا شروع کر دیا- ان کا کلام ہمایوں، عالمگیر، سب رس، نشیمن گورکھپور اور آجکل دہلی میں شائع ہونے لگا-

قمر جمیل بی اے کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں پاکستان آگئے- یہاں آنے کے بعد انہوں نے اپنی

ملازمت کا آغاز ریڈیو پاکستان سے کیا۔ابتدا میں وہ لاہور کے ریڈیو اسٹیشن میں بحیثیت پروڈیوسر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ لاہور سے کراچی ہوا۔بعد میں انہیں ترقی دے کر سینئر پروڈیوسر بنادیا گیا۔

شاعری قمر جمیل کی شخصیت کا بنیادی حوالہ ہے لیکن ایک نقاد کی حیثیت سے بھی وہ اپنی نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ ریڈیو پاکستان کراچی میں گزارا اور ایک ماہر براڈ کاسٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔قمر جمیل کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مجتبےٰ حسین مجلّہ ''چہار خواب'' میں لکھتے ہیں:

''قمر جمیل اپنے اس اسلوب کی وساطت سے جس میں دور دیسوں کے خواب دجلہ اور نیل اور فرات کی موجوں کی طرح ابھرتے اور جھلملاتے ہیں۔ایک رومانی فضا میں لے جاتے ہیں۔اپنی تمام تر علامت پرستی کے باوجود ان کا مزاج رومانی ہے۔ان کی شاعری سمبالزم اور سرویلزم کے درمیان سے گزرتی ہے۔اس میں تحتِ شعور، لاشعور اور شعور تینوں کی کارفرمائی ہے۔شعری تصویریں ازخود بنتی جاتی ہیں اور ازخود بجتی ہوئی موسیقی میں ڈھلتی جاتی ہیں۔''

ناچ ناچ کے سارے پتے ساری کلیاں گر جائیں گی
اور کہیں سے تیز ہوائیں ان کو اٹھانے آئیں گی
سورج ان کی سرد چتا میں آگ لگانے آئے گا
جاؤ جاؤ ان کلیوں کو آخری بار سلام کرو
پھر اپنا یہ ناچ نہ جانے ہم کو کہاں لے جائے گا

ضمیر علی بدایونی مندرجہ بالا نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ نظم ایسی نظم ہے جو بیسویں صدی میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔شاعر کائنات میں زندگی کا رقص نہیں دیکھ رہا بلکہ وہ اس ناچ میں موت اور زندگی کی وحدت محسوس کر رہا ہے۔ہم جسے زندگی کا ناچ سمجھتے ہیں وہ آہستہ آہستہ موت کے ناچ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔سارے پتے اور ساری کلیاں صرف اس لیے ناچ رہی ہیں کہ انہیں ایک دن گر جانا ہے۔یہ ناچ دراصل زندگی اور موت کا ملا جلا ناچ ہے یہاں روشنی اور تاریکی ایک ساتھ ناچ رہے ہیں۔

رلکے(RILKE)اس حقیقت کو موت اور زندگی کی وحدت کے نام سے پکارتا ہے۔قمر جمیل نے ناچ کی علامت میں زندگی اور موت کی وحدت کو تخلیقی حسن کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ناچ حُسن اور زندگی کا مظہر ہے لیکن یہ نا موت کا ناچ بھی ہے۔

قمر جمیل کے دو شعری مجموعے ''خواب نما'' اور ''چہار خواب'' شائع ہو چکے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں ہیئت کے تجربات کے ساتھ ساتھ نئے تصورات اور موضوعات کو بھی اپنے فن کے ذریعہ متعارف کرایا ہے۔نقاد کی حیثیت سے بھی وہ اپنی نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔حال ہی میں ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''ادب کی سرحدیں'' شائع ہوئی ہے جس میں ان کی تحریروں میں تنقیدی گہرائی اور تخلیقی رنگ نمایاں ہے۔قمر جمیل کے مجموعۂ کلام ''چہار خوب'' سے منتخب کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

عشق سے پہلے ہمارا شہر کابل تو نہ تھا
زندگی کا شور تھا بندوق کا غُل تو نہ تھا

رات وہ میرا لہو تھا شورِ بلبل تو نہ تھا
تم بہت ناداں ہو فصلِ گُل سمجھتے ہو جسے

سوچتا ہی رہ گیا میرا تخیّل تو نہ تھا
میرے سازِ دل سے نغمہ اس طرح پھوٹا کہ میں

دیکھنا پہلے جہاں لکڑی کا اک پُل تو نہ تھا
ایک سیلابِ بہاراں ہے کہ جاتا ہے وہاں

سرزمینِ عراق کے فرزند
ایک دنیا پہ خندہ زن جیسے

جنگجو بستیوں میں شہروں میں
کوہساروں میں خیمہ زن جیسے

اُڑ رہے ہیں ہواؤں میں پرچم
ناگ لہرا رہے ہوں پھن جیسے

ایک پردہ ہے بیاباں کے قریب
جس کو دیوار چمن جانتے ہیں

یہ ستاروں میں بھٹکتی ہوئی رات
ہم اسے اپنی تھکن جانتے ہیں

چاندنی جن کو جگاتی ہے جمیلؔ
وہی کانٹوں کی چبھن جانتے ہیں

عجیب سادہ و بے کیف تھا وہ قصۂ شوق
مگر بیان میں آیا تو غم کے پھول کھلے

یہ کیا تضاد ہے اس کائنات میں اے دوست
کہ ہر وجود کے اندر عدم کے پھول کھلے

جمیلؔ پہلے کہاں تھے دعا کے دروازے
یہ تیرے ہاتھوں میں کیسے حرم کے پھول کھلے

---••☆••---

قیوم راہی

اصل نام عبدالقیوم خاں اور قلمی نام قیوم راہیؔ ہے۔ وہ ۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۲۳ء کو سنبھل، ضلع مراد آباد یوپی (بھارت) کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مشتاق حسین کا شمار سنبھل کے معزز و معتبر لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کے حقیقی ماموں عبدالغفور خاں غفور مراد آباد کے مشہور وکیل اور شاعر تھے۔ وہ اپنا تخلص غفورؔ کرتے تھے۔ قیوم راہی کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد کنگ جارج یونین ہائی اسکول سنبھل میں پڑھا اور اسی اسکول سے سنہ ۱۹۴۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد کے بعد کارونیشن ہندو کامرس کالج میں تعلیم پائی۔ اسی زمانے میں ہندو مسلم فساد کھڑے ہوئے تو ان کی تعلیم منقطع ہوگئی جس کا انہیں آج تک بے حد ملال ہے۔

مئی سنہ ۱۹۵۰ء کو قیوم راہی ترک وطن کر کے پاکستان آگئے۔ ابتدا میں وہ لاہور میں مقیم ہوئے جہاں انہوں نے سید بھائیز فرم میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد لاہور کارپوریشن میں کام کیا۔ یہاں بھی انہوں نے تھوڑے عرصے کام کیا۔ اس کے بعد محکمہ بحالیات حکومت پنجاب سے وابستہ ہوگئے۔ آخر میں دفتر ڈپٹی کمشنر لاہور سے تقریباً ۲۷ برس خدمات انجام دینے کے بعد سنہ ۱۹۷۸ء میں قبل از وقت ریٹائر منٹ لے لی اور کراچی منتقل ہوگئے۔ کراچی آنے کے بعد قیوم راہی نے سنہ ۱۹۷۸ء سے ۳۰ر جون ۲۰۰۳ء تک ہمدرد فاؤنڈیشن کے شعبۂ ادارت میں بحیثیت سیکشن منیجر خدمات انجام دیں۔

قیوم راہی کے ادبی سفر کا آغاز گزشتہ صدی کی پانچویں دھائی سے ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ''غبارے'' تھا جو ماہنامہ ''ادب لطیف'' لاہور مئی۔ جون ۱۹۵۳ء کے مشترکہ شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت اس ماہنامے کے ایڈیٹر میرزا ادیب تھے۔

قیوم راہیؔ کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''یہیں انہی شہروں اور گلیوں کے نیم وا دریچوں، ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں اور ادھورے دروازوں کے

پیچھے قیوم راہی کے کردار زندگی بسر کر رہے ہیں اور وہ جب چاہتا ہے بظاہر ایک عام سے کردار اور معمولی سے واقعے پر ایک ایسی کہانی تعمیر کر لیتا ہے جو بلند بانگ دعویٰ نہیں کرتی، بس غیر محسوس طور پر قاری کے ذہن میں اترتی چلی جاتی ہے اور اس کی نفسیات تک میں نفوذ کر جاتی ہے۔''

ہندوستان کے معروف صاحب طرز افسانہ نگار جناب جوگندر پال نے قیوم راہی کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''قیوم راہی کے یہاں انسان دوستی اور دردمندی کے عناصر جو فنی ضمیر کی بنیاد ہوتے ہیں بہت نمایاں اور متاثر کن ہیں۔ ہم اپنے دکھ سکھ تو بھوگتے ہی ہیں، مگر فنکار بننے کی ٹھان لیں تو ہمیں سبھوں کے دکھ سکھ بھوگنا ہوتے ہیں۔ رفاقت کی یہی چاہ قیوم راہی کے فن میں تار پود کی مضبوطی کی موجب ہے۔''

قیوم راہی کے افسانے برصغیر کے صفِ اوّل کے ممتاز اور قابل ذکر ادبی رسائل میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ درج ذیل کتابوں میں قیوم راہی کے افسانے بھی شامل ہیں:

(۱) ''منتخب افسانے'' ...... ۱۹۷۱ء ناشر: مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۷۴ء (۲) ''منتخب افسانے'' ناشر: مطبوعات حریت، راولپنڈی (۳) ''کہانیاں'' دو ضخیم جلدوں میں ناشر: اُردو کلاسک، ممبئی (۴) ''بے مثال افسانے'' ۱۹۸۸ء ناشر: ادارہ ''شعاع ادب'' لاہور (۵) ''افسانہ ڈائجسٹ'' ناشر: شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی

قیوم راہی کے مندرجہ ذیل افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) ''تیسری آپا'' ناشر: تخلیق مرکز، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور ۱۹۷۰ء (۲) ''روشنی کا پتھر'' ناشر: مکتبۂ عالیہ، ایبک روڈ، انارکلی، لاہور ۱۹۷۵ء (۳) ''مسکراتا ہوا شخص'' ناشر: شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی ۱۹۸۴ء (۴) ''زیرِ سطح'' ناشر: یونائیٹڈ بک کارپوریشن اردو بازار، کراچی ۱۹۸۷ء (۵) ''آٹھواں سمندر'' مکتبۂ دانیال، ہارون روڈ، کراچی ۲۰۰۱ء

--••☆••--

کمال احمد رضوی

اُردو کے باکمال ڈراما نویس اور طنز و مزاح کے معروف اداکار کمال احمد رضوی یکم مئی ۱۹۳۰ء کو گیا' صوبہ بہار (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید عبدالرشید برطانوی سرکار میں بحیثیت پولیس آفیسر ملازم تھے۔ کمال احمد ابھی تین سال کے تھے کہ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں کی وفات نے ان کی زندگی اور مستقبل پر بڑا گہرا اثر چھوڑا اور انہیں بے حد حساس اور تنہائی پسند بنا دیا۔ جب وہ چھ برس کے ہوئے تو والد صاحب نے دوسری شادی کر لی۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے لکڑی کا کاروبار شروع کیا اور اپنے اس کاروبار میں وہ اکثر اپنے بیٹے کمال کو بھی ساتھ رکھتے تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں کمال سارا دن والد کے ساتھ جنگلوں میں گھومتے تھے۔ اس دوران درختوں کی سرسراہٹ' دھیرے دھیرے بہنے والی ندیوں کی لہریں اور پرندوں کی دل افروز آوازیں کمال کے ذہن پر ایک خوبصورت تخیل چھوڑتیں اور انہیں مدہوش کر دیتی تھیں۔

ان کے والد مذہبی آدمی تھے لیکن وہ تھیٹر کو بھی بہت پسند کرتے تھے اور فنکاروں کی بہت عزت کرتے تھے اور اکثر اپنے گھر پر ان کی دعوتیں بھی کیا کرتے تھے۔ جب بھی وہ تھیٹر دیکھنے جاتے تو اپنے بیٹے کمال کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ چنانچہ یہیں سے کمال احمد کو فنکارانہ ماحول ملا اور خداداد تربیت حاصل ہوئی۔ کمال احمد کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اس کے بعد انہوں نے رانی برج راج ہائی اسکول رفیع گنج سے میٹرک اور بہار نیشنل کالج پٹنہ سے بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ انہیں بڑے بڑے ادیبوں' عالموں اور دانشوروں کی کتابیں پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔

کمال احمد نے طالب علمی کے زمانے ہی سے جدید اور کلاسک ڈراموں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد مضمون نگاری اور اداکاری میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ اسکول میں اسٹیج کیے جانے والے ڈراموں میں باقاعدہ حصہ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے اسکول میں شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ مرچنٹ آف وینس اسٹیج کیا گیا تو انہوں یہودی شائلاک کا کردار بڑی کامیابی کے ساتھ ادا کیا۔

۱۹۵۰ء میں کمال احمد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی میں مقیم ہوئے- کچھ عرصہ کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے ابتدا میں لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''شمع'' اور ''بچوں کی دنیا'' کی ادارت کی اور دو نئے رسالے ''پھلواری'' اور ''تہذیب'' نکالے- وہ انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ بھی کرتے رہے- انہوں نے کئی ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا اور درجنوں کتابیں لکھیں- اس طرح وہ سات آٹھ سال تک ادبی دنیا سے منسلک رہے- اس کے بعد کمال احمد نے فیصلہ کیا کہ ڈرامہ کو اپنا مستقبل بنانا چاہیے- اس زمانے میں فیض احمد فیضؔ آرٹس کونسل کے سیکریٹری تھے- کمال صاحب ''تہذیب'' اور ''پھلواری'' رسالوں سے استعفیٰ دے کر فیضؔ صاحب کے پاس پہنچے اور اپنی خدمات پیش کیں جنہیں انہوں نے قبول کر لیا- اس طرح فیضؔ صاحب کے زمانے میں کمال احمد نے چار پانچ ڈرامے اسٹیج کیے- یہ ڈرامے انہوں نے بلا معاوضہ پیش کیے گئے- کمال احمد کا پہلا ڈرامہ ''آداب عرض'' الحمرا کے اسٹیج پر ٹکٹ لگا کر پیش کیا گیا اور تمام کرداروں کو معاوضہ بھی ادا کیا گیا- اس کے بعد انہوں نے متعدد ڈرامے اسٹیج کیے- اسی زمانے میں لاہور میں ٹیلی ویژن آ گیا جس پر کمال احمد کا ڈرامہ ''آؤ نوکری کریں'' دکھایا گیا- یہ پروگرام چار ہفتے چلا- اس پروگرام میں کمال نے رفیع خاور (ننھا) کو اہل لاہور سے متعارف کرایا اور پھر یہیں سے کمال اور رفیع خاور الٰن ننھا کے روپ میں پاکستان ٹیلی ویژن کے مشہور مزاحیہ پروگرام ''الف نون'' میں برسوں تک راج کرتے رہے- اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ طنز و مزاح کا یہ پروگرام مزاحیہ بھی تھا اور اصلاحی بھی- عوام کی بڑی تعداد اس ڈرامے کو اس قدر پسند کرتی تھی کہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے لوگ اپنے ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھ جاتے تھے- ملک کے معروف دانشور، محقق اور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک جناب کمال احمد رضوی کے فن اور شخصیت کا تعلق ہے تو کوئی اندھا اور بہرہ ہی ہوگا جو ان کے نام اور کام سے ناواقف ہو بھلا کون ہے جس نے شہرۂ آفاق ''الف نون'' دیکھی ہو اور پھر کمال صاحب کو بھول پایا ہو- گذشتہ تیس پینتیس برس میں پاکستان ٹیلی ویژن نے بہت رنگ بدلے ڈراموں کی پیشکش اور اسلوب میں بھی انقلابی تبدیلیاں آئیں- بڑے بڑے ڈرامہ نگار آئے اور بہت کامیاب ڈرامے لکھے گئے مگر ''الف نون'' آج بھی اس بنا پر منفرد ہے کہ کمال احمد رضوی نے معاشرہ کے جن کرداروں اور خامیوں کو طنز کا ہدف

بنایا تھا وہ نہ صرف آج بھی اس طرح سے موجود ہیں بلکہ اب ان میں مزید شدت اور غضب بھی آچکا ہے تو ایسے میں ضرورت ہے نئی ''الف نون'' کی!''

کمال احمد رضوی نے ملک سے باہر بھی اسٹیج ڈرامے کیے- ۱۹۷۶ء میں انہوں نے کامن ویلتھ انسٹی ٹیوٹ تھیٹر لندن میں ایک ڈرامہ ''کس کی بیوی کس کا شوہر'' اسٹیج کیا- ۱۹۷۸ء میں ایک ڈرامہ ''چور مچائے شور'' آرٹ تھیٹر ویسٹ اینڈ میں اسٹیج کیا- یہ عجیب بات ہے کہ ایسی صلاحیتوں والا انسان اسٹیج سے اچانک غائب ہوگیا- اس کی وجہ کیا ہے یہ ابن ادریس کی زبانی سنیے:

''کمال احمد رضوی کو دیکھ کر منیر نیازی کا یہ عنوان بہت یاد آتا ہے- ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' یہ مصرع اس کی پوری زندگی پر محیط ہے- آج اس کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے، جس کا انتساب ''معاشرے کے نام'' ہے- اس کی خوبیاں ذاتی اور خامیاں معاشرے کی عطا کردہ ہیں-..........

زمانہ بڑا ظالم ہے- اس دنیا میں بڑے بڑے لعل و جواہر پیروں تلے روندے جاتے ہیں- یہ دنیا کسی کی حیثیت کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتی- کسی کے بارے میں اگر یہ اندازہ ہو جائے کہ خدا نے اسے جوہر قابل بنایا تو زمانہ اس کی جان کا دشمن ہو جاتا ہے- کمال احمد رضوی سالہا سال تک شدید مخالفتوں کا مقابلہ کرتا رہا- آج بھی یہ پھول تند و تیز ہواؤں کا تنہا مقابلہ کر رہا ہے-''

کمال احمد رضوی جس طرح ڈراموں میں عیارانہ کردار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ویسے نہیں ہیں- میری جب ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں انتہائی خوش اخلاق اور ایک انسان دوست شخصیت کے روپ میں پایا- وہ اپنے دوستوں اور ضرورت مندوں کا بھی بہت خیال کرتے ہیں- سنہ ۱۹۹۰ء میں کمال احمد رضوی کو صدارتی اعزاز ''برائے حُسنِ کارکردگی'' سے نوازا گیا-

--••☆••--

کیفؔ بنارسی

کیفؔ بنارسی کا اصل نام سید یاور حسین، کیفؔ تخلص اور کیفؔ بنارسی قلمی نام تھا۔ وہ ۶ رمئی سنہ ۱۹۳۶ء کو چنار، ضلع مرزا پور یو پی میں پیدا ہوئے۔ کیفؔ صاحب نے ایک ایسے پڑھے لکھے خاندان میں آنکھ کھولی جہاں شعروسخن کا چرچا تھا۔ ان کے ماموں عباس حسین کاملؔ، علامہ عیشؔ بنارسی کے شاگرد تھے۔ ان کے خالو افسر حسین افسرؔ، حکیم قاسم بنارسی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اسی طرح خاندان کے اور افراد بھی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے ذوقِ سخن انہیں خاندانی ورثے میں ملا۔ وہ بچپن ہی سے شعروسخن میں دلچسپی لیا کرتے اور بیت بازی میں بڑھ چڑھ کا حصہ لیتے تھے اور اس طرح انہوں نے شعر بھی کہنا شروع کیا۔ کیفؔ بنارسی نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا لیکن تحریک پاکستان نے ان کی شاعری کو اور بھی جلا بخشی۔ وہ اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ انہوں نے اپنی ملیؔ، قومی نظمیں اور ترانے نہایت جوش اور ولولے کے ساتھ پیش کیے۔ ان کی تمام نظمیں قومی اور ملیؔ جذبات سے لبریز ہوتی تھیں۔ تحریک پاکستان کے وقت انہوں نے یہ ترانہ پیش کیا:

چشم روشن پاکستان دل کی دھڑکن پاکستان
صحرا صحرا اس کی دھوم گلشن گلشن پاکستان
اپنی ہستی کا حاصل اپنا مامن پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان

کیف بنارسی کا یہ ترانہ پاکستان کی تحریک پر بھرپور اثر انداز ہوا۔ اس ترانے کی گونج برصغیر کے ہر گلی کوچے میں سنی جاتی تھی۔

کیفؔ بنارسی ایک خوش کلام شاعر ہی نہیں، وہ ایک بہترین مقرر، اور متحرک سماجی راہ نما بھی تھے۔ ان کی ایک طویل نظم پر مشتمل کتاب ''بیت المقدس کی تلاش'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے تھے:

''تخلیق کار تو اپنی ہر تخلیق کو اچھا سمجھتا ہے لیکن میری طویل ترین نظم پر مشتمل کتاب ''بیت المقدس کی تلاش'' ہر اعتبار سے اہم ہے۔ممتاز مذہبی اسکالر' مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی نے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔حکومت پاکستان کی جانب سے اس کتاب کو دنیا بھر میں ہونے والی عالمی نمائش کتب میں بھیجا گیا۔یہ کتاب پڑھ کر سعودی عرب کے فرماں روا' شاہ خالد نے مجھے ذاتی خط لکھا۔''

ان کی تصنیف ''شعلۂ آزادی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالقدوس ہاشمی لکھتے ہیں:

''ہر مسلمان جو پاکستان کے قیام کے لیے کوشش کرتا رہا ہے' خداوندِ عالم سے اجرِ خیر کا مستحق ہے۔جناب کیف بنارسی کا حصّہ بھی اچھا خاصہ ہے۔ان کی تقریریں اور نظمیں جو ''شعلۂ آزادی'' کے نام سے شائع ہو رہی ہیں' ہماری جدوجہد کی تاریخ کا حصّہ ہیں اور انہیں محفوظ ہونا چاہیے۔ان تقریروں اور نظموں کا ملّی اور تاریخی مقام بھی ہے اور ادبی مرتبہ بھی!''

کیفؔ بنارسی کا شمار ملک کے ممتاز شعراء میں ہوتا تھا۔وہ آخری دم تک اپنی ادبی اور تہذیبی اقدار کو سینے سے لگائے رہے۔اس حوالے سے انہیں بیشتر سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات سے نوازا گیا۔ان کی تصانیف میں ''صدائے قلب''، ''شعلۂ آزادی''، ''بیت المقدس کی تلاش'' (عربی ترجمے کے ساتھ) ''چراغ آشیاں'' اور ''دل کی دھڑکن پاکستان'' شائع ہو چکی ہیں۔کیفؔ بنارسی ۲۵ر دسمبر ۲۰۰۳ء کو دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔پاکستان کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ان کے کلام سے لیے گئے کچھ اشعار ذیل میں درج ہیں' ملاحظہ کیجیے۔

باز آئے اب تو ایسی بے خودیٔ دل سے ہم
کھو گئے منزل پہ آ کر جادۂ منزل سے ہم

چل پڑیں گے ایک دن دنیائے آب و گل سے ہم
اب بہت اُکتا گئے ہیں رونقِ محفل سے ہم

جان کر کھاتے رہے ان کی نگاہوں کے فریب
ہائے کیا مجبور تھے اس بے خودیٔ دل سے ہم

چلتے چلتے تھک گئے اے کیفؔ ہستی کے قدم
اور کتنی دُور ہیں اب آخری منزل سے ہم

یوں تو ہر صنفِ سخن راحتِ جاں ہوتی ہے
پھر بھی جو بات غزل میں ہے کہاں ہوتی ہے

چند الفاظ میں صدیوں کی کہانی سنیے
ایک مصرعے میں بھی تاریخ بیاں ہوتی ہے

کیفؔ زندہ نہیں رہ سکتے محبت کے بغیر
اور غزل گوئی محبت کی زباں ہوتی ہے

آغاز میں ہم برباد ہوئے انجامِ محبت کیا کہیے
جب صبحِ محبت ایسی ہے پھر شامِ محبت کیا کہیے

ہر ایک قدم پر بدنامی، ہر ایک قدم پر رُسوائی
ہم اہلِ وفا پر دنیا کا الزامِ محبت کیا کہیے

نہ جانے ہے یہ محبت کی کونسی منزل
زباں کو تاب نہیں حالِ دل سنانے کی

غمِ حیات، غمِ دو جہاں، غمِ الفت
یہ سرخیاں ہیں مرے درد کے فسانے کی

لبوں پہ موجِ تبسم، مژہ پہ قطرۂ غم
فریب دیتی ہیں یوں گردشیں زمانے کی

کچھ اس طرح سے نکالے گئے چمن سے ہم
نہ مُڑ کے دیکھ سکے شکل آشیانے کی

فلک پہ قوسِ قزح کیفؔ جب اُبھرتی ہے
تو یاد آتی ہے گزرے ہوئے زمانے کی

دل کی بستی کچھ اس طرح اُجڑی
کہ پھر آباد عمر بھر نہ ہوئی

تھک گئے کیفؔ کہتے کہتے مگر
داستاں غم کی مختصر نہ ہوئی

--••☆••--

گہر اعظمی

اصل نام انصار الحق قریشی، گہر تخلص اور قلمی نام گہر اعظمی ہے۔ وہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو موضع مہ وارہ ضلع اعظم گڑھ کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد فضل حق قریشی کا شمار ضلع اعظم گڑھ کے معروف وکلا میں ہوتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ بلدیۂ عظمیٰ کراچی کے مشیر اعلیٰ قانون بھی رہے تھے۔ انہیں شعروسخن سے بھی لگاؤ تھا۔ انہوں نے کچھ نظمیں اور غزلیں بھی کہیں لیکن کسی بیاض میں محفوظ نہیں کیا۔ گہر کے برادر بزرگ عبید الحق قریشی، جن کا ۲۶ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا تھا، اردو اور فارسی کے اچھے شاعر اور عبید تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر جو انہوں نے انتقال سے قبل کہا تھا ملاحظہ کیجیے:

نہ راس آئی تمہیں عمر مختصر بھی عبید   بلائے جاں تھی کہیں طول یہ اگر ہوتی

گہر اعظمی نے ناظرہ قرآن اپنی والدہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں آمدن نامہ، گلستاں اور بوستاں اپنے نانا شمس الدین احمد سے پڑھیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک شبلی ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ ۱۹۵۱ء میں انہوں نے اپنے والدین کے ساتھ پاکستان ہجرت کی اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ یہاں پر انہوں نے عثمانی اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ڈی جے سائنس کالج سے انٹر اور این ای ڈی انجینئرنگ کالج سے اول درجہ میں بی ای (سول) کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک سال تک ایک نجی ادارے میں اور پھر ایک سال کراچی پورٹ ٹرسٹ میں بحیثیت اسسٹنٹ انجینئر فرائض انجام دیے۔ ۱۹۶۵ء میں گورنمنٹ اسکالرشپ پر انہوں نے ایشین انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی سے ماسٹر آف انجینئرنگ کی ڈگری اسٹرکچرل انجینئرنگ میں حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت ہوئی تو ۱۹۶۶ء میں انصار الحق قریشی کا تقرر بلدیہ عظمیٰ کراچی میں بحیثیت ایگزیکٹیو انجینئر ہوگیا جہاں ان کی ملازمت کا سلسلہ انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ میں مختلف عہدوں پر ۱۹۹۷ء

تک رہا-۱۹۸۰ء میں انہیں حکومت سندھ کے نامزد کردہ امیدوار کی حیثیت سے ایڈوانس مینجمنٹ کورس کرنے کے لیے پاکستان ایڈمنسٹریٹیو اسٹاف کالج لاہور بھیجا گیا-بلدیۂ عظمیٰ کراچی میں مختصر عرصہ راقم الحروف نے بھی ان کی زیرنگرانی کام کیا ہے-وہ انتہائی محنتی قابل اور ایماندار افسروں میں شمار کیے جاتے تھے-کراچی کی ترقیاتی منصوبہ بندی، تعمیر وتکمیل میں ان کا اعلیٰ کردار رہا ہے-

گہر اعظمی بنیادی طور پر ایک انجینئر ہیں لیکن طالب علمی کے زمانے سے وہ ایک خوبصورت شاعر بھی ہیں-بچوں کے لیے انہوں نے بہت کچھ لکھا جو بچوں کے رسالوں میں شائع ہوتا رہا-انجینئر نگ کی تعلیم اور ملازمت کے دوران شاعری کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا جسے انہوں نے ریٹائرمنٹ سے قبل دوبارہ شروع کیا-گہر صاحب نے غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں لیکن شاعری میں ان کی پسندیدہ صنف سخن نعت گوئی ہے-اور یہ سوغات انہیں ۱۹۸۴ء میں حج کے بعد نصیب ہوئی-ان کا پہلا نعتیہ کلام ''ثنائے رسول ﷺ'' نومبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا-اس کتاب پر رئیس امروہوی نے خوبصورت منظوم تبصرہ کیا ہے جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

کیا دلفریب نعت ثنائے رسولؐ ہے — جس کا ہر ایک لفظ ضیائے رسولؐ ہے
مجموعۂ ثنائے رسولِ عرب رئیس — سازِ ثنائے حق یہ نوائے رسولؐ ہے

گہر اعظمی کی تصانیف میں کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''ثنائے رسول ﷺ'' (نعتیہ) ''خیر البشر ﷺ'' (نعتیہ) ''اللہ اکبر'' (حمدیہ) ''ربّ العالمین ورحمتہ للعالمین'' (حمدیہ اور نعتیہ) اور پانچواں مجموعہ ''حضور ﷺ میرے ہیں'' شامل ہیں-ان کے پانچویں مجموعے پر گہر اعظمی کو حکومت پاکستان نے خصوصی انعام سے نوازا-گہر اعظمی نے ان کتابوں کے علاوہ حال ہی میں قرآنی تعلیمات پرمبنی احکام کو شعری قالب میں ڈھال کر ''رہنمائے حیات'' کے عنوان سے طبع کرایا ہے-ان کی زیرترتیب کتابوں میں حمدیہ کلام پر مشتمل ایک کتاب العظمتہ للہ ہے اور دوسری کتاب سرور کائنات ﷺ ہے جس میں سیرت نبوی کا نظم میں احاطہ کیا گیا ہے-

سرور کائنات ﷺ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''کتاب کے بغور مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ فاضل مصنف ایک کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر ہیں ورنہ حضور اکرم ﷺ کی پوری حیات طیبہ کو شاعری میں ڈھال دینا

کوئی آسان کام نہ تھا اور وہ بھی اس طرح کہ واقعات و حالات بھی بیان ہو جائیں اور شعری محاسن بھی برقرار رہیں۔"

گہرؔ اعظمی کے اجمالی تعارف کے بعد ان کی حمدوں اور نعتوں سے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہمیشہ میں تجھی سے مانگتا ہوں — مرا تیرے سوا کوئی نہیں ہے

رازِ تخلیقِ دو عالم ہے گہرؔ کن فیکون — کچھ نہیں اس کے سوا عالمِ ہستی کا وجود

رحمت ہو سر پہ سایہ فگن ربِّ ذوالمنن — لائق ہی کب ہیں تیرے سوال و جواب کے

سب کی ساری ضرورتیں پوری — پاک پروردگار کرتا ہے

ابجا جن کا قرآں میں ہے تذکرہ — راحتیں، نعمتیں رحمتِ بے کراں

سب کی سب ہیں تری کارفرمائیاں — سب کرشمے ترے صاحبِ کن رکن فکاں

دنیا کی کُل لغات میں موجود ہی نہیں — لفظوں سے کس طرح انہیں تعبیر کیجیے

دیکھا ہے میں نے گنبدِ خضرا قریب سے — ملتا ہے آدمی کو یہ موقع نصیب میں

گہرؔ اب تری بے زبانی زباں ہو — کہ دربارِ خیر الانامؐ آگیا ہے

فلاح ان کا مقدّر، بہشت ان کا نصیب — جو لوگ آپؐ کے نقشِ قدم پہ چلتے ہیں

قتلِ حسینؓ عظمتِ اسلام کی دلیل — درجات ہیں بلند بہت ہر شہید کے

جو کم تر سے بھی کم تر تھے نگاہِ بزمِ ہستی میں — وہ کندن بن گئے جب آئے ان کی سرپرستی میں

شبِ معراج کی اک مختصر تفسیر یہ بھی ہے — زمیں عرشِ بریں پہنچی، فلک زیرِ نگیں ٹھہرا

نبیؐ کے شہر کی آب و ہوا ہی ایسی ہے — ہر اک شخص لگا معتبر مدینے میں

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ" — یہ عقدہ حل ہوا جا کر مدینے

---••☆••---

محبؔ عارفی

ان کا اصل نام محب اللہ، تخلص محبؔ اور قلمی نام محبؔ عارفی ہے۔ ۲؍ جنوری سنہ ۱۹۱۹ء کو قصبہ یوسف پور ضلع غازی پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مقامی ہندو ہائی اسکول سے آٹھویں جماعت تک پڑھا۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ چلے گئے جہاں انہوں نے میٹرک اور انٹر کے دونوں امتحان اوّل درجے میں پاس کیے۔ اسی زمانے میں محبؔ عارفی نے ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پر بڑے لارڈ صاحب کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس دفتر کے ایک سینئر افسر نے ان سے کہا کہ تم بی اے کر لو تو تمہیں سرکاری ملازمت لے لیا جائے جائے گا۔ جب انہو نے بی اے کر لیا تو سنہ ۱۹۴۰ء میں وہ مرکزی حکومت کے سیکریٹریٹ میں کلرک ملازم ہوگئے۔ تقسیم کے وقت محبؔ صاحب ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور جناح ہسپتال کے قریب مہاجر کیمپ میں رہے پھر مارٹن کوارٹر میں منتقل ہو گئے۔

یہاں پر بھی وہ مرکزی حکومت میں کام کرتے رہے اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے جائنٹ سیکریٹری کے منصب تک پہنچے۔ ایوب خاں کے دور میں ان کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا۔ ساٹھ سال کی مدّت ملازمت پوری کرنے کے بعد سنہ ۱۹۷۹ء میں محبؔ عارفیؔ ریٹائر ہوئے۔

عارفی صاحب کو شعر و سخن کا ذوق زمانہ طالب علمی میں ہوا اور شادؔ عارفی رام پوری سے تلمذ کیا۔ ان کی تصانیف میں شعری مجموعہ ''گل آگہی'' ہے جو ایک کتاب کے حصہ کے طور پر سنہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا نام ''تین کتابیں'' تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۷۵ء میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''چھلنی کی پیاس'' نام سے شائع ہوا۔ ''میر تقی میرؔ اور آج کا ذوقِ شعری'' ان کی تنقیدی کتاب ہے جو سنہ ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ ان کی شاعری کی عمر خاصی لمبی ہے مگر اس مناسبت سے ان کا کلام بہت کم ہے۔ اس کی وجہ محبؔ عارفی صاحب اپنی کم گوئی کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعری کا سودا لڑکپن سے ہے۔ انواع و اقسام کی شعرانگیز کیفیتیں ہر شاعر کے دل پر

گزرتی ہیں لیکن جس کیفیت کے متعلق مجھے اطمنان نہیں ہو جاتا کہ پائیدار ہے عموماً اس سے شعر کشید نہیں کر پاتا - یہ ایک بڑی وجہ ہے اس بات کی کہ میری شعری تخلیقات کی مقدار بہت کم ہے"

ان کے کلام کے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں' ملاحظہ ہوں ۔

عمر بھر جس پہ تکیہ رہا، کچھ نہ تھا، دل نہیں مانتا
کیا کروں تجزیوں کا اٹل فیصلہ، دل نہیں مانتا

کوند کر ایک لمحہ جو پھر جا ملا وقت کے ابر میں
چھوڑ دے گی اسے وقت کی مامتا، دل نہیں مانتا

گھُپ اندھیرے سے لیتی ہے کیوں کر جنم، روشنی کی لگن
یہ کرشمہ نہیں ہے کسی شمع کا، دل نہیں مانتا

خشک ہی کیوں نہ ہو جائے دریا مرا، لہر بن کے میں
ڈھونڈنا چھوڑ دوں خشکیوں کا سرا، دل نہیں مانتا

اپنے مرکز کو اک وہم سمجھا کیا، عقل کا دائرہ!
جس کو کچھ اپنے دامِ کشش کے سوا، دل نہیں مانتا

اس کی تصویر کو دیکھتے دیکھتے، یہ کیا ہوا کیا مجھے
یعنی بے حسِ ہے تصویر کی ہر ادا، دل نہیں مانتا

دل میں کچھ ہے، زباں سے نکلتا ہے کچھ، بات ایسی ہے کچھ
میرا مطلب محبؔ کوئی پا جائے گا، دل نہیں مانتا

آکر زبان پر جو سخن ہو کے رہ گیا اک شعلہ تھا جو اپنا کفن ہو کے رہ گیا
منزل کی فکر کیا مرے سیلِ بہار کو ٹھہرا جہاں وہیں پہ چمن ہو کے رہ گیا
حد نظر کے پار پہنچنے کے شوق میں پائے نگاہ اپنی تھکن ہو کے رہ گیا
رنگینیاں وہ سطح کے روغن کی ہیں محبؔ غرقاب جن میں آج کا فن ہو کے رہ گیا

---••☆••---

محبوب خزاں

ان کا اصل نام محمد محبوب صدیقی، محبوب خزاں قلمی نام اور خزاں تخلص ہے۔ یکم جولائی ۱۹۳۰ء کو موضع چنداوائر، ضلع بلیہ یوپی کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد یوسف اپنے موضع کے معزز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ محبوب خزاں ابھی بارہ سال کے تھے کہ ۱۹۴۲ء میں ان کے سر سے والد کا سایہ اُٹھ گیا۔ والد کی وفات کے بعد ان کی تعلیم وتربیت ان کے بڑے بھائی محمد ایوب صدیقی نے کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد محبوب خزاں نے ۱۹۴۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا۔ اس کے بعد سی ایس ایس کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہوئے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ بحیثیت اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل مقرر ہوئے۔ ان کی پہلی تعیناتی لاہور میں ہوئی جہاں وہ ۱۹۵۷ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۷ء میں انہیں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر ڈھاکہ سابق مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا۔ تین سال وہاں کام کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں وہ ڈھاکہ سے کراچی آگئے اور پھر یہیں پر ملازمت کی مدت ختم ہونے کے بعد ۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہو گئے۔

محبوب خزاں نے اردو ادب کے قارئین کو گو ایک مختصر مجموعہ دیا ہے لیکن اپنے معیار اور انفرادیت کی بناء پر یہ مجموعہ آج بھی اردو شاعری کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ محبوب خزاں مغربی ادبیات اور مشرقی روایت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں ایسی جدیدیت ہے جو ہمیں نامانوس نہیں لگتی۔ ان کی شاعری میں ایک سادہ بیانی ہے لیکن اس سادہ بیانی کے پیچھے چھپے تجربے اور ایک خاص طرح کی موسیقیت ایسا انوکھا امتزاج ہے جو دل پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ بحروں کے انتخاب میں بھی ایک مخصوص آہنگ کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ محبوب خزاں کی آواز اردو شاعری کی ایک نئی، منفرد اور اثر انگیز آواز ہے۔

ان کی غزلوں میں گفتگو کا بے ساختہ پن ہے اور جذبات کی ایسی جمالیاتی تہذیب ہے جو ان کی

غزلوں کی انفرادیت کو اور سوا کر دیتی ہے۔ وہ نظموں میں ''امیجز'' کو اس نزاکت اور احتیاط سے باہم مربوط کرتے چلے جاتے ہیں کہ قاری احساس کی سطح پر ان کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ محبوب خزاں کی شاعری میں ایک باطنی جمال ہے جو سننے اور پڑھنے والے پر آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔ ''اکیلی بستیاں'' شاعرانہ تخیل کا ایسا طلسم کدہ ہے جو قدم قدم پر ہمیں حیرت سے ہم کنار کرتا ہے۔ ذیل میں ان کی ایک غزل اور چند اشعار پیش ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

حال ایسا نہیں کہ تم سے کہیں
ایک جھگڑا نہیں کہ تم سے کہیں

زیرِ لب آہ بھی محال ہوئی
درد اتنا نہیں کہ تم سے کہیں

سب سمجھتے ہیں اور سب چپ ہیں
کوئی کہتا نہیں کہ تم تم سے کہیں

کس سے پوچھیں کہ وصل میں کیا ہے
ہجر میں کیا نہیں کہ تم سے کہیں

اب خزاں یہ بھی کہہ نہیں سکتے
تم نے پوچھا نہیں کہ تم سے کہیں

جی چاہتا ہے کس نے کہا مت خریدیے
دولت سے حُسن حُسن سے دولت خریدیے

کچھ لوگ جی رہے ہیں شرافت کو بیچ کر
تھوڑی بہت انھیں سے شرافت خریدیے

دنیا کے رنگ جھیلیے کمرے میں بیٹھ کر
کھڑکی کے پاس جایئے حسرت خریدیے

بے رنگ ہے حکایتِ خونِ جگر خزاںؔ
خونِ جگر سے رنگ کی قیمت خریدیے

دیکھتے ہیں بے نیازانہ گزر سکتے نہیں
کتنے جیتے اس لیے ہوں گے کہ مر سکتے نہیں

اب ان آنکھوں میں جلوے ٹھہرتے نہیں
ایسے لمحے بھی ہیں جو گزرتے نہیں

ہجرت ہے شہر شہر وطن کی تلاش میں
باد صبا چلی ہے چمن کی تلاش میں

آنسو اب اس سے کیا چھپانا
جو دامن بھی ہے آستیں بھی

کسے خبر کہ اہل غم سکون کی تلاش میں
شراب کی طرف گئے شراب کے لئے نہیں

---••☆••---

محمد احمد سبزواری، سید

سید محمد احمد سبزواری ۱۶ر جنوری ۱۹۱۳ء کو بلدۂ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد مغل شہنشاہ ہمایوں کے ہمراہ ایران کے شہر سبزوار سے ہندوستان آئے تھے۔ ہمایوں نے اپنی حکومت قائم ہونے کے بعد اپنے ساتھ آئے ہوئے ایرانیوں کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جاگیریں عطا کیں۔ سبزوار سے آئے ہوئے لوگوں کو یوپی میں جاگیریں دیں۔ محمد احمد سبزواری کے جد امجد دیوبند کے ضلع املیا میں آباد ہوئے تھے۔

محمد احمد سبزواری نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی اور مولوی شمشیر علی نے قرآن پاک پڑھایا۔ اس کے بعد بھوپال کے وحیدیہ ٹیکنیکل اسکول میں چوتھی کلاس میں داخل ہوئے۔ یہاں سے چھٹی کلاس کا بورڈ کا امتحان پاس کر کے الکونڈرا اسکول، جہانگیریہ ہائی اسکول چلے گئے۔ اسی اسکول سے ۱۹۳۳ء میں میٹرک پاس کیا اور دوسرے نمبر میں کامیابی ہوئی۔ سبزواری حساب میں بہت کمزور تھے۔ اس زمانے میں اسکولوں اور کالجوں میں غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی۔ سبزواری بچپن سے ہی بڑے ذہین اور پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے۔ وہ بچوں کے رسائل مثلاً خواجہ حسن نظامی کی کہانیاں، سید امتیاز علی کا پھول لاہور اور حکیم احمد شجاع کا نونہال بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ جب اس اسکول نے سہ ماہی میگزین ''گہوارۂ ادب'' نکالا تو اس کے پہلے مدیر محمد احمد سبزواری تھے۔ تاریخ کے استاد کی سرکردگی میں ہسٹاریکل سوسائٹی بنی تو سبزواری صاحب اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ اسکول کے زمانے میں انہوں نے مختلف مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کیے۔

میٹرک کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے وہ اورنگ آباد گئے اور جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ ان کے مالی حالات بہت کمزور تھے۔ تعلیم کے اخراجات کے لیے ان کی والدہ انہیں پچیس روپے ماہوار بھیجتی تھیں۔ اس زمانے میں استاد بھی طلبہ کی مدد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ سبزواری کو کالج کے میگزین 'نورس' کا مدیر مقرر کیا جس کا اعزازیہ سات روپے ملنے لگا۔ ایک ٹیوشن دلوایا جس کا وظیفہ آٹھ

روپے تھا-اس طرح ان کی تعلیم کا مسئلہ بخیروخوبی حل ہوگیا-۱۹۳۵ء میں انہوں نے اُردو فارسی اور معاشیات کے مضامین میں دوسرے درجے میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۳۷ء میں معاشیات میں اوّل درجے میں بی اے پاس کیا-اوّل درجے میں آنے سے انہیں میرٹ پر اسکالرشپ ملا-اس کے بعد سبزواری صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی ہی سے ۱۹۳۷ء میں معاشیات میں اوّل درجے اور اوّل پوزیشن میں ایم اے کیا-پی ایچ ڈی کے لیے جامعہ نے ان کی فیس معاف کردی اور سو روپے وظیفہ مقرر کیا-ایک سال تک وہ اپنے تحقیقی کام میں مصروف رہے-ان کے مقالے کا عنوان "ریاست حیدرآباد کا نظام زر اور بینک کاری" تھا-اسی دوران سبزواری صاحب کو بھوپال میں ملازمت مل گئی اور پی ایچ ڈی کا مقالہ ادھورا رہ گیا-

۱۹۴۰ء میں ریاست بھوپال کی مردم شماری کے لیے وہ عارضی طور پر اسسٹنٹ سینئر آفیسر مقرر ہوئے-عجیب اتفاق ہے کہ سبزواری حساب میں کمزور تھے اور حساب کتاب ہی کی ملازمت ملی-اسی زمانے میں ریاست بھوپال میں ایک فرنٹ قائم ہوا جس کے جلسے ہر ماہ منعقد ہوا کرتے تھے-ایک جلسہ میں جس میں ریزیڈنٹ بھی موجود تھے، سبزواری صاحب نے بھی ایک تقریر کی-ان کی تقریر بہت پسند کی گئی جس کے نتیجے میں ان کی ملازمت مستقل کردی گئی-اس سے پہلے جارج پنجم کی جوبلی پر تقریری مقابلے میں بھی سبزواری صاحب انعام پا چکے تھے-کچھ عرصہ کے بعد محکمۂ مردم شماری سے تبادلہ کر کے انہیں راشننگ آفیسر مقرر کیا گیا-یہاں پر بھی انہوں نے بڑی محنت اور لگن سے کام کیا-ان کی ذہانت اور اعلیٰ کارکردگی کو دیکھتے ہوئے انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا-

تقسیم ہند کے بعد وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی میں مقیم ہوئے-پاکستان میں وہ ریسرچ آفیسر مقرر ہوئے-پاکستان میں بسلسلۂ ملازمت انہیں سماجی اعداد و شمار کی ٹریننگ کے لیے امریکہ بھیجا گیا-سبزواری نے ٹریننگ میں سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے ساتھ ہی امریکن یونیورسٹی سے معاشیات میں پوسٹ گریجویٹ کورس کر کے ۵۵-۱۹۵۴ء میں حال آف نیشن سرٹیفکٹ حاصل کیا-ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد پاکستان واپس آئے تو انہیں اکیڈمی برائے ترقی دیہات پشاور میں ریسرچ اسپیشلسٹ مقرر کیا گیا-کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۸ء میں ڈیولپمنٹ ایڈمنسٹریشن کی تربیت کے لیے وہ مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی گئے جہاں سے ۱۹۵۹ء میں ڈپلوما کیا-سبزواری صاحب نے ہندوستان پاکستان میں

مختلف محکموں میں بڑی تندہی، لگن، محنت اور نہایت ایمانداری سے خدمات انجام دیں۔ مدت ملازمت میں ایک سال توسیع کے بعد ۱۹۷۶ء میں وہ ریٹائر ہوئے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد چار سال جامعہ کراچی سے منسلک رہے جہاں انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے پروجیکٹ پر کام کیا۔

سبزواری صاحب ابتدا ہی سے لکھنے پڑھنے کے بہت شوقین رہے ہیں یا یوں کہیے کہ پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ الکزنڈرا اسکول کے زمانے میں وہ ''گہوارۂ ادب'' میگزین کے مدیر رہے۔ اورنگ آباد میں ''نورس'' دوماہی اور کالج میگزین کی ادارت کی۔ ۵۴-۱۹۴۹ء میں معاشیات انجمن ترقی اُردو (پاکستان) مجلّہ اور ۵۴-۱۹۵۱ء میں اسٹیٹیکل بلیٹن (حکومت پاکستان کے ماہوار مجلّہ کی ادارت کی۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز دورانِ طالب علمی ہو گیا تھا۔ ان کا پہلا مضمون ''جنون کی کہانیاں'' رسالہ تہذیب نسواں لاہور میں چھپا۔ سبزواری صاحب نے پبلک ایڈمنسٹریشن اور تحقیق پر آٹھ کتابیں لکھیں۔ زکوٰۃ پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ انہوں نے سات آٹھ لغات پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر کام کیا اس میں اصطلاحات بینکاری خاص طور پر قابل ذکر ہے جو بینکاری کی ساڑھے دس ہزار اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ ان کی یہ کتابیں زیر ترتیب ہیں: بھوپال کی ادبی تاریخ، بھوپال کے مخصوص الفاظ کی لغت اور اقبال کا شاہین اور رومی کا شہباز۔ روزنامہ ''جنگ'' میں ہر مہینے دو کالم اور ماہنامہ ''افکار'' میں کتابوں پر تبصرے لکھتے ہیں۔

محمد اختر جوناگڑھی

قاضی محمد اختر نام، اختر تخلص اور اختر جوناگڑھی قلمی نام ہے۔ محمد اختر جوناگڑھی بیسوی صدی کے دور آخر کے سربرآوردہ دانشور، محقق، اردو، فارسی، عربی اور اسلامیات کے مستند عالم، ماہرِ لسانیات قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے فرزند ہیں۔ قاضی احمد میاں اختر تحریک پاکستان کے ایک نہایت فعال کارکن (صدر گجرات مسلم لیگ) تھے۔ آزادی کے حوالے سے ان کا نام تقسیمِ ہند کے دو ڈھائی برس بعد تک نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندوستان کے سرکاری حلقوں میں بھی افسانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ان کا نام برصغیر کی ثقافتی تاریخ میں ناقابلِ فراموش ہے۔ احمد میاں جوناگڑھی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک انجمن ترقی اردو کے جوائنٹ سیکریٹری تھے۔ آخری عمر میں وہ دو تین سال سندھ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر بھی رہے۔
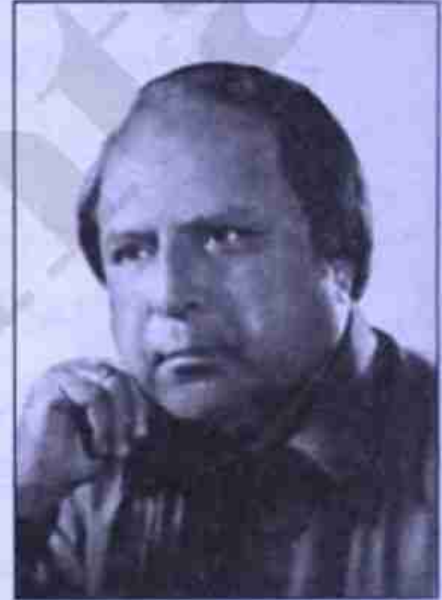
قاضی محمد اختر ۸ر جون ۱۹۴۳ء کو ہندوستان کے صوبے گجرات کے علاقے کاٹھیاواڑ کی معروف ریاست جوناگڑھ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد پانچ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ان کی ابتدائی تعلیم سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۵۷ء میں ان کے والد کے انتہائی معتقد ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم کی کوششوں سے انہیں جامعہ تعلیم ملی کے بورڈنگ ہاؤس میں نویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔ سب بھائیوں میں بڑے ہونے کے سبب گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ محمد اختر کے کاندھوں پر پڑا اور اس وجہ سے ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی وقتی طور پر منقطع ہو گیا۔ بہر حال ۱۹۶۲ء میں انہوں نے بطور پرائیویٹ میٹرک پاس کیا اسی سال اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسی زمانے میں انہیں شاعری، فکشن اور تنقید کے مطالعے کا ذوق پیدا ہوا۔ اردو کے معیاری ادبی جریدوں، شعروادب اور فکشن کی شاہکار کتابوں کا خوب مطالعہ کیا۔ مطالعے کے ساتھ ساتھ لکھنے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی بھی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے پہلا مضمون اپنے والد اور بابائے اُردو کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا جو ۱۹۶۳ء میں ''قومی

زبان'' کے بابائے اردو نمبر میں شائع ہوا تھا۔مضمون نگاری کے ساتھ انہیں شعروسخن سے بھی شوق ہوا جو انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔اور پھر ایک مجموعہ کلام ''ہم تو پتھر ہو گئے'' کے عنوان سے شائع بھی کر دیا۔ابتدا میں بڑے شاعروں کا کلام پڑھ کر محظوظ ہوتے تھے لیکن بعد میں وہ خود بھی شعر کہنے لگے۔شعر گوئی سے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''تخلیقی اظہار کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا بہر طور ضروری تھا۔چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ شعر گوئی کا سلسلہ جواب تک چند قریبی احباب تک محدود تھا اسے معرض اشاعت میں لایا جائے۔ قباحت یہ تھی کہ روایتی حوالے سے نہ میرا کوئی استاد تھا اور نہ میں کسی کا شاگرد! دوسرے شعر کہنے کے لیے فن عروض پر مکمل عبور لازم تھا جس سے یقیناً میں آج تک محروم ہوں۔ بہر حال دوستوں کے اصرار اور اپنی خود اعتمادی کا سہارا لے کر میں نے فیصلہ کیا کہ جیسی غزلیں میں نے کہی ہیں اچھی یا بری انہیں اب شائع کرا دینا چاہیے۔''

قاضی محمد اختر آج کل روزنامہ ''جنگ'' سے منسلک ہیں۔ان کی اہلیہ بھی معروف افسانہ نگار اور دہلی گورنمنٹ کالج سے بحثیت صدر شعبہ اردو وابستہ ہیں۔محمد اختر کے مجموعۂ کلام سے منتخب کیے گئے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

یہ تو نہیں کہ مجھ کو رفاقت نہ مل سکی
پھر تیرے بعد ایسی محبت نہ مل سکی

تجھ سے بچھڑ کے میں نے محبت تو کی، مگر
پھر ویسی جسم و جاں کی وہ چاہت نہ مل سکی

تیری جدائیوں میں یہ سوچا تھا روئیں گے
لیکن یہ حادثہ ہے کہ فرصت نہ مل سکی

آنکھیں بھی تیرے ہجر میں محرومِ خواب ہیں
تجھ کو گنوا کے نیند کی دولت نہ مل سکی

دنیا سے دل لگالیں یہ سوچتے رہے
لیکن ترے غموں سے اجازت نہ مل سکی

رفاقتیں بھی رہیں گی محبتیں ہوں گی
ہمارے بعد کہاں اتنی چاہتیں ہوں گی

بچھڑتے وقت کبھی ہم نے یہ نہیں سوچا
کہ اس کے ہجر میں ایسی بھی وحشتیں ہوں گی

جدا ہوئے تھے مگر یہ خیال ہی کب تھا
فراق و وصل میں اتنی مسافتیں ہوں گی

جسم صحرا ہو چکے ہیں ذہن بنجر ہو گئے
ہم کہاں زندہ ہیں دیکھو ہم تو پتھر ہو گئے

---••☆••---

محمد امین زبیری

محمد امین زبیری سنہ ۱۸۷۰ء کی دہائی میں مارہرہ، ضلع ایٹہ، یوپی میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے والد مولوی امانت حسین شفا سے حاصل کی- دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد رامپور کے سرکاری اینگلوورنا کیولر اسکول میں پڑھا- والد کے انتقال کے بعد معاشی حالات ناگفتہ ہوئے تو تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور تلاش معاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے- فارسی، عربی اور انگریزی کی جو کچھ علمی استعداد تھی وہ مطالعہ کا حاصل تھا جس کا اظہار مختلف موضوعات علم وادب پر ان کی کم وبیش ۲۴ تصنیفات وتالیفات اور برصغیر کے مقتدر جرائد میں شائع شدہ ان کے ان گنت مقالات سے ہوتا ہے-

تلاش معاش کے لیے زبیری صاحب پہلے ریاست گوالیار، پرتاب گڑھ، بارہ بنکی وغیرہ کے محکمات بندوبست اراضی سے وابستہ رہے لیکن یہ ملازمتیں انہیں پسند نہ آئیں تو چھوڑ کر ممبئ چلے گئے- ممبئ میں کچھ عرصے تگ ودو کے بعد وہ روزنامہ ''مسلم ہیرالڈ'' میں کالم نویسی پر ملازم ہوگئے- اسی زمانے میں ان کی ملاقات حاجی رحمت اللہ حاجی داؤد میمن سے ہوگئی جن کی طرف سے نکاح بیوگان کی ترغیب کے لیے قلیل مشاہرے پر مختلف اخبارات ورسائل میں مضامین لکھتے رہے- بعد میں زبیری صاحب کی رسائی نواب محسن الملک سے ہوگئی جنہوں نے ان کی تحریروں کو بہت پسند کیا اور انہیں ۲۳ روپے ماہانہ پر بحیثیت اپنا پرسنل اسسٹنٹ مقرر کرلیا- نواب صاحب کے ساتھ کافی عرصہ تک تصنیف وتالیف کی خدمات انجام دیں جس کی بدولت نواب صاحب کا ان کے ساتھ بہت ہی مشفقانہ اور بزرگانہ کا تعلق قائم ہوگیا- نواب صاحب کے کام کرنے کے دوران زبیری صاحب کی دوستی مولوی عبدالحق اور مولانا ظفر علی خاں سے قائم ہوگئی- ظفر علی خاں ان دنوں ممبئ ہی میں مقیم تھے-

زبیری صاحب کی علمی وادبی صلاحیت، ذوق وشوق اور تصنیفی معیار کو سراہتے ہوئے نواب صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ ان کا تذکرہ سیرت النبیؐ کے دیباچہ میں کیا جائے- چنانچہ سید سلیمان ندوی نے

جلد اوّل میں ان کی پُر خلوص خدمات کا ذکر کیا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد نواب محسن الملک کی سفارش پر بدرالدین طیب جی کے اخبار "مراۃ الاخبار" سے جو ممبئی سے نکلتا تھا' بحیثیت نائب مدیر وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد نواب صاحب کی امداد سے زبیری صاحب نے اپنا اخبار "سفیر" جاری کیا۔ نواب محسن الملک کے علی گڑھ اور مولوی عبدالحق اور ظفر علی کے حیدرآباد چلے جانے کے بعد زبیری صاحب بھی ممبئی چھوڑ کر بھوپال چلے گئے۔ بھوپال میں کچھ دن انہوں نے ملّا غلام حسین کی دکان پر بطور محاسب اور مقدمات کے پیروکار کام کیا پھر وہ ایک معروف اور سینئر وکیل سید عبدالعزیز کے ساتھ بطور اسسٹنٹ کام کرنے لگے۔ وکیل صاحب سے وابستگی اتنی بڑھی کہ ان کے گھر میں ان کی حیثیت ایک بیٹے کی سی ہوگئی۔ وکیل صاحب کے بیٹوں سے زبیری صاحب کے تعلقات مرتے دم تک رہے۔

وکیل صاحب جب حکومت کی مجلس مشاورت کے جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے تو انہوں نے زبیری صاحب کو اسی محکمہ میں عارضی طور پر ملازمت دلا دی۔ اسی دوران والیِ ریاست سلطان جہاں بیگم کو اپنے لیے ایک لٹریری سیکریٹری کی ضرورت تھی۔ بعض دیگر ناموں کے ساتھ زبیری صاحب کا نام پیش ہوا۔ چنانچہ سب کا امتحان لیا گیا تو زبیری صاحب کامیاب قرار دیے گئے اور چالیس روپے ماہانہ مشاہرہ پر روبکاری خاص میں تقرر ہوا۔ تقریباً ۲۴ سال بیگم بھوپال سے ان کا اتنا قریبی ربط رہا کہ دوسرے اعلیٰ افسران رشک کرتے تھے۔ بیگم بھوپال کے دوران سفر میں بھی زبیری صاحب شاہی عملے میں شامل ہوتے تھے اور ہر خوشی کے موقع پر انعام واکرام سے نوازے جاتے تھے۔ بیگم بھوپال تعلیم نسواں میں بہت دلچسپی رکھتی تھیں۔ اس سلسلے میں زبیری صاحب نے بہت کام کیا اور ایک سرکاری رسالہ "ظل السلطان" کے عنوان سے ان ہی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس زمانے کا ان کا سب سے بڑا کارنامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبیؐ کی امداد کے لیے ریاست سے امداد دلوانا تھا۔ مولانا سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں شاندار الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا (شبلی) نے اپریل ۱۹۱۲ء کے "الندوہ" میں سیرت النبیؐ کی امداد کے لیے ایک اپیل شائع کی تھی۔ محمد امین زبیری نے نواب سلطان جہاں بیگم جو اُس زمانے میں ان کے لٹریری سیکریٹری تھے سرکار سے عرض کیا:

"حضور! آج کونین کی دولت لٹ رہی ہے۔ اس کو بڑھ کر کیوں اُٹھا نہیں لیتیں! یعنی ایک عاشقِ رسولؐ مصنف گلے میں جھولی ڈال کر سیرت نبوی کی تصنیف کے لیے قوم سے بھیک

مانگنے نکلا' یہ عزت حضور کیوں نہیں حاصل کرلیتیں! اوراس فقیر کی جھولی میں ڈھائی سوماہوار ڈالدیتیں کہ وہ دل جمائی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوجائے- یہ بات بیگم صاحبہ کے دل میں اُتر گئی- انہوں نے اس حصولِ سعادت کی رضامندی ظاہر کی- منشی صاحب (زبیری صاحب) نے مولانا کو مطلع کیااوراپریل ۱۹۱۲ء کے شروع میں ان سے باقاعدہ درخواست منگوائی گئی جو ۱۴راپریل ۱۹۱۲ء کو دو برس کے لیے ۲۰۰ ماہوار کے حساب سے منظور ہوئی- مولانا نے مئی ۱۹۱۲ء کے ''الندوہ'' میں بڑی مسّرت سے اس کا اظہار کیا-''

بعد میں جب نواب حمید اللہ خاں والی ریاست ہوئے تو یہ رقم اضافے کے ساتھ مستقل کردی گئی تھی- ۱۹۳۱ء میں والیۂ ریاست سلطان جہاں بیگم کے انتقال کے بعد زبیری صاحب نے پینشن کی درخواست دیدی-۲۰۰ روپے ماہوار پینشن مقرر ہوئی جو انہیں زندگی بھر ملتی رہی-

پینشن ملنے کے بعد اپنے بیٹے اور دو بھتیجوں کی تعلیم کی خاطر علی گڑھ چلے گئے- اگرچہ محمد امین زبیری کالج یا یونیورسٹی کے اولڈ بوائز میں سے نہیں تھے لیکن سرسید اور سرسید کے علی گڑھ کے فدائیوں اور شیدائیوں میں تھے- علی گڑھ کے دوران قیام یونیورسٹی کے وائس چانسلر سرسید راس مسعودٗ ڈاکٹر ضیاالدین احمد سے خصوصی اور دیگر پروفیسروں سے ان کے قریبی تعلقات رہے- ان کے علاوہ برصغیر کے تمام ہی مشاہیر علم وادب سے ان کے تعلقات قائم تھے جن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں- بابائے اُردو سے تو ان کی دوستی تقریباً ۷۰ سال رہی-

تقسیم ہند کے بعد محمد امین زبیری ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی- ۲رستمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوگیا- زبیری صاحب نے فارسی' عربی اور انگریزی کی جو کچھ علمی استعداد حاصل کی وہ انہوں اپنے کثرت مطالعہ سے حاصل کی تھی- انہوں نے مختلف موضوعات علم وادب پر کم وبیش ۲۴ تصنیفات وتالیفات اور برصغیر کے مقتدر جرائد میں ان گنت مقالات لکھے جو شائع ہوتے رہے- ان کی تصانیف وتالیفات میں 'بیگمات بھوپال مصور' ۱۹۱۸ء، 'مختصر تاریخ مسلم یونیورسٹی' ۱۹۳۴ء 'سیاسیات ملّیہ'' ۱۹۴۱ء، ''ضیائے حیات'' (ڈاکٹر سرضیاالدین پر) ۱۹۵۲ء، ''پرنس آغاخاں'' ۱۹۵۲ء، ''شبلی کی رنگین زندگی'' ۱۹۵۲ء، ''خدوخال اقبال'' ۱۹۵۵ء شامل ہیں-

--••☆••--

محمد خلیل اللہ، پروفیسر

پروفیسر محمد خلیل اللہ ۷/اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء کو عزیز باغ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد الحاج محمد ولی اللہ جامعۂ عثمانیہ کے پہلے بیچ کے فرسٹ کلاس ایل ایل بی تھے۔ وہ اعلیٰ عدالتی عہدوں پر فائز رہے اور والی ریاست حیدرآباد کے مشیر قانون کی حیثیت سے پندرہ سال پیشہ وکالت سے بھی وابستہ رہے۔ پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب نے سنہ ۱۹۵۲ء میں جامعۂ عثمانیہ سے ایم اے سیاسیات میں امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

۵/اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء کو خلیل صاحب ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ یہاں آکر وہ اردو کالج میں لیکچرار سیاسیات مقرر ہوئے اور ۳۸ سال تک درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ وہ ۱۸ سال تک وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کے پرنسپل رہے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ پروفیسر صاحب سنہ ۱۹۵۲ء سے سنہ ۱۹۹۰ء تک رئیس کلّیۂ قانون (Dean of Law) رہے اور جامعۂ کراچی میں سنہ ۱۹۹۰ء سے تاحال وہ سینئر ریسرچ ڈائریکٹر ہیں۔

پروفیسر محمد خلیل اللہ پندرہ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''دساتیر عالم''، ''قانون و دستوری''، ''دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان''، ''پاکستان کی خارجہ پالیسی''، ''تحریک پاکستان''، ''اساس پاکستان''، ''علم تمدن اور تجوید القرآن'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی بیشتر تصانیف جامعہ کراچی کے بی اے، ایم اے اور ایل ایل ایم کے نصاب میں شامل ہیں۔

پروفیسر صاحب کی ۴۲ سالہ تدریس و تحقیقی تجربے اور ان کی غیر معمولی خدمات اور اعلیٰ کارکردگی کے پیش نظر امریکن بائیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ (American Biographical Institute) نے انہیں F.A.B.I کا اعزاز دیا اور عالمی شخصیت قرار دیا اسی طرح برطانیہ کے انٹرنیشنل بائیوگرافیکل ایسوسی ایشن (International Biographical Association) نے بھی FIBA کا اعزاز دیا اور گولڈ میڈل سے نوازا۔

محمد رضا کاظمی، پروفیسر

محمد رضا کاظمی یکم نومبر سنہ ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد موسیٰ رضا کاظمی نے محمڈن عربک اسکول پٹنہ سے میٹرک کیا پھر جوٹ ٹیکنالوجی میں ڈپلوما کیا۔ کچھ عرصہ کلکتہ میں ملازمت کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے ڈنڈی، سکاٹ لینڈ چلے گئے اور وہاں سے واپس آ کر ان کا تقرر جوٹ کمیشن میں ہوگیا تھا۔ وہ حکومتِ ہند میں ٹیکسٹائل کمشنر، چیئرمین آل انڈیا بورڈ، چیئرمین آل انڈیا ہینڈلوم بورڈ وغیرہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کا آبائی وطن علی نگر پالی تھا جو ضلع گیا، صوبہ بہار میں واقع ہے۔ رضا صاحب کی ابتدائی تعلیم بمبئی میں ہوئی۔ جب یہ چار سال کے ہوئے تو انہیں ولا ٹریزا اسکول بمبئی میں داخل کرایا گیا۔ لیکن ان کے والد کو یہ تشویش ہوئی کہ بمبئی جیسے مغرب زدہ شہر میں ان کے بیٹے کی مذہبی تعلیم ناقص نہ رہ جائے اس لیے انہوں نے لکھنؤ سے حکیم عباس علی صاحب کو بلوایا جنہوں نے رضا کو ناظرہ قرآن اور اُردو کی تعلیم دینی شروع کی، ان کی لگن اور مہارت کے باوجود، اسکول کی وجہ سے یہ سلسلہ بارآور نہ ہوسکا۔ اس کے بعد رضا صاحب کلکتہ گئے پھر ڈھاکہ چلے گئے جہاں انہوں نے سنہ ۱۹۶۷ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ بی اے کرنے کے بعد کراچی آ گئے۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے تاریخ اسلام میں ایم اے اور سنہ ۱۹۹۶ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''تحریکِ آزادی میں لیاقت علی خاں کا کردار...... ایک تاریخی تخمینہ'' تھا۔ محمد رضا کاظمی کے اس مقالے کو سنہ ۱۹۹۷ء میں مرکز مطالعۂ پاکستان، جامعہ کراچی نے LIAQUAT ALI KHAN THE FREEDOM MOVEMENT کے عنوان سے شائع کیا۔

ذریعۂ معاش کے لیے انہوں درس و تدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا۔ محمد رضا کاظمی سنہ ۱۹۷۳ء سے سنہ ۲۰۰۰ تک عبداللہ کالج، سینٹ پیٹرک اور گورنمنٹ نیشنل کالج میں لیکچرار، اسسٹنٹ پروفیسر اور ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے۔

رضا صاحب کو ادبی ماحول ورثے میں ملا ہے۔ ان کے والد باضابطہ ادیب یا شاعر تو نہیں تھے لیکن

ان کے دو ایک نثری مضامین تیسری دہائی میں شائع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ والد کے نقشِ قدم پر چل کر کاظمی صاحب نے بھی اپنا مقام خود بنایا۔ وہ ایک کشادہ ذہن کے تنقید نگار ہیں۔ ان کی تنقید نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف نقاد و شاعر احمد ہمدانی صاحب لکھتے ہیں:

''پروفیسر محمد رضا کاظمی ادب سے سچا شغف رکھنے والے ذہین نقاد ہیں ادبی تنقید ان کے لئے تعلقات بڑھانے اور شہرت کمانے کا وسیلہ نہیں بلکہ ادبی مسائل پر ان کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ بالعموم ہمارے نقاد اپنے ہمعصر نقادوں اور اپنے سے کچھ پہلے نقادوں کی خوبیاں اجاگر کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں جو ان میں خود اعتمادی کی کمی کا مظہر کہا جا سکتا ہے۔ محمد رضا کاظمی کی تنقیدی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود اعتمادی کا شکار بالکل نہیں ہیں۔''

محمد رضا کاظمی نے بہت سے تنقیدی مضامین اور متعدد تنقیدی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) ''جدید اردو مرثیہ'' (جدید اُردو مرثیہ کا پہلا تنقیدی محاکمہ)

(۲) ''تابِ سخن'' (تنقید نگاروں، تنقیدی کتب اور تنقیدی مسائل پر مضامین)

(۳) ''نقوشِ جوش'' (جوشؔ ملیح آبادی کی فکر و فن اور شخصیت کے جائزے)

(۴) ''فکرِ جمیل'' (جدید ایڈیشن)

---••☆••---

محمد زبیر، الحاج

الحاج محمد زبیر سنہ ۱۹۰۶ء کو مارہرہ کی مردم خیز بستی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم محمد اصلح اور دادا حکیم ابو محمد صالح مشہور و معروف حکیم تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت زبیرؓ سے ملتا ہے۔ مسلم گھرانے کے رواج کے مطابق قرآن پاک کی تعلیم کے لیے انہیں مارہرہ کے ایک چھوٹے سے مکتب میں داخل کرایا گیا جو ''بڑی آپا کا مکتب'' کہلاتا تھا۔ قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں ماریسن ہائی اسکول میں داخل کیا گیا۔ یہ اسکول سر سیّد کے تعلیمی مقاصد کا ایک جز تھا جسے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے قائم کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ہی وجہ سے ایم۔اے۔او۔ کالج کے پرنسپل سر تھیوڈر ماریسن نے اس اسکول میں بڑی دلچسپی لی اور کئی بار وہ اس کا معائنہ کرنے آئے۔ چنانچہ اس اسکول کو ان ہی کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ اس اسکول میں نہایت لائق استاد مولانا اویس احمد، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ماسٹر عنایت حسین بھی شامل تھے۔ فارسی کی کتابیں آمد نامہ، کریما، مامقیما، بوستاں اور گلستاں انہیں مولانا اویس احمد صاحب نے پڑھائیں۔ اسی زمانے میں جب یہ زیرِ تعلیم تھے تو مہاتما گاندھی اور علی برادران (مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی) کی قیادت میں کانگریس اور خلافت تحریکات اور ترکِ موالات بڑے جوش و خروش سے جاری و ساری تھیں جس سے تمام تعلیمی نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ لیکن زبیر صاحب نے اپنے پڑھنے لکھنے کے ذوق کو اپنے علم دوست صاحبانِ تصنیف و تالیف سے پورا کیا۔

جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا اور چونکہ اپنے آبائی پیشہ فنِ طب سے بھی نابلد تھے تو انہیں ملازمت کرنے کا خیال آیا۔ اسی اثنا میں ان کے والد بھی شدید بیمار ہو گئے۔ چنانچہ ان کی والدہ نے انہیں علی گڑھ بھیج دیا جہاں ان کے چند عزیز رہتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں زبیر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ علوم و فنون کے اس مخزن میں مختلف مضامین کی کتابوں کے ساتھ ساتھ لائبریری سائنس کی کتابیں بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہیں۔ اس کے علاوہ لائبریری میں کام کرنے سے

سائنس کے متعدد شعبوں بالخصوص کٹلاگ سازی پر بڑا عبور حاصل ہوا-لائبریری میں انہوں نے مختلف عہدوں پر کام کیا-اسسٹنٹ لائبریرین کے فرائض انجام دینے کے علاوہ وہ قائم مقام لائبریرین بھی رہے-سنہ ۱۹۵۱ء میں جب لائبریری سائنس کی کلاسیں لائبریری کے زیرِ سایہ جاری ہوئیں تو انہوں نے معلّمی کے فرائض بھی انجام دیے-بیالیس سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں خدمات انجام دینے کے بعد وہ سنہ ۱۹۶۴ء میں ریٹائر ہوکر پاکستان آگئے-یہاں آنے کے بعد ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے عہد میں وہ کراچی یونیورسٹی لائبریری سے منسلک ہوگئے-اس کے بعد زبیر صاحب نے پانچ سال تک نیشنل کالج لائبریری میں خدمات انجام دیں اور اس منصب کے ساتھ ساتھ انہوں نے تدریسی خدمات بھی انجام دیں-الحاج محمد زبیر صاحب نے ان خدمات کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور یہ سلسلہ انہوں نے علی گڑھ ہی سے شروع کردیا تھا-ان کی ایک مایۂ ناز تصنیف ''اسلامی کتب خانے'' کا پہلا ایڈیشن علی گڑھ کے زمانے ہی میں شائع ہوگیا تھا-پاکستان آ کر اس کتاب میں انہوں نے مزید اضافہ کیا اور اس کا دوسرا ایڈیشن بڑے اہتمام کے ساتھ کراچی میں شائع کیا-دوسرے ایڈیشن کی تقریب اجراء کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم تھے-اس موقعے پر ڈاکٹر صاحب نے محمد زبیر صاحب کی ابتدائی زندگی کا بھی ذکر کیا جب وہ ان کے شاگرد تھے-اس کتاب کے علاوہ ان کی چھوٹی بڑی تقریباً پندرہ بیس کتابیں ہیں جو فنِ کتاب داری اور دیگر موضوعات پر لکھی گئی ہیں-

۳ر فروری سنہ ۱۹۹۲ء کو الحاج محمد زبیر اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے-سخی حسن قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں-ان کی تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں: (۱) شاہانِ مغلیہ کے کتب خانے اور ان کا نظام (۲) پریکٹیکل کٹلاگنگ (انگریزی) (۳) کتاب نمبر کیا ہے (۴) پُستک پروعیشکار (ہندی) (۵) آپ حج کس طرح کریں (۶) چند دن حجاز میں (۷) اسلامی کتب خانوں کی سیر (۸) اردو نثر کا تاریخی سفر (۹) اسلامی کتب خانے (۱۰) کٹلاگ سازی (۱۱) اسلامی کتب خانے اضافہ شدہ ایڈیشن (۱۲) قرآن کس طرح پڑھیں (۱۳) افاداتِ قرآنی (۱۴) علی گڑھ تحریک کے دوستون (۱۵) نبوت کی کرنیں ماہ و سال میں-انہوں نے ''کتابِ زیست'' کے عنوان سے آپ بیتی اور جگ بیتی بھی لکھی ہے-

---••☆••---

محمد سعید، مرزا پروفیسر

پروفیسر مرزا محمد سعید ۲ رجون ۱۸۸۶ء کو دلی میں پیدا ہوئے- سر سید احمد خاں سے ان کی عزیزداری تھی-ان کی والدہ سر سید احمد خاں کے چھوٹے بھائی سید محمد خاں کی نواسی تھیں-مشہور و معروف مورخ، ادیب اور محقق منشی ذکاءاللہ سے بھی قرابت داری ہوگئی تھی-مرزا محمد سعید خود بھی اعلیٰ پایہ کے محقق، نقاد اور ناول نویس تھے-''مقالات مرزا محمد سعید'' جو انجمن ترقی اردو پاکستان نے شایع کیا ہے اس میں ایک مضمون شاہد احمد دہلوی کا ہے جو انہوں نے مرزا صاحب بارے لکھا ہے-وہ لکھتے ہیں:

''پچاس ساٹھ سال پہلے دلی کے مسلمان شرفا میں انگریزی تعلیم کو اچھی نظروں نہیں دیکھا جاتا تھا-مگر سر سید نے مسلمانوں کے اِس غلط نظریے کی بہت کچھ اصلاح ردی تھی-اُسی زمانے میں دلی کے دو نوجوانوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علمی حلقوں میں نمود حاصل کی-ایک پروفیسر مشتاق احمد تھے اور دوسرے پروفیسر مرزا محمد سعید-مرزا صاحب نے اس صدی کے آغاز میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی-ان کے اُستادوں میں علامہ اقبال بھی تھے جن سے اُن کے مخلصانہ تعلقات آخر دم تک قائم رہے-انگریزی ادبیات میں ایم اے کی سند لینے کے بعد مرزا صاحب نے ۱۹۰۶-۱۹۰۷ء میں سال دو سال علی گڑھ میں پڑھایا اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں انگریزی کے پروفیسر ہوگئے-پنجاب کے بیشتر اعلیٰ عہدہ دار مرزا صاحب کے شاگرد تھے-پطرسؔ اور تاجؔ نے بھی مرزا صاحب سے اکتسابِ علم کیا-بعد میں پطرسؔ خود انگریزی کے پروفیسر ہوگئے تھے، مگر اپنی غیر معمولی قابلیت وذہانت کے باوجود مرزا صاحب کی علمیت کے آگے اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے تھے-میں نے بارہا پطرسؔ کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے دیکھا ہے-پطرسؔ کو میں نے کسی اور کا اتنا ادب واحترام کرتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ ویسرائے ہند کا بھی-''

مرزا محمد سعید کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا- ان کے کتب خانے میں ہر موضوع کی کتابیں موجود تھیں- درس و تدریس سے منسلک تھے اس لیے نئی سے نئی کتاب پڑھتے تھے- وہ فرماتے تھے "اگر میں اتنا مطالعہ نہ کروں تو ان انگریز پروفیسروں کے آگے کیسے ٹھہر سکتا ہوں" ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا واحد مشغلہ کتاب پڑھنا ہی تھا جو آخری دم تک جاری رہا- مرزا صاحب کی اہلیہ بیگم فاطمہ بھی ادیب اور مترجم تھیں- اُن کی تصانیف میں "حشیش" سر ہنری کے ناول کا اردو ترجمہ شامل ہے- بیگم فاطمہ کا انتقال ۱۹۶۰ء کو کراچی میں ہوا- مرزا صاحب جو کچھ بھی لکھتے تھے پیسے یا شہرت کے لیے نہیں لکھتے تھے- انہوں نے ایک ناول "یاسمین" لکھا تو اپنے ایک شاگرد پبلشر کو دیدیا جس کی انہوں نے کوئی اجرت نہیں لی- اس کے بعد ایک دوسرا ناول "خواب ہستی" لکھا تو اسے بھی کچھ لیے دیے بغیر چھپوا دیا- ایک معرکتہ الآرا کتاب "مذہب اور باطنیت" لکھی جو ان کے دوست پروفیسر تاجور نجیب آبادی لے گئے- یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی- مرزا صاحب کا یہی صرف ایک کارنامہ ہے- ملّا واحدی اپنی کتاب "ہمارے زمانے کی دلّی" میں لکھتے ہیں

"مرزا محمد سعید کا بھی یہی حال ہے- اُن کے ساتھ پروفیسری اور پرنسپلی کے علاوہ ایک قصہ اور لگا رہا- وہ اعلیٰ درجہ کے نقاد ہیں اور ایسے نقاد کہ انہیں اپنا لکھا پسند نہیں آتا- ورنہ مرزا سعید تو اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کر سکتے تھے- مرزا محمد سعید کتاب کے کیڑے ہیں- انگریزی دانوں میں اُن سے زیادہ مطالعہ کم لوگوں نے کیا ہے"

کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو مرزا صاحب اس کے مشیر مقرر ہوئے- ۱۹۵۹ء میں پاکستانی ادیبوں کا گلڈ بنا تو انہوں نے اس کے پہلے اجلاس کی صدارت کی- مرزا صاحب نے قیام پاکستان سے پہلے سیاست میں خاصا حصہ لیا- وہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور مسلم لیگ کونسل کے ممبر بھی منتخب ہوئے- مرزا صاحب معدے کے کمزور تھے- اس بیماری نے بے انتہا کمزور کر دیا تھا- آخر ۱۰ر جون ۱۹۶۲ء کو دنیائے فانی سے رشتہ توڑ کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے اور دنیائے علم و ادب اس صاحب کمال سے محروم ہوگئی- اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے-

---••☆••---

محمد صلاح الدین، مولانا

مشہور و معروف، اعلیٰ مقام صحافی مولانا محمد صلاح الدین ۵؍جنوری ۱۹۳۵ء کو میرٹھ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام محمد شہاب الدین تھا۔ابتدائی تعلیم میرٹھ، پیلی بھیت اور احمد آباد میں حاصل کی۔قیام پاکستان کے بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء میں اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔مولانا صاحب غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔پاکستان آ کر انہوں نے نوعمری میں بہت محنت و مشقت کی۔کراچی کی غریب بستی ''گولیمار'' میں ان کا قیام تھا۔ ذریعہ معاش کے لیے وہ اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے رہے۔اس سلسلے میں انہوں نے موٹر مکینک، ڈینٹر ویلڈنگ اور سینیٹری فٹنگ وغیرہ کے کام کیے اور سائیکل، گھڑی سازی کی دکان بھی چلائی۔ناسا عد حالات کے باوجود انہوں نے حصول علم کا سلسلہ کسی بھی حال میں منقطع نہیں ہونے دیا۔سنہ ۱۹۵۵ء میں انہوں اول درجے میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد انہوں نے بیک وقت ادیب عالم، انٹر اور سی ٹی کے امتحان پاس کیے۔سنہ ۱۹۶۰ء میں بی اے پاس کیا۔اپنی تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے اور پھر بی ایڈ کے امتحانات بھی پاس کر لیے۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد ابتدا میں انہوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔۱۹۶۲ء تک وہ گورنمنٹ ہائی اسکول کراچی میں پڑھاتے رہے اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں وہ گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت استاد مقرر ہو گئے اور ۱۹۶۹ء تک وہ اس ادارے سے وابستہ رہے اس کے ساتھ ۱۹۶۳ء سے روزنامہ ''حریت'' کراچی میں بھی نائب مدیر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا تھا۔مولانا صلاح الدین بڑے ذہین اور خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ان کی اعلیٰ کارکردگی کی بدولت انہیں جلد ہی نائٹ شفٹ کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔۱۹۶۹ء میں وہ ملتان چلے گئے اور روزنامہ ''جسارت'' ملتان میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔جب روزنامہ ''جسارت'' کراچی کے اجرا کی تیاریاں شروع ہوئیں تو مولانا صاحب کراچی واپس آ گئے۔یہاں پر وہ ابتدائی دو برس نیوز ایڈیٹر اور سنہ ۱۹۸۳ء اواخر میں ایڈیٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

صلاح الدین صاحب نے ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں قید و بند کی بڑی صعوبتیں برداشت کیں۔وہ

ادارے کی پالیسی پر سختی سے کاربند رہنے اور اعلیٰ صحافتی اصولوں کی پاسداری کے لیے مشہور تھے-انہوں نے اپنا اخبار حکومت کی پالیسی یا کسی شخصیت کی خوشامد یا کسی کی بے جا مخالفت کے لیے استعمال نہیں کیا -اسی زمانے میں جسارت اخبار کے پالیسی سازوں سے کچھ اختلاف ہوگیا جس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور روزنامہ ''جسارت'' سے علیحدگی اختیار کرلی-صلاح الدین صاحب کا نام بلاشبہ پاکستان خصوصاً کراچی کی صحافت کا ایک معتبر نام تھا-روزنامہ ''جسارت'' سے علیحدگی کے بعد بالآخر انہوں نے ۲۳ر مارچ ۱۹۸۴ء سے ہفت روزہ ''تکبیر'' جاری کیا-۴ر دسمبر سنہ ۱۹۹۴ء کی شام دفتر تکبیر کے باہر نامعلوم قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر شہادت کا منصب پایا-ان کی موت دنیائے صحافت کا بدترین سانحہ ہے-

صلاح الدین صاحب صحافت کے ساتھ سماجی خدمات بھی انجام دیتے رہے-انہوں نے ملیح منٹ بیت المال' پاکستان نیوز سوسائٹی (اے پی این ایس)' پریس ایڈوائزری کمیٹی وفاقی محتسب اعلیٰ اور متعدد اداروں میں بحیثیت ممبر کونسل خدمات انجام دیں-تعلیمی اداروں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے-ممالک غیر میں منعقد ہونے والے سیمینار میں بھی شریک ہوتے تھے-ان کی اعلیٰ خدمات کے صلے میں انہیں متعدد ایوارڈ سے نوازا گیا-۱۹۷۴ء میں پریس کی آزادی کے لیے قربانی دینے پر کولمبیا یونیورسٹی نیویارک نے اعزاز دیا-۱۹۸۰ء میں عمر شیخ فاؤنڈیشن لندن نے گولڈ میڈل دیا-

صلاح الدین صاحب نے متعدد کتابیں بھی لکھیں ہیں جن میں ''بنیادی حقوق'' ان کی اہم کتاب ہے-اس کتاب کا پیش لفظ مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تحریر کیا-مولانا مودودی فرماتے ہیں ''محمد صلاح الدین صاحب نے اپنی اس کتاب میں بنیادی حقوق کے مسئلے پر اسلامی نقطہ نظر سے اس قدر جامع، مفصل اور محققانہ بحث کی ہے کہ غالباً اس سے پہلے کسی نے ایسی بحث نہیں کی-'' صلاح الدین صاحب کی دوسری تصانیف میں ''انقلاب ایران''، ''کلمہ طیبہ''، ''جمہوریت''، ''کیا کھویا کیا پایا''، ''فریب اور حقیقت''، ''عورت کی سربراہی'' اور ''پیپلز پارٹی کے مقاصد اور حکمت عملی''، ''خاندانی منصوبہ بندی یا اقدام خودکشی''، ''پاکستان ماضی حال مستقبل'' شامل ہیں-

---••☆••---

مجید ملک، کرنل

دنیا ایک سرائے ہے جہاں ملک عدم کے مسافر آتے ہیں اور کچھ دن قیام کرتے اور پھر تازہ دم ہوکر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہی ازل سے ہو رہا ہے اور یہی ابد تک ہوتا رہے گا۔ لیکن بعض جانے والے اپنے نقوش ایسے گہرے چھوڑ جاتے ہیں کہ انہیں نظرانداز کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ کرنل مجید ملک کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوئے اور سطرِ نور کھینچتے ہوئے ابدیت کی گود میں روپوش ہو گئے۔ ایسے لوگ قوم کا ناقابلِ فراموش سرمایہ ہوتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم کم از کم اپنے تذکروں اور یادوں سے ان کو زندہ رکھیں اور ان کی علمی اور شخصی محاسن سے استفادہ کریں۔

کرنل مجید ملک ۱۹۰۲ء کو لاہور کے ایک مہذب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ملک دین محمد علامہ اقبالؔ کے دوست اور علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھے جن کا مسلمان رؤسا اور والیان ریاست میں بھی بڑا اثر و رسوخ تھا۔ مجید ملک کی تعلیم و تربیت لاہور ہی میں ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کر کے وہ علی گڑھ چلے گئے اور مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں انہوں نے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور اخبار ''مسلم آؤٹ لک'' لاہور کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے۔ اُس زمانے میں "Muslim Outlook"Lahore مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے والا انگریزی کا واحد اخبار ہی تھا۔ چند برسوں کے بعد وہ اس اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ جب یہ اخبار بند ہو گیا تو وہ یونائیٹڈ پریس آف انڈیا میں شامل ہو کر بمبئی چلے گئے جہاں انہوں نے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں کام کیا۔ بمبئی کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آئی جس کے سبب ان کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ خرابیٔ صحت کی بنا پر اس ملازمت کو خیر آباد کہا۔ کرنل مجید ملک سیر و شکار کے شوقین تھے۔ اپنے تسکینِ ذوق کے لیے انہوں

نے راجپوتانہ کی ریاست ٹونک کی ملازمت اختیار کرلی۔اس ملازمت کاانتظام ان کے والد کے اثرورسوخ سے ہوا۔

چند سال بعد جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو ۱۹۴۰ء میں وہ افواج ہند سے وابستہ ہوگئے اور جنرل ہیڈکوارٹرز دہلی میں بحیثیت اسٹاف آفیسر مقرر ہوئے۔اتنے اہم عہدے پر فائز ہونے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ان کی اعلیٰ کارکردگی' قابلیت اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے جلد ہی انہیں کرنل کے عہدے پر ترقی دے کر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز میں ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔فوج کا صدر دفتر دہلی میں تھا۔کچھ عرصہ وہ قاہرہ میں بھی تعینات رہے لیکن زیادہ عرصہ دہلی میں گزارا جہاں وہ بہت خوش تھے۔اِس عہدے پر وہ ۱۹۴۶ء تک کام کرتے رہے۔

اِسی زمانے میں جب سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں تو انہوں نے اپنی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور آل انڈیا مسلم لیگ میں بحیثیت پبلک ریلیشنز آفیسر کام کرنے لگے۔پاکستان سے قبل تاریخ سازوں میں وہ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کے نہایت قریب تھے۔پاکستان بن جانے کے بعد شہیدِ ملّت لیاقت علی خاں نے کرنل مجید ملک کو حکومت پاکستان میں ایک خصوصی عہدے پر مقرر کیا اور انہیں لاہور میں مامور کیا جہاں شہیدِ ملّت نے عارضی طور پر اپنا صدر دفتر قائم کیا تھا۔۱۹۵۰ء میں جب وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خاں ٹرومین کی دعوت پر ان سے ملنے گئے تو مجید ملک ان کے ساتھ تھے۔جب حسین شہید سہروردی وزیراعظم ہوئے تو ان کے ساتھ بھی جاپان فلپائن، ملیشیا، سنگاپور، برطانیہ اور امریکہ کے دورے پر گئے۔ملک صاحب آزادی ہند کے لیے کی جانے والی جدوجہد کے عینی شاہد ہی نہیں تھے بلکہ تحریک پاکستان میں دل وجان سے شامل رہنے والے عظیم شخص تھے۔قائداعظم محمد علی جناحؒ اور شہید ملّت لیاقت علی خاں ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔

۱۹۵۹ء میں مجید ملک صاحب جب سرکاری ملازمت (پرنسپل انفارمیشن آفیسر) سے ریٹائر ہوئے تو کولمبو پلان کے تحت پرنسپل انفارمیشن آفیسر ہوکر سری لنکا چلے گئے۔ان کا صدر دفتر کولمبو میں تھا۔لیکن کرنل صاحب نے دفتری کاموں کے سلسلے میں جنوب اور جنوبی ایشیا کے تقریباً ہر ملک کا دورہ کیا۔۱۹۶۲ء میں وہ پاکستان واپس آئے تو اسی سال انہیں پاکستان کے قائم کردہ اُردو ڈویلپمنٹ بورڈ لاہور کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ملک صاحب نے آخری خدمت پاکستان ٹائمز اور امروز گروپ' نیز روزنامہ مشرق کے

مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں-

ملک صاحب صحافت سے قبل بیسوی صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں ادبی دنیا میں ایک شاعر اور ڈرامانگاری کی حیثیت سے متعارف ہوئے تھے-ان کا شمار پایہ کے اہل قلم میں ہونے لگا تھا-یہ زمانہ ملک صاحب کے عروج کا زمانہ تھا-انہوں نے رسالہ ''کارواں'' کا دوسرا اور آخری شمارہ مرتّب کیا-اس رسالہ کے اگرچہ صرف دو شمارے شائع ہوئے لیکن ایسے شمارے اُردو ادب کو پھر نصیب نہیں ہوئے-ملک صاحب سرکاری ملازمتوں سے پہلے دس بارہ سال تک ادبی دنیا میں فعال رہے-ان کی نظمیں اور نثری تحریں ''نیرنگِ خیال'' اور دوسرے رسالوں میں چھپا کرتی تھیں-ان کا بہت سارکارڈ سنہ ۴۷ء کے فسادات کی نذر ہوگیا-''خرمن جاں'' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مجید ملک کے ڈراموں کا ایک مجموعہ ''جواب'' سنہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا جس کا سرورق چغتائی صاحب نے بنایا تھا-انہوں نے اس عرصے میں جو کچھ بھی لکھا وہ اسی مختصر دور کی یادگار ہے-اس کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں ایسے محو ہوئے کہ ادب سے صرف مطالعے کی حد تک تعلق باقی رہ گیا تھا-لیکن وہ اپنے مختصر ادبی دور میں بھی بعض ایسی نگارشات اُردو ادب کو دے گئے کہ انہیں ادبی دنیا میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا-اُن کا یہ گیت جسے اب کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے ذرا ملاحظہ کیجیے:

مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں
مگر اے حسینۂ نازنیں

تو کہے یہ مجھ سے اگر کبھی — ہمیں لادو لعل و گہر کبھی
تو میں دُور دُور کی سوچ لوں — میں فلک کے تارے بھی نوچ لوں

یہ ثبوتِ شوقِ کمال دوں
ترے پاؤں پر اُنہیں ڈال دوں!

ادارۂ یادگارِ غالب کراچی نے ایک کتاب ''خرمن جاں'' شائع کی ہے جس میں مجید ملک کی ادبی زندگی، سرکاری ملازمتوں کا ذکر اور تحریکِ آزادی میں ان کی نمایاں خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے-۲۲راکتوبر ۱۹۷۶ء کو تحریکِ آزادی کا یہ خاموش مجاہد دارِ فانی کا سفر طے کر کے ملک عدم رخصت ہوگیا-

---••☆••---

مختار اجمیری

اصل نام سید مختار علی، تخلص مختار اور قلمی نام مختار اجمیری ہے- سید باقر علی کے فرزند ہیں- ۱۸/جنوری سنہ ۱۹۳۷ء کو اجمیر شریف میں پیدا ہوئے- اِن کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی- پہلے انہوں نے قرآن پاک پڑھا پھر حدیث اور فقہ کی مختصر تعلیم حاصل کی- اس کے بعد سنہ ۱۹۴۲ء میں معینہ ہائی اسکول میں داخلہ لیا- تعلیم کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے- پاکستان آ کر انہوں نے اُردو فاضل کیا اور علم عروض، علم بدیع اور علمِ جمل میں دست گاہ حاصل کی- وہ کراچی یونیورسٹی کے (بیرونی) طالب علم ہیں- سولہ سال سے مختار اجمیری انجمن ترقی اُردو پاکستان (کراچی) سے منسلک ہیں-

مختار صاحب کے والد سید باقر علی B.B.&C.I.R میں لوکو شاپ میں ملازم تھے- تقسیم کے وقت انہوں نے پاکستان Opt کیا- وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ سنہ ۱۹۴۷ء کو براستہ کھوکراپار حیدر آباد (سندھ) آ گئے- اس کے بعد ان کے والد لاہور میں ریلوے میں ملازم ہو گئے اور اس طرح یہ خاندان لاہور منتقل ہو گیا- کچھ عرصے کے بعد مختار صاحب اپنے بڑے بھائی کے پاس کراچی آ گئے- یہاں اُن کے بھائی منسٹری آف لا سے منسلک تھے-

چوں کہ علمی ادبی گھرانے سے تعلق تھا اس لیے بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوئی- اسی زمانے میں انہوں نے شعر و سخن میں سید محمود علی عرشی سے تلمذ حاصل کیا- کراچی کے ادبی ماحول نے ان کے ذوقِ سخن کو مزید جلا بخشی- یہاں پر انہوں نے مولانا محمد یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی شاعر آستانہ دہلی سے باقاعدہ اصلاح لینا شروع کر دیا- ان کی اب تک دو تصانیف (۱) چراغوں کا حرم (نعتوں کا مجموعہ) اور یہ شہر مرا شہر شائع ہو چکی ہیں- اپنے مجموعے "یہ شہر مرا شہر" کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:
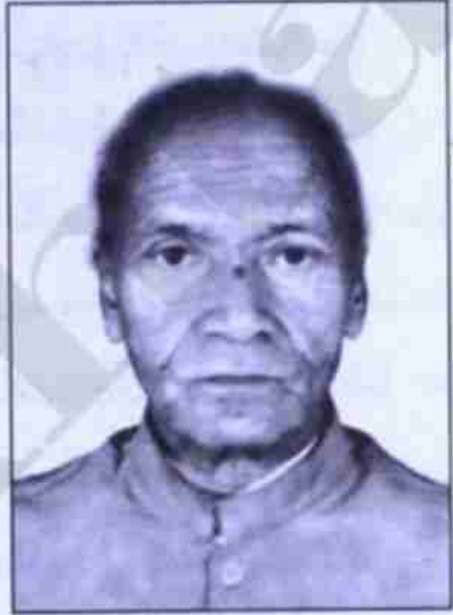
"قارئین محترم

بیسوی صدی کے آخری دس برسوں کے درمیانی عرصے میں شہری حالات کا جو تقاضا رہا، اُس کے پیش نظر اپنی کہی ہوئی منظومات (جن میں بہت سے کراچی کے موقر اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں) کو میں یکجا کرتے ہوئے،

''یہ شہر مرا شہر''

کے نام سے کتابی شکل دی ہے۔

لہٰذا گذارش ہے کہ اِس کتاب میں شامل تمام منظومات کو اُسی تناظر میں دیکھا اور پڑھا جائے''

اگر مندرجہ بالا سطریں مختار صاحب نہ بھی لکھتے تو اُن کا کلام قارئین حضرات اُسی تناظر میں دیکھتے جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں بیسوی صدی کے آخری دس برسوں کے درمیانی عرصے میں ہونے والی اُس قتل و غارت گری کی عبرت ناک تصویر پیش کی ہے جس سے ہر شہری کی آنکھ پُر آشوب تھی۔ اس شہر کے باسی جو ہمیشہ سے باوجود اختلاف مذہب و ملت پیار و محبت سے رہتے تھے اُس دور کے زہریلے اثرات سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے۔ شہر کے اُن حالات کا جو تقاضا تھا اُسے پورا کرنے میں مختار اجمیری نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اُن کا کلام ملاحظہ کیجیے:

ان قاتل کے حوالے ہے بچا تن دیکھو
ماﺅں کا شب و روز لٹے دھن دیکھو

اپنے قدموں سے گئے اوروں کے کاندھے آئے
اب تو دیکھا نہیں جاتا ہے یہ درپن دیکھو

بستیاں شہرِ خموشاں میں بسی جاتی ہیں
خوگرِ امن و اماں مسکن و مامن دیکھو

زمیں پر لہو، آسماں پر شفق، ہے
یہاں بھی قلق، ہے، وہاں بھی قلق، ہے

شروع کربلا کی زمیں سے ہوا تھا
نہ جانے ابھی اور کتنا سبق، ہے

قدم قدم پر جال بچھے ہیں نفرت کے
الفت تو بے جان ہوئی ہے توبہ ہے

رونقیں شہرِ خموشاں میں کیوں دفن ہوئیں
بستی کیا شمشان ہوئی ہے توبہ ہے

ان اشعار میں قارئینِ گرامی
نہیں شاعری غم کی تاریکیاں ہیں

مگر ذہن میں یہ بھی ملحوظ رکھیے
کہ ان میں چھپی فن کی باریکیاں ہیں

---••☆••---

مسلم شمیم

اصل نام محمد مسلم اور ادبی دنیا میں مسلم شمیم کے نام سے مشہور ہیں۔ مسلم شمیم ۳ر جنوری ۱۹۳۹ء کو ولی پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں پٹنہ سے تقریباً چوبیس میل کے فاصلے پر تھا۔ مسلم شمیم کہتے ہیں کہ اس گاؤں میں مسلمانوں کے دو ہی گھر تھے جن میں ایک ان کے والد کا اور دوسرا گھر ان کے والد کے ماموں کا تھا۔ مسلم شمیم کے والد محمد ناظر حسین ایک اوسط درجے کی زمیندار تھے اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ انہیں مذہب سے بڑا لگاؤ تھا۔ قرآن پاک انہوں نے قریب کے گاؤں میں ایک مہاوت محمد ابراہیم سے پڑھا۔ اس مہاوت کو ایک ہندو زمیندار نے اپنے ہاتھی کی دیکھ بھال کے لیے ملازم رکھا تھا۔ محمد ناظر حسین خود تو تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن انہیں اپنے بیٹے مسلم شمیم کو تعلیم دلانے کا بے حد خیال رہتا تھا۔ بیٹے کی تعلیم کے لیے وہ اپنے گاؤں کے برہمن پنڈت' جو ان کا بڑا ہمدرد تھا' سے بھی مشورہ کرتے رہتے تھے۔ اور پھر بیٹے کی تعلیم کی ابتدا بھی انہی پنڈت جی سے ہوئی۔ مسلم شمیم کہتے ہیں کہ ان کے گاؤں میں ہندو مسلم سب بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے اور آپس میں کسی قسم کی کوئی چپقلش نہیں تھی۔

پنڈت جی نے مسلم شمیم کو اس حد تک پڑھا دیا تھا کہ پڑوس کے گاؤں کے اسکول میں ان کا داخلہ براہ راست دوسری کلاس میں ہوگیا۔ اس وقت مسلم شمیم کی عمر چھ سال تھی۔ اگلے سال سنہ ۱۹۴۶ء میں' جب وہ چوتھی کلاس میں پڑھ رہے تھے' ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ لیکن ان کے گاؤں کے ہندوؤں نے ان کے دونوں گھر کے افراد کو اپنے گھروں' یہاں تک کہ اپنی عبادت گاہوں میں رکھ کر بڑا تحفظ دیا۔ پھر حالات اس قدر خراب ہوگئے کہ ایک دن ان لوگوں کو اپنے بسے بسائے گھروں کو چھوڑنا پڑا۔ گھر بار چھوڑنے پر گاؤں کے سارے ہندو بھی بڑے افسردہ اور تنگ نظر لوگوں کی انسان دشمنی پر شرمسار تھے۔

اپنے آبائی گھروں سے نکلنے کے بعد دونوں گھروں کا یہ قافلہ دو فوجیوں کی نگرانی میں خانہ بدوشوں

کی طرح مسوڑھی پہنچا اور پھر انہیں شام کی ٹرین کے ذریعے پٹنہ سے آگے مغربی بنگال کے کسی حصے میں ایک پناہ گزینوں کے کیمپ پہنچا دیا- یہاں پر حکومت کی طرف سے ان کی کچھ تھوڑی بہت امداد بھی کی گئی- بعد میں اس کیمپ کو بند کر کے سارے پناہ گزینوں کو ہگلی کے قریب بنڈیل کیمپ میں منتقل کردیا- جب یہ کیمپ بند ہوگیا تو یہ لوگ ہگلی شہر میں کرائے کا ایک چھوٹا سا مکان لے کر رہنے لگے- بچا کھچا سرمایہ جو یہ گاؤں سے لائے تھے اُسی پر گزر اوقات کرنے لگے- بدترین معاشی حالات کے سبب جب نوبت فاقوں تک آ پہنچی تو مسلم شمیم اور ان کے چھوٹے بھائی سڑکوں پر کھڑے ہو کر قلم، پینسل، غبارے اور دوسری چھوٹی موٹی اشیا فروخت کرتے رہے- ہگلی کی آب و ہوا مسلم شمیم کی والدہ کو راس نہیں آئی اور وہ آئے دن بیمار رہنے لگیں- چنانچہ ان لوگوں نے واپس اپنے گاؤں جانا چاہا لیکن حالات نے قطعی اجازت نہیں دی- لہذا یہ لوگ پٹنہ منتقل ہو گئے جہاں محلہ لودی کٹرہ میں مکان لے کر رہنے لگے- پھر ان کے والد نے اپنے گاؤں کا گھر اور زمینیں فروخت کیں- اس سلسلے میں گاؤں کے ہندوؤں نے ان کی بھرپور مدد کی اور ان کی غیر موجودگی میں ان کی جائداد کی دیکھ بھال بھی گاؤں کے یہی لوگ کرتے رہے-

پٹنہ میں معاشی حالات کمزور ہونے کے سبب مسلم شمیم کو کسی اسکول میں داخلہ تو میسر نہیں آسکا البتہ ایک اکادمی میں جانے کا موقعہ مل گیا- یہ اکادمی، جو حمید منزل کے نام سے مشہور تھی، ایک معروف شاعر شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد حمیدؔ عظیم آبادی کا مکان تھا- یہاں حمیدؔ تنہا رہتے تھے- ان کے اہل و عیال پاکستان منتقل ہو گئے تو انہوں نے اس مکان میں یہ اکادمی قائم کر کے نچلے درجے کی طالبات وطلبا کو پڑھاتے اور اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے- اس اکادمی کے ماحول میں اٹھنے بیٹھنے سے مسلم شمیم کو بھی شعر وادب سے لگاؤ پیدا ہوگیا- ۱۹۵۲ء میں حمیدؔ عظیم آبادی کے رہ نمائی میں مسلم شمیم نے میٹرک پاس کیا اور تعلیم کا سلسلہ جو منقطع ہوگیا تھا، پھر بحال ہوگیا- اس کے بعد پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے آنرز پاس کر کے پاکستان منتقل ہو گئے اور سندھ میں رہائش اختیار کی-

پاکستان آنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (سیاسیات) کیا- بعدازاں انہوں نے سندھ یونیورسٹی سے ۱۹۶۷ء میں ایم اے (اُردو ادبیات) اور ۱۹۷۳ء میں ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے- ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے لاڑکانہ کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے پڑھایا

اور پھر کراچی میں بحیثیت جنرل منیجر سویت پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں سنہ ۱۹۷۸ء تک کام کیا۔اس کے بعد انہوں نے وکالت شروع کی جو ہنوز جاری ہے۔

مسلم شمیم کو شعروادب سے لگاؤ حمید منزل میں منعقد ہونے والی شعری نشستوں اور حمید عظیم آبادی کی صحبت میں رہ کر ہوا۔حمید عظیم آبادی کو وہ اپنا استاد بھی کہتے ہیں۔مسلم شمیم' کشادہ ذہن' انسان دوست اور روشن خیال شخصیت کے مالک ہیں۔وہ اچھے نقاد' تذکرہ نگار اور ایک خوبصورت شاعر بھی ہیں۔ان کی تصانیف میں مجموعۂ کلام "امکان"' "آدرش" (مختلف شخصیات کے تذکرے)، اور "تناظر" (تنقید نگاری) شامل ہیں۔مسلم شمیم کا کلام ملاحظہ کیجیے۔

کیفیتِ شکستِ دلِ زار کچھ کہو ۔۔۔ سونی ہے آج انجمن یار کچھ کہو
اے اہلِ درد جذب کرے گی زمینِ دل ۔۔۔ کب تک یہ خونِ دیدۂ بیدار کچھ کہو
اس بار فصلِ گل کی عجب آن بان ہے ۔۔۔ چھایا ہوا ہے ابر شرربار کچھ کہو
تاریکیوں میں ڈوب گیا روشنی کا شہر ۔۔۔ ناپید پھر ہیں صبح کے آثار کچھ کہو
حرص و ہوس کی جیت ہوئی زندگی کی ہار ۔۔۔ پھر نفرتوں کا گرم ہے بازار کچھ کہو
یہ صبح آرزو ہے کہ شام غمِ فراق ۔۔۔ دام فریب شب کے گرفتار کچھ کہو
لب خشک ہیں شمیم مگر بیخودی کی بات ۔۔۔ یارانِ میکدہ کا ہے اصرار کچھ کہو

لوٹ آئی ہے نظر بارہا ایوانوں سے ۔۔۔ کتنی مانوس ہے اجڑے ہوئے کاشانوں سے
ان کو گمراہی احساس کا غم کیا ہوگا ۔۔۔ طالبِ نورِ سحر ہیں جو شبستانوں سے
آج کچھ اہلِ ہوس بھی ترا غم رکھتے ہیں ۔۔۔ ہم نے یہ بات سنی ہے ترے دیوانوں سے
زیست آرائشِ زندان و سلاسل ہے ہنوز ۔۔۔ کوئی یہ تلخ حقیقت کہے فرزانوں سے
آج بھی قتل گہہِ حسن میں قائم ہے شمیم ۔۔۔ عظمتِ جنسِ وفا چاک گریبانوں سے

---••☆••---

مسلمؔ عظیم آبادی، پروفیسر

محمد مسلم نام تخلص مسلمؔ اور قلمی نام مسلم عظیم آبادی تھا۔ ۱۸۸۸ء میں محلہ صادق پور، پٹنہ کے ایک نہایت ذی علم، متمول اور ممتاز اہلحدیث گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد مولانا عنایت علی کے فرزند تھے۔ مولانا عنایت علی، مولانا ولایت علی کے حقیقی بھائی تھے جو حضرت سید احمد بریلوی کے خلفاؤں میں تھے۔ وہ شمس العلما محمد حسن بانی محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی کے والد ماجد تھے۔ پروفیسر مسلم کے خاندان کے متعدد افراد نے صرف تبلیغ دین اور رشد و ہدایت کے لیے اپنا مال و دولت اور اپنی ساری زندگی وقف نہیں کر دی تھی بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں بھی یہ خاندان معتوب رہا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے سوانحی حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہمارا خاندان انگریزی حکومت سے ہمیشہ بغاوت کے الزام میں معتوب رہا اور ہمارے بزرگ اس الزام پر حبس دوام کا شکار ہوئے۔ انگریزوں کے مشہور معتوب باغیوں میں میرے پردادا مولانا عنایت علی بھی بہت نمایاں رہے۔ اس جرم کی سزا میں ہماری جائدادیں ضبط کی گئیں اور ہمارے بزرگوں کو قید و بند کی سزائیں دی گئیں۔ میرے دادا پردادا سرحد کی مہاجرت سے کبھی وطن واپس نہ آئے۔ والد ماجد مولوی محمد یوشع بھاگ کر عظیم آباد آ گئے مگر جاسوسوں کے تعاقب اور تھانے میں ہر ہفتہ حاضر ہونے کی پابندیوں سے تنگ آ کر شہر چھوڑ دیا اور چار سال کی عمر کے بعد میں نے پھر ان کی صورت نہ دیکھی۔''

پروفیسر مسلم نے عربی فارسی کی تعلیم مولانا عبدالسلام اور مولانا اشرف علی سے حاصل کی۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول سے میٹرک پاس کر کے بی این کالج سے بی اے اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اور ایم او ایل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ یہاں پر وہ انگریزوں کو اُردو فارسی بھی پڑھاتے تھے۔ ان کی صحبت میں انہوں نے مے نوشی بھی سیکھی، اچھی انگریزی سیکھی اور انگریزی شاعری سے انہیں دلچسپی بھی ہوئی۔ ان
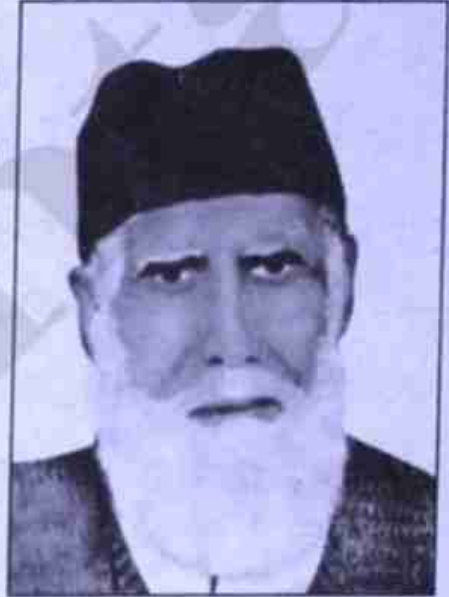
کی دو نظمیں انگریزی نظموں کا آزاد ترجمہ ہیں-پروفیسر مسلم کی شخصیت میں روایات سے بغاوت‘قدامت سے انحراف‘پرانی روش سے بیزاری اور جدت پسندی کے عناصر کی حیثیت سے امتیازی رہا ہے-

تعلیم سے فارغ ہوئے تو ان کے ایک عزیز محمد سمتی نے جو جامعہ ملیہ علی گڑھ میں لائبریرین تھے‘ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے کہہ کر انہیں علی گڑھ بلا لیا-اور شعبۂ تصنیف و ترجمہ میں جگہ دلوادی-چند دنوں میں ان کا ایک بیٹا جو بہت ذہین تھا‘ سل کے مرض میں مبتلا ہو گیا-مسلم صاحب اپنے اہلِ خانہ کو ساتھ لے کر پٹنہ چلے گئے جہاں ان کے بیٹے کا انتقال ہو گیا-اس کے بعد سنہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۵۵ء تک وہ سینٹ کولمباز کالج ہزاری باغ‘ بہار میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور پھر یہیں سے مدّت ملازمت پوری ہونے کے بعد ریٹائر ہوئے-

مسلم عظیم آبادی کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا-ان کا شمار حضرت شادؔ عظیم آبادی کے ممتاز شاگردوں میں کیا جاتا ہے-شادؔ عظیم آباد کے منتخب کلام کی اشاعت میں جسے جناب قاضی عبدالودود نے مرتب کیا تھا پروفیسر مسلم نے بھی ہاتھ بٹایا تھا-جناب شادؔ نے اپنی سوانح حیات کی تکمیل کے لیے مسلم عظیم آبادی ہی کا انتخاب کیا تھا-ان باتوں کا تفصیلی ذکر ’’شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی‘‘ میں موجود ہے جسے پروفیسر مسلم نے مرتب کر کے انجمن ترقی اُردو علی گڑھ سے ۱۹۶۱ء میں شائع کرایا تھا-

مسلم عظیم آبادی نے اپنی ساری زندگی ادبی خدمات اور درس و تدریس میں گزاری-اُردو ادب کی کوئی صنف ان کی تصانیف سے خالی نہیں ہے-ان کی اکثر علمی کتابیں ہندوستان میں عرصہ دراز تک نصاب میں بھی داخل رہیں ہیں-’’سلیقۂ تحریر‘‘(مبتدیوں کے لیے) اس کتاب پر ’الہلال‘ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تبصرہ لکھا تھا-یہ ایک عرصے تک بہار اور یوپی کے اسکولوں میں داخل نصاب رہی-’’پارسی علوم اور اسلام‘‘ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا-انہوں نے معتقدات عجم پر کئی تحقیقاتی مقالے اور دوسرے متعدد مقالے لکھے جو ’ندیم‘ ’بہارؔ‘ ’ساقی‘ دہلی‘ الناظر و نگار لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے-ان کا پہلا افسانہ ’’محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش‘‘ سنہ ۱۹۱۳ء میں ’’ الناظر لکھنؤ‘‘ میں چھپا تھا-

تقسیم کے بعد وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی-۵ر فروری ۱۹۷۷ء

محمد مسلم دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کے کلام کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں' ملاحظہ کیجیے ۔

خدا نایاب' بُت کمیاب' دَورِ خود پرستی ہے
یہ توحید بازارِ جہاں میں آج سستی ہے

الٰہی خیر بازارِ وفا کے سرفروشوں کی
دلاسا دے رہا ہے دل' خرد آوازہ کستی ہے

سیاست کی نسیم اب صرصرِ صحرا سے بدتر ہے
اُگاتی ہے یہ خار و خس کو' غنچوں کو جھلستی ہے

زمانہ پر ہے جن کا اقتدار ایک ان کی دنیا ہے
نہیں آپ اپنے اُوپر اختیار' ایک اپنی دنیا ہے

ہے پستی ہیچ ہونا آپ اپنی آنکھ میں مسلم
جو سچ پوچھو تو دنیا میں بلندی ہے نہ پستی ہے

زباں گو کٹ چکی' فریادِ پنہانی نہیں جاتی
نہیں جاتی، دلِ مضطر کی طغیانی نہیں جاتی

ہوئی صبح اور پھرتی ہے وہی تصویر آنکھوں میں
دہن سے لذتِ جامِ شبستانی نہیں جاتی

ہے اک اک سانس نغمہ بوستاں ہو یا بیاباں ہو
شجر ہو یا قفس' میری غزل خوانی نہیں جاتی

جگر کے ٹکڑے چپے چپے میں مدفون ہیں مسلم
نہیں جاتی، چمن کی مرثیہ خوانی نہیں جاتی

رونق رہی ہمیں سے تری بزمِ ناز میں
اٹھے بھی ہم تو بن کے تری داستاں رہے

مسلم! قفس میں جو چلے لاچار کیا کرے
ہے نغمہ زن' بہار رہے یا خزاں رہے

مجھے ہر داغ خونِ آرزو کا دل سے دھونے دو
مری تسکیں اگر منظور ہے جی بھر کے رونے دو

ہیں ناخن عاجز اب عقدہ کشائی سے تو ہونے دو
میں دُرِّ اشک پلکوں میں پروتا ہوں پرونے دو

مرے تخمِ عمل کشتِ ہوس میں ہو گئے ضائع
فقط اشکوں کے دانے رہ گئے ہیں ان کو بونے دو

میں بارِ زندگی ڈھوڈھو کے دن بھر تھک گیا مسلم
ڈھلا دن' شام آئی' چین سے اب مجھ کو سونے دو

---••☆••---

مشرف احمد، ڈاکٹر

ڈاکٹر مشرف احمد صاحب قیام پاکستان سے چند برس قبل انبالہ ڈویژن کی ایک تحصیل کھڑر میں پیدا ہوئے۔ سکھوں کے اس گاؤں کے نزدیک ہی حضرت مجدد الف ثانی کا گاؤں سرہند بستی آباد ہے۔ ان کے والد مولوی سید محمد عبدالرحیم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور مولانا حسین احمد مدنی کے مرید تھے۔ مشرف صاحب کے دادا قاری عبدالرحمٰن تھے جو مولانا رائے پوری کی ہدایت پر کھڑر گاؤں میں تبلیغ و خدمت دین کے لیے آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے بزرگوں کا اصل وطن پانی پت (ضلع کرنال) ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جبراً ترک وطن کر کے ان کا خاندان ابتدا میں لاہور آیا اور بعدازاں بہاول پور ریاست میں آباد ہوا، جہاں پر مشرف صاحب کے والد درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔

ڈاکٹر مشرف احمد کی ابتدائی تعلیم مسجد میں ہوئی پھر پرائمری اسکول، بھابھڑان' صادق ڈین ہائی اسکول بہاول پور اور صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں ہوئی۔ اس کے بعد رضا علی کالج سے بی اے، جامعہ کراچی سے ایم اے (اردو) اور پی ایچ ڈی کے امتحانات پاس کیے۔ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع ''اردو انشائیے کی روایت اور میر ناصر علی'' تھا۔ یہ مقالہ ڈاکٹر صاحب نے ممتاز دانش ور اور ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی نگرانی و رہنمائی میں لکھا۔ مقالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس مقالے میں اردو ادب میں انشائیہ نگاری کی روایت کا سراغ لگایا گیا ہے۔ اور میر ناصر علی کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ان کی ابتدائی تحریریں ہفت روزہ ''زمزم'' اور ہفت روزہ ''مدینہ'' بہاول پور میں شائع ہوئیں۔ اور پہلا افسانہ ایس ای کالج بہاول پور کے مجلّے ''نخلستان'' میں ''چناروں کے سائے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کا پس منظر کشمیر ہے۔ دو یک بابی ڈرامے کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ راوی میں، جو رفیق عزیز کی ادارت میں نکلتا تھا، شائع ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کا پہلا افسانہ سنہ ۱۹۶۸ء میں ماہ نامہ ''افکار'' میں ''ایک ویران گھر کی داستان'' کے

عنوان سے شائع ہوا- یہ ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے ''جب شہر نہیں بولتے'' میں شامل ہے- اس کے بعد نیا دور، سیپ، اوراق اور ماہِ نو ادر سہ ماہی ارمغان میں کہانیاں شائع ہوئیں- ڈاکٹر مشرف احمد کی کہانیوں کے تحریر کیے جانے کا زمانہ وہ ہے جب علامت کے نام پر مبہم اور بھونڈی انشاپردازی کا رجحان نمایاں تھا- مشرف احمد کی سلجھی ہوئی، معانی ومفہوم سے آراستہ اور سادہ و پرکار نثر کو دیکھتے ہوئے پروفیسر جمیل اختر خاں نے ان کی کہانیوں کو 'باحواس جدیدیت'' کی کہانیوں کا نام دیا تھا-

ان کی کہانیوں کے پہلے مجموعے ''جب شہر نہیں بولتے'' کا فلیپ لکھتے ہوئے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے بطور خاص ان کی کہانی ''خوف'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا ''خوف' بھی ایک تحریر میں بیان یا خود کلامی ہے- مشرف احمد نے خوف اور جب ''شہر نہیں بولتے'' میں خود کلامی اپنا کر آج کے انسان کی تنہائی پر اپنا وہ فیصلہ قلم بند کر دیا ہے جو آج کا جواز ہے-''

''جب شہر نہیں بولتے'' کا دیباچہ شوکت صدیقی نے تحریر کیا تھا اور انہوں نے مشرف احمد کی علامتی کہانیوں کے مثبت رجحان کی تعریف کی تھی- ڈاکٹر مشرف احمد کے بعض افسانے خاص طور سے ''پرندے'' سندھی، ہندی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں- ان کے افسانے پرندے کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے راجندر سنگھ بیدی نے لکھا تھا کہ ''آپ کی یہ کہانی رگ و پے میں اترتی محسوس ہوتی ہے-''

ڈاکٹر مشرف احمد کی کتاب ''حسین شاہ حقیقت اور ان کا خاندان'' کی تقریب تعارف سے خطاب کرتے ہوئے جلسے کے صدر اور معروف وممتاز نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فرمایا تھا کہ اگر اس کتاب کا مصنف اس کو شائع کرنے سے قبل کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے سند کے لیے پیش کر دیتا تو اسے سند مل جاتی-

ڈاکٹر مشرف احمد پندرہ برسوں تک ہفت روزہ ''اخبار خواتین'' کراچی میں ادبی موضوعات ومسائل پر کالم لکھتے رہے ہیں- کئی برسوں تک ممتاز اخبار روزنامہ ''ایکسپریس'' کراچی کے ادارتی صفحے پر ''بادب'' کے عنوان سے ادبی وسماجی موضوعات پر ہر ہفتے کالم لکھتے رہے- ڈاکٹر صاحب سہ ماہی ارمغان کے نام سے ایک ادبی جریدہ بھی شائع کرتے تھے- اس جریدے میں ابراہم جلیس اور ڈاکٹر جمیل جالبی نمبر شائع ہو چکے ہیں- مشرف صاحب نے اپنی مصروفیت کے باوجود ادارۂ یادگار غالب میں جوائنٹ

سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔اسی دوران اُن کی طبیعت خراب رہنے لگی تو انہوں نے ادارۂ یادگارِ غالب سے سبکدوشی حاصل کرلی۔دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی صحت گرتی چلی گئی۔ڈاکٹروں کی تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ وہ پھیپڑوں کے موذی مرض کینسر میں مبتلا ہیں۔اسی مرض نے اُن کی جان لے کر چھوڑا۔۱۳رمئی ۲۰۰۳ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔سخی حسن قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔

--••☆••--

مصطفیٰ علی بریلوی، سید

سید مصطفیٰ علی ۷؍ ستمبر ۱۹۲۳ء کو بریلی (یوپی، بھارت) کے علمی ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سید اشفاق علی لکڑی کے تاجر تھے وہ اپنے والد سید اسحاق علی بریلوی کے ساتھ جنگلات کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔تحریک آزادی کے سرگرم کارکن، اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی سیکریٹری الطاف علی بریلوی ان کے چچا تھے۔مصطفیٰ علی بریلوی صاحب جب چھ ساڑھے چھ سال کے ہوئے تو ان کے والد اور والدہ دونوں ہی کا انتقال ہوگیا۔ان کی پرورش و پرداخت ان کے چچا الطاف علی بریلوی اور ان کی چچی سیدہ انیس فاطمہ نے اپنی سگی اولاد کی طرح کی۔

مصطفیٰ علی نے مکتبی تعلیم گھر اور اسلامیہ پرائمری اسکول برانچ میں حاصل کی۔اسلامیہ ہائی اسکول بریلی سے چھٹا درجہ پاس کر کے علی گڑھ چلے گئے جہاں انہوں نے مسلم یونیورسٹی، سٹی ہائی اسکول علی گڑھ میں ساتویں کلاس میں داخلہ لیا۔مصطفیٰ علی نے ۱۹۳۹ء میں سائنس گروپ میں سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔۱۹۴۲ء میں زرعی انسٹی ٹیوٹ بلند شہر یوپی سے دو سالہ ڈپلوما زراعت حاصل کیا۔پاکستان آ کر ۱۹۵۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے کامرس میں انٹر اور ۱۹۶۲ء میں بی کام کیا۔بعد ازاں ۱۹۶۵ء میں سیکنڈ ڈویژن ایل ایل بی کیا۔مصطفیٰ علی نے ۱۹۶۰ء میں محکمانہ امتحان قوانین رائج الوقت بھی پاس کیا۔اس امتحان میں حکومت سندھ کی جانب سے ۱۳۵ افراد شریک ہوئے جن میں صرف مصطفیٰ علی پاس ہوئے۔

مصطفیٰ علی بریلوی نے ۱۹۴۲ء میں ڈپلوما زراعت کرنے کے بعد ذریعہ معاش کے لیے ٹوبیکو کمپنی سہارنپور میں بحیثیت اسسٹنٹ ٹوبیکو انسپکٹر ملازمت کا آغاز کیا۔اس کے بعد انسپکٹر زراعت ایگری کلچر ڈپارٹمنٹ کاندھلہ ضلع مظفر نگر، انسپکٹر پروپیگنڈا غلہ اُگاؤ اسکیم ضلع علی گڑھ رہے۔۱۹۴۶ء میں امن وامان کی حالت بگڑنے پر علی گڑھ میں "بریلی شاپ" بنام الطاف علی، مصطفیٰ علی ٹمبر اینڈ بمبو مرچنٹ قائم کی۔ستمبر ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کی۔پہلے ٹنڈو آدم میں مقیم ہوئے لیکن کاروباری ناکامی کے بعد دوسری ہجرت کراچی کی۔یہاں آ کر مصطفیٰ علی بریلوی نے مختلف محکموں میں خدمات انجام دیں۔پہلے محکمۂ مالیات

حکومت پاکستان پھر محکمہ تعلیمات کراچی میں ہیڈ کلرک، سینئر سپرنٹنڈنٹ، سینئر آڈیٹر، اسسٹنٹ ڈائریکٹر پرائمری ایجوکیشن، اسسٹنٹ ڈائریکٹر (امور قانونی) اور ملازمت کے آخری سالوں میں امور قانون اور محکمہ کے جملہ تحقیقاتی معاملات و تعلیمی پالیسیوں کے جوابات وغیرہ سے متعلق رہے۔

مصطفیٰ علی بریلوی نے تحریک پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ بھارت میں سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ گاؤں درگاؤں ضلع علی گڑھ میں تحریک پاکستان کے لیے بھی کام کرتے رہے جس کی وجہ سے انہیں سرکاری نوکری چھوڑنی پڑی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا وجود پاکستان بننے کے بعد مسلسل غیر مسلموں اور حکومت وقت کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ اس فضا کو بدلنے کے لیے انہوں نے سید الطاف علی اور ان کی اہلیہ کی سرپرستی میں کمیونسٹ پارٹی علی گڑھ کے تعاون سے اینٹی ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ محاذ بنایا۔

مصطفیٰ صاحب ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۹ء تک سید الطاف علی بریلوی کے رسالہ "مصنف" علی گڑھ میں بہ طور اسسٹنٹ مدیر خدمات انجام دیتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء تا وفات سید الطاف علی بریلوی ۱۹۸۶ء تک پاکستان میں سہ ماہی "العلم" آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس میں بہ طور اعزازی اسسٹنٹ کام کرتے رہے۔ سید صاحب کی وفات کے بعد سے تا حال رسالہ سہ ماہی "العلم" اور کانفرنس سیکریٹری کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تصانیف و تالیفات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) نواب خان بہادر خاں روہیلہ (۲) غلام قادر خاں روہیلہ (۳) مسلمانان سندھ کی تعلیم
(۴) مسلمانان پنجاب کی تعلیم (۵) مسلمانان بنگال کی تعلیم (۶) مسلمانان سرحد کی تعلیم
(۷) انگریزوں کی لسانی پالیسی (۸) قائد ملت لیاقت علی خاں۔ تعلیم سے سیاست تک
(۹) سید الطاف علی بریلوی...... حیات وخدمات (۱۰) سندھ کی تعلیمی حالت اور ہمارے مسائل

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ درجنوں کتابوں کے مقدمے، دیباچے لکھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے فوجی پروگرام میں بھی بہت حصہ لے چکے ہیں۔ ان کے تاریخی و تعلیمی مضامین روزنامہ "نئی روشنی"، "جنگ"، "انجام" اور اخبار جہاں میں وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ روزنامہ "جنگ" ان کی کتاب "مسلمانان سندھ کی تعلیم" کو بالاقساط شائع کر چکا ہے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی پاس شدہ علمی، تعلیمی تجاویز ۸۶-۱۹۵۱ء کی پیروی ان کی روزمرہ کی مصروفیات کا حصہ ہیں۔

---••☆••---

مظفر احمد ضیاؔ، سید

سید مظفر احمد ضیا ان کا اصل نام اور ضیاؔ تخلص ہے۔ ۱۵؍جولائی سنہ ۱۹۳۱ء کو اُلدن، ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام الحاج سید ممتاز علی تھا۔ ضیاؔ صاحب نے ابتدائی تعلیم اُلدن، پانچی اور میرٹھ میں حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے۔ یہاں پر انہوں نے صادق اُجرٹن کالج بہاول پور سے سلسلۂ تعلیم قائم کیا۔ انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۵۳ء میں اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کیا، اور اردو میں امتیاز کے ساتھ ایم اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد ضیاؔ صاحب نے سندھ مسلم کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

مظفر ضیاؔ حکومتِ پاکستان کے ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ وہ کلکٹر آف کسٹم کی حیثیت سے کراچی اور لاہور اور کوئٹہ میں رہے۔ سینٹرل بورڈ آف ریوینو کے ممتاز رکن کی حیثیت سے خاص طور پر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے کولمبو پلان کے تحت کناڈا، امریکہ، یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کا دورہ کیا۔ اس کے بعد ایک سرکاری وفد کے سربراہ کی حیثیت سے اٹلی، فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور انگلینڈ گئے۔

ضیاؔ صاحب ایک خوش بیاں اور حساس شاعر تھے۔ اُن کی شاعری میں انسانی زندگی کے درد و غم کی لہریں کروٹیں لیتی نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب لکھتے ہیں:

> ''ضیاؔ کی شاعری بحیثیت مجموعی، کلاسیکی رنگ سے ہم آہنگ ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اُن کے ادبی ذوق کی تربیت اور شعور کی تعمیر، بیشتر کلاسیکی ماحول ہی میں ہوئی ہے۔ چنانچہ زبان و بیان کی سطح پر، جو معاملات محبت سے تعلق رکھتے ہوں، اُن کے یہاں کلاسیکی رنگ، چوکھا ہو کر سامنے آتا ہے یعنی کم سے کم لفظوں میں، سادہ و پُرکار لہجے میں، چھوٹی چھوٹی بحروں اور روزمرہ کی زبان میں اُنہیں شعر کہنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔ صرف دو تین

شعر دیکھیے :-

بڑی پُرکشش ہیں محبت کی راہیں یہی آرزو ہے کہ منزل نہ آئے
ہو سکے جب نہ غمِ دل کا علاج درد پھر، خود ہی دوا لگتا ہے
اچانک کِس لیے مرجھا گیا ہے ہوا نے پھول سے کیا کہہ دیا ہے

اِن چھوٹے چھوٹے شعروں میں، بڑی شاعری کے آثار نمایاں ہیں، زبان کی سطح ہی پر نہیں، خیال کی سطح پر بھی یہ اشعار قاری کو چونکاتے ہیں اور شاعر کے فکر و نظر کی تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ ان میں کہیں میرؔ و سوداؔ کی جھلک نظر آتی ہے کہیں غالبؔ و اقبالؔ کی۔"

مظفر ضیا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے عمران عظیم لکھتے ہیں:

"مظفر ضیاؔ صاحب کی شاعری قدیم و جدید لہجے کی سنگم ہے ان کے کلام میں پختگی ہے اور بہت سلیقے سے آج کے معاملات کی نشان دہی کرتے ہیں، اور زمانے کی تلخیوں کا شکوہ بھی کرتے ہیں' موصوف فرماتے ہیں۔

گھر میں اک پیڑ لگایا تھا زمانہ گزرا لیکن افسوس مُیسّر کبھی سایہ نہ ہوا

اُن کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ اُنہوں نے کلاسیکی غزل کو بنیاد بنا کر جدید لہجے میں اشعار کہنے کی کوشش کی ہے اور روایت کو برقرار رکھا ہے، اپنے عہد کی شکست و ریخت اور مایوسی کا ملال اس طرح فرماتے ہیں۔

وحشت سی ہو رہی ہے اسی سے نہ جانے کیوں مدّت سے جس مکان میں تنہا رہا ہوں میں'

مظفر احمد ضیاؔ سنہ ۲۰۰۰ء کے اواخر میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی تصانیف میں کاغذی پیرہن (پہلا مجموعہ) اسلامی تصوف، اہلِ مغرب کی نظر میں (تالیف) روشنی کا سفر (دوسرا مجموعہ) شامل ہیں۔ ان کے کلام کے چند شعر اور ملاحظہ کیجیے۔

جو لوگ رنج و الم سہہ کے مسکراتے رہے اُنھیں کو اہلِ جہاں اور بھی ستاتے رہے
حسرتِ دید رہی دل نے اُٹھائے سو غم چشمِ پُرنَم سے گرا خونِ جگر عید کے دن
ہے نُور اس جہاں میں تو بس آپؐ کے طفیل اور آپؐ ہی کے دم سے عالَم سجا ہوا

خودذات میں گم ہوں کبھی آفاق میں گرداں
تاریخ کا نبّاض ہوں، میں اہلِ قلم ہوں

شہر گھٹتے جائیں گے ویرانیاں رہ جائیں گی
زندہ جسموں کی جگہ پرچھائیاں رہ جائیں گی

آشیانے خاک ہو جائیں گے جل کر دفعتاً
آسمانوں پر کڑکتی بجلیاں رہ جائیں گی

خشک ہو جائیں گے اک دن یہ سمندر دیکھنا
ریگزاروں میں بھی سوکھی ندیاں رہ جائیں گی

اطلس وکمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
وقت گر بدلا تو تن پر دھجیاں رہ جائیں گی

ایک اک پروانہ جل کر خاک ہوتا جائے گا
رو چکے گی شمع اور خاموشیاں رہ جائیں گی

کرب کے آثار ہر چہرہ پر ہو جائیں گے نقش
کل کے پس منظر میں سب رعنائیاں رہ جائیں گی

ریت کی مانند بہہ جائیں گے باطل کے پہاڑ
لوحِ گیتی پر اٹل سچائیاں رہ جائیں گی

چھٹنے لگی ہے فکر کی راہوں میں تیرگی!
تابانیاں نگاہ کی پھیلا رہا ہوں میں

--••☆••--

مظہر خیری

بے باک اور ممتاز صحافی ادب نواز ادیب ساز اور سخن پرور مظہر الحق خیری سنہ ۱۹۱۲ء کو مصورِ غم علامہ راشد الخیری کے خانوادے میں پیدا ہوئے جو علم و ادب کا ہمیشہ سے گہوارہ رہا ہے۔ مظہر خیری تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں وزارت دفاع، جس کا دفتر دہلی میں تھا، میں ملازم ہو گئے لیکن ادب، تحریر و نگارش کا شوق انہیں زمانہ طالب علمی سے تھا۔ سرکاری ملازمت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے بھائی احسان الحق خیری کے نام سے ایک جریدہ ''باغی'' نکالا جو آزادیٔ ہند کا علمبردار تھا۔ یہ زمانہ ''روزنامہ جنگ'' دہلی کی اشاعت کا ابتدائی دور تھا۔ ''باغی'' کے ادارتی اور مستقل کالموں کی بے لاگ اور حق گوئی نے اسے خاصا تند و تیز بنا دیا۔ چنانچہ اس تازیانہ تنقید اور حق گوئی کو حکومت وقت برداشت نہ کر سکی اور اس اخبار کو ضبط کر لیا۔ مظہر خیری حق گوئی اور آزادی کے سچے پرستار تھے۔ ''باغی'' کے ضبط ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک ماہنامے کا ڈیکلیریشن لے کر ایک رسالہ ''ارمان'' کے نام سے جاری کر دیا۔ سرکاری فرائض کی انجام دہی سے بچ جانے والا وقت وہ اپنے ان علمی و ادبی مشاغل میں گزارتے رہے اور یہ مشغلہ زندگی کے آخری لمحے تک عزیز و محبوب رہا۔

۱۹۴۷ء میں سرکاری ملازمین سے پاکستان یا ہندوستان کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے پاکستان کا انتخاب کیا اور اس طرح ان کی خدمات پاکستان کو منتقل کر دی گئیں۔ اس طرح کراچی آ کر وہ حکومتِ پاکستان کے محکمے Cypher Beauro سے منسلک ہو گئے۔ دہلی کی طرح سرکاری فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ انہوں یہاں بھی ایک ماہنامہ ''جام نو'' کی اشاعت کا آغاز کیا جس نے چند ہی دنوں میں اس قدر ترقی کی کہ یہ ملک کے اعلیٰ ترین ماہناموں میں شمار ہونے لگا۔ ''جام نو'' کے اجرا سے قبل مظہر خیری ریڈیو پاکستان سے بحیثیت ڈرامہ نویس اور صداکار بھی وابستہ رہے۔

۱۹۷۰ء میں انہوں نے سرکاری ملازمت سے سبکدوشی اختیار کر لی تاکہ وہ اپنے ماہنامے کو ایک معیاری اور بلند پایہ علمی و ادبی مجلّہ بنانے کے لیے وہ تمام تر مساعی اور وسائل اختیار کر سکیں جو عدیم

الفرصت ہونے کی وجہ سے اب تک ان کے لیے قابل عمل نہیں تھے۔مظہر خیری نے ادب کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ وہ ایک ادیب ساز تھے۔انہوں نے بیسیوں نئے لکھنے والے افسانہ نگار، شعراء، ناقدین اور محققین کو بھی ''جام نو'' کے ذریعہ متعارف کرایا اور اُن کی حوصلہ افزائی کی۔انہوں نے ماہنامہ ''جام نو'' کے کئی نمبر نکالے جن میں قائدِ ملت نمبر، اقبال نمبر، جگر نمبر، دس سالہ نمبر، پاکستان نمبر، شوکت رانا نمبر، اور ایم اسلم نمبر وغیرہ تاریخ ادب میں یادگار ہیں۔

مظہر خیری کی شخصیت ایک کہنہ مشق نثار کی تھی لیکن انہیں شعر و سخن سے بھی خاصا شغف تھا۔ان کی شاعرانہ حیثیت کے بارے میں شاعر لکھنوی لکھتے ہیں:

''مظہر خیری کا ذہنی رجحان نثر کی طرف زیادہ تھا مگر انہیں شعری دنیا سے بھی لگاؤ تھا۔انہیں اپنے جذبات کو سادہ اور آسان زبان میں ادا کرنے کی خاصی مشق ہو گئی تھی۔اکثر و بیشتر ان سے اس سلسلے میں گفتگو رہی اور وہ یہ معلوم کرتے رہے کہ وہ شعر گوئی کا سلسلہ جاری رکھیں یا ختم کر دیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا چنانچہ ان کی کئی نظمیں اور غزلیں ''جام نو'' کی وساطت سے قارئین کی نظروں سے گزریں اور پسند کی گئیں۔''

مظہر خیری نے ادب کو پروان چڑھانے میں انتھک محنت کی۔آخر میں وہ عارضۂ قلب میں مبتلا ہو گئے اور ۱۹؍فروری ۱۹۷۳ء کو دار فانی سے کوچ کر گئے۔ان کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مقدر اہل گلشن کا نہ پوچھو
نشیمن جل رہا ہے روشنی ہے

لرزتے ہیں گلوں پر اشک شبنم
کلی کو مسکرانے کے پڑی ہے

موجِ ساحل سے کھیلنے والے
کبھی طوفان سے آشنا نہ ہوئے

لاکھ غم ہیں مگر ہے ظرف کی بات
اشک آنکھوں میں رونما نہ ہوئے

میری آہیں نہ عرش تک پہنچیں
میرے نالے کبھی رسا نہ ہوئے

صرصر غم گزر گئی ! مظہر
قافلے شوق کے روانہ ہوئے

خبر کرنا ذرا دست جنوں کو
گلستاں میں بہار آئی ہے

--••☆••--

مقبول نقش

مقبول نقش سنہ ۱۹۲۲ء کو جمشید پور (ٹاٹانگر) صوبہ بہار میں پیدا ہوئے - ان کے آباواجداد جومدراس سے تعلق رکھتے تھے حصولِ معاش کے سلسلے میں جمشید پور آبسے تھے - آٹھ برس کی عمر میں مقبول نقش صاحب کو ان کے دادا صاحب نے تعلیم وتربیت کے لیے اپنی نگرانی میں لے لیا تھا - انہوں نے مقبول نقش کو اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم دینا شروع کی لیکن بدقسمتی سے یہ دادا کی وفات سے منقطع ہوگیا - اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں مقبول نقش کے سر سے ان کے والد کا سایہ بھی اٹھ گیا اور اس طرح تعلیم حاصل کرنے کی ان کی خواہش پوری نہ ہوسکی جس کا ملال انہیں زندگی بھر رہا - مقبول نقش اپنے والد کی اولاد میں سب سے بڑے تھے لہٰذا خاندان کی معاشی ذمہ داریاں ان ہی پر آپڑیں - چنانچہ انہوں نے مختلف النوع ملازمتیں اختیار کیں -

معاشی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے وہ باقاعدہ اسکول میں تعلیم نہیں لے سکے لیکن پڑھنے لکھنے کا شوق انہیں ہمیشہ رہا - وہ کلاسیکی قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھتے اور اپنی اماں جی کی خواہش پر ان کو بھی سناتے تھے - ان کہانیوں میں الف لیلہ، قصۂ چہار درویش، فسانۂ آزاد اور حاتم طائی وغیرہ تھیں - رفتہ رفتہ ان میں شعر وسخن کا ذوق بھی پیدا ہونے لگا - باقاعدگی کے ساتھ شاعری کا آغاز حضرت کمالی بینائی سے شرف تلمذ حاصل ہونے کے بعد ہوا - کمالی صاحب مقبول نقش کے اشعار اور ان کے ذوقِ شعری کی تعریف بھی کرتے تھے -

تقسیمِ ہند کے بعد مقبول نقش مشرقی پاکستان آگئے جہاں ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر حنیف فوق، رشید احمد، پروفیسر اقبال عظیم، پروفیسر نظیر صدیقی، سرور بارہ بنکوی اور اصغر گورکھپوری جیسے ممتاز شعراء کی صحبتیں میسر آئیں - ان صحبتوں نے مقبول نقش کے شعری ذوق کو مزید جلا بخشی - سقوطِ ڈھاکہ کے بعد وہ کراچی آگئے - یہاں پر بھی انہیں ادیبوں اور شاعروں کی رفاقتیں میسر آئیں -

مقبول نقش نے اپنی زندگی کے ایام بڑے ناگفتہ بے حالات میں گزارے۔ممتاز شاعر حمایت علی شاعر اپنی کتاب ''عکس و شخص'' میں مقبول نقش کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

''مقبول نقش کا شمار موجودہ اُردو ادب کی ''تیسری دنیا'' کے شاعروں میں ہوتا ہے ادب کی تیسری دنیا کے نام پر ممکن ہے آپ چونک پڑے ہوں مگر یقین کریں کہ میں نے یہ اصطلاح فیشن کے طور پر محض چونکانے کے لیے استعمال نہیں کی اور نہ میری آرزو ہے کہ ادب میں اس دنیا کی دریافت پر آپ مجھے اپنے عہد کے کولمبس کا خطاب عطا کردیں۔

ادیب کا قافیہ غریب بھی مطلع کے دو مصرعوں کی طرح زندگی سے پیوست ہے اور برسوں سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔درباروں میں اس غریب کی جو ''درگت بنی'' وہ قصیدے سے لے کر ریختی تک تاریخِ ادب کا ایک عبرت ناک تماشہ ہے۔.........

۶۸ء میں کشمیر کے موضوع پر نقش کی طویل نظم ''جوئے خوں'' شائع ہوئی جو ۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔اس نظم پر عندلیب شادانی اور نظیر صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مقبول نقش کی زندگی کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیں اور کم از کم مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان میں بھی کوئی احسان دانش ہے جس نے محنت کو زندگی میں محترم اور معتبر بنا دیا لاحقوں، سابقوں کی بے ساکھیوں پر چلنے کی بجائے اپنے پیروں پر ادب کا سفر بھی طے کیا۔''

مقبول نقش ایک ایسے شاعر تھے جنہوں نے شہرت اور نام و نمود کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''چشم خیال''، ''نوشتہ'' شامل ہیں۔مقبول نقش سے میری ملاقات اُس وقت ہوئی تھی جب ''دبستانوں کا دبستان'' جلد اوّل اشاعت کے آخری مراحل میں تھی۔انہوں نے دوسری جلد کے لیے اپنے حالات کے ساتھ اپنے مجموعے بھی دیے تھے۔لیکن افسوس! وہ دوسری جلد کے شائع ہونے سے قبل ۳۱ رجنوری ۲۰۰۵ء کو دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔''دبستانوں کا دبستاں'' کی دوسری جلد منظر عام پر آنے میں دیر ہوئی اور انہوں جانے میں جلدی کی۔ان مجموعۂ کلام سے منتخب کیے گئے کچھ اشعار درج ہیں، ملاحظہ کیجیے

وہ دن بھی یاد ہیں کہ قفس تھا چمن سے دور — اس نظمِ نو کی خیر قفس بھی چمن میں ہے

وہ ولولے حیات کے اے نقش کیا ہوئے
سینے میں دل ہے کوئی میت کفن میں ہے

اب کہیں شورِ سلاسل ہے نہ آوازِ جرس
قافلے شوق کے کیا جانے کہاں تک پہنچے

کچھ غبارِ رہِ منزل تو ہے منزل نہ سہی
یہ بھی کیا کم ہے کہ کچھ لوگ یہاں تک پہنچے

کچھ دن کٹے ہیں غم میں تو کچھ دن خوشی کے ساتھ
ہوتا رہا مذاق مری زندگی کے ساتھ

فطرت نے کیا سلوک کیا آدمی کے ساتھ
جینا خوشی کے ساتھ نہ مرنا خوشی کے ساتھ

اک حادثہ ہے یہ بھی مری زندگی کے ساتھ
میں ہوں کسی کے ساتھ مرا دل کسی کے ساتھ

کس منہ سے کوئی عظمتِ آدم کا نام لے
جب آدمی فریب کرے آدمی کے ساتھ

کیا جانے کیا اصول و عقیدہ ہے نقش کا
گاہے خدا کے ساتھ ہے گاہے خودی کے ساتھ

مایوس ہو کے اُٹھ گئے جب انجمن سے ہم
پھر آ کے کوئی انجمن آرا ہوا تو کیا

جس دل سے زندگی کی چمک چھین لی گئی
وہ دل کسی کی آنکھ کا تارا ہوا تو کیا

سچ ہے ماضی کا تصور دل کو تڑپائے بہت
دوست تو پھر دوست ہیں دشمن بھی یاد آئے بہت

میری دلجوئی میں یاروں نے کمی کوئی نہ کی
پھول بھی پھینکے بہت پتھر بھی برسائے بہت

کوئی بھی اب رنجِ محرومی نہیں وجہِ خلش
ہم نے خوشیاں بھی سمیٹیں غم بھی اپنائے بہت

جب بھی جھونکا کوئی خوشبو کا اِدھر سے گزرا
یاد کیا کیا تری قربت کے زمانے آئے

جس کو ہم اپنا کہیں ایک بھی ایسا تو نہیں
زندگی تو ہمیں کس شہر میں لے آئی ہے

تھے جو محبوس تو آفاق نگاہی تھی نصیب
ہوئے آزاد تو ہر چیز علاقائی ہے

---••☆••---

ممتاز احمد خاں، پروفیسر ڈاکٹر

ممتاز احمد خاں ۱۴ ستمبر ۱۹۴۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن بریلی ہے۔ ان کے والد کا نام اشفاق احمد خاں ہے۔ دہلی اسٹیشن کے قریب رائل موٹر ورکس کے نام سے ان کا کاروبار تھا جو سنہ ۴۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر ممتاز احمد اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آئے اور سکھر میں مقیم ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سنہ ۱۹۶۳ء میں انہوں نے ماڈرن ہائی اسکول سکھر سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں اسلامیہ پوسٹ گریجویٹ کالج سکھر میں انٹر کامرس میں داخلہ لیا اور سنہ ۱۹۶۵ء میں آئی کام اور ۱۹۶۷ء میں بی کام کیا۔ پھر سنہ ۱۹۶۹ء میں اسی کالج سے احسن فاروقی کی زیرنگرانی انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں ممتاز صاحب نے سندھ یونیورسٹی سے ایم اے معاشیات کیا اور بعد ازاں کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگرانی میں اُردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ ڈی میں مقالے کا موضوع ''آزادی کے بعد اُردو ناول ہیئت اسالیب اور رجحانات ۸۷-۱۹۴۷ء'' تھا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد دوسرے آدمی ہیں جنہوں نے کراچی یونیورسٹی سے اُردو ناول میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل۔ ان سے پہلے یہ ڈگری ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے حاصل کی تھی۔

ذریعہ معاش اور تعلیمی اخراجات کے لیے ڈاکٹر صاحب نے درس و تدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ابتدا میں انہوں نے ٹیوشن پڑھائے پھر تعمیر نو پرائمری وہائی اسکول سکھر میں پڑھایا۔ جنوری ۱۹۷۱ء میں وہ اسلامیہ پوسٹ گریجویٹ کالج سکھر میں بحیثیت لیکچرر مقرر ہوئے۔ ممتاز صاحب نے مختلف کالجز، جن میں عطا حسین شاہ موسوی کالج روہڑی، سچل سرمست کالج رانی پور، مہران ڈگری کالج مورو اور گورنمنٹ پریمیئر کالج کراچی شامل ہیں، میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد جن سے راقم حروف بھی اچھی طرح واقف ہے، بڑی ذہین شخصیت کے مالک ہیں۔ آج کل وہ بحیثیت پرنسپل سینٹ پیٹرکس کالج ۲ (شام) میں کام کر رہے ہیں۔ اب

ممتاز احمد صاحب کی یہ خواہش ہے کہ وہ ڈی لٹ بھی کریں۔

درس وتدریس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب تخلیقی اور ادبی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۹۳ء میں ان کی پہلی تصنیف ''اُردو ناول کے بدلتے تناظر'' (مقالات) ویلکم بک پورٹ اُردو بازار کراچی نے شائع کی۔ دوسری تصنیف ''آزادی کے بعد اُردو ناول (ہیئت اسالیب اور رجحانات ۱۹۴۷-۸۷)'' ممتاز صاحب کا لکھا گیا مقالہ ہے جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ اس مقالے کو کتابی شکل میں انجمن ترقی اُردو کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ملک کے معروف دانشور نقاد پروفیسر عتیق احمد صاحب لکھتے ہیں:

''پروفیسر ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی زیرِ نظر کتاب ان کے ڈاکٹریٹ کے لیے لکھے گئے مقالے کا اشاعتی یعنی باقاعدہ کتابی روپ ہے۔ اس کتاب کی کئی ایک بلکہ بہت سی جہتیں ہیں۔......

اس مقالے کی یوں بھی اہمیت زیادہ ہے کہ اولاً تو ہمارے یہاں خالص ادبی ناول نگاری کا منظر نامہ قحط و مشق کی ہیبت ناک صورت حال سے دوچار کرتا ہے اور اس پر مستزاد نقادان کرام کا ناول پر کچھ لکھنے لکھانے کے باب میں تغافل شعاری ستم بالائے ستم والی کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ یہ دکھ اپنی جگہ مستقل روگ ہے جس کی خاطر ناول نگاری کے باب میں جونئی فتوحات سامنے آرہی ہیں اس ان سے صرف نظر کرنا ایک دوسرے جرم کے مترادف ہے۔ اس لیے جونئی تحقیقات سامنے آئیں دل کھول کر ان کا استقبال کرنا اور ان کے حسن و قبح پر بات کرنا ہمیں اپنا فرض سمجھنا چاہیے۔''

سنہ ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر صاحب کی تیسری کتاب ''اُردو ناول کے چند اہم زاویے'' (مقالات) بھی انجمن ترقی اُردو کراچی نے شائع کی۔ ممتاز صاحب کی دوسری کتاب ''آزادی کے بعد اُردو ناول'' پر اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی جانب سے ۵۰،۰۰۰ ہزار روپے کا پہلا وزیراعظم انعام برائے ادب (تحقیق وتنقید) دیا گیا۔ ان کے افسانوں کی کتاب ''شہر پناہ مانگتا ہے'' اشاعت کے لیے تیار ہے۔ مزید منتظر اشاعت میں ''اُردو ناول کے کردار'' ہے۔

---••☆••---

منظؔر اکبرآبادی

ان کا اصل نام شمشاد حسین صدیقی، منظؔر تخلص اور قلمی نام منظؔر اکبرآبادی ہے۔ اردو کے مشہور و معروف شاعر سیمابؔ اکبرآبادی کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ منظؔر سنہ ۱۹۰۹ء کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم وتربیت اپنے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ انتہائی کمزوری اور خرابیِ صحت کی وجہ سے منظؔر کی تعلیم صحیح طور نہیں ہوسکی۔ کانپور، اجمیر، ٹونڈلہ اور آگرہ جہاں جہاں بھی ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں رہے منظؔر اُن کے ساتھ ہوتے تھے۔ ٹونڈلہ کے قیام کے زمانے میں منظؔر وہاں کے ریلوے ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے جہاں سے انہوں نے میٹرک پاس کیا۔ اسی زمانے میں سیمابؔ اکبرآبادی نے تمام کام چھوڑ کر آگرہ میں ایک ادارہ قصر الادب کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کی طرف سے ایک ماہنامہ ''پیمانہ'' جاری کیا گیا۔ اس ماہ نامہ کے ساتھ وقتاً فوقتاً اور بھی پرچے شائع ہوتے تھے جن میں ہفتہ وار ''تاج''، ''ثریا''، ''شاعر''، ''کنول''، ''ایشیا'' وغیرہ مشہور تھے۔ منظؔر صاحب ان تمام پرچوں سے کسی کسی نہ حیثیت سے نگرانی کرتے رہے۔ ہفتہ وار ''ایشیا'' کے وہ ۱۵ سال ایڈیٹر رہے۔ اس ادارے سے منسلک ہوجانے کی وجہ سے منظؔر کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ کچھ فارسی عربی اور اردو مدرسۂ عالیہ، جامع مسجد آگرہ اور مدرسۂ محمدیہ آگرہ میں حاصل کی۔ منظؔر نے زندگی کا بیشتر حصہ اپنے والد کی صحبت میں گزارا۔ یہ بھی بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ ادارہ قصر الادب کا جاری کردہ ماہنامہ ''شاعر'' آج بھی سیمابؔ اکبرآبادی کے پوتے ممبئی سے شائع کرتے ہیں۔

تقسیم کے بعد سیمابؔ اکبرآبادی ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ ان کے چلے جانے کے بعد قصر الادب کو منظؔر اکبرآبادی نے سنبھالا۔ لیکن سیمابؔ اکبرآبادی کے انتقال کے بعد وہ بھی کراچی آگئے۔ یہاں پر انہیں پر بہت مشکلات کا سامنا رہا۔ منظؔر اپنی ادبی مصروفیتوں اور پاکستان میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہندوپاک میں ایسے لوگ کم ہی ہوں گے جو یہ نہ جانتے ہوں کہ میں مولانا سیمابؔ

اکبر آبادی (مرحوم) کا خلف اکبر ہوں اس نسبتِ خصوصی کو میں اپنے لئے جس قدر بھی باعثِ فخر سمجھوں کم ہے اور چونکہ میری زندگی کا بیشتر حصہ انہیں کے زیر سایہ بسر ہوا ہے۔ اس لئے شاید اس کی وضاحت کی بھی ضرورت نہیں کہ میں نے ماضی کا تمام زمانہ کیسی کیسی اہم ادبی اور شعری مصروفیتوں میں گزارا ہوگا۔..........

قبلہ گرامی مولانا سیماب اکبر آبادی کی وفات کے بعد فروری سنہ ۱۹۵۱ء کے آخر میں پاکستان آ گیا ہوں۔ خیال تھا کہ یہاں رہ کر اپنے افکار پریشاں کو یکسوئی کے ساتھ مرتب کر سکوں گا لیکن یہاں آئے ہوئے مجھے تقریباً ایک سال اور ۸ ماہ ہو چکے ہیں۔ مگر ابھی تک کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی کہ میں اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کر سکوں اس عرصہ میں جن شدید مصائب اور روحانی اذیتوں سے گزرنا پڑا ہے وہ مجھے ذہنی اور دماغی طور پر مفلوج کر چکی ہیں۔ اور میں ان دنوں نہایت بے کیف اور بے روح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ پاکستان میں اہل اور نااہل قدر دانی اور ناقدری کی جو تلخ ترین تجربات ہوئے ہیں وہ مجھ جیسے جذباتی انسان کے لئے کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں ہیں اور اسی لئے میں گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا ہوں''

مالک رام اپنی تصنیف ''تذکرہ معاصرین'' جلد اول میں لکھتے ہیں:

''قصر الادب کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف پرچے شائع ہوتے رہے، جن میں ہفتہ وار تاج، ثریا، شاعر، کنول، مشورہ، ہفتہ وار ایشیا نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ منظر کسی نہ کسی حیثیت سے ان سب سے متعلق رہے اور غالباً پندرہ برس تک ایشیا کے ایڈیٹر رہے۔

جس ماحول میں انہوں نے پرورش پائی، اس میں شعر گوئی گویا لازمۂ حیات تھی، یہ بھی بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے، اصلاح اپنے والد سے لی۔ اگرچہ غزل بھی کہتے تھے لیکن زیادہ مزاولت نظم سے رہی۔

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء میں سیماب کا کراچی میں انتقال ہو گیا، تو منظر صاحب آگرے سے پاکستان چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے ایک ماہنامہ ''پرچم'' کے نام سے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ پاکستان میں پریشان حال رہے۔ انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے

ادبی وظیفہ ملتا تھا-تندرستی ادھر بہت دن سے خراب چلی آ رہی تھی-ضیق النفس کا عارضہ تھا-
لیکن اس کے باوجود بظاہر تشویش کی کوئی بات نہیں تھی-اچانک ۲راکتوبر سنہ ۱۹۷۱ء شب میں
کھانسی کا شدید دورہ پڑا، جس سے ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا-اور دس منٹ بعد آناً
فاناً ساڑھے دس بجے، روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی-''

منظر اکبر کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا-ایک کتاب ''عام فہم عروض'' کے نام سے ہندوستان میں لکھی تھی جس کے تین ایڈیشن ہندوستان ہی میں چھپے تھے-منظرؔ اکبر آبادی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میں پوچھتا ہوں یہ دنیا کے بامرادوں سے
وہ کیا کرے جو ناکامِ آرزو ہو جائے

جسے منظور ہو بربادیِ مطلق، منظرؔ!
آئے، وہ جامۂ ہستی کا گریباں ہو جائے

لڑکپن تھا کہ تھی ہر چیز پر اک سادگی طاری
جوانی ہے کہ اک دنیا جواں معلوم ہوتی ہے

عبادت ہے کہ سجدے روز کرتا ہوں خدا کو میں
طبیعت ہے کہ اب تک بت پرستی کو ترستی ہے

دیکھیے، کس نام سے ہو ذکرِ مرگِ عاشقی
نام میری بیخودی کا زندگی مشہور ہے

ستارے چپ، فضا خاموش، پچھلے شب کا سناٹا
مناسب وقت ہے، دل چاہتا ہے، اک فغاں کرلیں

جب میں نہ تھا تو دل کا تعین محال تھا
جب دل نہ تھا تو آپ کے جلوے کہاں رہے

مرا دل مر گیا تو زندگی کو روئے گی دنیا
نشاطِ محفلِ ہستی عبارت ہے مرے دل سے

بیکار ہے جنوں سے بھی فرصت اگر ملے
اب اتنی دُور لوٹ کے جائیں تو گھر ملے

دل کے ٹکڑے آنسوؤں میں بہہ گئے
اب بتا اے حسن ہم کیا رہ گئے

---••☆••---

منظر ایوبی، پروفیسر

عزیز احمد ایوبی نام، تخلص منظر اور ان کا قلمی نام منظر ایوبی ہے۔ ۱۴؍اگست ۱۹۳۲ء کو بدایوں (روہیل کھنڈ) یوپی، بھارت میں پیدا ہوئے۔ منظر ایوبی کا تعلق بدایوں کے زمیندار گھرانے سے تھا۔ وہ دس سال کے ہوئے تو ان کے والد علی احمد ایوبی کا انتقال ہوگیا۔ علی احمد کی وفات کے بعد ایک تو زمینوں کی دیکھ بھال اور اس کا نظام چلانے کا تمام تر بار ان کی والدہ کے شانہ پر آ گیا اور دوسری طرف زرزمین کے خاندانی تنازعات بھی کھڑے ہوگئے جس سے اس خاندان کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ اسی زمانے میں ملک تقسیم ہوا تو ہندو مسلم فساد برپا ہوگئے جس کے نتیجے میں اس خاندان کی جائدادیں، گھر اور مکان سب کچھ لٹ گیا۔ اس پریشانی کے عالم میں یہ خاندان ہجرت کر کے سنہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گیا۔

منظر کی ابتدائی تعلیم بدایوں کے دینی مکتب میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے تھوڑی بہت عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ قبل ہجرت منظر ایوبی صاحب اسلامیہ اسکول اور کالج سے میٹرک اور انٹر کامرس کے امتحانات پاس کر چکے تھے۔ پاکستان آ کر انہوں نے لاہور سے ادیب فاضل اور پھر کراچی سے بی کام کیا۔ اس کے بعد انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ذریعہ معاش کے لیے مرکزی وزارتِ عمال میں ملازمت اختیار کر لی جہاں وہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ بعدازاں انہوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور محکمۂ تعلیم سے منسلک ہوگئے۔ وہ گورنمنٹ ڈگری کالج اور دوسرے مختلف کالجز میں پڑھاتے رہے۔ سنہ ۱۹۹۴ء میں مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

منظر ایوبی نے ایسے شہر میں آنکھ کھولی تھی جو صدیوں سے علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس شہر میں لاتعداد عالم، فاضل، ادیب اور شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے دنیائے ادب میں بہت بڑا مقام حاصل کیا۔ لہذا وہاں کی فضا سے منظر ایوبی کا متاثر ہونا ایک فطری عمل تھا۔ چنانچہ بدایوں کے اس

ادبی و علمی ماحول میں منظرؔ ایوبی نے بھی ۱۹۴۷ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور آج ماشاء اللہ ایک کہنہ مشق اور نامور شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

''میں جب دنیا میں آیا تو کانوں میں پہلی آواز تو اذان کی پڑی تھی اور دوسری ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلات'' کی۔ ایسی فضا میں طبع موزوں رکھنے والا شخص شعر گوئی کی طرف فطرتاً راغب ہو جاتا ہے۔ میں نے مشقِ سخن شروع کی تو شہر میں کئی اساتذہ مسندِ شاعری کی زینت بنے ہوئے تھے۔ ان سب کی سرپرستی اور تعاون مجھے حاصل رہا۔ خاص طور پر میرے حقیقی ماموں علامہ عارف بدایونی (بھارت کے مشہور و معروف شاعر) نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ وقت بہت گزر چکا ہے۔ آج اُس دور میں کہی گئی غزلیں عجیب سی لگتی ہیں مگر میں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ وہ میری شعری تاریخ کا ایک حصہ ہیں اور اس ادبی ماحول کی آئینہ دار ہیں جس پر شعر و ادب کی جدید تحریکوں کا مطلق اثر نہ تھا، البتہ سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد پاکستان میں کہی جانے والی غزلوں اور نظموں میں آپ کو اپنا عہد، اپنی زندگی کی تمام سچائیاں، رعنائیاں اور تلخیاں بھرپور تاریخی پس منظر کے ساتھ نظر آئیں گی۔''

منظرؔ ایوبی کے کلام پر مشفق خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

''منظرؔ ایوبی منفرد لب و لہجہ کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری روایتی نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے جدید ادب کا دقیع حصہ ہے اور مستقبل کا کوئی مورّخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کی شاعری جذبے کی صداقت اور فکر کی آفاقیت کی آئینہ دار ہے۔''

منظر ایوبی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''منظرؔ ایوبی کی شاعری میں موضوع و مواد کا بڑا تنوع ہے۔ اس انداز کا تنوع صرف اُس شاعر کے ہاں ملے گا جو زندگی سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اور جس کی نگاہ اتنی وسیع و عریض دنیا میں کسی ایک نقطے پر جم کر نہ رہ گئی ہو۔ اس تنوع میں بڑی توانائی، رعنائی اور تازگی ہوتی ہے۔ دُکھ تو ہماری معیشت اور معاشرت کی دین ہیں اور شاعر کو ویسے بھی ان دُکھوں میں سے حصۂ وافر ملتا ہے مگر منظرؔ ایوبی کو یہ دُکھ ریزہ ریزہ نہیں کر ڈالتے، بلکہ اسے تن کر کھڑا ہونے اور اپنی بے بضاعتی کے باوجود، نبرد آزما رہنے کی جرأت اور استقامت بخشتے ہیں۔''

منظر ایوبی نے شعر و شاعری کے ساتھ تحقیق مقالے، ریڈیائی فیچر اور ڈرامے بھی لکھے ہیں جو بڑے مقبول ہوئے۔ ماہنامہ ''ہم قلم'' رائٹرز گلڈ، کراچی میں نائب مدیر (اعزازی) کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ منظر ایوبی کے مجموعوں سے لیے گئے کچھ اشعار پیش ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

سب سے ناتا جوڑ کے منظر آخر کیا پھل پاؤ گے
اپنے گھر کو چھوڑ کے کس کس گھر کی آگ بجھاؤ گے

آؤ ہمارے پاس دکھائیں اشکوں کی برسات تمہیں
کب تک اُڑتے بادل سے پانی کی آس لگاؤ گے

دیکھو ان کچی کلیوں کو مت مسلو ورنہ اک دن
سُوکھے پیڑ کی شاخ پہ بیٹھے تنہا اشک بہاؤ گے

چشمِ پُر آب روانی پہ روانی مانگے
دل کا یہ حال وہی سوزِ نہانی مانگے

وائے معبود کہ تُو میرے گناہوں کا حساب
چھوڑ کے مجھ کو فرشتوں کی زبانی مانگے

گیتوں پہ مردنی ہے نغمے سسک رہے ہیں
کس موڑ پر کھڑے ہم دنیا کو تک رہے ہیں

ہو جائے گُل نہ منظر اک دن چراغ لالہ
کب سے تہہِ بہاراں شعلے بھڑک رہے ہیں

ہزار شدّتِ غم سے اُداس رہتا ہے
ترا خیال مگر دل کے پاس رہتا ہے

وہی ہیں انجمنِ دل کی رونقیں لیکن
ترے بغیر یہ منظر اُداس رہتا ہے

بُجھ گئی شاخِ آشیاں یارو
گلستاں ہے دھواں دھواں یارو

حوصلے تھے ابھی جواں یارو
رُک گیا قافلہ کہاں یارو

محفلوں کے چراغ گُل نہ ہوئے
ہو چکی ختم داستاں یارو

یہ شامِ قفس، یہ دار و رسن، معلوم نہیں کیا ہونا ہے
لائی ہے کہاں تک دل کی لگن معلوم نہیں کیا ہونا ہے
گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں احساس کو اب تک ڈستی ہیں
ہے تیز بہت دل کی دھڑکن معلوم نہیں کیا ہونا ہے

---••☆••---

منظر علی خاں منظؔر

منظر علی خاں منظؔر بھاگلپور پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اسلامیہ مدرسہ مجاہد پور میں حاصل کی پھر ضلع اسکول بھاگل پور سے ۱۹۵۲ء میں میٹرک پاس کیا۔بعدازاں ماڑواڑی کالج بھاگلپور میں داخلہ لیااور ۱۹۵۶ء تک کالج میں رہے۔۱۹۵۶ء میں منظر علی خاں نے محکمہ زراعت سے ملازمت کا آغاز کیا۔تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان آگئے اور ڈھاکہ میں مقیم ہوئے۔۱۹۶۰ء میں وہ یونائٹیڈ بینک سے منسلک ہوگئے۔اس کے بعد سنہ۱۹۶۴ء وہ حبیب بینک میں آگئے اور وائس پریسیڈنٹ کے عہدے پر پہنچے۔

بینک میں اپنی انتیس سالہ خدمات کے دوران انہوں نے اگرچہ ہر شعبے میں کام کیا لیکن مشرقی پاکستان میں انہون نے بینکوں کی نئی شاخیں دوردراز علاقے میں کھولنے کے سلسلے میں جس قدر تگ ودو کی اس کی مثال کم ملتی ہے۔سنہ۱۹۵۳ء سے سنہ۱۹۶۰ء تک عوامی مشاعروں میں حصہ لیتے رہے۔ڈھاکہ آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا البتہ افسانہ نگاری ترک کردی۔۱۹۷۲ء میں کراچی آگئے اور یہاں بھی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔منظر علی منظؔر کی شاعری پر مشفق خواجہ صاحب کے یہ تاثرات ہیں:

> ''انہوں نے جو کچھ دیکھا،جس انداز سے دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا،لفظوں کے وسیلے سے اس کی تصویر کشی کی ہے۔انہوں نے اپنے جذبات ومحسوسات کو تصنع یا صنعت گری کے قالب میں نہیں ڈھالا۔جو جذبہ جس طرح رونما ہوا،اپنی فطری صورت میں صفحہ قرطاس پرآگیا......''

کراچی آنے کے بعدان کے دوستوں نے افسانہ نگاری پر مائل کیا تو چار سال میں انہوں طنزومزاح کے تین مجموعے شائع کیے۔اب تک اُن کی حسب ذیل کتابیں شائع ہوچکی ہیں:

''کرب آگہی''(شعری مجموعہ)''چھپائے نہ بنے''(طنزمزاح)''بدلتے چہرے'' (طنزومزاح) ''مکرر کہے بغیر''(طنزومزاح)''یہ بات چلی مجھ سے''(شعری مجموعہ)

نمونۂ کلام:

آج بیزار ہو کل آہ بھروگے تم بھی
ہم نہ ہونگے تو ہمیں یاد کرو گے تم بھی

اپنے ماضی کے فسانے تمہیں یاد آئیں اگر
کیا یہ ممکن ہے مرا ذکر کرو گے تم بھی

بجز ترے خیال کے مجھے اور کچھ نہ خیال تھا
تجھے دوسروں کا خیال ہے یہ میری وفا کا صلہ ملا

نہ رفاقتیں، نہ عنایتیں، نہ نگاہِ لطف وکرم ملی
تری انجمن میں مگر مجھے ترا غم ہر اک سے سوا ملا

ابھی زخم زخم حیات ہے ابھی معتبر ہیں جراحتیں
مجھے اپنے دل کی ہو فکر کیوں کہ کبھی کا زخم ہرا ملا

اپنی کاوش کہ ہوں روشن یہاں ایماں کے چراغ
ضد یہ ان کی کہ کوئی صاحبِ ایماں کیوں ہو

کربلا ہے میرے آبا کے تحمل کی مثال
تم مرے صبر پہ انگشت بدنداں کیو ہو

وارفتگیٔ شوق پہ کچھ وہ بھی پشیماں
اپنی بھی جبیں تر ہے کہ ہے اپنی خطا بھی

آداب کہاں آئے مجھے راہ روی کے
ہر چند ترے ساتھ بہت دور چلا بھی

کیوں تیرا ہی پیکر نہ ڈھلے میری غزل میں
کب آیا تصور میں کوئی تیرے سوا بھی

غم نہیں گر غریب ہیں ہم لوگ
دورِ نو کے نقیب ہیں ہم لوگ

گھر بناتے ہیں ہم لٹانے کو
ہائے کتنے عجیب ہیں ہم لوگ

بدنصیبی بھی رشک کرتی ہے
کس قدر خوش نصیب ہیں ہم لوگ

میں حدیثِ دل یہ مانا کسی رازداں سے کہتا
ترا غم اگر نہ ملتا تو غزل کہاں سے کہتا

---••☆••---

مہدی علی صدیقی

مہدی علی صدیقی فروری ۱۹۰۷ء میں ریاست حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کے آباواجداد کا وطن تحصیل فتح پور ضلع بارہ بنکی یوپی تھا۔ان کے والد ۱۸۹۰ء میں ایک دو سال کے لیے حیدرآباد آئے تھے جہاں انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور حیدرآباد ہی میں ایک معروف وکیل فدا حسین خاں کے پاس بطور زیر تربیت وکیل کا کام کرنا شروع کیا۔

مہدی علی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ان کے منجھلے بھائی نے انگریزی اور مولوی فضل اللہ نے اردو کے ساتھ فارسی پڑھائی۔''گلستان بوستان'' کے بعد ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' بھی پڑھایا گیا۔اس کے بعد انہیں پہلے تو ایک نارمل اسکول میں داخل کرایا گیا اور پھر سٹی اسکول میں۔مزید تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ گئے اور مسلم یونیورسٹی میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا لیکن سائنس سے رغبت نہ پاکر انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد تاریخ جغرافیہ سیکشن میں داخلہ لے لیا اور بی اے کیا اور بعدازاں ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔۱۹۳۰ء میں سول سروس کے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہوئے۔اس کے بعد آخری مرحلہ محکمہ کے انتخاب کا تھا جس میں انتخاب کرنے والے مختلف محکموں کے اعلیٰ افسر ہوا کرتے تھے۔ان افسران میں جناب چیف جسٹس نواب مرزا یار جنگ بھی تھے جنہوں نے مہدی علی صاحب کو اپنے محکمہ کے لیے منتخب کرلیا۔وہ اس محکمہ میں جانا نہیں چاہتے تھے لیکن ایل ایل بی ہونے کی وجہ سے ان کا انتخاب اسی محکمہ کے لیے کیا گیا۔منتخب ہونے کے بعد ایک دو ماہ حیدرآباد کی عدالتوں میں حکام کے ساتھ اجلاس میں بیٹھ کر کارروائی دیکھی۔عملی کام کے لیے ان کا تقرر بحیثیت ناظم عدالت جالنہ ضلع اورنگ آباد کردیا گیا۔اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں مزید کارآموزی کے لیے انہیں الہ آباد ہائی کورٹ بھیجا گیا۔اس کے ساتھ ہی اس ہائی کورٹ نے ان کی تعیناتی علی گڑھ میں کردی۔یہاں پر وہ ہفتے میں تین دن فوجداری (کریمنل) مقدمات دیکھتے اور تین دن کچہری میں بحیثیت سول جج اجلاس کرتے تھے۔

نومبر ۱۹۳۴ء میں حیدرآباد واپسی ہوئی اور پہلی بار انہیں بحیثیت سب جج مستقل طور سے ضلع رائچور

کے تعلقہ لنگسگور بھیج دیا گیا-اس کے بعد مہدی علی صاحب کو متعدد شہروں ضلعوں میں تعینات کیا گیا-سقوط حیدرآباد تک وہ اپنے عہدوں پر کام کرتے رہے-بھارت کے حملے کے بعد حالات ایسے ناگفتہ بے ہوئے کہ انہیں پاکستان ہجرت کرنا پڑی-اس طرح وہ ۲۲ رجنوری ۱۹۴۹ء کو کراچی آئے اور جمشید روڈ پر اپنے بہنوئی کے پاس ٹھہرے-

یہاں آنے کے بعد کچھ سکون ہوا تو وہ تلاش معاش کے لیے سرگرداں ہوئے-روزانہ دفتروں کے چکر لگاتے' پبلک سروس کمیشن کے مناسب اشتہاروں کے حوالے سے انٹرویو دیتے رہے لیکن کہیں کامیابی نہیں ہوئی-ان کے ایک مہربان اقبال سلیم تھے جن کی کتابوں کی تجارت حیدرآباد اور کراچی میں بھی تھی-انہوں نے ناولوں کے ترجمے کا کام بطور امداد پیش کیا-مہدی علی صاحب نے ڈکنس (Dickens) کی مشہور ناول A tale of two cities کا خاکہ تقسیم ہند کا پس منظر دے کر اردو میں منتقل کیا جس کا معاوضہ انہیں چھ سو روپے ملا-ایک دن وزارت دفاع کا اشتہار دیکھا کہ راولپنڈی میں فوجی صدر دفتر کی ایک اسامی عارضی منظور ہوئی ہے جس کے فرائض ان اپیلوں کو سننا ہے جو پینشن یافتہ فوجیوں نے کر رکھی تھیں-مہدی علی اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ بطور امیدوار راولپنڈی گئے لیکن انٹرویو میں کامیاب نہیں ہو سکے-

اس وقت صوبہ سرحد میں سیکریٹری داخلہ ایک سی ایس پی معزالدین احمد تھے جن سے ان کی دور سے قرابت تھی-اپنی ملازمت کے سلسلے میں مہدی علی پشاور چلے گئے-معز صاحب ان سے بہت اچھی طرح ملے اور ان کے کاغذات دیکھ کر ان کو مشورہ دیا کہ وہ خود وزیر اعلیٰ قیوم خاں سے مل کر درخواست دیں-قیوم خاں وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد جن کے متعلق معلوم تھا کہ وہ حیدرآبادیوں سے خاص ہمدردی رکھتے ہیں اس وقت نتھیا گلی میں تھے-معز صاحب کے مشورے کے بعد مہدی علی وزیر اعلیٰ قیوم خان سے ملے تو وہ ان سے بڑی محبت سے پیش آئے اور ان کا تقرر ضلع مردان میں گشتی مجسٹریٹ کی آسامی پر کر دیا-مہدی علی صدیقی تین سال تک صوبہ سرحد میں اسی آسامی پر کام کرتے رہے-۱۹۵۲ء میں مجسٹریٹ کی کچھ آسامیاں کراچی میں نکلیں تو ان کا تقرر بحیثیت مجسٹریٹ کراچی میں ہوگیا-اس وقت کراچی میں سٹی مجسٹریٹ اور اے ڈی ایم ضمیر ہاشمی تھے-مہدی علی صدیقی نے اپنی خودنوشت میں اپنے دور کے دو دلچسپ مقدموں کا بھی ذکر کیا ہے-ان دونوں مقدمات کا تعلق مشہور و معروف ادبی شخصیات سے تھا-ان میں

ایک مقدمہ پشاور کا ہے جس میں ن م راشد اور احمد فراز کو ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے کے الزام میں ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ مہدی علی صاحب نے ان دونوں حضرات کو سخت تنبیہہ کے بعد رخصت کر دیا۔ دوسرا مقدمہ کراچی کا ہے جو برصغیر کے مشہور افسانہ نگار منٹو کی فحش نگاری کا پیش ہوا۔ اس مقدمے میں اپنے فیصلے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''۵۳ء کے شروع میں مجھ پر ایک ''ادبی افتاد'' گزر چکی تھی .... منٹو کے اقبال کے بعد ان سب واقعات کی نہ جوابدہی ہوئی نہ مجھے بطور خود تحکم ہوسکا۔ دوسرے دن میں نے مختصری تجویز لکھی جس میں منٹو صاحب کے اقبالی بیان کو بنیاد بنا کر پچیس روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی کہ اس کا لحاظ کرتے اپیل بھی نہ ہو سکے اور غیر معیاری افسانے پر اپنی بدمزگی کا اظہار اور قانون کی پابندی بھی پوری ہو جائے۔''

سنہ ۱۹۵۶ء میں دیوانی عدالت ضلع قائم ہوئی تو مہدی علی صدیقی کو ترقی دے کر سول جج اور ۱۹۵۹ء میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج مقرر کیا گیا۔ مہدی علی فرماتے ہیں ''ایڈیشنل ڈسٹرکٹ ججی پر ترقی بظاہر بڑی دل خوش کن بات ہے مگر اس عہدے کی ذمہ داریاں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں۔'' سنہ ۱۹۶۵ء میں ایوب خان کا ایک آرڈیننس جاری ہوا جس کے تحت وہ عدالتی افسر جن کو ساٹھ سال کی عمر تک برسرکار رہنے کی اجازت دی گئی تھی اب ریٹائر کیے جاتے ہیں۔ اس آرڈیننس پر عمل اگلے سال ہوا۔ اس طرح جون ۱۹۶۶ء کو مہدی علی صدیقی اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جسٹس تنزیل الرحمٰن، جو مہدی علی صاحب کی کارکردگی سے بخوبی واقف تھے، نے انہیں بحیثیت مشیر قانون بلالیا۔ اسلامی کونسل میں مشیر قانون کی ابتدائی مدت پوری کرنے کے بعد اپریل ۱۹۸۴ء میں وہاں سے سبکدوش ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بہادر یار جنگ اکادمی کے صدر اور علمی ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ انہوں نے ایک دلچسپ کتاب اپنی خودنوشت ''بلا کم وکاست'' کے عنوان سے لکھی۔ آخر میں وہ اپنے بچوں کے پاس امریکہ چلے گئے۔ دسمبر ۲۰۰۳ء میں امریکہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

---••☆••---

میکش مرادآبادی

مسعودالقدر اصل نام، میکش تخلص اور مسعود میکش قلمی نام تھا۔ ۱۹۲۴ء کو مرادآباد یوپی کے ایک باعزت اور متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد ظفر صدیقی تھا۔ میکش نے تعلیم و تربیت مرادآباد ہی میں حاصل کی۔ حاصل مرادآبادی اور رئیس فروغ ان کے اسکول کے ساتھیوں میں تھے۔ شاعری کا ذوق رئیس فروغ کی صحبت میں ہوا اور قمر مرادآبادی کی شاگردی اختیار کی۔ انہوں نے ہندوستان ہی میں بہت جلد ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

تقسیم کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ ابتدا میں کچھ دن لاہور میں پھر اپنے ماموں کے پاس ملتان آ گئے۔ ذریعہ معاش کے لیے ۱۹۵۰ء سے تقریباً ۱۹۶۰ء تک ملتان کے کچھ ہفتہ وار پرچوں کی ادارت کرتے رہے جن میں ایک پرچہ ''نظامِ جدید'' ملتان تھا۔ ان کا کلام کئی دوسرے رسالوں میں بھی چھپتا تھا۔ اس کے علاوہ میکش کے طنز و مزاح کے کالم بھی چھپتے تھے جو بہت پسند کیے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں ملتان اور لاہور کے مشاعروں میں انہیں بڑی شہرت ملی۔ میکش ہر مشاعرے میں بلائے جاتے تھے اور اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے۔

مسعود میکش معاشی طور پر بہت تنگ رہے۔ کراچی آ کر مالی مشکلات پر قابو پانے کے لیے انہوں نے اُردو بازار میں ایک کتابوں کی دکان کھولی۔ ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے وزیری پانی پتی صاحب نے ان کی معاشی جدوجہد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ''میکش صاحب نے انتہائی افلاس کے دن بھی گزارے اور فارغ البالی بھی ان کا مقدر رہی۔ لیکن تنگدستی میں انہوں نے عزتِ نفس کا سودا نہیں کیا۔ اور کشادہ دستی کے دنوں میں وہ احساسِ تکبر سے دور رہے۔ ایم۔ ایم پبلیکیشنز کراچی ان کا اپنا ادارہ تھا اور اس کے کاروباری روابط ملک کے ہر حصے میں قائم

ہوگئے تھے۔ یہ تمام کاروبار ان کے اعتبار پر چلتا تھا اور ان کی دیانت مسلم تھی۔
شاعری اور ادب کی کتابوں کو ہمارے معاشرے میں فروخت کرنا کوئی معمولی
بات نہیں ہے۔ اکثر ادارے صرف ان ہی کتابوں کو ہاتھ لگاتے ہیں جن کے
ہاتھوں ہاتھ بک جانے کی امید ہو۔ میکشؔ صاحب بھی کاروباری نقطۂ نظر سے
ایسی کتابوں کے حصول کی کوشش کرتے تھے لیکن شاعری اور ادب کی کتابوں کو
فروخت کر کے انہیں بڑی خوشی ہوتی تھی۔"

میکشؔ ابھی معاشی طور پر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ملک عدم کا وقت سفر آ پہنچا اور ۱۹؍ مارچ ۱۹۸۰ء کو دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کے کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

عالمِ یاس میں بھی دل کے سہارے نہ گئے
شامِ فرقت مری پلکوں سے ستارے نہ گئے

ذہن سے مٹ نہ سکے عہدِ گذشتہ کے نقوش
صبحِ فردوس کے شاداب نظارے نہ گئے

شمع بجھ بھی گئی محفل کا تبسم لے کر
خاکِ پروانہ سے اب تک بھی شرارے نہ گئے

جسم اور جاں کا یہ رشتہ کہ سوئے بحرِ اُمید
موج تنہا ہی گئی ساتھ کنارے نہ گئے

جگمگا سکتی تھی مغموم نظر بھی میکشؔ
نقشِ ماضی دلِ محزوں سے اُبھارے نہ گئے

کسی کی زلف کے سائے میں کچھ سکوں کے لیے
یہ لمحہ بھر کا زمانہ گذار لوں تو چلوں

جینا پڑا قفس میں حدودِ چمن سے دُور
عکسِ جمالِ سنبل و ریحاں لئے ہوئے

میکشؔ کسی کی یاد سے بہلا رہا ہوں دل
شامِ فراق دیدۂ گریاں لئے ہوئے

فروغِ گردشِ لیل و نہار ختم ہوا
خزاں کا وقت ہے دورِ بہار ختم ہوا

حیات موت کی سرحد میں ہوگئی داخل
کہاں پہ سلسلۂ انتظار ختم ہوا

سسک سسک کے اُمیدوں نے جان دی آخر
تڑپ تڑپ کے دلِ بیقرار ختم ہوا

پیار کی چاندنی میں کھلتے ہیں
دشتِ انسانیت کے پھول ہیں ہم

زندگی نے کہا اُجالا ہیں
موت نے جب کہا فضول ہیں ہم

---••☆••---

نثار احمد علوی، حکیم

نثار احمد علوی ۱۳ر فروری ۱۹۲۱ء کو قصبہ کاکوری، ضلع لکھنؤ کے تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے- ان کے والد حکیم بشیر علی، جدِ محترم حبیب علی جدِ اعلیٰ حکیم مشتاق علی اور ان کے نانا حکیم محبّ علی سب شاعر تھے- نثار احمد صاحب کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم حلیم مسلم کالج کانپور اور فیض عام میں ہوئی- سنہ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے ہندوستان کے مشہور طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لے لیا اور سنہ ۱۹۴۶ء میں طب کی اعلیٰ سند حاصل کی- نثار احمد بنیادی طور پر ایک مستند حکیم تھے لیکن اپنے گھر میں شعروسخن کے ماحول سے متاثر ہو کر انہیں بھی شعروادب سے بے حد لگاؤ ہوا- نثار احمد علوی مستند حکیم تو تھے ہی لیکن وہ ایک خوبصورت شاعر بھی تھے- کراچی میں اپنے اشعار پر اصغر شاہ جہاں پوری سے اصلاح لیتے تھے- ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

کسی کی بزم سے نکلے جو ہم تو یوں نکلے کہ جل رہا تھا جبیں کی شکن شکن میں چراغ

ہمارا عزم ہمارا ہے حوصل ساقی جلائے بیٹھے ہیں اس دور پُر فتن میں چراغ

طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ کانپور آ گئے اور یہاں کے مشہور ہفت روزہ ''قومی اخبار'' میں نیوز ایڈیٹر ہو گئے- یہ اخبار برصغیر کے ممتاز صحافی اور دانشور جناب اسمٰعیل ذبیح نکالتے تھے- یہاں پر نثار احمد علوی صاحب نے صحافت کے رموز و نکات سے آگاہی حاصل کی- جب ان کے قلم کی جنبش حدودِ صحافت سے آگے بڑھی تو سنہ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے مشہور عرب سرجن ابوالقاسم الزہراوی کی کتاب ''التصریف'' کا ''جراحیاتِ زہراوی'' کے عنوان سے اردو ترجمہ کیا- یہ کتاب طبی دنیا میں بہت پسند کی گئی اور پاکستان و ہندوستان کے طبیہ کالجوں کے نصاب میں شامل کر دی گئی-

تقسیم ہند کے بعد سنہ ۱۹۴۹ء میں نثار علوی صاحب اپنے والد حکیم بشیر علی کے ساتھ پاکستان آ گئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی- یہاں پر وہ فوراً ہی ہمدرد دواخانے سے وابستہ ہو گئے اور سنہ ۱۹۷۰ء تک نائب مدیر ''اخبار الطب''، ناظمِ مطب ہمدرد، رجسٹرار ہمدرد طبیہ کالج اور معتمد ''انجمن ترقی طب'' اور ''پاکستان

طبی ایسوسی ایشن" کے مختلف فرائض دیتے رہے۔ اُس وقت پاکستان کے اطباء میں ان کا خاص مقام تھا۔ نثار احمد علوی صاحب پی آئی ڈی سی میں بحیثیت انچارج شعبۂ طب مشرقی کے فرائض بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ حکیم صاحب نے ایک کتاب "سخنورانِ کاکوری" اپنے والد صاحب کی خواہش پر لکھی ہے۔ "سخنورانِ کاکوری" اُردو کا پہلا تذکرہ ہے جسے مستند کتابوں کی مدد سے مشہور اور گمنام شاعروں اور ادیبوں کے سوانح اور ادبی خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ نثار احمد علوی نے اس کتاب کو لکھنے میں تیس سال صرف کیے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک کتاب "شب چراغ" لکھی جس میں انیس نامور شخصیات کا تذکرہ اور سات شہروں کی مرقع نگاری کی ہے۔ شخصیات کے تاثرات، جن کا تذکروں میں ذکر کیا گیا ہے، انہیں بالمشافہ ملاقاتوں یا بالواسطہ طور پر کسی دوسرے ماخذ یا شخص سے حاصل ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں نثار احمد علوی نے ایک ادبی ہفت روزہ "نیاز مانہ" کے نام سے جاری کیا تھا لیکن جلد ہی بند ہو گیا۔

"سخنورانِ کاکوری" اردو ادب میں ایک بڑا اضافہ ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب "سخنوران کاکوری" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "سخنورانِ کاکوری" جیسی جامع ضخیم اور معتبر کتاب کا اس خوش اسلوبی سے انجام پانے کا خاص سبب ہے۔ اس کے مرتب حکیم نثار احمد علوی صاحب کا ذہن و قلم ایک ایسے خانوادے کا تربیت یافتہ ہے، جس کے علمی و ادبی کارناموں کو ہماری تہذیبی زندگی میں مستقل روایت کی حیثیت حاصل ہے حکیم صاحب کے گھرانے میں پچھلی کئی صدیوں سے تالیف و تصنیف کا سلسلہ قائم ہے۔ حکیم صاحب کے والد بزرگوار شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، شعر فہمی کے ساتھ کتب بینی سے بھی ان کو شغف تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں فارسی اور اُردو ادبیات سے متعلق تقریباً ساری اہم کتابیں موجود تھیں اور ان کا بیشتر وقت مطالعے اور اہل علم کی صحبت میں صرف ہوتا تھا۔ مصنف کے بڑے بھائی سرفراز احمد فطرتؔ اور چھوٹے بھائی احسان احمد احسانؔ کو بھی شعر و سخن سے ربط خاصا ہے اور کبھی شعر کہتے ہیں؛ یوں سمجھ لیجئے کہ ان کا گھر "ایں ہمہ خانہ آفتاب است" کے مصداق ہے۔

اس پسِ منظر میں کہہ سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کو تالیف و تصنیف کا ذوق فطرت سے بھی ملا

ہے اور انہوں نے ورثے میں بھی بہت کچھ پایا ہے- لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے ورثے کی حفاظت ہی کو سب کچھ نہیں جانا- انہیں سعدیؔ کا یہ قول یاد ہے کہ

''آنچہ پدر نتواند پسر تمام کند''

چنانچہ انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں اور صلاحیتوں کے ذریعے' اس ورثے میں قابل قدر اضافہ بھی کیا ہے- زیرِ نظر کتاب اس اضافے کی ایک مثال ہے- ایسی مثال جو ایک طرف اپنے خاندان کی علمی و ادبی روایات کا تحفظ کرتی ہے اور اُسے آگے بڑھاتی ہے، دوسری طرف اس کے ذریعے، دوسرے علمی و ادبی گھرانوں کے افراد میں کام کرنے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے- میرا یقین ہے کہ جب تک مختلف گھرانوں' قصبوں اور شہروں کے لوگ اپنے اسلاف کی ذہنی کاوشوں اور تہذیبی قدروں کو کتابی صورت میں محفوظ کر لینے کی ذمہ داری قبول نہ کریں گے اور اپنے بزرگوں کے گُم شدہ کارناموں کے اجزا کا سراغ نہ لگائیں گے' مسلمان پاک و ہند کی ذہنی زندگی کی کوئی معتبر تاریخ مرتب نہ ہو سکے گی-

نثار احمد علوی کو شہر کانپور سے بڑا لگاؤ تھا- اپنے ایک تذکرے میں وہ لکھتے ہیں:

برصغیر کی تقسیم سے پہلے لوگ اسے ہنگامہ آرائی اور ہندو مسلم فساد کا شہر کہا کرتے تھے- یہ وہ لوگ تھے جو برطانوی حکومت کے کارندوں کی آنکھوں سے دیکھتے تھے- ان کے دماغوں سے سوچتے تھے اور ان کے مشوروں پر اپنی زندگی گزارتے تھے اور ان کی خواہشوں کو پورا کرتے تھے- کانپور کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ ایک حریت پرور شہر تھا- اس کے باسیوں میں ہمیشہ سے برطانوی حکومت کے خلاف چنگاریاں دبی رہی تھیں اور وہ سرفروشی کے میدان میں آگے رہا تھا-''

سخنورانِ کاکوری کے مصنف حکیم نثار احمد علوی ۲۷ جولائی سنہ ۱۹۸۶ء کو دارِ فانی سے رخصت ہو گئے- میوہ شاہ کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں-

--••☆••--

تجمل آفندی، میرزا تجمل حسین

میرزا تجمل حسین آفندی نام اور تجمل تخلص ہے۔ سنہ ۱۳۱۰ھ (۹۳-۱۸۹۲ء) کو آگرے کے علمی ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شعروسخن ان کے ورثے میں چلا آتا ہے۔ تجمل کے والد میرزا عاشق حسین بھی بڑے پایہ کے شاعر تھے اور بزم تخلص کرتے تھے۔ اس خاندان کے جدّ میں میرزا جعفر علی فصیح اپنے عہد کے معروف مرثیہ گو تھے جن کے متعلق محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ میرزا جعفر علی فصیح اپنے عہد کے چار نامی مرثیہ گو میں سے تھے۔ تجمل آفندی نے اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد چندے مفید عام اسکول، آگرہ میں داخل ہوئے اور آٹھویں کلاس پاس کی۔ یہاں پر انہوں نے انگریزی استعداد مطالعے سے حاصل کی۔

تجمل آفندی نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے اطراف شعروسخن کا ماحول پایا جس سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ دس بارہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ اپنے کلام کی اصلاح اپنے والد میرزا عاشق حسین بزم سے لیا کرتے تھے اور ان کے سوا انہوں نے کسی سے بھی اصلاح نہیں لی۔ ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے محکمہ ریلوے سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ اُن کی پوسٹنگ دلّی میں ہوئی جہاں تجمل آفندی کو سائل، بیخود اور امرناتھ ساحر جیسے اہلِ زبان کی صحبت میسر آئی۔ ایسی علمی صحبت میں انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور خود بھی استادی کا درجہ حاصل کرلیا۔ کچھ دنوں بعد تجمل آفندی کا تبادلہ غازی پور ہوگیا۔ یہاں پر انہوں نے ''انجمنِ شبابِ سخن'' قائم کی۔ اِن دنوں آل انڈیا شیعہ کانفرنس اپنے عروج پر تھی جس کے اجلاس بڑے بڑے شہروں میں منعقد ہوتے تھے۔ اِن اجلاس میں صفی لکھنوی اپنی تاریخی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں ہونے والی اس کانفرنس کے اجلاس میں جو ۱۵ سے ۱۷ اکتوبر تک الٰہ آباد میں منعقد ہوئے اُن کا ذکر کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

''اس اجلاس کی صدارت آنرایبل سید ابوجعفر (راجا پنڈراول) نے کی تھی۔ اس جلسے میں

نجم آفندی نے اپنی نظم ''درِ یتیم'' پڑھی۔نظم بہت کامیاب رہی اور اس کے ایک ایک مصرعے کو بار بار پڑھوایا گیا۔نظم ختم ہونے پر کئی حضرات نے انہیں گود میں اُٹھالیا۔حضرت عزیزؔ لکھنوی نے جو جلسے میں موجود تھے،انہیں طلائی تمغہ دینے کا اعلان کیا.......... (یہ نظم نجم آفندی کے پہلے مجموعۂ کلام ''پھولوں کا ہار'' میں شامل ہے۔''

اس زمانے میں سیاسی تحریک اپنے عروج پر تھی۔نجم آفندی ہمیشہ سے انگریزوں کے خلاف تھے۔انہوں نے بھی اس تحریک میں حصہ لینا شروع کیا تو اُن کے انگریز افسر نے انہیں ایسا کرنے کو منع کیا۔لیکن انہوں نے اُس کی کوئی بات نہیں سنی اور اپنی دھن میں لگے رہے۔انگریز افسر نے بطور سزا ان کا تبادلہ آسنسول بنگال میں کردیا۔بعد میں ملازمتوں کے ترک کرنے کا سوال اُٹھا تو انہوں نے بھی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔تحریک ترکِ موالات کا ذکر کرتے ہوئے ضیاء الحسن موسوی ''مجلّہ بیادِ شاعرِ اہل بیت حضرت علامہ نجم آفندی'' میں لکھتے ہیں:

''جب برصغیر میں تحریک ترکِ موالات پھیلی تو نجم آفندی نے سرکاری ملازمت ترک کردی اور ردولی لکھنؤ اور آگرہ میں کچھ وقت گزار کے حیدرآباد آگئے جہاں نواب شہید یار جنگ کنٹرولر جونیئر پرنس نے ان کو شاہزادہ معظم جاہ بہادر سے متعارف کرایا اور معظم جاہ ان کے گرویدہ ہوگئے اور جب نجم آفندی شہزادہ معظم جاہ کی اُستادی سے دستکش ہوگئے تو انہوں نے چھتہ بازار میں ایک دکان کھول لی جس میں مشقِ سخن کے ساتھ جوتے اور چپل فروخت کرتے تھے اور شام کو حکیم محمد عباس صاحب سرسوی کے گھر واقع دارالشفاء کی محفلوں میں حصہ لیتے تھے۔جہاں نواب شہید یار جنگ سید علی رضا صاحب سید علی بن کاظم صاحب زیباؔ ردولوی سید علی محمد اجلالؔ صاحب مولانا غلام عباس ناصرؔ یگانہ چنگیزی مہذبؔ لکھنوی غرض مختلف مہمان اور مقامی اہل کمال ادیب اور شاعر جمع ہوتے اور ہر قسم کی پُر تکلف اور بے تکلف نشستیں ہوا کرتیں جن میں فلسفۂ و مذہب کے نکات بھی زیرِ بحث آتے شعر و ادب کی بلندیاں بھی نظر آتیں اور بابا شی لطائف اور دعوتوں کے سلسلے بھی جاری رہتے۔''

حیدرآباد میں تیس برس تک قیام رہا پھر سنہ ۱۹۷۱ء کو اپنے چھوٹے بھائی سلیمان میرزا کوکبؔ آفندی

سے ملنے کراچی آئے تو عزیز و اقارب کے اصرار پر یہیں رہ گئے۔ چار سال بعد ۲۲ر دسمبر سنہ ۱۹۷۵ء کو تجمّ کا انتقال ہوا۔ سخی حسن قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ کلام ملاحظہ کیجیے:

اللہ! یہ نبیؐ کے نواسے کی موت تھی — زینبؑ کا غم شریک ہو، اتنا نہ تھا کوئی
برسا فلک سے خون زمیں تھرتھرا گئی — جو موج اُٹھی فرات سے سر پیٹتی اُٹھی

ماتم کا اہتمام کیا شش جہات نے
پُرسہ دیا امام کا کُل کائنات نے

دو گھڑی، عیشِ مصلّا چھوڑ دے — اُٹھ کوئی ٹوٹا ہوا دل جوڑ دے
تا کُجا محراب و منبر کی پناہ — دستِ باطل، حق کا دامن چھوڑ دے
یوں نہ جی، او ناشناسِ زندگی — گود میں انسانیت دم توڑ دے
موت برحق ہے، تو بن جا حق پرست — موت سے پہلے ہی کیوں جی چھوڑ دے
تجمّ! کچھ لفظی تکلّف چاہیے — بات وہ کیا، جو کلیجا توڑ دے

بھری بہار تھی، پھولوں میں آشیانہ تھا — میں سوچتا ہوں، حقیقت تھی یا فسانہ تھا
ملال کس کو ہے، دشمن نہیں، وہ دوست سہی — مجھے کسی نہ کسی سے فریب کھانا تھا

بدل دیتی ہے دنیا، مختلف مفہوم و معنی میں
جب آتا ہے اُدھر سے، ایک ہی پیغام آتا ہے

یہ موت ہوگئی، اے دوست! زندگی نہ رہی — جو دل میں تمنّا بری بھلی نہ رہی
حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی — تصورِ فکر و نظر ہے، جو تشنگی نہ رہی
پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر بھر پردہ — مگر نگاہِ محبت کبھی چھپی نہ رہی

--••☆••--

نذر الحسن صدیقی

معروف ادیب افسانہ نگار جناب نذر الحسن صدیقی یکم جولائی سنہ ۱۹۴۰ء کو عارف پور نوادہ ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم گھر پر اور مکتب میں ہوئی۔ سنہ ۱۹۵۲ء اسلامیہ کالج بدایوں سے میٹرک اور سنہ ۱۹۵۴ء میں انٹر کیا۔ اس کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد سنہ ۱۹۵۷ء میں نذر الحسن نے گورنمنٹ کالج لائل پور سے بی اے پھر ایس ایم لاء کالج کراچی سے ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ابتدا میں وکالت کرتے رہے پھر سنہ ۱۹۶۳ء میں حبیب بینک سے بحیثیت افسر اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے بینک ایگزیکٹو (سینئر وائس پریزیڈنٹ) ہوئے اور یہیں سے سنہ ۱۹۹۷ء میں سبکدوش ہوئے۔
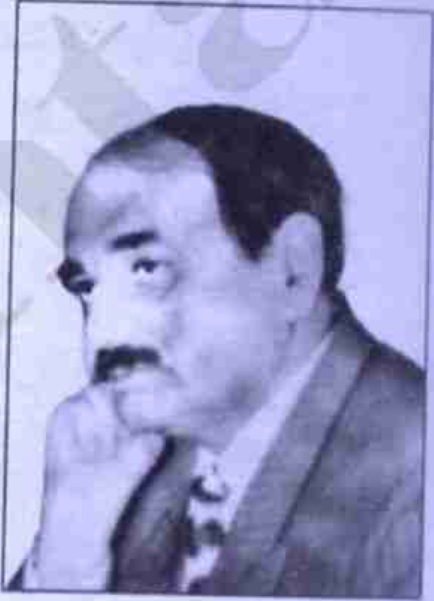
نذر الحسن نے ایسی سرزمین میں آنکھ کھولی جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس گہوارے میں نذر الحسن صدیقی کے خاندان پر نظر جاتی ہے تو دور دور تک علمی و ادبی لوگ نظر آتے ہیں۔ ان کے پر دادا احمد حسن علیل شاعر تھے اور علیل تخلص کرتے تھے اور دادا ابوالحسن صدیقی بصیر نثر نگار اور اردو فارسی اور انگریزی کے شاعر بھی تھے۔ نذر الحسن کے والد محترم ابوالموید سعید شاعر' دو صاحب دیوان پھوپیاں بیگم رسول جہاں تخفی بدایونی اور نور جہاں نور بھی شاعرہ تھیں۔ ان کے تایا ابوالفضل صدیقی اردو زبان کے نامور افسانہ نگار تھے۔ لہٰذا نذر الحسن کو جو کچھ ملا وہ انہیں اپنے خاندان سے ورثے میں ملا ہے۔ نذر الحسن کو بچپن ہی سے ادبی رسائل پڑھنے کا شوق تھا۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں بتایا:

''جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں ادبی کتب کے علاوہ اس دور کے بڑے رسالوں کو ہر ماہ آتے دیکھا مثلاً ادبی دنیا' ساقی' ادب لطیف' عالمگیر وغیرہ۔ ہوش سنبھالتے ہی پڑھنے میں ذرا سدبدھ ہوتے ہی ان ادبی رسائل کو پڑھنے کا موقع ملا جس میں میرے تایا ابوالفضل صدیقی کے افسانے باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے چونکہ وہ میرے تایا تھے اس لیے فطری طور پر ان کے افسانے میں بڑے ذوق اور شوق سے پڑھا کرتا اور چونکہ ان

افسانوں کا ماحول وہی تھا جس میں میں نے آنکھ کھولی، پرورش پائی، دیکھا اور برتا تھا۔ اس لیے ان کے افسانوں سے دیگر اور افسانہ نگاروں کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی اور مطالعہ وسیع ہوتا گیا میں ان سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ میں نے جن افسانہ نگاروں کو اپنے ابتدائی دور میں پڑھا وہ افسانے کا نشاۃ ثانیہ کہلایا جا سکتا ہے۔ تمام افسانہ نگاروں کے ہاں کہانی بہت قوی اور موثر انداز میں پیش کی جاتی تھی جو قاری کو اپنی بے پناہ گرفت میں لے لیتی تھی۔''

نذرالحسن نے خود افسانہ نگاری کی ابتدا سنہ ۱۹۶۷ء سے کی۔ ان کا پہلا افسانہ سہ ماہی ''نیا دور'' کراچی میں شائع ہوا جسے ادبی حلقوں نے بہت پسند کیا گیا۔ ان کے افسانوی مجموعہ ''سرد لہو کا نوحہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''میں نے ''سرد لہو کا نوحہ'' پر پیش لفظ لکھتے ہوئے نذرالحسن صدیقی کے ذہنی سفر اور افسانہ نگاری کے فن پر کچھ باتیں کہی تھیں۔ اُن میں ایک بنیادی بات یہ تھی کہ ان کے افسانوں میں جدید شہر ایک زندہ حقیقت ہے اور نذرالحسن جدید شہر کی پیچیدہ زندگی سے پیدا ہونے والی پیچیدہ تہذیبی، ذہنی اور مادّی صورتِ حال کے افسانہ نگار ہیں۔''

نذرالحسن کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے بھارت سے جگندر پال لکھتے ہیں:

''میں نذرالحسن صدیقی کی عصری صداقتوں کی بھانپ سے واقعی متاثر ہوا ہوں۔ نذرالحسن کی کہانیاں ایک مخصوص پہلو سے کراچی یا ساؤتھ ایشیا کے کسی بھی بڑے شہر کی حالیہ زندگی کی مثالی عکاسی کرتی ہیں۔ اس تناظر سے اُن کے یہاں واقعات کی لغوی ترتیب اتنی سلجھی ہوئی ہے کہ وہ سارے نکات برابر واضح ہوتے چلے جاتے ہیں جن کی بدولت ان کو کہانی کی تحریک ہوتی ہے۔''

تصانیف: (۱) ''سرد لہو کا نوحہ'' افسانوی مجموعہ ۱۹۸۴ء اور (۲) ''نئی سمت'' افسانوی مجموعہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ''قلم گوید'' شخصی خاکوں کا مجموعہ اور آفتاب تازہ (افسانوی مجموعہ) زیر طبع ہیں۔

نذرالحسن کو علمی ادبی خدمات کے اعتراف میں نقوش صدارتی ایوارڈ ۹۲-۱۹۹۱ء، فرینڈز ۲۰۰۰ء ایوارڈ، پاکستان نیشنل اکیڈمی ایوارڈ، بزم ادب ایوارڈ اور نیشنل بینک ایوارڈ برائے نثر دیا گیا۔

---••☆••---

نسیم درّانی

برِصغیر کے ممتاز و معروف افسانہ نگار،شاعر اور ادبی صحافی نسیم درانی ۱۴ راگست ۱۹۳۸ کو آگرہ بھارت میں پیدا ہوئے-ان کا اصل نام نسیم احمد خاں درّانی اور قلمی نام نسیم درّانی ہے-ان کے دادا ایک صاحب دیوان شاعر تھے اور والد نسیم احمد خاں درّانی تاریخی ناولوں کے مطالعہ کے شوقین تھے-نسیم درانی نے ابتدائی تعلیم آگرہ،ممبئی اور پھر پاکستان آ کر کراچی میں حاصل کی-اردو کالج سے بی اے کیا- اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس،سیکنڈ پوزیشن میں ایم -اے کی ڈگری''یادگار جگر'' گولڈ میڈل کے ساتھ حاصل کی-درّانی صاحب بچپن ہی پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے-بچپن میں انہوں نے بچوں کے رسائل پڑھے-اس کے بعد عبدالحلیم شرر،صادق صدیقی،رئیس احمد جعفری،نسیم حجازی کے ناولوں کا مطالعہ کیا-آٹھویں نویں کلاس تک انہوں نے منٹو اور عصمت کی تقریباً ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں-سنجیدہ مطالعے کے شوق نے انہیں ایسا شعور بخشا کہ ایک نامور افسانہ نگار ہو کر چھکے اور ادبی صحافت پر چھاگئے-درانی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ سے شروع ہوگیا تھا-۱۹۵۳ میں ان کی پہلی تحریر ماہنامہ ''ساتھی'' کراچی میں شائع ہوئی-

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد نسیم درّانی نے افسانہ نگاری،شاعری اور ادبی صحافت ہی کا پیشہ اختیار کیا-وہ ۱۹۶۳ سے تاحال کراچی سے شائع ہونے والے سہ ماہی ''سیپ'' کے ایڈیٹر ہیں-اس ادبی سہ ماہی ''سیپ'' نے نسیم درّانی کو ایسی شہرت بخشی کہ ''سیپ'' ان کی شناخت ہوگیا-''سیپ'' کے علاوہ درّانی صاحب کئی اور ماہناموں کے ایڈیٹر بھی ہیں-۱۹۷۱ سے تاحال ماہنامہ ''الفاظ'' کراچی،۱۹۸۶ سے تاحال ماہنامہ ''سمندر'' کراچی اور ۱۹۷۲ء سے تاحال ماہنامہ ''آرٹس انٹرنیشنل'' کراچی میں بحیثیت ایڈیٹر خدمات انجام دے رہے ہیں-۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۶ء تک ماہنامہ ''ناول سیریز'' کراچی اور ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۴ء تک ماہنامہ ''نقش'' میں بھی بحیثیت ایڈیٹر و سب ایڈیٹر رہ چکے ہیں-

نسیم صاحب مختلف علمی،ادبی اور ثقافتی اداروں سے وابستہ ہیں اور اہم مناصب پر خدمات انجام

دے رہے ہیں۔ ۱۹۹۵ء سے تاحال رائٹرز گلڈ (مرکز) کے سکریٹری جنرل ہیں۔ اس کے علاوہ بورڈ آف گورنرز'' پاکستان اکادمی آف لیٹرز'' اسلام آباد' بورڈ آف گورنرز'' نیشنل بک کونسل آف پاکستان'' اسلام آباد' مرکزی مجلس عاملہ انجمن ادبی رسائل پاکستان لاہور اور دوسری متعدد انجمنوں کے رکن ہیں۔

نسیم درّانی کی تصانیف میں ابھی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے البتہ دو کتابیں ''ٹھوکر گلی'' اور'' چچا سام کے نام'' زیر طبع ہیں۔'' ٹھوکر گلی'' افسانوی مجموعہ اور'' چچا سام کے نام'' طنزیہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ ان کی مطبوعہ تحریریں بہت ہیں جو پاک و ہند کے رسائل میں چھپ چکی ہیں۔

نسیم درّانی کی علمی ،ادبی اور ثقافتی خدمات کے اعتراف میں انہیں متعدد اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں تمغۂ امتیاز اسلام آباد، ۱۹۸۰ء میں ایوارڈ بحیثیت مدیر بزم ہم خیال (کراچی)، ۱۹۸۸ء میں ایوارڈ بحیثیت مدیر کل پاکستان انشائیہ کانفرنس (لودھراں ملتان) اور ۱۹۸۲ء میں سیپ کی خدمات پر رائٹرز گلڈ سندھ نے ایوارڈ دیا۔

---••☆••---

نظرؔ امروہوی

پورا نام سید علی منصرم خاں نقوی تخلص نظرؔ اور قلمی نام نظرؔ امروہوی ہے۔ ۲۷ رنومبر سنہ ۱۹۲۴ء کو امروہہ کے سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ''گھڑیال والے'' (گھڑیال منزل) کے نام سے مشہور تھا۔ نظرؔ امروہوی کا سلسلۂ نسب مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ شرف الدینؒ سے ملتا ہے۔ ان کے والد سید علی محتشم خاں کا شمار امروہہ کے معززین میں ہوتا تھا۔ ان کے دادا علی تقی خاں نقوی اور پردادا علی منتظم خاں نقوی حضرت امیر مینائیؔ کے تلامذہ میں سے تھے اور اودھ پنچ کے مرزا لاا ُبالی نظرؔ امروہوی کے حقیقی نانا تھے۔ گھڑیال منزل کے دیوان خانے میں ایک طرف سیاسی اور علمی شخصیتیں آتی تھیں تو دوسری طرف شعروسخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں روشؔ صدیقی، ماہرؔ القادری، بہزادؔ لکھنوی، نخشبؔ جارچوی، تابشؔ دہلوی، خمارؔ بارہ بنکوی، رازؔ مرادآبادی اور جگرؔ مرادآبادی جیسے نامور شعراء شریک ہوتے تھے۔

نظرؔ امروہوی کی ابتدائی تعلیم گھر کے بعد مدرسہ تحصیل میں ہوئی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول اور پھر امام المدارس ہائی اسکول میں پڑھا اور یہیں سے میٹرک پاس کیا۔ مٹرک کے بعد انٹر کرنے کے لیے انہوں نے گورنمنٹ کالج مرادآباد میں داخلہ لیا لیکن ادھوری تعلیم چھوڑ کر علی گڑھ چلے گئے۔ اور پھر وہاں سے بھی بھاگ کر دہلی چلے گئے۔ شعرسخن کا ذوق خاندانی ورثہ سے ملا تھا۔ دہلی میں ان کی ملاقات خواجہ محمد شفیع اور کنور مہندر سنگھ بیدیؔ سے ہوئی۔ انہوں نے نظرؔ امروہوی کو پطرس بخاری سے ملایا۔ پطرس بخاری نے ان سے معلوم کیا کہ کیا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا انٹر کی پڑھائی چھوڑ کر یہاں آیا ہوں، شعروسخن کا ذوق ہے اور پھر اپنا یہ شعر سنایا:

نہ کارواں ہے نہ رہ گزر ہے نہ کوئی منزل نہ کوئی رہبر
مقام ہوش و خبر سے آگے تمام عالم غبار سا ہے

پطرس بخاری کو شعر بہت پسند آیا اور انہیں سمجھایا کہ واپس علی گڑھ جا کر اپنی تعلیم مکمل کر لو بی اے

کرلو گے تو میں تمہیں ریڈیو پاکستان میں کسی اچھی جگہ پر لگا دوں گا۔ لیکن نظر امروہوی کو پڑھائی سے زیادہ دلچسپی ریڈیو کی ملازمت سے تھی۔ لہٰذا پطرس بخاری نے جمعہ کے دن نظر سے نعت پڑھوانی شروع کر دی۔ نظر صاحب عرصۂ دراز تک آل انڈیا ریڈیو سے ہر جمعہ کو نعتِ سرورِ کائنات پیش کرتے رہے۔ اس کے بعد فیچر پروگرام میں بھی کام کرنے لگے اور آل انڈیا مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ مشاعروں میں ان کی ملاقات اے ڈی اظہر سے ہوئی جنہوں نے نظر امروہوی کو ریلوے کے محکمہ اکاؤنٹس میں ملازم کرا دیا۔ ریلوے میں نظر صاحب مہینہ پر تنخواہ لینے کی حد تک ملازم تھے باقی کام دھام کچھ نہ کر کے دیا۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان چلے آئے اور لاہور میں مقیم ہوئے اور اپنے محکمے ریلوے اکاؤنٹس سے منسلک رہے۔ جس دن وہ پاکستان آئے اسی دن رات کو گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک آل پاکستان مشاعرہ تھا جس کی صدارت پطرس بخاری کر رہے تھے۔ نظر صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ دوران مشاعرہ پطرس بخاری کی نگاہ ان پر پڑی تو انہیں اسٹیج پر بلایا اور مشاعرے کے شرکاء سے متعارف کرایا۔ اس تعارف اور مشاعرے کی روداد کا ذکر انتظار حسین نے اپنی کتاب ''بجھتے چراغوں کا دھواں'' میں کیا ہے۔ نظر امروہوی ۴۵ سال کی عمر میں ریلوے کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے کر کراچی آ گئے۔ یہاں پر اب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے ایک فرزند اقبال نظر معروف افسانہ نگار ہیں۔ دوسرے بیٹے انجم ایاز عالمی شہرت یافتہ مجسمہ ساز ہیں اور اس فن میں دنیا بھر میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ حال ہی میں ان کے شاہکار مجسمے کراچی کے ساحل پر سی ویو کے سامنے نصب کیے گئے ہیں جو ان کے کمالِ فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ نظر صاحب کے ایک بیٹے جاوید نظر آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم کے کوچ ہیں۔ وہ آسٹریلیا کے نیشنل ہیں اور وہیں مقیم ہیں۔

نظر امروہوی نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں شعر و سخن کا چرچا پایا تو بچپن ہی میں شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔ انہوں نے غزل کو اپنا شعار بنایا اور شعیب حزیںؔ امروہوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام ''متاعِ نظر'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے اور دوسرا مجموعہ ''شعاعِ نظر'' زیرِ ترتیب ہے۔ نظر امروہوی کے کلام ''متاعِ نظر'' کے کچھ منتخب اشعار ذیل میں درج ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

ہر ایک گام پہ ڈالی نئے سفر کی طرح
دیارِ شوق سے گزرے ہیں راہبر کی طرح

بدل گئے ہیں طریقِ وفا میں کچھ ہم بھی
تری نظر بھی نہیں اب تری نظر کی طرح

کوئی الجھن نہیں پھر بھی کسی الجھن میں رہتا ہے
عجب دھڑکا سا ہر دم دل کی ہر دھڑکن میں رہتا ہے

حریم دیدہ و دل میں چراغاں جن کے دم سے تھا
اب اُن یادوں کا سناٹا مرے آنگن میں رہتا ہے

خودی کو بیچ کر جھوٹی مسرت مل تو سکتی ہے
مگر طوقِ ملامت عمر بھر گردن میں رہتا ہے

نظرؔ محبت کے راستوں میں کچھ ایسے دلکش مقام آئے

کہ اب خیالِ سکونِ منزل بھی فطرتِ غم پہ بار سا ہے

غم سے مانوس طبیعت کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

پھر وہی غم کے اندھیرے وہی تنہائی ہے
زندگی کیا مجھے پھر ہوش میں لے آئی ہے

ہر ایک نقشِ تمنا مٹا دیا دل سے
اب اور اے غمِ جاناں تری خوشی کیا ہے

خِرد گم، ہوش گم، دل گم، نظر گم
اسی عالم میں ہوں شام و سحر گم

بہار آئی تو یارانِ گلستاں
نہ جانے ہو گئے کیا سوچ کر گم

سوزِ غم تیری نگاہوں سے نمایاں ہوگا
میں پریشاں ہوں تو کیا تو نہ پریشاں ہوگا

لوگ کہتے ہیں نہ تو لوٹ کے آئے گی کبھی
عمر بھر کیا نہ مرے گھر میں چراغاں ہوگا

میں تجھے دل سے بھلا دوں یہ مرے بس میں نہیں
تو مجھے دل سے بھلا دے ترا احساں ہوگا

فصلِ گل اب کے بھی آئے گی چمن میں لیکن
جیب و دامن ہی نہ ہوں گے نہ گریباں ہوگا

زندگی بحرِ حوادث میں گزاری ہے نظرؔ
پھر ہمیں کیا کوئی اندیشۂ طوفاں ہوگا

زندگی گرمِ سفر ہے مری رفتار کے ساتھ
میں جو ٹھہرا تو یہ طوفاں بھی ٹھہر جائے گا

کوئی رہبرؔ کوئی جادہ ہے نہ کوئی منزل
اب کہاں لے کے مرا شوقِ سفر جائے گا

--••☆••--

نظیر حسنین زیدی، پروفیسر ڈاکٹر سید

پروفیسر ڈاکٹر سید نظیر حسنین زیدی یکم اپریل ۱۹۲۳ء کو ضلع کرنال کے قصبے برست نواح پانی پت کے تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ابوالحسن زیدی محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر نظیر حسنین اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم فیروز پورہ میں حاصل کی۔ فارسی اور عربی کی تعلیم بستی نوگاواں ضلع امروہہ جا کر مولانا سبط نبی کی سرپرستی میں حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے دہلی جا کر مولانا سبطِ حسن اور ابوبکر شیث کی سرپرستی میں اورنٹیل کالج فتح پوری سے منشی فاضل کا امتحاں پاس کیا۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۰ء میں فاضل اور ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ گریجویشن کے بعد ڈاکٹر صاحب نے آریہ ہائی اسکول پانی پت میں بطور معلم عارضی ملازمت اختیار کر لی۔ تقسیم کے بعد ہجرت کر کے وہ پاکستان آ گئے۔ یہاں بھی انہوں نے درس وتدریس کے مہذب پیشے کو نہیں چھوڑا۔ کراچی میں انہوں نے جیکب لائنز ہائی اسکول نمبر۲، جامعہ ملیر اسکول کراچی اور دیگر مدارس میں تعلیم دیتے تھے۔ درس وتدریس کے ساتھ وہ خود بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے سندھ یونیورسٹی سے اول درجے میں ایم اے اردو کیا۔ اول آنے پر یونیورسٹی کی طرف سے انہیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں نظیر حسنین نے کراچی یونیورسٹی سے اول درجے میں ایم اے فارسی کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے بی ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں انہوں نے مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

پبلک سروس کمیشن کی کامیابی کے بعد گورنمنٹ کالج سکھر حیدر آباد میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مسلسل سترہ اٹھارہ سال سندھ کے مختلف تعلیمی اداروں میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ جن کالجز میں انہوں نے پڑھایا اُن میں گورنمنٹ کالج حیدر آباد، گورنمنٹ کالج ٹنڈو محمد خان، گورنمنٹ کالج ٹھٹھہ، ممتاز کالج خیر پور اور سُپیریر سائنس کالج کراچی شامل ہیں۔ ریٹائرمنٹ سے سات

سال قبل ۱۹۸۰ء میں نظیر حسنین صاحب نے سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کرنے کا اعزاز پایا۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ ''مولانا ظفر علی خان بحیثیت شاعر و صحافی'' تھا۔ اس تحقیقی مقالے میں انہوں نے مولانا ظفر علی خان کی علمی اور ادبی خدمات کا تذکرہ بڑی مہارت سے کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب فارسی میں بھی پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے جس کا موضوع ''نعمت علی خان'' تھا مگر بعض وجوہ کی بنا پر اس خواہش کی تکمیل نہیں ہوسکی۔

درس و تدریس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب دینی کاموں سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۷ء تک انجمن وظیفہ سادات مومنین پاکستان کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ مسجد نور ایمان ٹرسٹ کراچی کی مسجد و مدرسہ کے بھی ٹرسٹی رہے۔ اس دینی علمی فریضے میں بھی انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک ممتاز شخصیت اور اعلیٰ درجے کے استاد تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی پڑھنے لکھنے اور تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے میں گزاردی۔ ۳ر نومبر ۱۹۹۳ء کو ان کی زندگی کا سفر اختتام کو پہنچا۔ قلیل علالت کے بعد وہ دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ کینال ویو ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے علمی و ادبی مضامین صحیفہ لاہور، ہماری زبان کراچی، الولی حیدرآباد، جام نو کراچی، ماہنامہ معارف اسلام اور دیگر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے بھی متعدد کتابیں لکھیں۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی کے مطبوعہ علمی سرمائے میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

(۱) غالب تاریخ کے آئینہ میں ۱۹۶۳ء
(۲) انقلابِ ایران بیسویں صدی میں ۱۹۶۶ء
(۳) خطوط مولانا جلال الدین حیدر ۱۹۷۵ء
(۴) مولانا ظفر علی خان بحیثیت شاعر ۱۹۸۰ء
(۵) بچوں کی باتیں ۱۹۸۳ء
(۶) شخصیات و مباحث ۱۹۸۳ء
(۷) تذکرہ سہوان ۱۹۸۵ء
(۸) مولانا ظفر علی خان بحیثیت صحافی ۱۹۸۵ء
(۹) مولانا ظفر علی خان احوال و آثار ۱۹۸۶ء

--••☆••--

نقاش کاظمی

نقاش کاظمی کا اصل نام کاظم علی، تخلص نقاش اور قلمی نام نقاش کاظمی ہے۔ نقاش کاظمی ۱۸ر جولائی سنہ ۱۹۴۴ء کو بنارس کے قریب مغل سرائے میں پیدا ہوئے۔ تیسرے درجے تک ابتدائی تعلیم جون پور کے ایک پرائمری مدرسے میں ہوئی۔ اس کے بعد والدین کے ساتھ پاکستان آگئے اور کراچی کے معروف علاقے پی آئی بی کالونی میں رہائش اختیار کی۔ اس کے بعد ان کے خاندان کا قیام کراچی کی مختلف بستیوں، جن میں کورنگی، لیاقت آباد وغیرہ شامل ہیں، میں رہا۔ نقاش صاحب کو فیض عام ہائی اسکول پی آئی بی کالونی میں پانچویں کلاس میں داخل کرادیا گیا۔ فیض عام ہائی اسکول میں نویں کلاس تک پڑھا پھر حالی مسلم سیکنڈری اسکول لارنس روڈ میں داخلہ لیا اور یہیں سے سائنس میں میٹرک پاس کیا۔ سندھ مسلم کالج سے انٹر کرنے کے بعد انہوں نے ٹیلی کمیونی کیشن اسٹاف کالج سے ٹیلی کمیونی کیشن انجینئرنگ کا کورس کیا۔ اس کے بعد ملازمت کے ساتھ ساتھ اردو کالج سے بی اے کیا۔ سنہ ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۲ء میں جامعہ کراچی سے اُردو لسانیات اور اُردو ادب میں ایم اے کیا۔ بیرونی امیدوار کی حیثیت سے سیاسیات میں ایم اے کرنے کے بعد آخر میں اُردو کالج سے ایل ایل بی کیا۔

نقاش کاظمی کو بچپن ہی سے شعروسخن سے لگاؤ ہو چکا تھا۔ حالانکہ ان کے والد صاحب نے انہیں بار بار نصیحت کی کہ پہلے تعلیم حاصل کرلو اس کے بعد شاعری کرنا۔ لیکن انہیں شاعری سے اس قدر لگاؤ تھا کہ والد سے چھپ چھپ کر شعر کہتے تھے۔ دراصل شعروسخن اور ادبی رویے کا چسکا اس وقت پڑا جب ان کے والد صاحب نے انہیں گلستاں، بوستاں اور بانگِ درا ختم کرائی تھی۔ اس کے علاوہ شعروادب انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد بھی شاعر ادیب و عالم تھے اور شعر کہتے تھے۔ اُن کی تصنیف کی ہوئی کتاب ''فصیح اردو'' کے نام سے تقریباً بارہ سال تک پٹنہ یونیورسٹی کے انٹر کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ جون پور کے رسالے ''شمیم'' کے مدیر بھی رہے اور لکھنؤ میں انہیں ''فصیح الملک'' کے خطاب سے بھی نوازا گیا تھا۔ نقاش کاظمی کی ابتدائی شاعری کا یہ شعر ہے، جو انہیں

یاد ہے۔

میرے اشکوں سے کسی گھر کے دیے جلتے ہیں
روز کوچے میں ترے اس لیے میں جاتا ہوں

نقاش کاظمی اپنی شاعری اور شاعری کا طرز اور ادبی رویہ تبدیل ہو جانے کے بارے میں فرماتے ہیں:

''لیکن ہماری شاعری کا طرز اور ادبی رویہ سنہ ۱۹۶۱ء میں تبدیل ہوا جب کہ ہم نے میٹرک پاس کر لیا۔ ترقی پسند شاعروں ادیبوں سیاسی لوگوں کا ماحول ملا۔ ہمیں شاعری میں میرؔ وغالبؔ سے جو مختلف آواز ملی وہ ساحر کی ''تلخیاں'' تھی۔
اس کتاب نے ہم پہ گہرا اثر ڈالا۔ اس شعر کے الفاظ مفلسی حس لطافت اور ادب و آدابِ زندگی کے ان خانوں کے نام ہیں جن سے ہمارا خاندان ہمارے دوست اور معاشرہ گزر رہا تھا۔ اور یہیں سے ہم نے اپنا حس لطافت کا کلام چھوڑ کر مفلسی بھوک بیماری جہل نا انصافی اور ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھانے والی شاعری کو اپنا مسلک بنایا۔ اس طرح ہمارا راستہ وہ بنا جو ادب کے مقابلے میں ادب برائے زندگی کہلاتا ہے۔''

نقاش کاظمی ابتداہی سے بہت سی تنظیموں سے وابستہ رہے لیکن بعد میں وہ ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سے وابستہ ہو گئے۔ آج کل وہ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی سے منسلک ہیں۔

حصولِ معاش کے لیے انہیں بڑی جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے بہت سے چھوٹے چھوٹے مختلف کام کیے اور اکلِ حلال کے لیے محنت مزدوری اور کسی بھی کام کو عیب نہیں سمجھا۔ حالانکہ ان کا تعلق اُس خاندان سے ہے جو زمانہ گزشتہ میں زمیندار گھرانا تھا۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں نقاش کاظمی ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور انجینئرنگ کا کورس کرنے کے بعد سنہ ۱۹۶۵ء میں اسی محکمے سے منسلک ہو گئے۔ انہوں نے کچھ عرصہ نبی باغ ضیاء الدین میموریل کالج اور سراج الدولہ کالج میں بحیثیت لیکچرار درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ نقاش کاظمی صاحب کے تین مجموعے ''چاندنی اور سمندر''، ''رخ سیلاب'' اور ''رنگ سفر'' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ نثر اور شاعری پر کئی کتابیں زیر طبع ہیں۔

نقاش کاظمی کے چند اشعار پیش ہیں ملاحظہ کیجئے ۔

کوئی تو آخر اس دھرتی پر روپ تمہارا جانے گا　　چاند کے اوپر خاک پڑے گی پھول سے پیارا جانے گا

درد کے کیا کیا رنگ کھلیں گے کیا مطلب انگڑائی کا　　آنکھ اگر خاموش رہے گی جسم تو سارا جانے گا

ہر چہرہ بے چہرہ ہوکر کورا کاغذ چھوڑ گیا　　اب بینائی ماند پڑے تو آنکھ کا تارا جانے گا

منا رہے ہیں جو کچھ لوگ جشنِ موسمِ دار　　انہیں بتاؤ کہ اب رات جانے والی ہے

اُجڑ کے رہ گیا بستی میں کوچۂ عشاق　　دلوں کے شہر میں بھی اب کے قحط سالی ہے

پرانے زخم ابھی مندمل ہوئے بھی نہ تھے　　بنا یہ کس نے نئی وحشتوں کی ڈالی ہے

چلی ہے کیسی ہوا اس کی بادشاہی میں　　کہ دست، دستِ طلب ہے نظر سوالی ہے

کسی کی یاد میں نقاش ہم نے اک تصویر　　اندھیری رات کی دیوار پر بنالی ہے

کرو نہ غم کہ ضرورت پڑی تو ہم دیں گے
لہو کا تیل چراغوں میں ڈالنے کے لیے
سَروں کی فصل جو تیار ہے تو کیوں نہ کٹے
بہت ہے عہدِ جوانی تو کیوں ہو عمر دراز

اے ارضِ وطن میرا مقدر بھی یہیں ہے
حالات کے نیزے پہ مرا سر بھی یہیں ہے
میں سیکھ رہا ہوں نئی ٹھوکر کا قرینہ
شاید کہ مری راہ کا پتھر بھی یہیں ہے

--••☆••--

نقی محمد خاں خورجوی

نقی محمد خاں ۷ ار مئی ۱۸۸۹ء کو یوپی بھارت کے ایک بڑے قصبہ خورجہ میں پیدا ہوئے جو دہلی سے ۵۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے-اس قصبے میں کچھ پٹھان قبیلے کاکڑ، خلیل، خویشگی، غذی، ترین، مہمند اور سلمہاک نام کے آباد تھے-والد کی طرف سے نقی محمد کا تعلق پٹھان قبیلے ''خلیل'' سے اور والدہ کی طرف سے ''کاکڑ'' سے تھا-نقی محمد جو خود بھی پولیس انسپکٹر رہے ہیں ان کے دو بیٹے تقی محمد خاں اور سمیع محمد خاں دونوں بھائی کراچی پولیس میں ڈی آئی جی کے اہم منصب پر انتہائی ایماندارانہ خدمات انجام دے چکے ہیں-تقی محمد خاں سے راقم حروف کی بھی عرصہ دراز تک خاصی دعا سلام رہی ہے-ان کا رہن سہن ایک عام آدمی جیسا، سادہ اخلاق انتہائی بلند اور رویہ ہمدردانہ تھا-ان سے ملتے ہوئے کسی کو یہ شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ڈی آئی جی کے اتنے اہم عہدے پر فائز ہیں-

نقی محمد خاں نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنی والدہ سے حاصل کی-اس کے بعد انہیں محلے کے ایک مکتب میں داخل کیا گیا-تیرہ چودہ سال کی عمر میں نقی محمد خاں کو خورجہ کے انگریزی وکٹوریہ جوبلی اسکول میں داخل کیا گیا-اسی زمانے میں انہیں مضامین اور ناول لکھنے اور رسالے میں اپنا نام چھپوانے کا شوق ہوا جسے ان کے والد پسند نہیں کرتے تھے-سرکاری ملازمت کی مصروفیت کے سبب ان کے والدان کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکتے تھے لہٰذا انہوں نے نقی محمد خاں کو ان کے کزن کے پاس سنبھل بھیج دیا-اس طرح وہ کچھ دن سنبھل میں پڑھے-جب کزن کا بریلی تبادلہ ہوا تو یہ بھی بریلی چلے گئے-بریلی جانے کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد نے انہیں پھر خورجہ بلا کر اسکول میں داخل کرادیا-اسی دوران نقی محمد خاں سخت بیمار ہوگئے اور تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا-جب یہ صحت یاب ہوئے تو پنجاب میٹرک کی تیاری کرنے لگے-اس وقت ان کی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی-

ایک دن نقی صاحب کو معلوم ہوا کہ انسپکٹر جنرل پولیس دورے کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں تو یہ ان کے کیمپ میں پہنچ گئے اور انہیں اپنے آنے کی اطلاع کرائی-انسپکٹر جنرل نے انہیں اندر بلایا

اور پوچھا کہ کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں ملازمت چاہتا ہوں- پولیس افسر نے ان سے عمر اور تعلیم کا پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میری عمر ۱۸ سال ہے- فارسی، اردو انگریزی اور قرآن پڑھنے کی حد تک عربی بھی جانتا ہوں اور آج کل میٹرک کی تیاری کر رہا ہوں- یہ سن کر افسر نے کہا کہ ملازمت کے واسطے عمر دو سال کم ہے- کیونکہ بیس سال سے قبل ملازمت کا شمار نہیں ہوتا- بہتر یہی ہے کہ تم میٹرک پاس کر لو تاکہ تم کو ٹریننگ اسکول بھیج دیا جائے ورنہ ہیڈ کانسٹیبل بھرتی کیے جاؤ گے دس روپے ماہور تنخواہ ہوگی- علی گڑھ میں رہ کر قواعد پریڈ اور قوانین وغیرہ کا امتحان پاس کرنا ہوگا- دو سال بعد ٹریننگ اسکول مراد آباد بھیجے جاؤ گے- جب نقی صاحب نے یہ شرائط منظور کر لیں تو پولیس افسر نے ایک خط سپرنٹنڈنٹ پولیس علی گڑھ کو لکھ کر انہیں دیا- جب ان کے والد صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور بُرا بھلا بھی کہا لیکن ان کی لعن طعن کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور یہ خط لے کر خوشی خوشی علی گڑھ چلے گئے- اس طرح ان کی ملازمت کا آغاز محکمہ پولیس سے ہوا اور پھر محنت و مشقت سے ترقی کے مراحل طے کرتے رہے اور مختلف شہروں میں اپنی خدمات انجام دیں-

۱۹۰۴ء میں نقی محمد صاحب کا تبادلہ الہ آباد ہو گیا- یہاں پر ان کی ملاقات اکبر الہ آبادی کے حقیقی بھانجے سید علی حسین سے ہوئی- ایک دن انہوں نے سید صاحب سے کہا کہ اپنے ماموں اکبر الہ آبادی سے ملاقات کرائیں- چنانچہ ایک دن سید صاحب انہیں اکبر الہ آبادی صاحب کے پاس لے گئے اور ماموں سے ان کا تعارف کرایا- تعارف کے بعد اکبر الہ آبادی نے بتایا کہ وہ خورجہ میں منصف رہ چکے ہیں اور ان کے خاندان سے بخوبی واقف بھی ہیں- اور جب یہ معلوم ہوا کہ نقی صاحب بھی پولیس میں ملازم ہیں تو یہ شعر پڑھا۔ حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں

کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

رفتہ رفتہ اکبر الہ آبادی سے ان کے اتنے گہرے مراسم ہو گئے کہ انہوں نے اپنی عشرت منزل کا ایک حصہ نقی صاحب کے لیے مخصوص کر دیا جہاں یہ کئی سال متواتر ان کے ساتھ رہے- اکبر الہ آبادی کی صحبت میں رہنے سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور علمی و ادبی فوائد حاصل کیے- پانچ چھ سال کی اس مدت میں انہوں نے اکبر الہ آبادی کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا- اپنی خود نوشت میں اکبر الہ آبادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بعض اصحاب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اکبر مردہ دل تھے - میرا خیال اس کے برعکس ہے - اکبر کی زبان اور قلم وقتی حالات اور تاثرات کے ترجمان تھے - انسانی دل رکھتے تھے - تنہائی' بے کسی' ضعیفی اور علالت سے کیسے متاثر نہ ہوتے؟ سوائے ایک بیوہ ضعیف بہن کے کوئی بھی تو گھر میں نہ تھا - وہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

جب طبیعت خوش نہ ہو تو کیا کرے اچھا مکان
دل بہل سکتا نہیں اپنا در و دیوار سے

بیوی کے انتقال کے بعد ہاشم ایک سہارا تھا' جب وہ بھی جوان ہونے سے پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا' فرماتے تھے کہ کتنا بڑا دل ہے کہ دل شکنی ہوتی ہی رہتی ہے -''

نقی محمد محکمہ پولیس میں کئی اہم مناصب پر فائز رہے اور ہر جگہ انتہائی محنت اور ایمانداری سے خدمات انجام دیں - پینتیس سال سروس کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے تو انہیں چھ طلائی و نقرئی تمغے دیے گئے اور خان صاحبی' خان بہادری جیسے اعزازات سے نوازا گیا - گورنر جنرل نے اپنی تقریر میں ان کے تمام کارناموں کو ایک ایک کر کے گنایا - ریٹائرمنٹ کے بعد تحریک پاکستان میں بھی نمایاں کام کیا - ۲۳ را پریل ۱۹۵۲ء کو نقی صاحب پاکستان آ گئے اور کراچی میں مقیم ہوئے -

نقی محمد کو دوران طالب علمی ہی سے لکھنے لکھانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا جس کا سلسلہ ملازمت کے دوران بھی جاری رہا - ان کے سیکڑوں مضامین اخبار اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے - ان کی تصانیف و تالیف میں مندرجہ ذیل کتابیں ہیں جن میں ''عمر رفتہ'' ان کی خود نوشت ہے جو شاہد احمد دہلوی کے اصرار پر لکھی تھی -

(۱) بزمِ حسیناں (۲) زینت الحرم (۳) طلسمِ ہستی (۴) اعجوبۂ اسرار (۵) انتخاب دلپسند (۶) بقول شخصے (۷) مذاقِ سلیم (۸) میلاد شریف (۹) شیطان کی خالہ (۱۰) قدیم خورجہ (۱۱) تاریخ خاندان خلیل (۱۲) حیات امیر خسرو (۱۳) سرمد شہید (۱۴) غنچۂ ادب (۱۵) عمر رفتہ

۲۳ رنومبر ۱۹۶۹ء کو نقی محمد خاں دار فانی سے رخصت ہو گئے - کراچی میں سوسائٹی کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں -

---••☆••---

نگار صہبائی

ان کا اصل خاندانی نام محمد سعید تھا، لیکن اس نام سے انہیں کوئی بھی نہیں جانتا-ان کی شہرت ان کے قلمی نام نگار صہبائی سے ہوئی جو ان کے استاد پروفیسر محی الدین اثر نے رکھا تھا-ان کے والد محترم کا نام محمد فضل الکریم تھا-محمد سعید صاحب ۷ر اگست ۱۹۲۶ء کو ناگپور (بھارت) میں پیدا ہوئے-نگار صہبائی نے ابتدائی تعلیم مدراس کے مدرسۂ اعظم میں حاصل کی-اس کے بعد انجمن ہائی اسکول ناگپور سے میٹرک پاس کیا-۳ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء کو پاکستان آ گئے-کراچی یونیورسٹی سے انٹر اور پھر گریجویشن کیا-نگار صہبائی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شعر موزوں کرنے لگے تھے-شعری تربیت انہوں نے اپنے ماموں عبدالوہاب صاحب سے حاصل کی-اس کے علاوہ ابتدا میں انہوں نے افسانے بھی لکھے اور پھر پینٹنگ کا شوق بھی رہا-نگار صہبائی نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن گیت ان کی محبوب صنفِ سخن تھی-اُردو شاعری میں گیت کی صنف اگرچہ قدیم ہے لیکن اس کے حوالے سے چند ہی شعراء کے نام مشہور ہیں-ان شعراء میں نگار صہبائی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا-

ان کے گیت ملک کے مشہور رسالوں میں چھپتے رہے-لیکن انہوں نے اپنا یہ ریکارڈ محفوظ نہیں رکھا-پاکستان میں ان کے کچھ دوست احباب نے نگار صاحب سے کہا کہ وہ اپنا کلام ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کر لیں-بہرحال اپنے رفقاء کی خواہش پر انہوں نے اپنے کلام کو اکھٹا کرنا شروع کیا-اس کے لیے کچھ تو اپنے حافظے سے کام لیا کچھ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ریکارڈ سے مدد لی-اس طرح وہ اپنے کلام کو محفوظ کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے-

نگار صہبائی کا گیت نگاری میں ایک منفرد مقام تھا-گیت نگاری کے سلسلے میں انہوں نے ایک اہم واقعہ تحریر کیا تھا جو ان کے شعری سفر میں وسیع تر شہرت کا حامل بنا-یہ واقعہ سنہ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے وسط کا ہے جب ریڈیو پاکستان سے ایک ہفت روزہ پروگرام بعنوان ''داستان'' نشر کیا جاتا تھا-یہ پروگرام جناب زیڈ اے بخاری صاحب کی جدت کا عطیہ تھا-اس پروگرام میں الف لیلیٰ کی داستانوں

کوازسرِنولکھواکرداستان گو سے نشرکرواناااور ان داستانوں میں جابجاموقع محل کے اعتبار سے گیتوں کااندراج اس پروگرام کی خصوصیت تھی-داستان کی بیشتر کہانیاں سلیم احمد نے تحریر کی تھیں اوران میں زیادہ سے زیادہ گیت لکھنے کا سہرانگارصہبائی کے سرتھا-ریڈیوپاکستان میں اپنے ایک انٹرویوکاحال اس طرح بیان کرتے ہیں:

''............پھر بخاری صاحب نے اردوگیت کے بارے میں دریافت کیاجب میں نے آرزولکھنوی کانام لیاتووہ چونک پڑے-اس انٹرویومیں اتناوقت ہوچکاتھاکہ اس پروگرام کے نشرہونے میں بمشکل تمام ایک گھنٹہ رہ گیاتھا-موسیقارنے وقت کی کمی کاتذکرہ کیاتوبخاری صاحب نے حکم صادرکیاکہ آج داستان براہ راست یعنی (Live) نشرہوگی-اس داستان میں چھ گیت تھے-میں نے پہلے پانچ گیت تولکھ دیے لیکن چھٹا گیت اتنامشکل تھاکہ مجھے سردی کے موسم میں پسینے آگئے-خداخداکر کے چھٹا گیت بھی ہوگیااور جب میں اپنے گھر پہنچاتوریڈیوسے میراآخری گیت نشرہورہاتھا-اس آزمائش پرپورااترنے کے بعد اگلے روز بخاری صاحب نے پروگرام داستان کے مستقبل میں لکھے جانے والے گیت میرے لیے وقف کردیے-''

نگارصہبائی کے شاعری پرتبصرہ کرتے ہوئے جناب انجم اعظمی صاحب لکھتے ہیں:

''نگارصہبائی اس عہدکی ایک اہم آواز ہے-اس نے راستے کے نشیب وفراز سے بے نیاز ہوکر زندگی کی حقیقی قدریعنی انسان کواپنالیاہے-وہ گیتوں کاشاعرہے،اپنی دانست میں آرزولکھنوی سے رشتہ جوڑکراردومیں گیت کی روایت کومستحکم کرنے میں ذہن کے تمام سوتوں اوردل کی تمام کیفیات سے کام لے رہاہے لیکن اس کی تمام شاعری کے بغورمطالعے سے پتہ چلتاہے کہ اس نے ایران اورہند کے قدیم شعری سرمایہ کی مدد سے ایک بھرپورانفرادیت کی تعمیروتشکیل پرپورے خلوص سے توجہ دی ہے-''

سکھیو میرے سنوریا کا نام　　　مہندی سے لکھ دوری ہاتھوں پہ

ہندوستان میں اس گیت کے مکھڑے کاسرقہ کیاگیاہے-نگارصہبائی کے تین مجموعۂ کلام ''جیون درپن''، ''من گاگر''اور''انت سے آگے'' شائع ہوچکے ہیں-زندگی کے ۷۸سال گزارکر ۸ر

جنوری ۲۰۰۴ء کو نگار صہبائی دل کو لبھانے والے مدھر گیت دے کر دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کے گیتوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

بیتی رُت کا کب تک رونا   جی کی لگن ہے جیون سونا
ڈوب رہا ہے سورج جیسے مہندی کوئی چڑھائے
ہولے ہولے پون گلی میں پھول بچھاتی جائے
دور کسی مہوے کے نیچے بنسی کوئی بجائے
پائل کی چھن چھن میں گوری پیا ملن کو جائے

---••☆••---

نورالحسن جعفری

نورالحسن جعفری ۶ راپریل سنہ۱۹۲۱ءکوالہ آباد میں پیدا ہوئے-انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کیا جس میں مسلمانوں میں پہلی اور مجموعی طور پر دوسری پوزیشن حاصل کی-الہ آباد یونیورسٹی سے ہی تاریخ میں ایم اے کیااور اقبال گولڈمیڈل حاصل کیا-اس کے بعدسنہ۱۹۴۶ء میں فیڈرل پبلک سروس سے سینٹرل سپیریئر سروس میں منتخب ہوئے اور پاکستان منتقل ہوگئے-

نورالحسن جعفری پاکستان میں وزارت خزانہ' کامرس اور کیبنٹ ڈویژن میں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور سنہ۱۹۸۳ء وفاقی سیکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے- سروس سے سبکدوش ہونے کے بعد سنہ۱۹۸۳ء سے۱۹۹۳ءتک پاکستان برما شیل کے چیئرمین 'اکنامک ڈیویلپمنٹ انسٹی ٹیوٹ واشنگٹن اور انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز پاکستان کے فیلو رہے-روزنامہ ''جنگ''،''نوائے وقت''،''ڈان''اور''بزنس ریکارڈر'' میں بھی کالم لکھتے رہے-روزنامہ''جنگ'' میں''معیشت کی جھلکیاں'' کےعنوان سے ان کے کالم شائع ہوتے رہے- نورالحسن صاحب انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدراور جامعہ کراچی کی سنڈیکیٹ کے رکن بھی رہے-

نورالحسن جعفری انتہائی محبت سے پیش آنے والے ایک منکسرالمزاج شخص تھے-اُن کے حلقۂ احباب سے یہی سنا گیا ہے کہ وہ انتہائی دیانتدار'محنتی اورقانون کے زبردست پاسدار افسر تھے-وفاقی سیکریٹری یااس سے قبل متعدداعلیٰ عہدوں پر رہنے کے باوجودطرزِعمل سے وہ سرکاری افسرنہیں لگتے تھے-ان کی اہلیہ محترمہ اداجعفری اپنی سرگزشت''جورہی سوبےخبری رہی''میں ایک واقعہ بیان کرتی ہیں:

''نور کے مزاج میں دردمندی'دلداری اوردلنوازی کے تمام رنگ گھلے ہوئے ہیں دوسال کی عمرمیں ان کی والدہ کاانتقال ہواوہ خالق حقیقی سے صرف انیس سال کی مہلت حیات لے کر آئی تھیں-نورکی پرورش اُن کی پھوپی نے اپنے بچوں کے ساتھ اوراپنے بچوں ہی کی طرح پیاراورمحبت سے کی-لیکن وہ ایک محبت جو ہر بچے کاحق ہوتی ہے'اس سے محرومی اپنی جگہ

تھی۔نور شاید اس دو سال کے بچے کو آج بھی بھولنا نہیں چاہتے جسے محبت اور توجہ احسان کی طرح ملی تھی۔یہ ایک ایسا قرض ہے جسے وہ بڑی چاہت کے ساتھ اپنوں اور غیروں میں سب کو ادا کرتے رہتے ہیں۔اجنبی لوگوں کو بھی مقدور بھر موسموں کی شدت سے محفوظ رکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں اور دوستوں کے خلوص کا قدرداں نور جیسا کوئی مشکل سے ہی ملے گا۔نور کے وجود میں بہ یک وقت دو بڑی دل آویز شخصیتیں سانس لیتی ہیں۔ایک حفاظت اور امان کی علامت وہ چھتنار گھنا سایہ جسے باپ کہتے ہیں اور ایک وہ بچہ جو دو سال کی عمر میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔میلے میں کھویا ایک اکیلا بچہ۔زندگی اپنی تمام تلون مزاجیوں اور سب جھمیلوں کے باوجود خوبصورت بھی ہے اور مہربان بھی۔نور نے سائبان بن کر مجھے موسموں کی شدت سے محفوظ و مامون رکھا ہے۔انہوں نے میری خوشی کو کتنا عزیز جانا ہے۔یہ لکھنے کی ضرورت بھی کیا اور حاصل بھی کیا۔احساس کی امانت کا بار الفاظ کہاں اُٹھا سکیں گے۔''

نورالحسن جعفری کی خدمات اردو کے لیے پیش بہا ہیں۔اُن ہی کی کاوشوں سے انجمن ترقی اردو کا دفتر گلشن اقبال کی خوبصورت عمارت میں منتقل ہوا تھا۔۳ردسمبر سنہ ۱۹۹۵ء کو نورالحسن جعفری کا اسلام آباد میں انتقال ہوا۔

---••☆••---

نیاز بدایونی

ان کا اصل نام نیاز احمد صدیقی ہے- نیاز تخلص اور نیاز بدایونی ان کا قلمی نام ہے- سنہ ۱۹۳۵ء کو بدایوں، یوپی بھارت کے ایک علمی وادبی خانوادے میں پیدا ہوئے- انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں برسوں سے شعروسخن کا چرچا تھا- ان کے والد کے نانا مولانا ناز لالی مولانا حالی کے شاگرد تھے- ان کے جدامجد مولانا شاد صدیقی اوران کے والد جناب مولوی سلمان احمد ہلالی' صاحب دیوان شاعر تھے- منور بدایونی، محشر بدایونی اور دلاور فگاران کے قریبی عزیز تھے- سنہ ۱۹۵۶ء میں نیاز صاحب پاکستان آئے- نیاز صاحب دورجدید کے شاعر ہیں مگران کی شاعری میں جدّت طرازی کا عنصر بہت ہے- نیاز بدایونی صاحب خود فرماتے ہیں:

''مجھے ورثے میں جوشاعرانہ انداز ملا تھا، وہ قطعی روایتی تھا- مگر میرا شعور تادیر اس سے سمجھوتا برقرار نہ رکھ سکا- میں نے نئے مگر مانوس تجربات ومشاہدات کو اپنا موضوع بنایا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ نہ ان میں کرب کی اتنی شدّت ہو کہ سہار مشکل ہوجائے اور نہ غموں کی اتنی بھرمار ہو کہ آدمی ان کے بوجھ تلے سانس بھی نہ لے سکے- ہجرت کے تعلق سے میری شاعری کا اہم عنصر یہ بھی رہا کہ میں نے استعارے کی زبان میں گھر کی اہمیت اور تقدس کا احساس دلایا-''

ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نیاز صاحب ایک نصاب ساز بھی ہیں اور تنقید نگار بھی ہیں- انہوں نے شعبۂ نصاب میں بھی بڑی خدمات انجام دی ہیں جن کے اعتراف میں مرکزی وزارتِ تعلیم کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا گیا- تنقید نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''تنقید ادب کا بڑا اہم شعبہ ہے- تنقید ہی ادب کو اس کی روایات کا احساس دلاتی ہے- تنقید کے ارتقاء کے ساتھ ہی ادب نے ترقی کی ہے لیکن آج خصوصاً ہمارے یہاں تنقید کہاں ہے؟ گزشتہ عشرہ سے تو کوئی تحقیقی نقاد سامنے آیا ہی نہیں- آخر عسکری صاحب مرحوم،

کرار حسین صاحب مرحوم اور چند دوسروں کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا، انور سدید یا فہیم اعظمی، سحر انصاری اور جاذب قریشی اس خلا کو کب تک اور کیوں کر پورا کریں گے۔ نئے تنقید نگاروں کو سامنے آنا چاہیے اور اس خیال کو رد کرنے کے عزم کے ساتھ کہ تنقید کم تر عمل نہیں۔ اچھی تنقید سے ہی اچھی تخلیق کو راہ ملتی ہے۔ مگر نئے نقاد کو تسلیم کرنے کی کسوٹی پر ہونا چاہیے کہ وہ نقد کے اصولوں سے بہ خوبی باخبر ہو اور تنقید و تخلیق کے باہمی تعلق کو سمجھتا ہو، اس کا مطالعہ بھی وسیع ہو اور ضروری حد تک تحقیقی رجحان بھی رکھتا ہو۔''

نیاز صاحب تقریباً ۴۵ برس سے شاعری کر رہے ہیں۔ انہیں شاعری کی تمام اصناف پر عبور حاصل ہے۔ ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

دن جب بھی محاسبے کے ہوں گے　　سب سامنے آئینے کے ہوں گے
باہر مرا ہوگا منتظر کون؟　　پتھر مرے راستے کے ہوں گے
دشمن بھی ہمارے ساتھ رویا　　دکھ ایک ہی سلسلے کے ہوں گے
صحرا میں کبھی نہ ہوں گے وحشی　　کچھ لوگ تو قاعدے کے ہوں گے
تم مجھ سے بچھڑ کے خط نہ لکھنا　　الفاظ بھی فاصلے کے ہوں گے

---••☆••---

واحد بشیر

واحد بشیر ۵ مئی ۱۹۳۰ء کو شہر حیدر آباد (دکن) سے ملحق سرور نگر کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد عبید اللہ شیخ کو مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ چالیس برس تک جامعہ نظامیہ میں حدیث کا درس دیتے رہے۔ واحد بشیر کے نانا اور ماموں بھی تدریس سے وابستہ تھے۔ ادب سے انہیں اپنے ماموں سید انور الدین عتیق سے ملا جو داغ دہلوی، امیر مینائی اور جلیل مانک پوری کے ہم نشین تھے۔ ان کا کلام اس وقت کے ادبی رسائل عالمگیر لاہور اور مخزن شائع ہوتا تھا۔ خاندان کے بزرگ افراد گھر میں جمع ہوتے تو عربی وفارسی شعروادب پر گفتگو ہوتی تھی۔

واحد بشیر ابھی بہت چھوٹے تھے کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ پڑھی لکھی تو نہیں تھیں لیکن اپنی علمیت کی وجہ سے خاندان میں مولوی صاحبہ کہلاتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسۂ فرقانیہ سیکنڈری اسکول کی سطح تک پہنچتے پہنچتے واحد بشیر دوسرے مشاغل میں دلچسپی لینے لگے۔ والد کی وفات کے بعد والدہ رخصت ہوگئیں۔ گھر کے معاشی حالات بھی خراب تر ہوتے جارہے تھے۔ نوعمری میں تعلیم حاصل کرنے کی بجائے مجبوراً مختلف جگہ ملازمتیں کرنی پڑیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء کو ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ کچھ عرصہ وہ میر پور خاص میں رہے۔ عزت کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے انہوں نے چھ سال تک یہاں دستکاری سیکھنے میں گزارے۔ شعروادب کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ یہیں پر انہیں خالد علیگ سے نیاز مندی کا شرف حاصل ہوا۔

۱۹۵۶ء کو واحد بشیر کا دل اچاٹ ہوا تو سب کچھ چھوڑ کر کراچی آ گئے۔ یہاں پر انہیں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے میٹرک کے امتحان کا فارم لے آئے جس کو پُر کرنے میں انہیں دو جگہ دشواری پیش آئی۔ پہلی تو پریشانی یہ تھی کہ وہ کس کو اپنا سرپرست لکھیں یہاں ان کا کوئی سرپرست یا رشتہ دار نہیں تھا۔ دوسری پریشانی یہ تھی کہ ان کے برتھ سرٹیفکیٹ میں ان کی پیدائش ۱۹۳۰ء لکھی ہوئی تھی جو امتحان دینے کی معیاد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے ایک دوست

سید عزیز الحسن ان کے سرپرست بنے اور برتھ سرٹی فکیٹ میں ۱۹۳۰ء کے صفر کو ۹ میں تبدیل کردیا۔اس طرح میٹرک کے سرٹی فکیٹ میں ان کی پیدائش ۱۹۳۹ء کی ہوگئی۔ان کا خیال تھا کہ وہ سی ایس پی کا امتحان پاس کریں۔سی ایس پی کا امتحان تو کیا پاس کرتے کالج کی تعلیم کے دوران سیکورٹی ایکٹ آف پاکستان کے تحت جیل چلے گئے۔اس کے بعد کبھی جیل جانے، کبھی شہر بدر ہونے کا سلسلہ چلتا رہا۔

زمانہ طالب علمی میں ذریعہ معاش کے لیے وہ پندرہ روزہ ''طالب علم'' کی ترتیب' اشاعت اور فروخت سے وابستہ رہے۔۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۴ء تک کل وقتی کارکن کی حیثیت سے ٹریڈ یونین سے وابستہ رہے۔۱۹۷۴ء سے جنوری ۱۹۸۲ء تک ہفت روزہ ''الفتح'' (انگریزی و اردو) میں کبھی بحیثیت مدیر، کبھی شریک مدیر اور کبھی سب کچھ رہے اور اب مارچ ۱۹۸۴ء سے انگریزی روزنامہ بزنس رکارڈر کے ادارتی عملے میں شامل ہیں۔وہ ۱۹۷۹ء سے کتابی سلسلے ''ارتقا'' کے رکنِ ادارہ بھی ہیں۔ان کی نظموں کا ایک مجموعہ ''کیکٹس کے پھول'' ہے جسے سماجی انصاف کے دل دادگان میں پذیرائی ملی۔غزلوں کا مجموعہ ''......جو اعتبار کی'' طباعت کے مراحل میں ہے۔ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

بیٹھے رہو تو دور بہت دور کوئے یار
چلتے رہو تو آپ سمٹتے ہیں فاصلے

اک تمنا عذابِ جاں ہے بہت
ایسے زخموں کا اندمال کہاں

چشمِ تر کو رونے دو، اس قدر کہ خوں برسے
مدتوں مرا دامن آنسوؤں کو ترسا ہے

کتنا تاریک ہے مرا ماحول
کالی صدیوں کا جس پہ سایہ ہے

روشنی کی تلاش کو اک جرم
اس نے ہر دور میں بتایا ہے

تم بھول جاؤ تو کوئی بات نہ ہوگی
بے یاد ہماری بسر اوقات نہ ہوگی

اک رات تو سکھ چین سے سو پائیں گے ہم لوگ
اک روز تو یہ صورتِ حالات نہ ہوگی

دل کو اندیشۂ بے جا سے بچائے رکھیے
صبح سے اہلِ وفا آس لگائے رکھیے

یا تو کر لیجیے چپکے سے گریباں رفو
یا سر کوئے بتاں حشر اٹھائے رکھیے

زرد پتوں کے لیے ایک ہی جھونکا ہے بہت
نرم کونپل کی طرح پاؤں جمائے رکھیے

---••☆••---

وفا براہی

اصل نام سید شاہ محمود عالم، وفاؔ تخلص اور وفا براہی قلمی نام ہے۔ ۱۹۱۷ء میں موضع باسو پنڈہ براہ، ضلع پٹنہ بہار (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد مولانا سید شاہ وصی احمد ایک عالم تھے۔ وفاؔ براہی کو بچپن ہی سے شعروسخن سے بڑا لگاؤ تھا اور اسی زمانے سے وہ شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ بہ سلسلۂ ملازمت وہ کافی عرصہ الٰہ آباد میں رہے جہاں کے ادبی ماحول نے ان کے ذوقِ سخن مزید جلا بخشی۔ وہ الٰہ آباد کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

تقسیم کے بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں وہ بہار سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وفاؔ براہی کا بیشتر قیام ڈھاکہ میں رہا۔ وہاں بھی ان کی بڑی شہرت تھی اور ہر مشاعرے میں اپنا کلام سنانے کے لیے انہیں دعوت دی جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہوئے تو وفاؔ براہی کراچی آ گئے اور پھر یہیں رہے۔

وفاؔ براہی بحیثیت شاعر ہندوستان ہی میں بڑے مشہور ہو چکے تھے۔ وہ اپنا کلام برِصغیر کے ممتاز شعرا کے ساتھ سنا چکے ہیں جن میں جگرؔ مرادآبادی، جوشؔ ملیح آبادی، ساغرؔ نظامی، روشؔ صدیقی، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان کا پہلا کلام (غزلیات کا مجموعہ) ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔ ان کا آخری مجموعہ ''شعاعِ نو'' جو ان کی وفات سے قبل ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ وفاؔ براہی کے مجموعہ ''شعاعِ نو'' میں مشہور نقاد منظور حسین شورؔ نے لکھا ہے:

''جو لوگ زندگی کے حرکی اور جدلیاتی مزاج سے ناآشنا ہوتے ہیں ان کے یہاں وقت کا تسلسل ماضی سے شروع ہو کر حال پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں زندگی اور ادب کا اٹوٹ رشتہ ابدی نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کی نوعیت وقتی اور ہنگامی ہوا کرتی ہے۔ زندگی کا یہی محدود تصور ہے جو شاعر کو مرنے کے بعد سچ مچ مار دیا کرتا ہے۔ سقراطؔ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے مرنے سے کچھ پہلے جب اس کے شاگرد دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تو سقراطؔ کے آخری الفاظ یہ تھے

"تم ضبط سے کام لو‘ تم صرف میرے جسم کو دفن کرو گے"

واقعہ یہ کہ بے شمار لوگ مرنے کے بعد سچ مچ مر جایا کرتے ہیں۔ بقول وفاؔ"

کچھ کھیلتے ہیں موت سے ‘مرتے نہیں مگر
کچھ لوگ اپنی موت سے پہلے ہی مر گئے

۴ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو وفا براہی کا کورنگی کے ایک مشاعرے کے دوران حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ان کے کلام کے کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں ملاحظہ کیجیے۔

جس شاعری سے دعوتِ فکر و نظر ملے
اس دور میں ہے ایسی وفاؔ شاعری کہاں

شکلِ فردا دیکھ کر آئینۂ تقدیر میں
رنگِ ارماں بھر رہا ہوں وقت کی تصویر میں

ارتقا میں زندگی کا ساتھ دے تو کس طرح
ذہنِ انساں ہے مقید وقت کی زنجیر میں

مل جو بیٹھے ہیں ہم لوگ اے وفاؔ غنیمت ہے
کیا خبر خدا جانے‘ کون کل کہاں ہوگا

ہے عالمِ وجود پہ چھایا ہوا جمود
اے کاش انقلاب کوئی فیصلہ کرے

خالقِ کونین نے کچھ سوچ کر
عشق والفت کا جلایا تھا چراغ

خود فراموشیِ انساں نے وفاؔ
کر دیا گُل آدمیت کا چراغ

آئینہ کیا جو آئینہ گر کا نہ دے پتہ
قرآن ہی میں صاحبِ قرآں کا نام ہے

کچھ واقعات تھے جو نگاہوں میں پھر گئے
گزرے جو آج کوچۂ دلدار کی طرف

جب باغِ لطافت کھو بیٹھے‘ پھولوں کی نکہت اُڑ جائے
اے موسمِ گل کے شیدائی‘ کیا بادِ صبا کی بات چلے

سنتا ہوں کہ اُن کی محفل میں ہر طرح کے چرچے ہوتے ہیں
اے کاش وفاؔ یاد آجائے‘ جب اہلِ وفا کی بات چلے

---••☆••---

وفا راشدی، ڈاکٹر

ممتاز دانشور، محقق، نقاد اور تخلیق کار ڈاکٹر وفا راشدی صاحب یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام عبدالستار خاں اور وفا راشدی قلمی نام ہے۔ ان کے والد کا نام گلزار احمد خاں راشدی تھا۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ہوئی اور یہیں سے انہوں نے امتیازی نمبروں کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہ مدرسہ ۱۷۸۱ء میں قائم ہوا تھا جہاں قدیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اسپرنگر، بیلی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے عالی مرتبت اشخاص اس مدرسے کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ وفا راشدی صاحب کی طالب علمی کے دوران اس مدرسے کے پرنسپل خان بہادر الحاج مولانا محمد یوسف ہاشمی صاحب تھے جن کا تعلق سیالکوٹ پنجاب سے تھا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر وفا صاحب نے کلکتہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد ایم اے (اُردو) کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی ادبی سرگرمیاں دوران طالب علمی سنہ ۱۹۳۹ء میں شروع ہو چکی تھیں جبکہ ان کی عمر صرف ۱۴ سال تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ مجلسِ مذاکرہ کے جنرل سیکریٹری رہے۔ اسی زمانے میں انہیں اسکول میگزین کی ادارت سونپی گئی۔ شعر و سخن کا ذوق بھی اسی دوران پروان چڑھا اور علامہ رضا علی وحشت کلکتوی سے تلمذ کیا۔ ابتداءً غزل گوئی سے کی جو ان کی پسندیدہ صنفِ سخن تھی۔ لیکن بعد میں تحقیق و تنقید اور تاریخ و ثقافت کی طرف مائل ہو گئے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں اپنے مدرسے کے میگزین میں ''حضرت وحشت اور ان کی شاعری'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ یہی مضمون نظر ثانی کے بعد ۱۶ر جنوری ۱۹۴۶ء کو ''آج کل دہلی'' میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے مرغوب موضوعات تحقیق و تنقید اور تاریخ و ثقافت تھے۔

ڈاکٹر صاحب کلکتہ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں ایک نوعمر کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے۔ ان ہی محفلوں میں انہیں متحدہ ہندوستان کے تقریباً سب ہی صوبوں کے شعراء و ادباء سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہاں ''بنگال میں اُردو'' لکھی تو علمی

وادبی حلقوں نے ان کی بہت پذیرائی کی-مشرقی پاکستان کی تاریخ' تہذیب' ادبیات' مقامات' مشاہیر اور اولیائے کرام پر تحقیقی کام ''سنہرا دیس'' کے عنوان سے شائع کیا-انہوں نے ''پیام نو'' میں پنجاب سے بنگال تک اور یوپی سے لے کر دکن تک ہر مرکز کے نمائندہ شعرا کی ملکی وقومی نظمیں شامل کیں-

سقوط ڈھاکہ کے بعد ۱۹۵۰ء میں وہ ممبئی سے ہوتے ہوئے پاکستان آ گئے اور لاہور میں قیام کیا-یہاں آ کر انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا-ابتدا میں فری لانسر جرنلسٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے اس کے بعد درس وتدریس' تصنیف وتالیف' ادبی تحقیقات اور شعری تخلیقات کو اپنی گزربسر کا وسیلہ بنایا-سنہ ۱۹۵۳ء میں یہ لاہور سے کوٹری آئے پھر حیدرآباد سندھ میں طویل عرصہ تک قیام کیا-حیدرآباد کے بعد راشدی صاحب مستقل طور پر کراچی آ گئے اور ٹیلی کمیونی کیشن ٹریننگ اسکول سے وابستہ ہو گئے اور یہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے بحیثیت سینئر اسکالر انجمن ترقی اردو میں خدمات انجام دیں-یہاں پر وہ سنہ ۱۹۹۱ء تک کام کرتے رہے-

وفا راشدی صاحب کو اُردو' انگریزی' فارسی' سندھی' پنجابی اور بنگلہ زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا-چنانچہ انہوں نے تحقیق وتنقید' تاریخ اور ثقافت کے علاوہ اور موضوعات پر مذکورہ زبانوں میں ترجمے کیے-سندھ سے متعلق ان کی پہلی تصنیف ''مہران نقش'' کے عنوان سے سنہ ۱۹۸۶ء میں مکتبۂ اشاعت اردو سے شائع ہوئی-دوسری کتاب ''اُردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ'' کے نام سے شائع ہوئی جو ان کا تحقیقی مقالہ تھا جو انہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے لکھا تھا-وطن عزیز پاکستان کے نامور معلّم' محقق' مورّخ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ڈاکٹر وفا راشدی کی کتاب ''مہران نقش'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر وفا راشدی صاحب ایک لائق فائق ادیب ومحقق ہیں جن کی جستجو کا دائرہ کافی وسیع ہے-انہوں نے اپنی بیش بہا تصانیف میں ہمارے لیے موجودہ دور کے اُردو ادب اور شاعری کے قیمتی مواد میں سے کافی کچھ محفوظ کر لیا ہے-اس کے ساتھ ساتھ ''مہران نقش'' مطبوعہ ۱۹۸۶ء ان کی قابل قدر کتاب ہمارے سامنے آ چکی ہے-جس میں شعراء کے ساتھ ساتھ بعض سربرآوردہ علماء کا ذکر بھی موجود ہے-''

مرحوم کی تخلیق کی ایک خوبی جس کا اظہار ان کے ہم عصروں نے بجا طور پر کیا وہ یہ تھی کہ وہ جس خطہ میں بھی رہے وہاں کی تاریخ' تہذیب' ادبیات' تحریکات' مشاہیر اور صوفیائے کرام کی بابت گہری تحقیق

کرتے کہ اس میں نہ صرف خود رچ بس جاتے بلکہ پڑھنے والے کو یہ گمان ہی نہ ہونے دیتے کہ وہ جس خطہ کے' خواہ وہ سندھ ہو، پنجاب ہو یا بنگال ہو' بارے میں تحقیق کر رہے ہیں اور وہاں سے ان کا تعلق صرف واجبی ہے۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں ''میرے بزرگ میرے ہم عصر'' میں اپنے معاصرین کے ادبی خاکے پیش کیے۔ ''داستان وفا'' اپنی آپ بیتی لکھی جس میں ان کی اپنی ادبی جھلکیاں ہیں۔ ان کی دیگر کتابوں میں جہان رنگ و بو' کیف و عرفان' کیفیات غالب' حیات وحشت' خالد ایک نیا آہنگ' سحرِ حلال اور آہنگِ ظفر ہیں۔

ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں کئی انعامات سے نوازا گیا۔ سنہ۱۹۶۴ء میں ''سنہرا دیس'' کی اشاعت پر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے دورِ حکومت میں انہیں بہترین مصنف قرار دیا گیا اور سنہ ۱۹۶۶ء میں صدر محمد ایوب خان نے خود اپنے ہاتھوں سے نقد اور توصیفی سند دی۔ ڈاکٹر وفا راشدی کے تحقیقی مقالے ''اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ'' پر سندھ یونیورسٹی نے پذیرائی کرتے ہوئے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی عطا کی۔ سنہ ۱۹۹۲ء میں انجمن ترقی اردو نے ان کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں انہیں ''نشانِ حسنِ کارکردگی'' سے نواز۔ ۲ر نومبر ۲۰۰۳ء کو ڈاکٹر وفا راشدی دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

---••☆••---

ہادی مچھلی شہری

سید محمد ہادی نام' ہادی تخلص ہادی مچھلی شہری قلمی نام تھا۔ سنہ ۱۸۹۰ء کو مچھلی شہر ضلع جونپور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ہادی مچھلی شہری کو ذوقِ سخن ورثہ ملا تھا۔ ان کے والد سید عبدالرزاق شاکر' جو سب جج کے اہم منصب پر فائز تھے' عربی فارسی کے زبردست عالم اور معروف شاعر تھے۔ ہادی مچھلی شہری کے صاحبزادے محمد وسیم صوبہ سندھ کے چیف سیکریٹری اور محتسب اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ ہادی مچھلی شہری اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''میرے والد مولانا سید عبدالرزاق شاکر غالب مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ چنانچہ ان کے نام کے اکثر خطوط مکتوبات غالب کے مجلدات میں اب تک موجود ہیں۔''

ہادی مچھلی شہری کے والد فارسی اور عربی کے ایک جید عالم تھے اس لیے انہوں نے اپنی اولاد کو بہتر سے بہتر تعلیم دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہادی مچھلی شہری خود بھی فارسی زبان کے منتہی تھے۔ اُن کا خاصا کلام فارسی میں بھی تھا جو غالباً کلام کی صورت میں چھپ نہیں سکا۔ البتہ ان کا فارسی کلام سنہ ۱۹۲۶ء میں کے رسالے ''مرقع'' لکھنؤ میں چھپتا رہتا تھا۔ ہادی صاحب کے بڑے بھائی سید محمد تقی ڈپٹی کلکٹر اور دوسرے بھائی علی نقوی ایڈوکیٹ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ قانون کے معلم اور صدر بھی تھے۔ ہادی مچھلی شہری نے عربی فارسی کی تعلیم مولانا حافظ احمد حسن اور مولوی مظہر حسین سنبھلی سے حاصل کی۔ ان کی شاعری کا مستقل دور بیس سال کی عمر سے ہوا۔ فصاحت جنگ جلیل مانکپوری سے تلمذ کیا۔ شاعری کے حوالے سے وہ خود لکھتے ہیں:

''میری شاعری کا مستقل دور سنہ ۱۹۱۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل بھی میں نے چند غزلیں لکھی تھیں جو جلیل القدر حضرت جلیل مرحوم کی اصلاح کے بعد ایک رسالہ میں جو وہ حیدرآباد سے اس زمانے میں نکالتے تھے شائع ہوئی تھیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۰ء سے مستقل طور پر شعر کہنا شروع کیا۔ تو کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بلکہ اپنے فطری ذوقِ شعری

سے مدد لے کر خود اپنے اشعار کی اصلاح کر لیتا تھا اگر صرف تین چار غزلوں پر اصلاح اور وہ بھی ایسے زمانہ میں جب وہ محض اتفاقیہ طور پر کہی گئی ہوں- کسی کا شاگرد ہونے کے لئے کافی ہے تو بیشک میں حضرت جلیل مرحوم کا شاگرد ہوں ورنہ کسی کا بھی نہیں-

اب یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود میرا رنگِ شاعری کیا ہے، یہ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا کہ میرا وہ رنگ نہیں، جو داغ اور میر کا تھا- ہاں اگر اس کو کچھ نسبت ہو سکتی ہے تو اس رنگ سے ہو سکتی ہے جس کے علمبردار میر مومن اور غالب وغیرہ تھے- اس نظریے کے بعد میرے رنگ کو جو کچھ بھی کہا جائے جدید یا قدیم مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا- میں نے شاعری کے میدان میں اپنے کو ہمیشہ رکیک اور عامیانہ تخیل سے بچانے کی کوشش کی ہے- چنانچہ میرے دیوان میں کوئی ایسا لفظ نہ ملے گا، جس کے ادا کرنے میں ایک مہذب شخص کو کسی قسم کا پس و پیش ہو-''

ہادی مچھلی شہری کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

''ہادی مچھلی شہری اپنے دور کے اہم شاعر تھے- اپنے وقت کے مُسلّم الثبوت استاد- زبان و بیان پر ایسی قدرت کہ کم لوگوں کو ہوگی- جوشِ طبع کا یہ عالم کہ مضمونِ شعر بادلوں کی طرح اُڑتے اور برستے تھے- اُن کی غزل میں تسلسلِ فکر کا احساس ہوتا ہے- جلال کی شاگردی کے باوجود مزاجاً وہ میر، غالب اور مومن سے زیادہ قریب ہیں- سنجیدگیِ فکر، شائستگیِ بیان، صحتِ الفاظ کا سلیقہ اور لہجے کا سبھاؤ ان کے کلام کی بنیادی خصوصیت ہیں-''

ہادی مچھلی شہری مشہور و معروف اور بلند نظر شاعر تھے- تاریخ گوئی میں بھی ان کو بڑی مہارت تھی- وہ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے- فارسی سے انہیں ہمیشہ خاص دلچسپی رہی- جدید فارسی شاعری میں نظم کے علاوہ ان کے نثری مضامین بھی جرمنی اور ایران میں شائع ہوئے تھے- ان کا مجموعہ کلام ''نوائے دل'' سنہ ۱۹۴۷ء کو الہ آباد سے شائع ہوا- ملازمت کے سلسلے میں وہ زیادہ تر الہ آباد میں مقیم رہے- قیام پاکستان کے بعد ہادی مچھلی شہری پاکستان آ گئے اور کراچی میں آباد ہوئے- ان کا دوسرا مجموعہ ''صدائے دل'' ان کے صاحبزادے محمد وسیم نے طبع کرایا- ۲۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کو ہادی مچھلی شہری کی وفات ہوئی- لالوکھیت کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں- نمونہ کلام ملاحظہ ہو

دل کے آئینے میں ہادؔی عمر بھر
خود کو اک تصویرِ غم پاتا رہا

رنج و غم سے کس کو حاصل ہے نجات
شادمانی ہے فقط کہنے کی بات

باتیں نئی دل نے مصیبت کی سنادیں
ہم قصہ ماضی کو بھلانے میں لگے تھے

دلِ شکستہ کے مٹنے کا غم نہیں لیکن
ہے غم یہی کہ کوئی محرم وفا نہ رہا

اور بھی ہستیاں تھیں آزمانے کے لئے
کیا بشر ہی رہ گیا تھا غم اٹھانے کے لئے

ابھی ٹوٹی ہے کوئی شے دلِ محزوں کے قریب
چارہ گر دیکھ! ہماری وہ رگِ جاں تو نہیں

صحرا بھی مجھ کو گلشنِ جنت سے کم نہیں
ہو تیری یاد دل میں تو پھر کوئی غم نہیں

وہ اُٹھ کے کیا گئے ہیں کہ عالم بدل گیا
معلوم ہو رہا ہے کہ دُنیا میں ہم نہیں

کب ایک ہی پہ ذوقِ محبت ہے منحصر
کوئی تو ہوگا دہر میں ہادؔی جو ہم نہیں

رونقیں دُنیا کی ہادؔی ہیں وہی
میرے اُٹھ جانے سے کیا جاتا رہا

اک کھلونا ٹوٹنے جس کو نہیں لگتی ہے دیر
زندگی کیا ہے فقط ترکیب آب و گل کی بات

عہدِ پیری تک تھیں جتنی منزلیں سب آ گئیں
رہ گئی ہے اب تو ہادی آخری منزل کی بات

ان کی نگاہ جھک کر رہ گئی جواب میں
کیا جانے میں نے کہہ دیا کیا اضطراب میں

اب وہ پیری میں کہاں عہد جوانی کی امنگ
رنگ موجوں کا بدل جاتا ہے ساحل کے قریب

---•• ☆ ••---

ہاشم رضا، سید

سید ہاشم رضا صاحب ۱۶رفروری ۱۹۱۰ء کو قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خان بہادر سید محمد رضا عہدۂ منصفی پر مامور تھے، بعد میں اودھ کے اضلاع میں انصاف وقانون کے مختلف عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۶ء تک چیف کورٹ لکھنو کے جج مقرر ہوئے۔ ہاشم رضا جب چار سال چار ماہ اور چار دن کے ہوئے تو رسم بسم اللہ محترم مولوی احمد حسین نے کرائی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے اوّل درجہ میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔
ہاشم رضا صاحب کی طالب علمی کا زمانہ زیادہ تر لکھنؤ میں گزرا۔ بی اے کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ سے ایم اے (سیاسیات) کا امتحان پاس کیا۔ اس امتحان میں بھی انہوں نے اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں منعقدہ امتحان میں انڈین سول سروس کے لیے منتخب ہوئے۔ جیسس کالج، آکسفورڈ یونیورسٹی میں سنہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک انہوں نے بحیثیت پروبیشنر کے گزارے۔ اس دوران آپ سیکرٹری آکسفورڈ مجلس، صدر آکسفورڈ آئی سی ایس سوسائٹی اور صدر مسلم سوسائٹی آکسفورڈ بھی رہے۔ ۱۹۳۴ء میں وطن واپس آئے تو وہ احمد نگر ممبئی پریسیڈنسی میں سب ڈویژنل آفیسر مقرر ہوئے۔

قائداعظم سے ان کی پہلی ملاقات سنہ ۱۹۳۲ء میں ہوئی جب وہ لکھنؤ یونین کی جانب سے انہیں تقریر کرنے کی دعوت دینے گئے تھے جسے قائداعظم نے قبول کرلیا تھا۔ تقسیم کے بعد قائد قائداعظم نے ہاشم رضا کو پاکستان کے وفاقی دارلحکومت کراچی کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا۔ اس طرح وہ دارالخلافہ پاکستان کے پہلے ایڈمنسٹریٹر تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے الیکشن کمشنر سندھ، چیف سیٹلمنٹ کمشنر پاکستان، چیف سکریٹری سندھ، چیف سکریٹری مشرقی پاکستان اور وفاقی حکومت کے سکریٹری جیسے اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۱ء میں کچھ مدت کے لیے وہ مشرقی پاکستان کے گورنر بھی رہے۔ متعدد اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۶۶ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ علاوہ ازیں انہوں نے بیرونی ممالک اقوام متحدہ اور دوسری کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔ وہ فیڈرل پریس کمیشن، اردو

ترقی بورڈ، نیشنل سیرت کمیٹی کے ممبر اور قرآن کونسل آف پاکستان کے صدر اور قائداعظم اکیڈمی بورڈ آف گورنرز کے رکن بھی رہے۔

سید ہاشم رضا غیر معمولی حافظہ' غیر معمولی صلاحیت اور غیر معمولی تہذیبی مطالعہ کے آدمی تھے۔ انہوں نے کچھ زیادہ لکھا نہیں۔ تحریری صورت میں صرف ایک کتاب ہماری منزل ان سے یادگار ہے اور وہ بھی انگریزی زبان میں۔ لیکن اس کتاب کے مطالعے کے بعد پڑھنے والے کو صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہاشم رضا ایک انتہائی شائستہ' تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانے کے فرد تھے۔ وہ پاکستان کی بڑی ملازمتوں کے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اور پاکستان کی بنیادی تزئین و تعمیر کے لیے بڑے بڑے کام کیے لیکن وہ اپنے اور مسلمانوں کے ثقافتی ورثہ سے بھی غافل نہیں رہے۔ اپنے شعر و ادب' اپنی موسیقی' اپنی مصوری' اپنی مجلسی آداب اور اپنی شعری ادبی محافل سب کو سینے سے لگائے رہے۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور دوسروں کی تخلیق اور تخلیقی ذہن کو بھی فروغ دینے کی عملاً کوشش کرتے تھے۔ ہر شخص کو خوش کر کے یوں خوش ہوتے تھے جیسے انہوں نے کوئی بڑی چیز پالی ہے۔ جن لوگوں سے ان کی ملاقات رہی ہے وہ سب ان کی خوش اخلاقی' خوش اطواری اور فراخ دلانہ عنایات کے مدّاح تھے۔

ہاشم رضا بچپن ہی سے شعر و سخن میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اپنا طالب علمی کا دور زیادہ تر شعر و سخن کی بستی لکھنؤ میں گزارا تھا۔ مرحوم کا شمار کالج کے ذہین طلبہ میں ہوتا تھا۔ انہوں نے کالج کے ایک جلسے میں سب سے پہلے نعت کہی تھی۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال کی ایک نظم جو "نیرنگِ خیال" میں چھپی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

موت کو سمجھا تھا غافل اختتامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

اس شعر سے متاثر ہو کر ہاشم رضا صاحب نے یہ شعر کہے

تو نہ سمجھا آج تک غافل پیامِ زندگی ہوش میں آ جا چلی آتی ہے شامِ زندگی
اپنی دنیا سے نکل اوروں کی دنیا میں بھی آ دوسروں کا دکھ بٹانا ہے نظامِ زندگی

ہاشم رضا صاحب کی ہر میدان میں اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف میں انہیں ستارۂ قائداعظم' ستارۂ پاکستان کے اعزازات سے نوازا گیا۔ ہاشم رضا صاحب کی ماشاءاللہ ۹۳ برس کی عمر ہوئی۔ وہ آخری عمر تک ادبی جلسوں' مجالس اور دوسری تقریبوں بڑی پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ ڈیفنس ہاؤسنگ

سوسائٹی میں قیام تھا- آخری دنوں میں وہ گردوں کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے تھے-تکلیف میں شدت ہوئی تو انہیں علاج کے لیے ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا لیکن سفرِ دارِ فانی طے ہو چکا تھا-۳۰ رستمبر ۲۰۰۳ء کو ملک عدم رخصت ہو گئے-

مرحوم نے پسماندگان میں بیوہ سلمہ ہاشم رضا کے علاوہ دو بیٹیاں اور دو بیٹوں کو سوگوار چھوڑا ہے-ان کے ایک صاحبزادے سید علی رضا نیشنل بنک آف پاکستان کے صدر ہیں-وہ بھی دیانت دار اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے-ہاشم رضا کے کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

دل میں میرے اب تک ہے مستی' اُس بچھڑے متوالے کی
باسی پھول میں جیسے خوشبو 'پھول پہننے والے کی

خیالِ حُسن میں یوں زندگی تمام ہوئی
حسین صبح ہوئی اور حسین شام ہوئی

اب رضاؔ شعر کہیں بھی تو کہاں سے لائیں
وہ تڑپ جس کے اشارے پہ کہا کرتے تھے

رضاؔ بس زندگی اتنی ہی تھی اور سب تماشا ہے
نہ آنا تھا' نہ جینے کا مزہ پھر عمر بھر آیا

منزل سراب بن گئی جس طرف بڑھے
اِک کاروانِ شعبدہ گر دیکھتے رہے

انسان کی قدر گھٹ گئی ذرّے کے سامنے
کچھ کر سکے نہ اہلِ نظر دیکھتے رہے

مقدور تھا بس ایک ہی سجدہ ترے در پر
سر میں نے جھکایا ہے اُٹھانا نہیں آتا

آتی ہے رضاؔ مجھ کو محبت کی غلامی
احسان محبت کا جتانا نہیں آتا

---••☆••---

ہاشمی فریدآبادی

اصل نام سید ہاشم علی، قلمی نام سید ہاشمی فریدآبادی اور کنیت ابوالخیر ہاشم تھا۔ ۳۰ رجنوری سنہ ۱۸۹۰ء کو فریدآباد میں پیدا ہوئے۔ فریدآباد عہد جہانگیری میں آگرہ نئی دتی روڈ پر آباد کیا گیا تھا جو اپنے بانی سید احمد مرتضٰی خان شیخ فرید کے نام سے موسوم ہوا۔ سید ہاشمی فریدآبادی کے والد میر احمد شفیع ایک دولت مند صاحب ثروت وجائدادا ور علم وفضل میں خاص مقام رکھتے تھے۔ وہ اس خاندان کے واحد فرد تھے جو اپنی دولت اور افتادِ طبع کی وجہ سے خود کو "میر" کے بجائے نواب کہلواتے تھے۔ انہیں شعروادب کا نہ صرف ذوق تھا بلکہ خود بھی کہنہ مشق شاعر تھے اور غیر تخلص کرتے تھے۔ امیر مینائی کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ میر احمد شفیع عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے بھی دلدادہ تھے۔ ہاشمی فریدآبادی کی والدہ کا تعلق نوابین لوہارو سے تھے اور گھریلو سطح پر ان کا فارسی اور عربی کا اچھا مطالعہ تھا۔

اُس زمانے کی مروجہ رسوم کی مطابق سید ہاشمی فریدآبادی کی ابتدائی تعلیم بھی گھر ہی سے شروع ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ گھر کی تعلیم کے بعد انہیں فریدآباد کے اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ تانہیال اور ددھیال دونوں جانب علم وادب کے چرچے تھے۔ گھر کی فضا اور ادبی ماحول نے ان کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جس کی بدولت انہیں مطالعے سے گہرا شغف ہوگیا۔ فریدآباد سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہاشمی صاحب اپنے چھوٹے ماموں ضمیر مرزا کے پاس دہلی چلے گئے جہاں انہیں اینگلو عربک اسکول میں داخل کرایا گیا۔ سولہ ۱۶ سال کی عمر میں جب وہ نویں کلاس میں پڑھ رہے تھے تو ان کے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔

والد کی وفات کے بعد ایسے حالات نہ تھے کہ وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکتے۔ سب سے بڑے بیٹے ہونے کے ناتے گھر کی کفالت کا سارا بوجھ ہاشمی صاحب کے کندھوں پر آپڑا۔ میٹرک کے بعد والد مرحوم کے تعلقات کی بنا پر کمشنر دہلی نے انہیں امیدوار تحصیلدار چن لیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ مستعفی ہوگئے

اور لاہور آ کر پیسہ اخبار میں قلیل تنخواہ پر نائب مدیر بن گئے یہاں ان کا تعارف بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ہوا- بابائے اردو کے مشورے پر مزید تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ چلے گئے- ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء تک سید ہاشمی فرید آبادی نے علمی اور عملی جدو جہد کو ساتھ ساتھ رکھا- ۱۹۱۲ء میں انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایف-اے پاس کیا-

ہاشمی صاحب بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے کہ اسی زمانہ میں کانپور میں ایک مسجد کے انہدام کا افسوس ناک سانحہ پیش آ گیا جس میں پولیس کی فائرنگ سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے تھے- یونیورسٹی کے طلبہ کے ایماء سے ہاشمی صاحب نے ایک ولولہ انگیز نظم ''خطاب بہ مٹین لکھی'' جسے انہوں نے قصیدے کا نام لے کر اسٹریچی ہال میں مسٹن (گورنر یوپی) کو مخاطب کر کے پڑھی- اس نظم میں انگریز دشمنی اور انگریز بیزاری کا رنگ نمایاں تھا- مسٹن (گورنر یوپی) اردو زبان سمجھ لیتا تھا- چنانچہ دو تین اشعار کے بعد وہ کرسی صدارت چھوڑ کر چلا گیا- اس وقت ڈاکٹر ضیاالدین کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے جنہیں حکومت نے مجبور کیا کہ سید ہاشمی کو کالج بدر کیا جائے- اس طرح سید ہاشمی کو بحالت مجبوری اپنی تعلیمی زندگی کو خیر آباد کہنا پڑا جس کا انہیں تا عمر رنج رہا-

کالج سے رخصت ہونے کے بعد وہ مولانا محمد علی کے ''ہمدرد'' کے حلقۂ ادارت سے منسلک ہو گئے- اُس زمانے میں محمد علی کو ''مولانا'' کا نام نہیں دیا گیا تھا- ہاشمی صاحب کو ان کی انگریزی تہذیب سے وابستگی بہت ناگوار گزرتی تھی- چنانچہ انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا سارا ترکش ان پر خالی کر دیا- اس کے بعد وہ ہمدرد میں کس طرح رہ سکتے تھے- ہمدرد کے بعد انہوں نے حیدر آباد دکن کا رُخ کیا اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۵ء تک کا عرصہ وہیں گزارا- ۱۹۱۶ء میں قائم ہونے والے دارالترجمہ میں سید ہاشمی کا تقرر ہوا- اس ادارے سے ان کی وابستگی ۱۹۳۳ء تک رہی- اس کے بعد یہ ادارہ ختم ہو گیا تو انہیں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے پر فائز کر دیا گیا-

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے اصرار پر ہوم ڈیپارٹمنٹ سے ریٹائرمنٹ لے کر انجمن سے منسلک ہو گئے- تقسیم ہند کے ہنگاموں کے وقت سید ہاشمی ہندوستان کے مرکز اعلیٰ دہلی میں موجود تھے- ان کے متعلق یہ بات غلط مشہور ہو گئی تھی کہ وہ فسادات کی نذر ہو گئے- بہر حال ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان آ گئے- پہلے وہ کراچی آئے اور انجمن کے کام سے بابائے اُردو سے ملے- اس کے بعد لاہور جا کر کچھ

گھریلو انتظامات کیے اور پھر کراچی آ گئے اور ۱۹۵۴ء تک وہ انجمن سے منسلک رہے۔ بعدازاں ان کے مولوی عبدالحق صاحب سے کچھ اختلافات ہو گئے تو ۱۹۶۰ء میں انجمن سے علیحدہ ہو گئے۔ رسالہ ''قومی زبان'' کراچی نومبر/دسمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۵ پر تحسین سروری لکھتے ہیں:

''سید ہاشمی فرید آبادی ۱۹۵۴ء تک انجمن سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد چند مفاد پرستوں، مفسدوں نے ایسے درویش صفت اور عابد وزاہد عالم پر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ اور مولوی عبدالحق کو ان سے برگشتہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہاشمی صاحب جیسے شریف النفس اور متوکل شخص کیا کرتے۔ مولوی صاحب کی چالیس سال کی رفاقت پر آنسو بہاتے ہوئے لاہور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جب مولوی صاحب کو اصل حقیقت کا علم ہوا تو وہ افسوس کرنے لگے۔ اور کوشش کرنے لگے کہ وہ (سید ہاشمی) پھر سے ان کی رفاقت میں آ جائیں۔ مگر ہاشمی صاحب کا ٹوٹا ہوا دل پھر نہ جڑ سکا......''

لاہور جانے کے بعد سید ہاشمی فارغ نہیں بیٹھے بلکہ وہاں بھی لکھنے پڑھنے میں مصروف رہے۔ کیوں کہ یہی ان کی روزی کا وسیلہ تھا۔ لاہور میں وہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے۔ اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی میں زیرِ ترتیب ''انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' میں بھی کام کرتے رہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وفات کے بعد جب انجمن کی دوبارہ تشکیل وتدوین ہوئی تو اس وقت کے ارکان نے کوشش کر کے سید ہاشمی فرید آبادی کو دوبارہ بلالیا۔ ۱۹۵۹ء میں وہ کراچی آ گئے لیکن زیادہ دن نہیں رہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں مستعفی ہو کر انجمن سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گئے۔

لاہور جانے کے چند برس بعد ۱۹ر جولائی ۱۹۶۴ء کو سید ہاشمی فرید آبادی ملک کو عدم رخصت ہو گئے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں۔

---••☆••---

یاورعباس، ڈاکٹر

ڈاکٹر صاحب کا اصل نام سید یاور عباس تخلص یاؔور اور قلمی نام یاور عباس ہے۔ وہ ۱۹۱۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید ناصر عباس ہے۔ یاور عباس کے آباو اجداد دوسو برس پہلے خراسان سے آئے تھے اور دہلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ انہوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم دہلی اور لاہور میں حاصل کی اس کے بعد عثمانیہ میڈیکل کالج حیدرآباد دکن سے ایم بی بی ایس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دہلی میں پریکٹس کا آغاز کیا۔ یاور صاحب پیشہ کے لحاظ سے تو معالج تھے لیکن انہیں شعروسخن سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ انہوں نے ساتویں جماعت سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ شاعری صرف بطریق تفریح طبع کرتا ہوں۔ اپنے پیشے کی مصروفیات کے باوجود انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور مرثیے بھی کہے۔ یاؔور عباس اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے اور کراچی میں پریکٹس کرنے لگے۔ ان کا کلینک سعید منزل پر واقع تھا جہاں ان کے بھائی دلاور عباس بھی پریکٹس کرتے تھے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی اپنی کتاب ''آنگن میں ستارے'' میں لکھتے ہیں:

> ''یاور صاحب غزل اور مرثیے کے شاعر تھے۔ نظم سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی ممکن ہے انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہوں مگر مجھے ان کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ غزل بڑی خوبصورت کہتے اور خوب کہتے تھے۔ مشاعرے میں پڑھتے بھی بڑی آن بان سے تھے۔ ایک دفعہ داغ کی ایک مشہور زمین میں سب نے غزلیں کہیں۔ بخاری صاحب کی غزل کا مطلع تھا:

مجھے گناہوں کے تجربوں سے نکالنا ہیں ہزار باتیں
ابھی سے روزِ شمار کیسا ابھی تو ہیں بے شمار باتیں

یاور صاحب نے قافیہ بدل کر غزل کہی اور مطلع ایسا کہہ دیا جس میں پیشہ ورانہ نفسیاتی

اظہار نے بڑی عجیب کیفیت پیدا کردی تھی

کچھ اور تشویش بڑھ رہی ہے عجیب ہیں چارہ گر کی باتیں
جواب دینے سے بچ رہا ہے اِدھر کی باتیں اُدھر کی باتیں

مدّتوں چرچا رہا کہ اگر یاور صاحب طبیب نہ ہوتے تو شاید ایسا نازک نفسیاتی مطالعہ اس سہولت اور بے تکلفی سے پیش نہ کر پاتے۔''

سنہ......۱۹ء میں ان کی وفات ہوئی اور کراچی میں مدفون ہوئے۔ان کے کلام ملاحظہ کیجیے ۔

کس طرح کہہ دوں کہ کوئی آرزو باقی نہیں — ہاں مگر پہلا سا کیفِ جستجو باقی نہیں
اب وہ اندازِ جنونِ گفتگو باقی نہیں — یعنی وہ سودائے شرحِ آرزو باقی نہیں
چشمِ تر کا یہ تقاضا اشکِ خوں ٹپکایئے — دل کا یہ عالم کہ چہرہ تو لہو باقی نہیں
چپہ چپہ گلستاں کا چھانتا پھرتا ہوں میں — رنگ کلیوں میں نہیں پھولوں میں بو باقی نہیں
ناگوارِ خاطرِ نازک نہ گزرے تو کہوں — تم میں پہلی سی مروت کی وہ خو باقی نہیں

آئینہ دیکھا تو دیکھا، اب ملال اچھا نہیں
تم یہ کیوں سمجھے تھے کوئی خوبرو باقی نہیں

کیا کہیے کہ کیا ہو گیا اس شہر کا عالم — جس شہر میں الفت کے بھی دستور رہے ہیں
مجبور کسے کہتے ہیں یہ کون بتائے — پوچھے کوئی ان سے کہ جو مجبور رہے ہیں
احسان بڑا بوجھ ہے اس خوف سے یاورؔ — دیوار کے سائے سے بھی ہم دور رہے ہیں

جو کان دھر کر سنیں بھی میں نے کبھی کسی باخبر کی باتیں
وہی شکوکِ خرد کے قصے، وہی فریبِ نظر کی باتیں

سارے فروعات میں رنج و غم و حزن و یاس — حسن تماشائے عام عشق بعید القیاس

چمن میں ہر ہر کلی کو یاورؔ میں سوز و غم بانٹتا پھرا ہوں
مگر یہ غنچے یونہی ہنسیں گے یونہی نئے گُل کھلا کریں گے

طوفانِ التفات ہے ان کی نگاہ میں — کس درجہ مطمئن ہوں میں حال تباہ

---••☆••---

یاور مہدی

یاور مہدی ۱۳؍جنوری سنہ ۱۹۳۸ء کو پرتاب گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن کرنجہ نورد ضلع جون پور ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین کا تعلق بھی جونپور سے تھا۔ یاور مہدی کے والد سید حماد حسین (داروغہ جی) کا شمار کرنجہ نورد کے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور اسکول کی تعلیم ٹانڈے سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے وہ لکھنؤ گئے۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے انہوں نے گریجویشن کیا۔ یاور مہدی کے اساتذہ میں پروفیسر آل احمد سرورؔ، پروفیسر مسعود حسین ادیب، پروفیسر احتشام حسین اور متعدد نامور اور قد آور ادبی اور علمی شخصیات شامل تھیں۔ خاص طور پر یاور مہدی پر ان کے استاد پروفیسر احتشام حسین نے گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور وہ بھی ان کی اطاعت شعاری، نیک اطواری اور حسنِ کارکردگی سے بہت متاثر تھے۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد یاور مہدی سنہ ۱۹۵۵ء ہی میں پاکستان آ گئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ ہجرت کی بے سروسامانی، مالی مشکلات اور نا مساعد حالات کی وجہ سے یاور مہدی بڑی دشواریوں کا سامنا کرتے رہے۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی کچھ عرصہ کے لیے منقطع رہا۔ ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے کراچی میں کلرکی کی ملازمت اختیار کر لی۔ پھر بھی گھر کی ضروریات پوری نہیں ہوئیں تو انہوں نے ٹیوشن بھی پڑھائے اور اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھا۔ بالآخر ۱۹۶۰ء میں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (پولیٹکل سائنس) کی ڈگری حاصل کر لی۔

تعلیم سے فارغ ہوئے تو بہتر ملازمت کی تلاش میں نکلے۔ اسی زمانے میں انہیں تین جگہ سے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ تینوں جگہوں پر یاور مہدی کامیاب قرار دیے گئے۔ ابتدا میں وہ تین سال تک ٹیکسٹائل کمشنر حکومت پاکستان مقرر ہوئے اس کے بعد پانچ سال تک کنٹرولر سدرن ایریا، موجودہ اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ رہے۔ بعد ازاں یاور مہدی نے تحریری امتحان اور انٹرویو میں کامیابی حاصل کر کے ۱۹؍مئی سنہ ۱۹۶۲ء میں ریڈیو پاکستان کراچی میں پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے اپنی پسندیدہ ملازمت

کا آغاز کیا۔ یاور مہدی بڑی متنوع صفات کے مالک اور ایک بہترین تخلیق کار بھی ہیں۔ اپنی اعلیٰ صفات اور بہتر کارکردگی سے انہوں نے ریڈیو پاکستان کے پروگراموں کو بڑی ترقی دی اور مختلف اصناف کے پروگرام پیش کیے جن میں طالب علموں کا پروگرام "بزم طلبا"، "یونیورسٹی میگزین" بہت مقبول ہوئے۔

ابتدا میں یہ پروگرام ہفتہ وار نشر کیا جاتا تھا لیکن بعد میں یہی پروگرام ہفتہ میں دو بار اور پھر تین بار نشر کیے جانے لگے۔ ۱۹۶۶ء میں ریڈیو پاکستان، کراچی سے پہلی مرتبہ جشن طلبا اور جشن تمثیل (طلبا) کی بنیاد ڈالی گئی۔ ان تمام پروگراموں کی کامیابی کا سہرا یاور مہدی کے سر ہے۔ بزم طلبہ، یونیورسٹی میگزین اور جشن تمثیل (طلبا) کو بہتر سے بہتر طور پر پیش کرنے کے لیے وہ خود کراچی کے تمام تعلیمی اداروں کا سروے کرتے اور ذہین و شوقین طلبہ و طالبات کو ڈھونڈ نکالتے تھے۔ اور پھر وہ ان کی تعلیم و تربیت اتنی لگن اور محنت سے کرتے تھے کہ طلبا و طالبات "جشن تمثیل" میں کھیل خود لکھتے اور خود صداکاری کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ پیش کش بھی انہی کی ہوتی تھی۔ مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد یاور مہدی ۱۴ر جولائی ۱۹۹۸ء کو ریٹائر ہوئے۔

یاور طالب علمی کے دور سے ہی سماجی و ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے لکھنؤ میں چکبست سوسائٹی سے آغاز کیا جس کے وہ فعال اور سرگرم کارکن تھے۔ انہوں نے اس سوسائٹی کو قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور اس کے تحت مختلف علمی و ادبی پروگرام پیش کیے۔ ان پروگراموں میں مشاعرہ 'غالب اس دور میں' اور 'تمثیلی مشاعرے' قابل ذکر ہیں جن میں جوش ملیح آبادی' فراق گورکھپوری' مرزا جعفر علی خاں اثر اور فنا کانپوری بھی شرکت کر چکے ہیں۔

یاور مہدی کو دوران طالب علمی سے ہی سماجی اور ثقافتی کاموں سے دلچسپی رہی ہے۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ آرٹس کونسل میں بھی سرگرم عمل رہے۔ وہ آج بھی چھوٹے سے لے کر بڑے فنکار، آرٹسٹ، گلوکار، شاعر، ادیب، مصور اور مجسمہ ساز سب کے اعزاز میں آرٹس کونسل میں محفلیں سجاتے رہتے ہیں۔ اپنے تمام تر نامساعد حالات کے باوجود سماج کو خوب تر دیکھنے، سنوارنے اور نکھارنے کی تگ و دو سے اپنی زندگی کا اٹوٹ رشتہ سمجھتے ہیں۔ ان کو رسمی طور پر نہیں بلکہ پوری معنویت کے ساتھ ایک ادارہ اور ایک انجمن تصور کیا جا سکتا ہے۔

---••☆••---

یکتا امروہوی

ان کا اصل نام سید واحد علی، تخلص یکتا اور قلمی نام یکتا امروہوی تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء کو امروہہ کی مردم خیز بستی میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سید لطف علی نقوی کو ''حقانی'' کے شاہی خطاب سے نوازا گیا تھا اور اسی مناسبت سے امروہہ میں ان کی رہائش گاہ کے اطراف کا علاقہ محلّہ ''حقانی'' کے نام سے موسوم ہے۔ یکتا صاحب نے ابتدائی تعلیم سید المدارس، نورالمدارس امروہہ اور باب العلم نوگانواں سے حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم میرٹھ کے منصبیہ عربی کالج میں حاصل کی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر دہلی چلے گئے جہاں وہ نیشنل پبلک لائبریری کے مہتمم مقرر ہوئے۔ انہوں نے اسی لائبریری کے ماہنامہ ''قوم'' میں بحیثیت ایڈیٹر بھی خدمات انجام دیں۔

یکتا صاحب نے سخن پرور بستی امروہہ میں آنکھ کھولی تھی۔ لہٰذا بچپن ہی سے ان کی طبیعت شعر سخن کی طرف مائل ہوئی اور اس میں دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے غزلیں، نظمیں، گیت اور نعتیں لکھیں جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا کرتی تھیں۔ وہ بڑے بڑے مشاعروں میں بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ یکتا امروہوی نے بچوں کے ادب کے لیے بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے سیکڑوں طویل اور دلچسپ کہانیاں لکھیں جن کے عنوان بھی وہ بڑے دلچسپ منتخب کرتے تھے۔ مثلاً ''بی پتیلی مہمان گئیں''، ''مسٹر بخار دورے پر''، ''کھلونوں کا اجلاس''، ''چوہوں کا کرفیو''، ''بی اے پاس چوہا'' وغیرہ۔ ان کہانیوں میں طوالت کے باوجود شروع سے آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اسی طرح بچوں کے لیے انہوں نے بہت سی مزاحیہ نظمیں ''حاتم''، ''اللہ میاں کی پیاری یاد''، ''اے میرے غٹرغوں''، ''گنتی کی نظم''، ''وقت ہے انمول موتی'' وغیرہ کے عنوان سے لکھیں۔ انہوں نے صرف بچوں کے ادب ہی پر کام نہیں کیا بلکہ بڑوں کے لیے بھی تقریباً سوا سو کتابیں لکھی ہیں جن میں منظومات، منقبتیں، قصائد اور غزلیں شامل ہیں۔

تقسیم ہند سے پہلے مختلف اخبارات اور رسائل میں ان کا کلام اور تصانیف شائع ہوتی رہی ہیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں جو فساد برپا ہوئے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اس سے متاثر ہو کر یکتا امروہوی نے ایک کتاب ''خونی ہے ہندوستان'' لکھی جس کی ہر طبقۂ فکر میں بڑی شہرت اور بے حد پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ارشد تھانوی نے لکھا:

''یہ مجموعہ مضامین اسی سعی مضطرب کے نتائج فکری کا شیرازہ ہے جن کی تدوین و اشاعت کے لیے ملک کے ہر بہی خواہ امن پسند اور نیک دل انسان کو جناب یکتا امروہوی کی ہوشمندانہ صلاحیتِ عمل کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ انہوں عین موقعہ پر اس کتاب کو چھاپ کر بھڑکتی آگ پر پانی ڈالا ہے۔''

اسی کتاب ''خونی ہے ہندوستان'' پر شوکت تھانوی نے اس طرح تبصرہ کیا ہے:

''یکتا صاحب امروہوی کے اس مجموعہ میں صرف اسی لیے میں خود بھی شامل ہونا چاہتا ہوں کہ اس نسل کے بعد کا مورخ مجھ کو اور میرے خاندان کو شیروں، بھیڑیوں اور کتوں وغیرہ کے شجرہ میں تلاش نہ کرے بلکہ میرا پتہ اُس کو ''خونی ہے ہندوستان'' سے مل سکے۔ کہ میں بھی اس انسانیت سے بیزار دور میں بمشکل تمام انسان بنا رہا۔''

اس کتاب کی اشاعت کے بعد بہت سی نامور شخصیات نے اپنی اپنی آراء سے نوازا اور خطوط لکھے جن میں نیاز فتح پوری، احمد ندیم قاسمی، اشتیاق اظہر، پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین زور، ساغر نظامی، گوند ولبھ پنت وزیراعظم یوپی کے نام شامل ہیں۔

یکتا امروہوی آزادی کے فوراً بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے اور یہاں بھی وہ ادب کے فروغ میں مصروف ہو گئے۔ ابتدا میں سنہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک پاک ہیرالڈ کے رسالے ''خاتونِ پاکستان'' کے شعبے ادارت سے منسلک رہے۔ یکتا امروہوی کسی ایک ہی صنف کے فرد نہیں تھے، انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؓ کے سفرِ کربلا کو مثنوی کی ہیئت میں ''شاہنامہ کربلا'' کے عنوان سے شائع کیا جس کی مذہبی اور ادبی دونوں طبقوں میں بہت پذیرائی ہوئی۔

کچھ عرصہ کراچی میں قیام کرنے کے بعد وہ خیر پور میرس چلے گئے جہاں وہ والی خیر پور ہز ہائی

نس میر علی تالپور کے اتالیق مقرر ہوئے۔ خیر پور میں بھی انہوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں پر انہوں نے سہ روزہ ''مراد'' میں بحیثیت مدیر خدمات انجام دیں اور بچوں کا ایک رسالہ ''کہانی'' کے عنوان سے جاری کیا۔ ان کی تصانیف میں ادبی تحریریں بھی ہیں اور افسانوی ادب بھی۔ یکتا امروہوی نے نعتوں پر مشتمل مجموعہ ''درود اُن پر'' اور ایک سلاموں کا مجموعہ ''سلام اُن پر'' لکھ کر شائع کیا۔ انہوں نے سلاموں کا مجموعہ حروف تہجی کی ترتیب سے لکھا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر ادباء، شعراء اور بہت سی نامور شخصیات نے تبصرہ کیا اور بے حد پذیرائی کی جن میں مولانا ماہر القادری، شفیق بریلوی اور زیڈ اے بخاری کے نام شامل ہیں۔ پشاور سے نکلنے والے ماہنامہ ''الجبت'' جواب شائع نہیں ہوتا، غالباً بیس پچیس سال پہلے یادگار حسینی نمبر میں اس کے مدیر نے لکھا تھا:

''اب تک ہندوپاکستان میں متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعراء میں سے کسی نے بھی سلاموں کا کوئی مجموعہ ایسا تصنیف نہیں کیا جو غزلوں کے دیوان کی طرح سلاموں کے دیوان کی حیثیت سے تصنیف کیا گیا ہو۔ یعنی ''الف'' سے لیکر ''ی'' تک ردیف وار تسلسل سے سلام کہے گئے ہوں مگر یکتا صاحب اس پیشکش میں بھی اپنی خداداد یکتا صلاحیت کے ساتھ یکتا ہی ہیں۔''

۱۴ر جولائی ۲۰۰۳ء کو علم وادب کا یہ روشن چراغ سیاہ پوش ہو گیا۔ بہشتِ زہرہ ناتھ کراچی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

یکتا امروہوی کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

دستِ رنگیں میں اگر ان کے چھلکتا جام ہو ۔۔۔ شعلہ در آغوش موجِ بادۂ گلفام ہو

اتنا رنجیدہ نہ اے میرے دلِ ناکام ہو ۔۔۔ یہ تو آغازِ جنوں ہے دیکھ کیا انجام ہو

سچ تو یہ ہے میں سمجھتا تھا کہ ناممکن ہے یہ ۔۔۔ آپ کا پیغام ہو اور وہ بھی میرے نام ہو

وقتِ آخر ہے چلے آؤ رُکا جاتا ہے دم ۔۔۔ نام ہوجائے تمہارا، اور ہمارا کام ہو

موت کی وہ ایک ہچکی ہے امینِ زندگی ۔۔۔ اے عزیزو جس پہ میری زیست کا اتمام ہو

وہ نہ آئیں گے، نہ آئیں گے، نہ آئیں گے کبھی ۔۔۔ آج یکتا! کاش یہ میرا خیال خام ہو

---••☆••---

یونس حَسنی، ڈاکٹر

حَسنی صاحب کا پورا نام سید محمد یونس' اور یونس حسنی قلمی نام ہے۔ ۳ر ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء کو ٹونک (راج) بھارت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید عبیداللہ رحمان کا شمار شہر کی معزز شخصیات میں ہوتا تھا۔ حَسنی صاحب کا تعلق سید احمد شہید کے علمی گھرانے سے ہے جو ٹونک میں محلّہ قافلہ میں آباد ہے۔ حَسنی صاحب کو ابتدائی تعلیم گھر پر دی گئی اس کے بعد انہیں دربار ہائی اسکول ٹونک میں داخل کرایا گیا جہاں سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے وہ بھوپال چلے گئے۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں انہوں نے وکرم یونیورسٹی، اُجین سے اوّل درجہ میں ایم اے (اردو) کیا۔ اس کے بعد اسی یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۶۴ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ پی ایچ ڈی میں ان کے مقالے کا عنوان ''اختر شیرانی اور جدید اردو'' تھا۔ ڈاکٹر حسنی صاحب کی مادری زبان تو اردو ہے لیکن وہ انگریزی' ہندی' فارسی زبان پر بھی دسترس رکھتے ہیں اور کچھ انہیں عربی زبان کی بھی سدبدھ ہے۔

تعلیم سے فارغ ہوئے تو تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے درس و تدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا۔ اگست سنہ ۱۹۶۳ سے نومبر ۱۹۶۴ء تک انہوں نے ایم بی کالج (راج) بھارت اور راجستھان کالج جے پور میں پڑھایا پھر سنہ ۱۹۶۵ء سے سنہ ۱۹۶۸ء تک وہ مدھاوا کالج، وکرم یونیورسٹی، اُجین میں بحیثیت لیکچرار رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب پاکستان آ گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ یہاں آ کر وہ کراچی کنٹونمنٹ کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں حَسنی صاحب نے فیڈرل بورڈ آف ایجوکیشن اور ڈیپارٹمنٹ آف اردو، کراچی یونیورسٹی میں بحیثیت ممبر کمیٹی آف کورس اور بورڈ آف اسٹڈیز سے منسلک رہے۔ ۱۹۸۵ء سے تا حال وہ کراچی یونیورسٹی میں BOARD OF FACULTY کے ممبر ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی کی ACADEMIC COUNCIL,SENATE اور BOARD OF INTERMEDIAT EDUCATION,KARACHI کی ACADEMIC COUNCIL کے ممبر بھی رہے۔

ڈاکٹر حسنی صاحب نے ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء تک کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے چیئر مین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں- انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس میں گزارا-ان مصروفیات کے علاوہ وہ انجمن ترقی اردو میں خدمات انجام دے چکے ہیں اوراردولغت بورڈ میں بحیثیت مدیراعلیٰ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے-یونس حسنی صاحب ایک ادبی شخصیت کے مالک ہیں اورادبی دنیامیں انہیں اعلیٰ اور بلند مقام حاصل ہے-اتنی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے تالیف وتصنیف کا بھی بڑا کام کیا ہے-

ان کی مطبوعہ کتب جوشائع ہوچکی ہیں ان میں (۱)اختر شیرانی اورجدیداردو (۲) جاپان آئینۂ ایام میں(ترجمہ)(۳)جاپان کا مکتبی نظام(ترجمہ)(۴)انسان عہد بہ عہد (ترجمہ)(۵)اختر شیرانی (کتابیات)(۶) کاوشیں(ادبی اورتنقیدی مضامین)(۷)کلیات اختر شیرانی(۸)صبح بہاراں اختر شیرانی(ترتیب وتدوین)(۹)اختر ستان ازاختر شیرانی(ترتیب وتدوین) (۱۰)لالہ طورازاختر شیرانی (ترتیب وتدوین)(۱۱)طیورازاختر شیرانی (ترتیبوتدوین)(۱۲)شہنازازاختر شیرانی(ترتیب وتدوین) (۱۳)رودونغمۂ آوارہ ازاختر شیرانی(ترتیب وتدوین)(۱۴)نغمۂ حرم اختر شیرانی(ترتیب وتدوین)اور ہائیکو- مستقبل اورامکانات وغیرہ شامل ہیں-

ان کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے خاکے' متفرق تحریریں' مختلف کتابوں کے مقدمات وپیش لفظ' تراجم اور پچاسوں تحقیقی' تنقیدی اورادبی مقالات بھی لکھے ہیں جوادبی رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں- بچوں کے لیے بھی انہوں نے خوبصورت اوردلچسپ کہانیاں لکھی ہیں اورمختلف موضوعات پرریڈیو پاکستان کراچی سے تبصرے بھی کیےاور مذاکروں میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں-درس وتدریس' تصنیف وتالیف' تدوین اور مضمون نگاری کے علاوہ صحافت سے ان کا تعلق ہندوستان اور پاکستان کے دونوں ادوار میں رہا-وہ آج کل بھی روزنامہ ''ایکسپریس'' کراچی میں کالم لکھتے ہیں-

---••☆••---

کتابیات

کتاب کا نام	مصنف/مولف	پبلشر	سنہ
حمتائے سخن	شاہ محمد ریحان قادری	فاران پبلی کیشنز کراچی	فروری ۲۰۰۲ء
مضامین افضل	خواجہ افضل امام	پاکیزہ آفسٹ پریس پٹنہ	۲۰۰۱ء
تذکرۂ معاصرین جلد ۱، ۲، ۳، ۴	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	
سخن ور آج کی شاعرات	مہر سلطانہ		
سخن امروز	خان ظفر افغانی	ٹرسٹ شان پرنٹنگ پریس کراچی	اکتوبر ۱۹۹۴ء
سخنگان کراچی	پروفیسر محمد اسلم	ادارۂ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب	نومبر ۱۹۹۱ء
بادِ سنگ دست	جوہر سعیدی	بزمِ جوہر سعیدی ۳-۱ے ۵۸۸ لانڈھی	۱۹۸۱ء
مہر و ماہ	انجم فوقی	جنگ پرنٹنگ پریس، راولپنڈی	۱۹۸۰ء
ستارۂ سفر	جمال احسانی	تعبیر پبلیکیشنز، کراچی	۱۹۸۲ء
مقالات مرزا محمد سعید	مرتبہ شیما مجید	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	۲۰۰۲ء
انگلیاں فگار اپنی	دلاور فگار	ایجوکیشنل پریس کراچی	اکتوبر ۱۹۷۱ء
صدائے دل	ہادی مچھلی شہری	ایجوکیشنل بکڈپو حیدرآباد	۱۹۶۶ء
عکس فریادی	نصیر ترابی	ترابیہ، سی ۲۰، ۱۹/۱۱ ایف بی ایریا کرا	۲۰۰۰ء
اردو غزل انتخاب	اکادمی ادبیات		
ابرِ صحرا	ساحر عباسی	افریشیا پرنٹنگ پریس کراچی	۱۹۷۸ء
اردو غزل انتخاب ۱۹۷۶-۷۹/۷۷	اکادمی ادبیات پاکستان		۱۹۸۰ء
معروف لوگوں کا بچپن جلد ۲	فیروز احمد سمیع	ادارہ ابلاغ فن و ادب	۱۹۹۹ء
ایک جہاں اور بھی ہے ۲ مڈویک جنگ ۲۰۰۳ء	رضیہ فصیح	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۶۷ء
صدیوں کی زنجیر	رضیہ فصیح	مکتبۂ اسلوب کراچی	۱۹۸۸ء
سب رس (یادِ رفتگاں حصہ دوم)	حمید الدین شاہد		۱۹۸۲ء
چراغ آشیاں	کیف بنارسی	مدینہ پبلشنگ کمپنی ایم اے جناح روڈ	۱۹۸۷ء
غزالِ رعنا	رعنا اکبرآبادی	عدنان اکیڈمی، کاسموپولٹن کالونی کراچی	۱۹۶۸ء
محمد عمر مہاجر احوال و آثار نقوش ۱۰۰	فریسہ عقیل	عصری مطبوعات کراچی	۱۹۸۰ء
میرے زمانے کی دلی	ملا واحدی	گلڈ انجمن کتاب گھر، کشور یار روڈ کراچی	
اطہر ہاپوڑی حیات و فن شاعری، رسالہ نقوش	شاہدہ افضال مرحومہ	ناشر محمد اطہر نفیس سندیلوی، سندیلہ یوپی	
صریر کراچی (جون، جولائی سالنامہ ۲۰۰۳ء	ایڈیٹر ڈاکٹر فہیم اعظمی	سی ۱۴-بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا کراچی	۲۰۰۳ء
ماہنامہ ''قومی زبان'' مئی ۱۹۸۵ء (شبیر علی کاظمی)	انجمن ترقی اردو	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۸۵ء
ضیائے سخن ضیائی ہاشمی کا کلام		ابن حسن آفسٹ پرنٹنگ پریس کراچی	

ماہنامہ "نگار" ۱۹۶۹ء			
مجموعہ کلام "وجدانِ سلیم"	اسعد شاہ جہان پوری		
"سوکھے ساون"	ضمیر الدین احمد	مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ کراچی	۱۹۹۱ء
"لاہور میں مشاہیر کے مدفون"	ایم آر شاہد	جنگ پبلشرز لاہور	۲۰۰۳ء
گنجینۂ گوہر	شاہد احمد دہلوی	عظمی پرنٹرز، ناظم آباد کراچی	۱۹۶۲ء
ماہنامہ "بدایوں" کراچی اکتوبر ۱۹۹۱ء شمارہ نمبر ۹			۱۹۹۱ء
انسائیکلوپیڈیا پاکستانی کا	سید قاسم محمود		
"مجلہ" یونی کیرین سنہ ۹۳، ۱۹۹۶ء			
"آنگن میں ستارے"	ڈاکٹر اسلم فرخی		
"جنگ" میگزین ۲۴ نومبر ۲۰۰۲ء			
"شعرستان" تذکرہ شعرائے پاکستان			
ماہنامہ "العلم" کراچی (سہ ماہی اپریل تا جون)			سنہ ۲۰۰۳ء
حیدرآباد کے شاعر انتخاب کلام	مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد	آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی	۱۹۵۸ء
مڈویک "جنگ" یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء			
"حکایاتِ خونچکاں"	ضمیر نیازی		
"سخنورانِ کاکوروی"	حکیم نثار احمد علوی		
"شعر و ادب کانپور"	ڈاکٹر سید سعید احمد	کراچی	
دیر و حرم کا افسانہ	صغیر بلگرامی اکیڈمی	احمد برادرس پریس ناظم آباد کراچی	۲۰۰۳ء
خرمنِ جاں (مجموعہ نظم و نثر)	ادارہ یادگار غالب	احمد برادرس پریس ناظم آباد کراچی	۲۰۰۳ء
بہ یادِ پنہاں	فردوس اسماء	شہاب آرٹ پرنٹرز نارتھ ناظم آباد کراچی	
سہ ماہی "انشاء" شمارہ ۳، ۷ جنوری تا مارچ حیدرآباد		معاونین عفت افضل ظفر محمد قریشی فضال	۲۰۰۳ء
یاور مہدی	اویس ادریس انصاری		۱۹۹۸ء
انجم	باقر زیدی	بزم انجم آفندی ۵-سی ۵/۱۱ ناظم آباد کراچی	۱۹۷۷ء
پاکستان کی منتخب افسانہ نگار خواتین	وردانہ جاوید	قصر الادب حیدرآباد	۲۰۰۲ء
محمد احمد سبزواری فن اور شخصیت	ڈاکٹر رضیہ اختر	مطبع: عباس ڈاٹ کام بھوپال	۲۰۰۳ء
ماہنامہ "قومی زبان" انجمن ترقی اردو (سبزواری)		اکتوبر	۲۰۰۳ء
شعرستان شعرائے پاکستان	نعمان تائب مظہر صدیقی	مکتبہ پرچم، حسن علی آفندی روڈ کراچی	۱۹۵۰ء
مجلہ "حرفِ نشاط آور" رفیق خاور			
انسائیکلوپیڈیا پاکستانی کا	سید قاسم محمود	شاہکار بک فاؤنڈیشن آفندی کراچی	
بیدار دل لوگ (ابو الجلال ندوی)	شاہ محی الحق فاروقی	اکادمی بازیافت کراچی	مئی ۲۰۰۳ء

ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل کراچی (ابوجلال)	۱۷-۲۳ جنوری ۲۰۰۳		
معارف	مرتبہ ضیاءالدین اصلاحی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	اگست ۱۹۹۴ء
شخصیات میرٹھ، مشاہیر میرٹھ، تذکرہ شعراء میرٹھ	نور احمد میرٹھی	ادارہ فکرِ نو کراچی	۲۰۰۳ء
''فکروفن کے محرکات'' کراچی	مدیر شفیق احمد شفیق	حلقۂ آہنگِ نو	۲۰۰۱ء
دیروحرم کا افسانہ	سید وصی احمد بلگرامی	صفیر بلگرامی اکیڈمی ۶۳ شرف آباد کراچی	۲۰۰۳ء
تاریخ رفتگان	صابر براری	ادارہ فکرِ نو کراچی	۱۹۸۶ء
''جام نو'' مظہر خیری نمبر	''جام نو'' کراچی		۱۹۷۵ء
''اپنی یادیں''	سید علی محمد زیدی	عزتی پبلیکیشنز ردولی بارہ بنکی یوپی	
اُردو کی ادبی تحقیق وتنقید میں خواتین کا حصہ	ڈاکٹر عظمیٰ فرمان	کراچی یونیورسٹی پریس	
کمال کے مضامین	حسن اکبر کمال	سیپ پبلیکیشنز کراچی	
تذکرہ کہکشانین	شاہ بلیغ الدین	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی	۲۰۰۱ء
بیسوی صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں	سید عاشور کاظمی	انسٹیٹیوٹ تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر برطانیہ	۲۰۰۱
پاکستان کی منتخب افسانہ نگار خواتین	دردانہ جاوید	قصر الادب حیدر آباد	۲۰۰۲ء
رشیدہ رضویہ، خالدہ شفیع، سعیدہ گزدر			
بلا کم وکاست (خودنوشت)	مہدی علی صدیقی	شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامع کراچ	جنوری ۲۰۰۰
دریا آخر دریا ہے	امید فاضلی	سیپ پبلی کیشن کراچی	
زنجیرِ ہمسائیگی	رسا چغتائی	رسا پبلی کیشن، مشرقی ۹۶ کورنگی ۵ کراچی	
یادِ رفتگاں جلد اول ودوم ماہر القادری کے مضامین	مرتبہ طالب ہاشمی	البدر پبلیکیشن ۲۳ راحت مارکیٹ لاہور	فروری ۱۹۸۶ء
نشاطِ کرب	پاشا رحمٰن	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۷۸ء
سخن در سخن	شاہد الوری	مکتبہ الانصار، الف/۶۶۹، کورنگی ٹاؤن	۱۹۸۲ء
حرفِ نمو	علامہ طالب جوہری	ناشر ذوالفقار علی شیخ	۱۹۹۶ء
''چشمِ خیال''، ''نوشتہ'' مجموعہ کلام	مقبول نقش		
شعاعِ نور	وفا براہی	مکتبہ شعاعِ نو، بلاک ایچ نارتھ ناظم آباد	جنوری ۱۹۹۲ء
گوشے اور جالے	احمد صغیر صدیقی	کتابیات پبلی کیشنز	۲۰۰۲ء
انکشافات	ڈاکٹر محمد صدر الحق		
رات کے جاگے ہوئے (مجموعہ کلام)	جمال احسانی	سندھ آفسٹ پریس کراچی	۱۹۸۶ء
بے صدا بستیاں (مجموعہ کلام)	جاوید منظر	ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی	۱۹۹۶ء
پاکستانی اہلِ قلم کی ڈائریکٹری		اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان	۱۹۷۹ء
افسانوی مجموعہ ''بدلتے رنگ شگوفوں کے''	خالدہ شفیع	سیپ پبلیکیشنز، کراچی	ستمبر ۱۹۸۳ء
مجموعۂ کلام ''اک سائے کا قتل ہوا''	شمیم نوید	مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور	۲۰۰۴ء
شعری مجموعہ ''پیش کش''	شاہد مقوی	ارتقا مطبوعات	۱۹۹۹ء

سید ہاشمی فرید آبادی احوال و آثار (مقالہ)	تابانہ تنزیلہ	پنجاب یونیورسٹی اور نیشنل کالج لاہور	۱۹۸۷ء
ماہنامہ "فاران" کراچی (ارم لکھنوی)			مارچ ۱۹۶۷ء
ماہنامہ "قومی زبان" (ارم لکھنوی)			مارچ ۱۹۶۷ء
"ادبیات و شخصیات"	ڈاکٹر فرمان فتح پوری		
حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	
"جو رہی سو بے خبری رہی" (سرگزشت)	ادا جعفری		
"اردو افسانہ اور افسانہ نگار"	ڈاکٹر فرمان فتح پوری		
"ادب و ادبیات"	ڈاکٹر فرمان فتح پوری		
مجموعۂ کلام "دیدۂ تر"، "حضور" اختر لکھنوی	اختر لکھنوی		
ماہنامہ "دائرے" ڈاکٹر مشرف کا مضمون			
(۱) "میرے بزرگ میرے ہم عصر"	ڈاکٹر وفا راشدی		
ماہنامہ "الفاظ" کراچی۔ شمارہ جون ۱۹۸۵ء			
ماخذ۔ معروف لوگوں کا بچپن (۲) اردو غزل انتخاب			
"نقوش آپ بیتی نمبر" جون سنہ ۱۹۶۴ء			
مجموعہ کلام "سوادِ شام سے پہلے"	نگار سجاد ظہیر	قرطاس، کراچی	
روزنامہ "ریاست" کراچی ۸ نومبر ۲۰۰۳ء	جلیل قدوائی کی ایک تحریر		
"اردو وا سوخت" شمیم صبائی متھراوی دیوان ہمدم			
مقالات۔ چھٹی کل پاکستان اہل قلم کانفرنس	اکادمی ادبیات پاکستان		
۱۷۔۱۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء			
تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ ششم	حکیم سید احمد اللہ ندوی	انٹرنیشنل پریس کراچی	۱۹۷۰ء
مجموعۂ کلام "دکھ پیمبری کے"	رفعت القاسمی	پاکستان اردو اکادمی۔ کراچی	

---☆---

''دبستانوں کا دبستان'' (کراچی) جلد اوّل کی فہرست..........سال اشاعت ۲۰۰۳ء

---••☆••---

مصنف کی دیگر کُتب

خودنوشت

کراچی کی تاریخ

امروہہ کی تاریخ

کراچی کی ادبی تاریخ

''سیاحت ماضی'' کی تقریب اجراء کی تصاویر

ڈاکٹر شان الحق حقی

قاری وحید ظفر قاسمی

سحر انصاری

تاجدار عادل

ڈاکٹر منظور احمد

علی نواز وفائی

سامعین

سامعین

''سیاحتِ ماضی'' پر اہل ادب کے تبصرے

ڈاکٹر شان الحق حقی: مجھے احمد حسین صدیقی صاحب کی تحریر ''سیاحت ماضی'' بہت پسند آئی - ...... اس میں چند افسانوی واقعات نے بھی بہت متاثر کیا، بلکہ مستقل تاثر ذہن پر چھوڑا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری: میں اسے صرف تخلیقی ادب پارہ کا نام دیتا ہوں - ایسا تخلیقی ادب پارہ جسے لکھا نہیں گیا بلکہ یوں لگتا ہے جیسے پورے کا پورا ادب پارہ لفظ و معنی کی جملہ وسعتوں کے ساتھ مصنف پر نازل ہوگیا ہے چنانچہ میری نظر میں ''سیاحت ماضی'' ان ادب پاروں میں سے ایک ہے جو اپنے آپ کو قاری سے بصد شوق پڑھواتا ہے اور احمد حسین صدیقی کو ایک تخلیق کار کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

زاہدہ حنا: 'باغ و بہار'' کے درویش نے زیب داستاں کے لیے کہا تھا کہ اس دنیا میں جس پر جو بیتی وہ بیان کرے بشرطیکہ جھوٹ اس میں کوڑی بھر نہ ہو - احمد حسین کا قصۂ ماضی پڑھتے ہوئے ''باغ و بہار'' کی یاد آئی تو یوں کہ اپنی بپتی سنانے والا یہ قصہ گو سچ کا دعویٰ کہیں نہیں کرتا اور پھر بھی ہر سطر پکار پکار کر کہتی ہے کہ اس بین پر رتی بھر جھوٹ کا گمان نہ کیجیو۔

جونؔ ایلیا: 'سیاحت ماضی'' میں امروہے کی زبان ٹکسالی اردو لکھی گئی ہے - یہاں میں یہ بات بھی بڑے عجز و انکسار کے ساتھ عرض کردوں کہ کھری اردو وہی ہے جو روہیلکھنڈ میں بولی جاتی ہے - اگر احمد حسین کے لہجے کا سلسلہ نسب تلاش کیا جائے تو وہ باغ و بہار اور آرائشِ محفل (قصہ حاتم طائی) سے شروع ہوتا ہے اور غالبؔ کے خطوط تک آتا ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد: اس کتاب میں اور اس شخص میں جس نے یہ کتاب لکھی ہے ایک ایسی یک رنگی پائی جاتی ہے کہ آپ کو وہ دوسری کتابوں میں ملے گی نہیں۔

علی نواز وفائی: میرا یہ خیال ہے ...... میری Forecast ہے ...... میری پیش گوئی ہے کہ اس کتاب کے بعد احمد حسین .... دیکھنا پانچ چھ کتابیں لکھیں گے۔

ڈاکٹر عظیم حیدر: امروہہ مصنف احمد حسین صدیقی کی یادوں کی منڈیروں پر جتنے بھی چراغ جھلملا رہے تھے ان سب کو انہوں نے تصنیف کے فانوس میں رکھ کر نہ صرف محفوظ کر دیا ہے بلکہ نئی زندگی بھی عطا کی ہے۔

''کشورِ اولیاء'' (امروہہ) کی تقریب اجراء امروہہ میں منعقد ہوئی

بھونیش کمار شرما

ڈاکٹر منظر عباس

ابھی نندن جین

ڈاکٹر خلیق انجم کتاب کا اجراء کرتے ہوئے

نثار احمد فاروقی اسٹیج پر

متین صدیقی

''کشورِاولیاء'' (امروہہ) پردانشوروں کے تبصرے

حکیم کلب علی: امروہہ

کشوراولیاایک پاکیزہ تصور، ایک مقدس تخیل اور ایک تحقیقی مقالہ ہے۔اس کامصنف بشری جلال وجمال کا آئنہ دار، انسانی اقدار کا سرمدی سرچشمہ ہے۔کسی مقام پر اس کا قلم کج مج، زیاں اور الکن نہیں ہوا ہے۔''کشوراولیا'' صدیقی صاحب کی تازہ تصنیف ہے جس کی رسم اجراء امروہہ میں بڑے عزم وجمال کے ساتھ ادا کی گئی ہے۔اس دبلے پتلے اور کم عمر شخص نے اتنی بڑی مہم کیسے سرکرلی۔ ہندو پاک کی ادبی شخصیتیں اور تاریخی شعور رکھنے والی معتبر اور مشہور شخصیتیں صدیقی کو ہدیہ تحسین وتبریک پیش کررہی ہیں اور چاروں طرف سے لبیک لبیک کی آواز آرہی ہے۔یہ صاف ستھری تصنیف اس صدی کی اعلیٰ ترین تصنیف قرار دی جارہی ہے۔ساکنان امروہہ اور اہل ہند صدیقی اور پاکستان کو اس عظیم تاریخ کی تصنیف پر داد دے رہے ہیں۔

جونؔ ایلیا: کراچی

احمد حسین کا دوسرا احمد حسین میرے لیے کئی برس سے ایک مسئلہ بن رہا ہے۔وہ قلم وقرطاس کا نہایت ''صاحب دل انسان'' واقع ہوا ہے۔وہ اپنے قلم سے کوئی بھی ''پرمایہ فتنہ'' بپا کرسکتا ہے۔میں جن بزرگوں، اپنی پیڑھی کے لوگوں اور اپنے بعد آنے والے مصنفوں سے واقف ہوں ان میں یہ شخص مجھے اب تک وہ پہلا او آخری مصنف دکھائی دیتا ہے جو اپنی پہلی ہی تصنیف ''سیاحت ماضی'' میں ایک نام بُردہ اور صاحب اسلوب، صاحب اسلوب یگانہ مصنف کے طور پر شہود میں آیا۔احمد حسین کی تالیف نہایت بیش قدر تالیف ہے۔''کشورِاولیا'' میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ تاریخ تاریخ ہے افسانہ افسانہ

ڈاکٹر عظیم حیدر: امروہہ

احمد حسین صدیقی امروہہ کے وہ پہلے مورّخ ہیں جو نہ صرف مورّخ بلکہ مصوّر بھی ہیں مگر مورّخ ایسے کہ غیر بھی جنہیں مصنف مان لے اور مصور ایسے کہ تصاویر کو قوتِ گویائی عطا کردیں' گونگی تصاویر کو زبان عطا کردیں۔

--••☆••--

''دبستانوں کا بستان'' (کراچی) جلد اوّل پر دانشوروں کے تبصرے

ہفت روزہ 'ہماری زبان'
انجمن ترقی اردو ہند دہلی

اردو میں شاعروں کے تذکروں کی روایت بہت قدیم ہے۔ابتدا میں یہ تذکرے فارسی زبان لکھے گئے تھے۔اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ میر تقی میر کا نکات الشعراء ہے جو ۱۷۵۲ء میں لکھا گیا۔نکات الشعراء سے لے کر احمد حسین صدیقی کے ''دبستانوں کا دبستان کراچی'' تک تقریباً ستر (۷۰) تذکرے لکھے گئے ہیں۔...... مشکل یہ تھی کہ جو حضرات ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی چلے گئے تھے ان کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ہمیں ان کی ذاتی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کے بارے میں بہت کم معلوم تھا۔صدیقی صاحب کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے کراچی کے ادیبوں اور شاعروں کے تذکرے دو جلدوں میں لکھے۔

ریاض الرحمٰن شروانی
حبیب منزل میرس روڈ علی گڑھ

پیکٹ میں سے کتاب نکالی تو لگا گویا دبستان کھل گیا، واقعی دبستانوں کا دبستان ہے۔آپ نے اس پر کتنی محنت اور کتنا وقت صرف کیا ہوگا۔اس میں مجھے اپنے اُستاد بھی ملے بزرگ بھی، زمانۂ طالب علمی کے ساتھی بھی ملے اور احباب بھی۔

روزنامہ 'جنگ''
۱۸ر مئی ۲۰۰۳

اہل کراچی کو مبارک کہ شہر کراچی میں رہ کر ادبی کام کرنے والے پورے ایک سو چورانوے افراد پر ایک بے گروپ، بے لقب 'فاضل' اہل نظر نے بڑی محنت کے ساتھ یہ کتاب مرتب اور شائع کی۔یہ مختصر خاکے ہیں جن میں ممدوحین کے کوائف (خواہ مختصراً) آگئے ہیں یعنی یہ ایک کتاب حوالہ بھی کہی جاسکتی ہے۔مرتب کون؟ کے ڈی اے کے ڈائریکٹر جنرل احمد حسین صدیقی امروہوی۔

DAWN
29.Jan.2003

True that there is no defence of the big claim which the title of the book makes--and the writer has left to us to see that, with so many luminaries -buried in Karachi 's graveyards.

BUSINESS RECORDER
22,Nov2003

He has provided a lot of precious information about the writers and poets who are very famous but people little know about them. "Dabistano Ka Dabistan Karachi" may be called research-based sketches book. ....